گلِ قریش

بہ نوکِ خارمی رقصم

نگہت سیما

نمی دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقصم
مگر نازم بہ آں ذوق کہ پیش یار می رقصم
بصد سامانِ رسوائی سَرِ بازار می رقصم
بگرد مرکز خود صورتِ پرکار می رقصم !

''میاں جی!''

ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہوئے مدحت نے اونچی آواز میں کہا۔

''میاں جی آ رہے ہیں۔''

لیکن لاؤنج خالی پڑا تھا۔ ایک شرمندہ سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر آ کر ٹھہر گئی۔

میاں جی آ رہے تھے۔ وہ کتنے دنوں بعد میاں جی سے ملے گی۔ اُف۔ اُف پورے تین ماہ ہو گئے تھے تو اسے میاں جی سے ملے ہوئے۔ اور ابھی ابھی باصر نے اُسے فون پر اطلاع دی تھی کہ وہ میاں جی کو ساتھ لے کر آ رہا ہے۔

''اُف اوہ کس کو بتائے کہ میاں جی آ رہے ہیں۔ انکل مراد تو آفس میں ہوں گے۔ اور آنٹی اپنے بیڈروم میں ہوں گی۔ یہ وقت اُن کے آرام کا تھا۔ ہاں سونیا۔ سونیا ضرور جاگ رہی ہوگی۔''

''سونی' سونی''

وہ اپنے لمبے سے دوپٹے کو سنبھالتی ہوئی سونیا کے کمرے میں آئی تو سونیا کارپٹ پر اوندھی لیٹی گانے سُن رہی تھی۔ اور اُس کے اردگرد کیسٹوں کا ڈھیر لگا تھا۔

''سونی۔ سونی۔'' اُس کی سنہری رنگت دمک رہی تھی۔

''ہوں۔'' سونیا نے نگاہیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ ''وہ۔ وہ میاں جی آ رہے ہیں۔ ابھی ابھی باصر نے

فون کیا ہے۔"

"باصر نے۔" سونیا اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں وہ گاؤں گئے ہوئے تھے۔ رات انکل نے اُن سے کہا تھا' وہ صبح گاؤں جا کر میاں جی کی خبر لے آئیں۔ اور اَب باصر نے فون کیا ہے کہ وہ میاں جی کو ساتھ لے کر آ رہا ہے۔ اُن کا کمرہ ٹھیک کر دیں۔"

"کمرہ تو اُن کا ٹھیک ہی ہوگا۔ مہراں ہر دوسرے تیسرے روز اُن کی صفائی کر دیتی ہے۔ لیکن میاں جی کو نہیں آنا چاہئے تھا۔ میرا مطلب ہے اس وقت نہیں۔"

"کیوں سونی" مدحت اُس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ اُس کا دمکتا ہوا رنگ ماند پڑ گیا۔ اور آنکھوں میں نمی سی اُتر آئی۔

"تمہیں کیا پتا سونی' میں میاں جی کیلئے کتنی اداس ہو رہی تھی۔ کتنا یاد کر رہی تھی اُن کو"

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ باصر تمہیں اُن سے ملوا لاتا۔" سونیا بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ نگاہیں جھکائے آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی۔

"مدحو" سونیا نے پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔

"تمہیں میاں جی سے بہت پیار ہے"؟ اُس نے سر ہلایا۔

"میں زندگی میں پہلی بار اُن سے جدا ہوئی ہوں۔ ناں۔ اس لئے وہ بہت یاد آتے ہیں۔ اور پھر میں نے اُن کے علاوہ اور کسی کی محبت نہیں دیکھی۔"

"ہم سب۔" سونیا نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔

"یقین کرو مدحو۔ ہم سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں اور جب آنٹی کی وفات کے بعد انکل شیراز تمہیں چھوڑ گئے تھے تو ماما ہرگز تمہیں میاں جی کے پاس چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ لیکن یہ میاں جی کی اور ماں جی کی خواہش تھی۔ اور پھر ماں جی کی وفات کے بعد بھی ماما تمہیں لانا چاہتی تھیں۔ لیکن پاپا نہیں مانے۔ اُن کا خیال تھا تم اگر یہاں آ گئیں تو میاں جی اکیلے رہ جائیں گے۔ اور اس مسئلے پر پاپا اور ماما کے درمیان کئی بار جھگڑا بھی ہوا ہے۔ دراصل ماما نہیں چاہتی تھیں کہ تم اس چھوٹے سے گاؤں میں پل کر زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاؤ کہ بہرحال تمہیں قصرِ مراد کی بہو بننا ہے۔"

سونیا نے شرارت سے اُسے دیکھا تو اُس کی سنہری رنگت پر شفق پھوٹ پڑی اور لانبی پلکیں جھک گئیں۔

"ہاؤ کیوٹ۔" سونیا نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا۔ اُسے اپنی مرحوم پھوپھی کی یہ اکلوتی بیٹی ان تین ماہ میں ہی بے حد عزیز ہو گئی تھی۔

اگرچہ عمر میں وہ اُس سے دو برس چھوٹی تھی۔ لیکن پہلے ہی دن جب وہ قصرِ مراد میں رہنے کے لئے آئی تھی تو سونیا نے اُس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔

"باجی۔ آپی کچھ نہیں۔ صرف سونی۔ میں تمہاری دوست ہوں۔"

اور مدحت جو پہلی بار میاں جی سے بچھڑی تھی۔ اور اس وسیع و عریض گھر کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اور کچھ کچھ گھبرا رہی تھی۔ اُس کے اندر طمانیت اُتر آئی۔ حالانکہ اس سے قبل دو تین بار ایک دو روز کیلئے سونیا جب گاؤں آئی تھی تو اُسے اپنی یہ ماموں زاد بہن کچھ مغرور مغرور سی لگی تھی۔ اور جب میاں جی نے یہ فیصلہ سُنایا تھا کہ اُسے اَب مزید تعلیم کے لئے قصرِ مراد میں جا کر رہنا پڑے گا تو وہ کچھ ڈر سی گئی تھی۔ بھلا وہ اُن مغرور لوگوں کے ساتھ کہاں رہ سکے گی۔ ماموں جنہیں وہ انکل مراد اور ممانی جنہیں وہ آنٹی کہتی تھی۔ سب ہی اُسے مغرور سے لگتے تھے۔

"نہ میاں جی! مجھے کہیں نہیں جانا۔ بس بہت پڑھ لیا۔"

"علم اچھی چیز ہوتی ہے' جتنا بھی حاصل کرو کم ہے اور پھر وہ تیرے ماموں کا گھر ہے ڈر کیسا؟"

"نہیں میاں جی! مجھے اور نہیں پڑھنا میں تو بس آپ کے پاس رہوں گی۔"

میاں جی تو شاید اُس کی بات مان بھی لیتے لیکن انکل مراد نے جانے اُن سے کیا کہا تھا کہ انہوں نے زبردستی اُسے یہاں بھیج دیا تھا۔

"اپنے پیارے نبی کا بھی حکم ہے بیٹا علم حاصل کرو۔"

اور یوں وہ میاں جی کے گھر کو چھوڑ کر یہاں قصرِ مراد میں آ گئی تھی۔ اور یہاں آ کر ہی اُسے سونیا سے پتا چلا تھا' کہ اُسے بالآخر اسی گھر میں آنا ہے۔ اور جب سے اُسے پتا چلا تھا وہ باصر کا سامنا کرنے سے گھبرانے لگی تھی۔ پتا نہیں کیوں اُسے سامنے دیکھتے ہی ہاتھ۔ پیروں میں سنسناہٹ ہونے لگتی تھی۔ لیکن باصر کے رویے سے کبھی کسی ایسی بات کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ وہی نارمل سا رویہ جو سونیا کے ساتھ تھا۔ اُس کے ساتھ بھی تھا۔

انکل مراد کے تین بیٹے تھے۔ بڑے تبریز مراد جس کو اُس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی کبھی گھر میں اُس کا ذکر سُنا تھا۔ پھر باصر مراد تھا۔ پھر سونیا تھی۔ اور پھر سب سے چھوٹا رمیض تھا۔ رمیض سے بھی ابھی تک اُس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ دراصل وہ کاکول میں تھا۔ انکل مراد اور آنٹی کی مرضی کے خلاف اُس نے آرمی میں کمیشن لے لیا تھا۔ اور آج کل ٹریننگ لے رہا تھا۔ سونیا نے اُسے اُس کے متعلق ساری تفصیل بتا دی تھی۔ اور باصر مراد تو سال میں ایک دو بار انکل مراد کے ساتھ میاں جی کے پاس آتا تھا۔ سو وہ اس گھر میں سب سے زیادہ باصر کو ہی جانتی تھی۔ اور اُسی سے بے تکلف تھی۔ لیکن جب سے سونیا نے اُسے بتایا تھا کہ اُسے قصرِ مراد کی بہو بننا ہے۔ تو وہ باصر سے بات کرتے ہوئے جھجکنے لگی تھی۔

حالانکہ صبح جب باصر' میاں جی سے ملنے جا رہا تھا تو اُس کا کتنا جی چاہا تھا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ جا کر میاں جی سے مل آئے۔ لیکن وہ بات کرتے ہوئے جھجک سی گئی تھی۔ اور کوریڈور میں دیوار سے ٹیک لگائے وہ چُپ چاپ کھڑی اُسے دیکھتی رہی تھی۔

"ہاں تو مدحت بی بی' میاں جی کے نام کوئی پیغام؟ اُس نے جاتے جاتے مڑ کر اُسے دیکھا تھا۔

اُس کا دل چاہا تھا' وہ باصر کو بتائے کہ وہ میاں جی سے جا کر کہے کہ وہ اُنہیں بہت یاد کرتی ہے۔ لیکن اُس کی آواز رندھ گئی تھی۔ اور اُس نے بنا بولے سر ہلا دیا تھا۔ اور اَب۔ اَب میاں جی آ رہے تھے۔ اُس کے پیارے میاں جی۔ اُس کے شفیق نانا ابا۔ شعور کی آنکھ اُس نے اُنہی کی گود میں کھولی تھی۔

وہ تین سال کی تھی۔ جب اُس کی ممی' اچانک چند دن بیمار رہ کر چل بسی تھیں۔ اور اُس کے ڈیڈی شیراز احمد اُسے آنٹی کے حوالے کر کے خود امریکہ چلے گئے تھے۔ سونیا کی امی اُس کی صرف ممانی ہی نہیں پھوپھی بھی تھیں۔ شیراز احمد اُن کے سگے بھائی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سونیا کو اپنے پاس رکھنا چاہتی تھیں۔ لیکن پھر میاں جی اور ماں جی کے سامنے جو جوان بیٹی کی موت سے دلگرفتہ ہو رہے تھے۔ مجبور ہو گئیں۔

"ہم اسے پا کر نزہت کا غم بھولنے کی کوشش کریں گے۔ اسے ہمیں دے دو بہو۔"

اور زینت مراد کتنی بھی ایڈوانس اور ماڈرن تھیں۔ میاں جی کی بات ٹالنے کا حوصلہ اُن میں نہیں تھا۔ حالانکہ دل ہی دل میں وہ اس بات پر بہت کڑھا کرتی تھیں۔ کہ مدحت ایک دقیانوسی ماحول میں پرورش پا رہی ہے۔ جبکہ وہ شیراز احمد سے وعدہ کر چکی تھیں کہ مدحت ہمیشہ اُن کی بیٹی بن کر اُن کے گھر میں رہے گی۔

"میاں جی نے اُسے پردے کی بو بنا رکھا ہے۔ وہ ہائی سوسائٹی کے آداب سے قطعی ناواقف

ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں شیراز سے کیا گیا وعدہ کیسے نبھاؤں گی۔'' وہ اکثر مراد علی سے اُلجھتی تھیں۔

''مراد پلیز آپ اُسے یہاں لے آئیں''۔

مگر میاں جی اُسے کسی صورت بھیجنے پر آمادہ نہ تھے۔ اور مراد علی جب بھی اُسے لینے کے ارادے سے شاہ پور گئے۔ بوڑھے باپ کی تنہائی کے خیال نے اُنہیں حرف مدعا کہنے نہ دیا۔ وہ میاں جی کا کس قدر خیال رکھتی تھی۔ صبح صبح اُن کے وضو کا پانی گرم ہوتا۔ تہجد کے لئے اُٹھتے تو وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوتی۔

اُن کے ناشتے' اُن کے کھانے پینے۔ اُن کی ہر ضرورت کا خیال۔ اور پھر سب سے بڑھ کر اُن کی تنہائی کی رفیق حویلی میں کئی نوکر تھے۔ لیکن میاں جی کا ہر کام مدحت خود کرتی تھی۔

اگر وہ مدحت کو لے گئے تو میاں جی تو بالکل اکیلے ہو جائیں گے۔ بالکل تنہا۔ تب وہ اصرار کرتے۔

''میاں جی! آپ چلیں نا میرے ساتھ چل کر شہر میں رہیں۔''

''نہ بچے میں یہاں ہی ٹھیک ہوں۔''

''میں آپ کو مس کرتا ہوں میاں جی''

''جیتے رہو بیٹا: پر اپنے ٹھکانے پر ہی جی لگتا ہے''

''میاں جی! میں روز روز یہاں نہیں آ سکتا پر میرا دل یہاں اٹکا رہتا ہے''۔

''میں تجھ سے گلہ تو نہیں کرتا بیٹا۔ جانتا ہوں تو نے بہت کام پھیلا لیا ہے''۔

اور یوں مدحت وہیں شاہ پور میں میاں جی کے پاس ہی رہی۔ لیکن زینت مراد کو جب سے پتا چلا تھا کہ اُس نے انٹر کر لیا ہے۔ اور شاہ پور کے قریبی قصبے میں لڑکیوں کا کالج صرف انٹر تک ہی تھا۔ تب سے وہ مراد علی کے پیچھے پڑی تھیں۔ کہ وہ مدحت کو لے آئیں۔

''وہ صرف میری بھتیجی ہی نہیں آپ کی بھانجی بھی ہے۔ اور کل کو بچوں نے اُس سے شادی سے انکار کر دیا تو؟ آج کل کے بچے گلیمر کو پسند کرتے ہیں۔ پڑھی لکھی لڑکی چاہتے ہیں۔''

''مدحت کے لئے رشتوں کی کمی نہیں ہوگی۔ وہ شاہ پور کے میاں جی کی نواسی ہے۔ برسوں سے جن کا خاندان شاہ پور کے لئے باعثِ فخر رہا ہے۔''

''جانتی ہوں پر یہ میاں جی کی بھی خواہش ہے کہ مدحت آپ کی بہو بنے''۔

اور میاں جی کی خواہش کا سُن کر مراد علی چُپ رہ گئے تھے۔ اور اگلی ہی صبح اُنہوں نے شاہ پور جا کر مدحت کی مزید تعلیم کے لئے بات کی تھی۔ اور میاں جی نے اس بات پر قطعی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا' یہ تو اُن کو اپنی خواہش بھی تھی کہ اُن کی لاڈلی بیٹی کی یہ نشانی زندگی کے کسی معاملے میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔

سونیا' مدحت کے چہرے پر نگاہیں جمائے سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

''سونی!'' مدحت نے اُسے پکارا تو وہ چونکی۔

''ہاں''

''میاں جی کس کمرے میں ٹھہریں گے۔ اگر تم مجھے بتا دو تو میں دیکھ لوں کہ وہاں' اُن کی ضرورت کی سب چیزیں موجود ہیں کہ نہیں''۔

''میاں جی پاپا کے ساتھ والے کمرے میں رہتے ہیں۔ مگر'' سونیا کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

''مگر کیا'' اُس نے پوچھا

''مگر میاں جی کو اس وقت نہیں آنا چاہئے تھا۔''

''کیوں؟'' مدحت کو بہت حیرت ہو رہی تھی۔

''کیا تمہیں میاں جی اچھے نہیں لگتے۔ وہ تو تم سب سے بہت محبت کرتے ہیں۔ مجھ سے ہمیشہ تم سب کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ تم سب کی بچپن کی باتیں۔ تبریز بھائی کی باصر کی' اور انکل مراد کی باتیں۔ ہمارے پاس کرنے کو اور کوئی باتیں بھی تو نہیں ہوتی تھیں۔ اس لئے وہ مجھ سے تم سب کی باتیں کرتے تھے۔ مگر تم؟'' اُس نے تاسف سے مدحت کی طرف دیکھا۔

''تم اُن کے آنے سے گھبرا رہی ہو۔ جب کہ وہاں حویلی میں بڑے بڑے لوگ آ کر میاں جی کی منتیں کرتے تھے۔ کہ وہ ان کے پاس آ کر رہیں۔ چند دن کے لئے ہی سہی۔''

''یہ بات نہیں ہے مدحو۔'' سونیا نے پریشانی سے کہا۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میری تو ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ میاں جی ہمارے پاس آ کر رہیں۔ جب ہم چھوٹے ہوتے تھے تو میاں جی یہاں آتے تھے۔ کبھی کبھی تو ہمیں مزے مزے کی کہانیاں سناتے تھے۔ اور یہ تو جب سے ماں جی کی وفات ہوئی ہے' انہوں نے آنا کم کر دیا۔ تمہاری وجہ سے۔ وہ تمہیں وہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ناں۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''وہ دراصل تبریز بھائی''

''کیا تبریز بھائی کو اُن کا آنا پسند نہیں ہے۔''

اُسے انتہائی دُکھ پہنچا۔

''اور میاں جی کو تبریز بھائی سے کتنی محبت ہے۔ سونی! تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔ سب سے زیادہ تبریز بھائی کے بچپن کی شرارتیں سُناتے ہوئے وہ محبت جو اُن کی آنکھوں سے چھلکنے لگتی تھی۔ اُس پر تو مجھے ہمیشہ رشک آتا رہا۔ کئی دفعہ تو مجھے یوں لگا جیسے۔ میاں جی مجھ سے بھی زیادہ تبریز بھائی سے محبت کرتے ہیں۔ اور پتا ہے مجھے سب سے زیادہ تبریز بھائی سے ہی ملنے کا شوق تھا۔ لیکن باصر نے بتایا تھا کہ وہ کہیں باہر گئے ہیں۔''

''وہ باہر نہیں گئے ہیں''۔ سونیا کی آواز رندھ سی گئی۔

''وہ دراصل (ADDIC) ہو گئے ہیں۔ نشہ کرنے لگے ہیں۔ تمہارے آنے سے پہلے وہ پاپا کی سیف سے پچاس ہزار روپیہ لے کر کہیں چلے گئے تھے۔ اور رات ہی واپس آئے ہیں۔ اُس وقت اپنے کمرے میں بے سُدھ پڑے ہیں۔ اس وقت کسی کو بھی اُن کی آمد کا نہیں پتا۔ سوائے میرے اور باصر کے۔ ہم دونوں رات جاگ کر مووی دیکھ رہے تھے۔ جب وہ اچانک آ گئے تھے۔ اور باصر کو تو پتا تھا پھر پتا نہیں وہ میاں جی کو ساتھ لے کر کیوں آ رہا ہے۔ میاں جی تبریز بھائی کو اس حالت میں دیکھیں گے تو اُنہیں دُکھ ہوگا۔ مدحو مجھے پتا ہے وہ تبریز بھائی سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ یہ صدمہ کیسے برداشت کریں گے۔ اور وہ کتنے سالوں کے بعد یہاں ہمارے گھر آ رہے ہیں۔ اور آتے ہی یہ دُکھ۔''

''تبریز بھائی نے بتایا نہیں' وہ کہاں چلے گئے تھے؟'' مدحت نے دُکھ اور حیرت سے پوچھا۔

''نہیں اُنہوں نے ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ میں نے کھانے کا پوچھا لیکن جواب نہیں دیا۔ اور سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ پہلے بھی ایسے ہی دو دو تین تین ماہ کے لئے غائب ہو جاتے تھے۔ لیکن پہلے جب واپس لوٹتے تھے۔ تو بہت بُری حالت ہوتی تھی۔ کپڑے پھٹے ہوئے بال اُلجھے ہوئے۔ مگر اس بار کچھ بہتر حالت میں تھے۔''

"مگر اس کا کوئی علاج نہیں ہے سونی؟"

"ہے۔ ہے مدحو! پاپا نے دو بار انہیں کلینک میں داخل کروایا۔ لیکن وہاں سے بھاگ گئے۔ ماما اُن کے آگے ہاتھ جوڑے' میں نے منتیں کیں۔ باصر نے سمجھایا' پاپا غصہ ہوئے۔ مگر وہ کسی کی سنتے ہی نہیں شروع شروع میں وعدہ کر لیتے تھے۔ مگر اب تو وعدہ بھی نہیں کرتے۔ الٹا ہنگامہ کرنے لگتے ہیں۔"

"یہ عادت اُنہیں کیسے پڑی سونی؟"

"پتا نہیں۔" سونیا نے بے دردی سے اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے کاٹا۔

"وہ اتنے اچھے تھے' اتنے پیارے اتنے محبت کرنے والے کہ ہم سب کو اُن پر فخر تھا۔

اسکول' کالج' یونیورسٹی ہر جگہ نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ ایم۔ بی۔ اے کرنے کے لئے پاپا نے اُنہیں امریکہ بھیج دیا۔ دو سال قبل اُنہوں نے نمایاں درجے میں ایم۔ بی۔ اے کیا اور پھر پاپا سے انہوں نے یورپ کی سیاحت کی اجازت مانگی۔ پاپا نے بخوشی اُنہیں اجازت دے دی کہ وہ چار چھ ماہ گھوم پھر لیں۔ مگر چھ ماہ کے بجائے اُنہوں نے ایک سال لگا دیا۔ اور جب ایک سال قبل واپس آئے تو وہ نشہ کے عادی (ADDIC ہو چکے تھے' مگر ہمیں اُس وقت پتا نہیں چلا۔ پاپا نے کتنی بار اُن سے کہا کہ وہ اب پاپا کے ساتھ جایا کریں۔ پاپا نے اُن کے لئے اتنا شاندار آفس ڈیکوریٹ کیا۔ مگر وہ اس آفس میں ایک ماہ سے زیادہ نہیں بیٹھے۔ اکثر ... سے پڑے رہتے۔ پھر یکا یک راتوں کو دیر سے گھر آنے لگے۔"

اُس کی آواز بھر آ گئی۔

"پاپا نے یہ ساری باتیں میاں جی سے چُھپائی ہیں۔ اُنہیں یہی معلوم ہے کہ تبریز بھائی ابھی امریکہ سے آئے ہی نہیں۔ مدحو! میاں جی کو یہ سب جان کر بہت دُکھ ہوگا۔ بہت دُکھ۔" وہ یکا یک دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"ہاں میاں جی کو بہت دُکھ ہوگا۔" مدحت نے سوچا۔ اور بمشکل روکے ہوئے آنسو بے اختیار بہہ نکلے۔

☆☆☆☆

"تینو۔ تینو۔ ارے بھئی کہاں ہو تینو؟"

دیپ کمار شور مچاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

گھر میں خاموشی تھی۔ اُس نے صحن میں ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ خاموشی خلاف معمول تھی۔ ورنہ جب بھی وہ گھر آتا اول تو اُس کی جیپ کی آواز سُن کر ہی سارا گھر صحن میں اکٹھا ہو جاتا تھا۔ ورنہ رتن تو ضرور صحن میں ہی موجود ہوتی' کبھی ننھے وکرم سے کرکٹ کھیلتی ہوئی اور کبھی یونہی صحن میں ٹہلتی ہوئی۔ چاہے تپتی دوپہر ہی کیوں نہ ہوتی۔

"دراصل مجھے پتا چل جاتا ہے۔ دیپو کہ تم آ رہے ہو"

"کیسے پتا چلتا ہے؟" وہ اُس کے لمبے بال کھینچتا۔

"دراصل ہم دونوں کے شریر (جسم) میں ایک ہی آتما (روح) ہے۔" وہ ہنستی۔

"ایک آتما دو شریر" وہ اپنا خوبصورت گورا چٹا ہاتھ آگے پھیلاتی۔

"یہ دیکھ رہے ہو اس ہاتھ کی لکیریں۔ دوسرے ہاتھ سے بالکل میل نہیں کھاتیں۔ دراصل یہ تمہارا ہاتھ ہے۔ اور تم اپنا ہاتھ دیکھو۔ دایاں ہاتھ۔ یہ میرا ہاتھ ہے۔" وہ حیرانی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھتا۔ یہ حقیقت تھی کہ اُس کے دائیں ہاتھ کی لکیریں بہت مختلف تھیں۔ اور ایک بار اُس نے اپنے ایک پامسٹ دوست کو جب ہاتھ دکھایا تھا تو اُس نے بتایا تھا۔ تمہارے اس ہاتھ کی لکیروں کی خصوصیات میں نسوانیت ہے۔" "دراصل ہماری لکیریں تبدیل ہو گئی

ہیں۔" رتن وضاحت کرتی۔ وہ اُلجھتا مگر اُس کی بات پر ایمان لے آتا۔ حالانکہ وہ دونوں جڑواں تھے۔ اور وہ رتن سے تین منٹ بڑا تھا لیکن بچپن سے لے کر اب تک وہ اُس کے نقشِ قدم پر چلا تھا۔ اُس کی بات مانی تھی۔ دونوں میں بے حد پیار تھا۔ حالانکہ اُسے ڈاکٹر بننا پسند نہیں تھا۔ لیکن صرف اُس کی خواہش پر اُس نے میڈیکل کی لائن اختیار کی تھی۔ اور اُسے گھر سے دور جانا پڑا تھا۔ مگر چھٹیاں ہوتے ہی وہ گھر کی طرف بھاگتا۔ اور پتا نہیں رتن کو کیسے خبر ہو جاتی تھی کہ ہمیشہ ہی وہ اُسے باہر ملتی مگر آج۔ آج پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ "کہیں وہ بیمار تو نہیں؟" اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ یکدم دم توڑ گئی اور چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ اُس نے تیزی سے بڑا سا صحن عبور کیا اور برآمدے میں آ کر ایک بار پھر اُسے آواز دی۔ "تینو۔ تینو" تب ہی رسوئی کے دروازے پر بھابھو کا آنچل لہرایا۔ سُتا ہوا چہرا۔ سوجی سوجی آنکھیں۔ "بھابھو" وہ حیرانی سے اُنہیں دیکھتا اُن کی طرف بڑھا۔

"کیا ہوا ہے؟ سب خیریت تو ہے ناں؟"

"ہاں" اُنہوں نے نظریں جھکا لیں۔

"سب' تینو' وکرم' بھاجی۔ اور ماتا جی سب خیریت سے تو ہیں ناں" اُس نے بے یقینی سے اُنہیں دیکھا۔

"ہاں سب خیریت سے ہیں۔ تم اچانک کیسے آ گئے"

"کالج میں اسٹرائیک ہو گئی تھی۔ چلا آیا۔ مگر یہ سب ہیں کہاں؟" اُس نے ایک بار پھر اُن کے چہرے کی طرف متجسس نظروں سے دیکھا۔

"وکرم سو رہا ہے۔ ماتا جی کہیں باہر گئی ہیں۔ اور تمہارے بھاجی ابھی دفتر سے ہی نہیں آئے۔"

"اور تینو؟" اُس نے بے قراری سے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں ہے"

"او گاڈ! وہ اپنے کمرے میں ہے۔ اور ابھی تک باہر نہیں آئی۔ او وہ تینو کی بچی کیا آج تیری آتما نے تجھے خبر نہیں دی کہ ہم آ گئے ہیں؟"

وہ بھابھو کو وہیں چھوڑ کر اُسے آوازیں دیتا اُس کے کمرے کی طرف لپکا۔ وہ کمرے کے وسط میں قالین پر گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹیکے بیٹھی تھی۔ اور اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔

"تینوں کی بچی" دیپ نے اُسے ہلکی سی چپت لگائی۔

"تو یہاں چھپی بیٹھی ہے۔ اور میں ایک گھنٹے سے باہر کھڑا آوازیں دے رہا ہوں۔ کیا بات ہے۔ آج تیری آتما نے تجھے میرے آنے کی خبر نہیں دی۔"

"نہیں مجھے پتا تھا آج تم آؤ گے' دیپو میرا دل کہہ رہا تھا۔"

"پھر؟" وہ اُس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا اور جُھک کر اُس کا چہرا دیکھا۔

"میرے آنے سے پہلے تم رو رہی تھیں؟"

"نہیں۔ نہیں تو؟"

"اوہ کیا بات ہے؟ یہ سب کیا ہے۔ ماتا جی کہاں ہیں اور تمہیں کیا ہوا ہے۔ بھابھو بھی روئی روئی سی لگ رہی تھیں۔ تم سب مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ سب سچ سچ بتا دو۔ ماتا جی تو ٹھیک ہیں۔ ناں' بھاجی اور وکرم؟"

"سب ٹھیک ہیں دیپو۔"

"پھر؟"

"کچھ نہیں' وہ ہنسی۔

''یونہی۔''

''یونہی کیا؟'' وہ جھنجلا گیا۔

''میں پوچھتا ہوں بھابھو سے۔ کچھ تو ہے میں پاگل تو نہیں ہوں' جو اس بدلے ہوئے ماحول کو محس

نہ کرسکوں۔ کیا بھاجی کی رپورٹس آ گئی ہیں۔ ڈاکٹر نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟'' وہ ایک دم ہی بہت پریشان ہو گیا تھا

''سب ٹھیک ہے دیپو''۔ رتن نے ہولے سے اُس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

''ساری رپورٹس کلیئر ہیں۔ بس یونہی معمولی سا معدے کا پرابلم تھا۔''

''پھر؟'' اُس نے سوالیہ نظروں سے اُس کی روئی روئی آنکھوں کو دیکھا۔ تو اُس نے نگا

چُرالیں۔

''سب مجھ سے خفا ہیں ناراض ہیں۔ ماتا جی ' بھابھو بھاجی سب؟''

''تم سے؟'' اُس نے حیرانی سے اُسے دیکھا۔ وہ تو سب کی آنکھوں کا تارا تھی۔ بھابھو اور بھاج

اُسے وکرم سے زیادہ چاہتے تھے۔

''تم نے کیا کیا ہے؟''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ دیپو''۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی

''مت روتینو''۔ دیپ نے اُسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''تم سے کوئی خفا نہیں ہوسکتا۔ تمہیں وہم ہوا ہوگا۔ میں پوچھتا ہوں ابھی بھابھو سے کہ وہ تینو

کیوں خفا ہیں۔ وہ یونہی تمہیں ستا رہی ہوں گی۔''

اُس نے اپنے ہاتھوں سے اُس کے آنسو پونچھے۔

''نہیں' وہ خفا ہیں بہت زیادہ خفا ہیں۔ رتن کور نے روتے ہوئے کہا۔'' حالانکہ میں نے تو صرف

ہی کہا تھا کہ ہمارا مذہب صحیح نہیں ہے۔''

''کیا؟'' دیپ نے بے اختیار اُسے خود سے الگ کر دیا۔

''کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''اب تم بھی مجھ سے خفا ہو جاؤ گے۔ مگر دیپو تم۔ تم تو مجھے جانتے ہو۔ اچھی طرح سے جانتے ہو

میں کوئی بات یونہی نہیں کہتی۔ اور یہ بھی میں نے یونہیں نہیں کیا ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر بہت غور و فکر کر کے بہ

سے سوالوں کے جواب ڈھونڈے ہیں۔ میں نے اور پھر جواب نہ پا کر میں نے بھاجی سے پوچھا ہے۔ بھا

سے پوچھا ہے۔ ماتا جی سے پوچھا ہے۔ اور سب خفا ہو گئے ہیں۔ مجھ سے سب نے بات چیت بند کر دی ہے

مجھ سے حتیٰ کہ وکرم کو بھی میرے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیا ہے۔''

دیپ حیرت سے پوری آنکھیں کھولے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''اگر ہمارا مذہب سچا ہے تو پھر بھاجی میرے سوالوں کے جواب کیوں نہیں دیتے۔'' اُس

ہولے سے اُس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

''اور مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ یہ سب کیا ہے۔

یہ کرشن جی' گؤ ماتا ہنومان جی''

''چپ۔ چپ کرو تینو'' دیپ نے گھبرا کر اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

''آگے کچھ مت کہنا۔''

''دیپو۔ دیپو کیا تم بھی کیا تم بھی میرے سوالوں کے جواب نہیں دو گے؟''

''میں۔'' دیپ کمار نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔

''میں خود کچھ نہیں جانتا تینو۔ لیکن ایک بات کا مجھے پتا ہے۔ کہ ہمارا دھرم سچا ہے۔ اور بھگوان۔''

''بھگوان کہاں ہے۔ بھگوان کون ہے۔؟'' رتن نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''یہ اتنی ڈھیر ساری مورتیاں کیا یہ سب بھگوان ہیں''؟

''نہیں۔ نہیں یہ تو بھگوان کے مختلف روپ ہیں''۔ وہ پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا۔

سچ تو یہ تھا کہ اُسے خود مذہب کے متعلق کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔ اور نہ ہی اُس نے مذہبی کتابیں زیادہ پڑھ رکھی تھیں۔ بچپن سے ہی وہ کانونٹ میں پڑھ رہا تھا۔ اور وہاں کانونٹ کے چرچ میں اُس نے حضرت مریمؑ کا بڑا سا مجسمہ دیکھا تھا۔ جس پر ہاتھ رگڑنے سے ہاتھوں سے خوشبو آتی تھی۔ یا پھر حضرت عیسیٰؑ کا وہ مجسمہ جو دعائیہ ہال کے وسط میں تھا۔ لکڑی کی صلیب پر ٹنگا ہوا تھا۔ اور چھٹیوں میں جب کبھی وہ گھر آتا تھا تو ماتا جی کو عبادت والے کمرے میں صبح سویرے کرشن جی کی مورتی پر ہار ڈالتے اور ہاتھ باندھ کر پراتھنا کرتے دیکھا تھا۔ مندروں میں تو شاید وہ اپنی اس پوری زندگی میں ایک دو بار ہی گیا تھا۔ بچپن میں ایک بار وہ ماں جی کے ساتھ۔ ہومان مندر گیا تھا۔ اور وہاں اُس نے ہنومان جی کی مورتی دیکھی تھی۔ اور بھاجی نے اُسے بتایا تھا کہ یہ شری رام چندر جی کا غلام تھا۔ اور جب راون جو لنکا کا راجہ تھا۔ سیتا جی کو اغوا کر کے لے گیا تھا تو ہنومان جی نے اپنی دُم سے آگ باندھ کر تمام لنکا کو جلا دیا تھا۔ اور ہنومان جی کی مورتی کے آگے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے ہوئے اس پر ایک عجیب سا رعب اور ہیبت طاری ہو گئی تھی۔ بس اس کے علاوہ تو وہ کچھ نہ جانتا تھا۔ مذہب کے معاملے میں اُس کا علم بالکل محدود تھا۔ لیکن اتنا اُسے پتا تھا کہ اُس کے باپ دادا کا یہی مذہب تھا اور اُس کا بھی یہی مذہب ہے۔ اور یہ کہ اُس کے باپ ' دادا کا مذہب جھوٹ نہیں ہوسکتا۔

رتن نگاہیں اُٹھائے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''دیکھو تینو میں کچھ نہیں جانتا لیکن میرا ایک دوست ہے گوپی اُس کے دادا بہت بڑے عالم ہیں۔' انہوں نے بڑے جاپ کیے ہیں۔ اور اُن کا علم مذہب کے متعلق بہت زیادہ ہے۔ میں شام کو تمہیں اُن کی طرف لے چلوں گا۔ وہ یقیناً تمہیں مطمئن کر دیں گے۔''

''میں بھی تو مطمئن ہونا چاہتی ہوں۔ دیپو۔'' رتن کی آنکھوں میں ستارے سے چمکے۔

''میں اُن سارے سوالوں کے جواب جاننا چاہتی ہوں جو ریٹا اور آن نے مجھ سے کیے ہیں''۔

''یہ کون ہیں۔؟'' دیپ نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''مسٹر رابرٹ کی بھانجیاں ہیں اور پاکستان سے آئی ہیں۔''

''مسٹر رابرٹ کیسے ہیں؟''

''فائن اور تمہیں یاد کرتے ہیں۔''

''اور اُن کا جیکی''

''وہ مر گیا ہے۔ پاگل ہو گیا تھا۔ مسٹر رابرٹ نے اُسے خود گولی مار دی اور پھر خود تین دن تک روتے رہے۔''

''اوہ ویری سیڈ: دیپ نے افسوس کا اظہار کیا۔

''میں شام کو اُن سے ملنے جاؤں گا۔''

''تم کتنے دنوں کے لئے آئے ہو دیپو؟''

"کچھ کہہ نہیں سکتا فی الحال کالج نا معلوم مدت کے لئے بند ہوا ہے۔"

"اوہ پھر تو عیش ہے۔ ہم خوب گھومیں گے۔ خوب سیر کریں گے۔ کتنے دن ہو گئے ہیں مجھے جو ہو گئے ہوئے۔ ریتا اور آن کو بھی لے لیں گے" وہ ایک دم خوش دکھائی دینے لگی تھی۔ دیپ گہری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُسے اپنی یہ جڑواں بہن بے حد عزیز تھی۔ بے حد پیاری تھی۔ اور ابھی چند دن پہلے تک یہ فضول قسم کے خیالات اُس کے ذہن میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ یقیناً سارا قصور ریتا اور آن کا ہے۔ میں بھابھو سے کہہ دوں گا کہ وہ ان لڑکیوں کو زیادہ اِدھر نہ آنے دیا کریں۔ اور تینو کو بھی اُدھر نہ جانے دیا کریں۔ مسٹر رابرٹ اُن کے گھرانے کے بہت پرانے دوست تھے۔ وہ اور تینو تو اُنہی کے گھر میں کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ وہ برصغیر کی تقسیم سے کچھ ہی دن پہلے ہندوستان آئے تھے اور پھر تقسیم کے بعد واپس نہ گئے اور وہاں ہی ایک اینگلو انڈین لڑکی سے شادی کر لی تھی اور وہاں ہی رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ بیوی ایک بچی کی پیدائش کے بعد چل بسی تھی۔ اُس بچی کی پرورش ہی اُن کی زندگی کا حاصل تھی۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ اٹھارہ سال کی عمر میں اِس لڑکی نے اچانک گھر چھوڑ دیا۔ پتا نہیں وہ کہاں تھی زندہ بھی تھی یا نہیں؟ اُس کے متعلق مسٹر رابرٹ نے کبھی بات نہیں کی تھی۔ اور ایک طویل عرصے سے وہ تنہا زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُن کا ساتھی اُن کا کتا جیکی تھا۔ جیسے وہ ہر وقت ساتھ رکھتے تھے۔ رتن سے اور دیپ سے وہ بہت پیار کرتے تھے۔ اور یہ کیسے ممکن تھا کہ تینو کو اُن کے گھر جانے سے منع کر دیا جاتا۔ خود ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کون سا یہ لڑکیاں یہاں عمر بھر رہیں گی۔ زیادہ سے زیادہ دو ماہ یا تین ماہ رہیں گی۔ اور بس پھر میں دیکھتا ہوں بھابھو کو خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا رکھا ہے۔

"بھابھو! بھابھو۔" وہ اُنہیں پکارتا ہوا باہر نکل آیا۔ وہ ابھی تک رسوئی کے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں۔

"یہ کیا مصیبت ہے، اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہوں۔ اور یہاں سب کے منہ سوجے ہوئے ہیں۔ جلدی سے چائے پلا دیں۔"

وہ رسوئی کی طرف مڑیں۔

"اور سنیے چائے اُدھر تینو کے کمرے میں ہی لے آئیں۔ اور یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے جس کے لئے آپ سب نے تینو سے قطع تعلق کر رکھا ہے۔"

"بڑی بات نہیں ہے۔ دیپو؟" وہ جاتے جاتے پلیٹ آئیں۔

"وہ تمہاری لاڈلی بہن ناستک بک رہی ہے۔ پاپی ہو گئی ہے۔ عجیب عجیب باتیں کرنے لگی ہے۔ کہتی ہے۔ ہمارا دھرم جھوٹ ہے۔ اور ہم سب جاہل ہیں۔ اَن پڑھ ہیں۔ جو پتھروں کو خدا مان رہے ہیں۔ بھگوان یہ پتھر، مٹی اور لکڑی سے تراشی مورتیاں نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے۔ تم سے اُس نے کچھ نہیں کہا۔ وہ تو اور بھی بہت کچھ کہتی ہے۔"

"بھابھو! پیاری بھابھو" اُس نے اُن کے گلے میں بانہیں ڈال کر اُنہیں گدگدایا۔

"وہ کوئی بہت بڑی نہیں ہے۔ اس دسہرے کے تہوار میں وہ اٹھارہ برس کی ہوئی تھی۔ اور اس عمر میں ایسے سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ذہن میں اور پھر جب اُن کا تسلی بخش جواب مل جائے تو پھر خود بخود ہی سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اسے اس طرح الگ کرنے کے بجائے آپ کو اس کے سوالوں کا جواب دینا چاہئے تھا"۔

"ہوں" انہوں نے گہری سانس لی۔

"کہتے تو تم ٹھیک ہو لیکن دیپو، تم بھی تو اٹھارہ سال کے ہو۔ لیکن تمہارے ذہن میں اس طرح کے سوال پیدا کیوں نہیں ہوئے۔؟"

"میرے ذہن میں" اُس نے سٹپٹا کر اُن کی طرف دیکھا۔

"دراصل میرے پاس تو وقت ہی نہیں ہوتا۔ ہر وقت پڑھائی۔۔ ہر وقت پڑھائی۔ پیاری بھابھو اب کچھ ملے گا بھی یا نہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں" پہلی بار وہ مسکرائیں۔

تم چلو ریتو کے کمرے میں، میں وہاں ہی چائے لاتی ہوں۔"

اُس نے ہلکے سے سیٹی بجائی یعنی بھابھو کی ناراضگی تو ختم، کیونکہ جب اُنہیں رتن پر بہت ٹوٹ کر پیار آتا تھا تو وہ اُسے ریتو کہہ کر بلاتی تھیں۔ ریتو بھابھو کی پہلی بیٹی تھی۔ دو سال کی عمر میں گردن توڑ بخار سے مر گئی تھی۔ اور یہ حقیقت تھی کہ انہوں نے تینو کو اور دیپو کو ماتا جی سے زیادہ چاہا تھا۔ ریتو کے بعد بارہ سال تک وہ اولاد کی نعمت سے محروم رہی تھیں۔ اور بارہ سال بعد پھر دکرم آیا تھا۔ کتنی منتیں مانی تھیں۔ انہوں نے اور ماتا جی نے۔

"رتن رتنوا۔ تینو۔" وہ سُر میں اُسے پکارنے لگا۔ اور یونہی گنگناتا ہوا اندر آیا تو وہ اس طرح زمین پر بیٹھی تھی۔

"ارے تم اسی طرح بیٹھی ہو؟"

"بھابھو بہت خفا ہیں نا؟" اُس نے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں" اُس نے اُس کے بال پکڑ کر کھینچے۔

"چلو اُٹھو، منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ بھابھو زبردست چائے بنا کر لا رہی ہیں"

"مگر وہ تو۔"

"بھئی میں نے اُنہیں سمجھا دیا ہے نا کہ اپنی تینو تو ایک دم سے بدھو ہے۔ گوپی کے دادا جی اُس کے تمام سوالوں کے تسلی بخش جواب دے دیں گے۔ اور بس سب ٹھیک۔"

تم شام کو مجھے لے چلو گے نا گوپی کے دادا کی طرف"

"ضرور کیوں نہیں۔"

"میں بھی چلوں گی دیپو۔" بھابھو دروازے پر کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ اور اُن کے پیچھے رسوئیا ٹرے اُٹھائے کھڑا تھا۔

"بھابھو آپ مجھ سے خفا نہیں ہیں نا؟" رتن نے بھاگ کر اُن کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اور بھابھو نے اُسے گلے لگاتے ہوئے اُس کی پیشانی چوم لی۔

☆☆☆☆

میاں جی کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ اور وہ مراد علی کا ہاتھ تھامے پوچھ رہے تھے۔

"یہ سب کب ہوا؟ کیسے ہوا اور تم نے اُسے روکا نہیں، منع نہیں کیا؟"

"میں کیا کرتا میاں جی۔ مجھے خود کچھ خبر نہ تھی۔"

مراد علی نے نگاہیں جھکا لیں۔

"اور جب خبر ہوئی تو میں نے بڑے بڑے ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کیں۔ دو بار کلینک میں داخل کروایا۔ لیکن سخت نگرانی کے باوجود یہ وہاں سے بھاگ نکلا۔"

میاں جی تاسف سے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔ اور اُن کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

"میاں جی، میاں جی بس اَب مت روئیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ پہلے ہی بیمار ہیں"۔ مدحت نے اُن کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ اُن کا ہاتھ تھام کر التجا کی تو انہوں نے مدحت کی طرف دیکھا اور اُن کا دل بے اختیار اور زیادہ

رونے کو چاہا۔ مگر انہوں نے ہونٹ بھینچ کر اپنی سسکیاں روک لیں اور ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں صاف کیں۔

اُنہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ تبریز ہی تھا۔ جو ابھی کچھ دیر پہلے اُن کے سامنے سے گذرا تھا۔ لیکن اُس نے میاں جی کی طرف یا وہاں موجود کسی بھی شخص کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کا شلوار سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور اُس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ چہرا زرد تھا۔ پانچ سال قبل جب امریکہ جانے سے پہلے میاں جی اُس سے ملنے آئے تھے' وہ ایک۔ صحت مند نوجوان تھا۔

''کیا۔ کیا یہ تبریز تھا؟'' اُنہوں نے بے یقینی سے مراد علی کی طرف دیکھا تھا۔

''جی میاں جی!'' مراد علی کی نظریں جھک گئیں۔

''تبریز بیٹا! تبریز بیٹا!'' میاں جی _____ بے اختیار اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''بیٹھیے میاں جی۔'' مراد علی نے اُنہیں کندھوں سے پکڑ کر بٹھایا۔

''یہ امریکہ سے کب آیا ہے اور کیا اس کی آنکھوں سے پہچان ختم ہو گئی ہے۔''

وہ دراصل میاں جی'' مراد علی نے ہولے ہولے ساری حقیقت کہہ دی۔

''اور تم نے مجھے خبر تک نہ دی۔ اطلاع بھی نہ کی'' اُنہوں نے شکوہ کیا۔

''آپ کو دُکھ ہوتا میاں جی!''

''دکھ۔'' انہوں نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

کیا اَب اُنہیں دُکھ نہ ہوا تھا۔ اُن کا دل تو کٹ رہا تھا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ یہ وہی تبریز تو تھ جس کے لئے اُنہوں نے راتوں کو اُٹھ کر دُعائیں کی تھیں۔ 'جو اُن کا سب سے چہیتا تھا۔ اور جس کے لئے وہ مراد علی سے اکثر کہا کرتے تھے۔

''مراد علی! یہ تو میرا بیٹا ہے۔ یہ اپنی تعلیم مکمل کر لے پھر میں اسے اپنے پاس ہی رکھ لوں گا۔'' اور خود تبریز بھی اُن پر جان چھڑکتا تھا۔ اُن کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتا تھا۔ اُن سے لاڈ کرتا تھا۔ اور جب مراد علی شاہ پور۔ چھوڑ رہے تھے۔ تو اُس وقت صرف تبریز ہی قدرے سمجھدار تھا۔ باصر اور سونیا تو بچے تھے۔ لیکن میاں جی کے لئے کیسا تڑپ تڑپ کر رویا تھا۔ اور پھر لاہور آتے ہی وہ اُن کی جدائی میں بیمار پڑ گیا تھا۔ اور وہ صرف تبریز کی خاطر ہی دو تین ماہ بعد وہ لاہور کا چکر لگائے جاتے تھے۔ لیکن پھر مدحت کی وجہ سے اُن کا آنا کم ہو گیا تھا۔ لیکن تبریز اُنہیں فون ضرور کرتا تھا۔

''میاں جی پلیز' آپ اپنے کمرے میں چل کر آرام کریں۔ آپ پہلے ہی بیمار ہیں۔'' باصر نے ہاتھ پکڑ کر اُنہیں اُٹھایا تو وہ چُپ چاپ اُٹھ کر ساتھ چل دیے۔

''میاں جی کو بہت دُکھ ہوا ہے۔'' سونیا نے گہری سانس لی۔

ابھی کچھ دیر قبل ہی تو وہ آئے تھے۔ اور ابھی۔ لیونگ روم میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ باصر نے دو تین بار کہا تھا۔

''میاں جی آپ کمرے میں چل کر آرام کریں۔ میں ابھی کچھ دیر تک ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔''

''نہیں بھئی بیٹھنے دو' مدحت بیٹی اور تم سب کو دیکھ کر میری آدھی بیماری تو ختم ہو گئی ہے۔''

باصر' میاں جی کو اُن کے کمرے میں چھوڑ کر آیا تو سونیا نے اُسے بلا لیا۔

''تمہیں پتا تھا باصر کہ تبریز گھر آ گیا ہے۔ پھر بھی تم میاں جی کو لے آئے۔''

''میاں جی بہت بیمار تھے۔ اور اُنہیں وہاں اکیلا چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ شکور نے بتایا تھا۔ میاں جی کو بہت تکلیف ہے۔ دمے کی شکایت ہے۔ کئی دفعہ تو سانس اُکھڑتا ہے۔ تو لگتا ہے جیسے واپس نہیں آئے گا۔''

''میاں جی اتنے بیمار تھے اور انہوں نے اطلاع بھی نہ دی۔'' سونیا نے پوچھا۔

''میاں جی ایسے ہی ہیں سونی۔ پہلے بھی جب کبھی بیمار ہوتے تھے۔ اور میں کہتی تھی۔ انکل مراد کو اطلاع دے دوں تو منع کر دیتے تھے۔ کہ خواہ مخواہ پریشانی ہو گی''۔

''ہمارے میاں جی گریٹ ہیں۔'' باصر وہیں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''سونی تم نے پوچھا تھا تبریز بھائی سے کہ وہ کہاں رہے اتنا عرصہ؟''

''نہیں میں دو بار گئی مگر وہ سو رہے تھے۔ بس ابھی تمہارے سامنے ہی تو وہ کمرے سے باہر آئے ہیں۔ ناشتا بھی نہیں کیا۔ اور نہ ہی کھانا کھایا ہے۔ میاں جی کے آنے سے کچھ دیر پہلے میں نے ماما کو اُن کے متعلق بتایا تھا۔ تو وہ اُن کے کمرے میں گئی تھیں''۔

''ماما سے کیا بات ہوئی؟''

''پتا نہیں۔''

''ماما باصر نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز دی۔ زینت مراد میاں جی سے مل کر واپس اپنے بیڈ روم میں چلی گئی تھیں۔

''ماما کے کلب میں تو آج کوئی فنکشن ہے۔ وہ تیار ہو رہی ہیں۔'' سونیا نے بتایا۔

''ماما کے کلب میں تو ہر روز ہی کوئی نہ کوئی فنکشن ہوتا ہے۔'' باصر نے بیزاری۔ سے کہا''

''آج تو کم از کم اُنہیں گھر میں رہنا چاہیے تھا۔ میاں جی آئے ہیں۔''

''تمہیں پتا ہے باصر' ماما اپنے کلب کے فنکشن مِس نہیں کر سکتیں۔ پھر کڑھنے سے فائدہ۔''

''دراصل'' وہ مدحت کی طرف مُڑی جو دونوں ہاتھوں کی کٹوری میں ٹھوڑی ٹیکے کچھ سوچ رہی تھی۔

''اس لیڈیز کلب کی بنیاد ماما نے ہی رکھی ہے۔ اس لئے وہ۔''

''تم ماما کو DEFEND (دفاع) مت کیا کرو سونی؟ باصر نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''آج کم از کم ماما کو گھر پر رہنا چاہیے تھا۔

''ماما'' اُس نے پھر آواز دی۔

''کیا ہے بھئی کیوں چلا رہے ہو؟ ناخنوں پر سے کیوٹیکس صاف کرتی ہوئی وہ اندر آئیں۔

''ماما آج کلب جانا ضروری ہے کیا؟''

''ہاں جانا ضروری ہے نا آج ہم بیگم وہاب کے اعزاز میں ڈنر دے رہے ہیں۔ اور سارا انتظام مجھے ہی کرنا ہے۔''

''آپ کو پتا ہے' آج میاں جی آئے ہیں۔ اور وہ بیمار ہیں۔ آپ کے کلب کی اتنی ممبرز خواتین ہیں۔ کسی اور کے ذمے کر دیجئے نا سارا انتظام۔ آپ اگر نہیں جائیں گی تو کوئی فرق پڑے گا کیا؟

''پڑے گا فرق میری جان پڑے گا''۔ انہوں نے آہستگی سے اُس کے رخسار پر تھپکی دی۔

''وہاب صاحب قومی اسمبلی کے ممبر ہی نہیں ہیں بلکہ تیل اور گیس کی وزارت بھی اُن کے پاس ہے۔''

''ماما پلیز آپ آج رُک جائیں۔ میاں جی کو ابھی میں نے سکون آور دوا دی ہے۔ اُمید ہے' وہ سو گئے ہوں گے۔ لیکن تبریز بھائی کو دیکھ کر اُنہیں بہت شاک لگا ہے''

''وہ تبریز سے ملے۔'' زینت مراد نے کس قدر پریشانی سے پوچھا۔

''اُنہیں تبریز سے نہیں ملنا چاہیئے۔ سونی میں نے تمہیں سمجھایا بھی تھا۔''

''ماما وہ خود ہی نیچے اُتر آئے اور پھر میاں جی کے سامنے سے اُن کی طرف دیکھے بنا گذر گئے''۔

''اوہ خدایا۔'' انہوں نے سر تھام لیا۔

''ماما۔'' باصر نے اُن کی طرف دیکھا۔

''تبریز'' بھائی سے آپ کی کیا بات ہوئی تھی۔
انہوں نے یہ تین ماہ کہاں گذارے ہیں۔''

''وہ اپنا علاج کرواتا رہا ہے۔ اور اَب اُس نے نشہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔''

''رئیلی ____ (سچ مچ) ماما۔'' سونیا خوشی سے اُچھل پڑی۔

''میں ابھی جا کر میاں جی کو بتاتی ہوں''

''دھیرج سسٹر''۔ باصر نے اُسے کندھے سے پکڑ کر بٹھا دیا۔

''میاں جی آرام کر رہے ہیں۔''

''کیا آپ کو یقین ہے ماما کہ تبریز بھائی سچ کہہ رہے ہیں۔''؟ باصر نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

''ہوں۔'' اُنہوں نے کن اکھیوں سے مدحت کی طرف دیکھا۔

''مجھے یقین ہے۔ کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ اُس کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔''

''ہاں لگ تو رہا ہے۔'' سونیا نے آہستگی سے کہا۔

''لیکن انہوں نے ہم سے بات کیوں نہیں کی۔''

''وہ شرمندہ ہے تم سب سے''

باصر نے صوفے کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''ڈاکٹر صاحب تو گئے'' سونیا نے مدحت سے کہا تو اُس نے چونک کر باصر کو دیکھا۔ اور پھر فوراً نظریں جھکا لیں۔

''مدحو! سونی تم دونوں چلو گی میرے ساتھ۔'' ''نو ماما''۔ سونیا نے انکار کیا اور مدحت نے بھی نفی میں گردن ہلا دی اور زینت مراد سر کو ہلکا سا خم دے کر پھر اپنے ڈریسنگ روم میں چلی گئیں۔

''پتا ہے مدحو! ماما اَب پورے دو گھنٹے بعد اپنے ڈریسنگ روم سے برآمد ہوں گی''۔

''اور میں اتنی دیر میں شاہ پور کا ایک چکر لگا کر واپس بھی آ سکتا ہوں'' باصر نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔

''خیریت تو ہے ناں۔ آج کل شاہ پور کے بڑے چکر لگتے ہیں۔''

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔ سسٹر''

اُس نے بدستور آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔

''کوئی دھماکہ تو نہیں کرنے والے؟''

دھماکہ ہی سمجھ لو''

''کب کر رہے ہو یہ دھماکا؟''

''پہلے ہاؤس جاب مکمل کر لوں پھر''۔؟

''کسی لڑکی کو پسند کر لیا ہے کیا؟''

''اوہ ہو سونی۔'' وہ آنکھیں کھول کر سیدھا ہو بیٹھا۔

''تم لڑکیوں کو اس کے علاوہ بھی کوئی بات آتی ہے۔''

''تو پھر کیا دھماکا کرنے والے ہو۔''

''میں'' اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''نہر کے پیچھے والی جو زمین نہیں ہے ہماری۔''

''ہاں''

''میں اُس پر ایک ہاسپٹل بنوانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''وہاں شاہ پور میں'' سونیا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''وہاں کیا فائدہ؟''

''کیوں؟'' اُس نے بھنویں اچکائیں۔

''کیا وہاں انسان نہیں رہتے۔ کیا وہ بیمار نہیں ہوتے''

''مگر باصر! پاپا وہاں ہرگز روپیہ انویسٹ نہیں کریں گے۔''

IT IS NOT YOUR PROBLEM MY SISTER

یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے میری بہن۔

''مگر باصر! میں جانتی ہوں' مجھے پتا ہے پاپا نے گلشن اقبال والے چاروں پلاٹ تمہارے ہاسپٹل کے لئے رکھ چھوڑے ہیں۔ بلکہ اُنہوں نے کسی آرکیٹکٹ سے بات بھی کر لی' وہ ساری پلاننگ کر چکے ہیں باصر۔''

''زندگی میری ہے اور اس کی پلاننگ بھی مجھے کرنی ہے۔ اب اس موضوع کو ختم کرو۔''

''مگر باصر! پاپا ہرٹ (دلبرداشتہ) ہوں گے تبریز بھائی نے اُنہیں پہلے ہی بہت دُکھ پہنچایا ہے۔''

باصر نے کچھ جواب نہ دیا اور گہری گہری نظروں سے مدحت کو دیکھنے لگا۔ جو اُن دونوں کی گفتگو سے بے نیاز سر جھکائے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اور یہ لڑکی مدحت شیراز کتنی معصوم اور سادا لگتی ہے۔ یہاں کی لڑکیوں سے بالکل مختلف اور منفرد۔

مدحت نے اُس کی نگاہوں کی تپش محسوس کرتے ہوئے نگاہیں اُٹھائیں۔

''کیا سوچا جا رہا ہے مدحت بی بی۔'' اُسے اپنی طرف دیکھتا پا کر باصر نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ وہ میاں جی۔ میاں جی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ کہیں اُن کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔''

''وہ سو رہے ہوں گے۔ تم بے فکر رہو۔ لیکن اگر تمہیں تسلی نہیں ہو رہی تو خود ایک نظر جا کر دیکھ لو۔''

''جی'' وہ ایک دم ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''دراصل اُس نے میاں جی کے علاوہ اور کسی کو دیکھا بھی تو نہیں ہے ناں۔ بہت محبت کرتی ہے اُن سے''۔ سونیا نے اُس کے جانے کے بعد کہا۔

''اور میاں جی بھی تو اُس سے بہت محبت کرتے ہیں۔'' باصر نے جواب دیا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر ایک بار پھر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆☆

دیپ کمار واپس ہوسٹل جاتے ہوئے رتن کی طرف سے کافی مطمئن تھا۔ گوپی کے دادا نے بہت تفصیل سے اُس کے سوالوں کے جواب دیے تھے۔ اور بہت دیر تک اُس سے مشہور مذہبی کتابوں وید گیتا اپنشد پران کے حوالے سے باتیں کرتے رہے تھے۔ دیپ کو مذہب سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اُس لئے وہ بور ہو کر اُٹھ گیا تھا۔ رتن کس حد تک اُن کے جوابات سے مطمئن ہوئی تھی۔ اُس کا اظہار اُس نے نہیں کیا تھا۔ اور نہ

ہی اس موضوع پر پھر اُس نے کوئی بات کی تھی۔

''شکر ہے دیپو' تم اسے داؤ جی کے پاس لے گئے۔ اور اس کے پاپ خیالات ختم ہوئے۔ ورنہ مجھے تو ڈر ہی لگ گیا تھا کہ کہیں یہ کرسچن ہی نہ بن جائے۔

''اوہو بھابھو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بس کچھ سوال اُس کے ذہن میں آئے تھے۔ اگر بھاجی اور ما جی اُس کے سوالوں کے جواب دے دیتے تو بات اتنی بڑھتی ہی نہ۔''

بظاہر سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ دیپ جتنے دن وہاں رہا سب کچھ روٹین کے مطابق ہی ہوتا رہا۔ وہی کرم کے ساتھ اُس کی اُچھل کود' بھابھو کے ساتھ مل کر رسوئی میں کام کرنا ماتا جی کے سر میں تیل لگانا۔ بھاجی کے کپڑے استری کرنا خود دیپ کیساتھ مل کر کیرم کھیلنا۔ شام کو رابرٹ صاحب کی طرف جانا۔ سب ٹھیک تھا۔ لیکن کبھی کبھی دیپ کو اُس کے چہرے پر اُداسی کی ایک جھلک سی دکھائی دی تھی۔ اس کی ہنسی میں وہ بے ساختہ پن نہیں تھا۔ نہ ہی اُس کی آنکھیں پہلے جیسی لگتی تھیں۔ بلکہ اُن میں کچھ سوچ سی ہلکورے کھاتی دکھائی دیتی تھی۔

''کیا بات ہے تینو! تم کچھ چپ چپ سی لگتی ہو؟'' جانے سے پہلے دیپ نے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' وہ ہنسی۔

''تمہیں وہم ہوا ہے''

''بھابھو نے کچھ کہا؟''

دیپ نے کریدتی کھوجتی نظروں سے اُسے دیکھا۔

''بھلا بھابھو مجھے کچھ کہہ سکتی ہیں۔''

''ماتا جی نے''

''اوں ہوں''

''پھر''

''کچھ نہیں بابا''۔ وہ زور سے کھلکھلا کر ہنس دی۔ وہی مخصوص ہنسی تو وہ مطمئن ہو گیا۔

''ٹھیک ہے تینو لیکن اگر کوئی بات تمہیں پریشان کرے۔ تو تم داؤ جی کے پاس چلی جانا۔ میں نے اُن سے کہہ دیا ہے۔ اور پتا ہے' داؤ جی کیا کہہ رہے تھے۔''

''کیا؟'' اُس نے پوچھا۔

''وہ کہہ رہے تھے کہ تینو کسی دیوی سے کم نہیں اُس کے شریر میں دھرم کی سچی چاہ ہے۔''

''اچھا۔'' اُسے حیرت ہوئی۔

''یہ کہہ رہے تھے۔ داؤ جی حالانکہ وہی سوال جب میں نے ماتا جی سے کئے تھے۔ تو انہوں نے مجھے کافر قرار دے دیا تھا۔'' ''داؤ جی کے پاس بڑا علم ہے تینو۔ مذہبی کتابوں کا علم' تمہیں تو اَب کوئی پرابلم نہیں ہے''

''نہیں؟ اُس نے دیپ کمار کو تو مطمئن کر دیا تھا۔ مگر خود اپنے آپ کو مطمئن نہ کر سکی تھی۔ داؤ جی نے اُس کے ساتھ بڑی مشکل باتیں کی تھیں۔ وید اوتار رشی' بھگوان خدا جانے وہ کیا کیا کہتے رہے تھے۔ کہاں کہاں کے قصے سُناتے رہے تھے۔ اُس کے پلے تو کچھ بھی نہیں پڑا تھا۔ اُس کے دل کی گولک میں سوال اَب بھی اسی طرح کھنک رہے تھے۔ مگر اُس نے اپنے لب سی لئے تھے۔ وہ بھابھو' کرم' بھاجی' ماتا جی کسی کو خفا نہیں کر سکتی تھی۔ اُن کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن اُس کے اندر عجیب سی بے چینی اور اضطراب تھا۔ کسی کام میں اُس کا دل نہ لگتا تھا۔ نہ پڑھائی میں نہ گھر کے کاموں میں نہ کھیلوں میں۔ لیکن سب کی خاطر وہ یونہی بے دلی سے سب کچھ کرتی رہتی مگر رات کو جب اپنے بستر پر

لیٹتی تو اُس کے کانوں میں ریٹا کی آواز گونجنے لگتی۔ ''تینو بھلا پتھر کے دیوی' دیوتا خدا کیسے ہو سکتے۔ خدا تو اوپر آسمانوں میں رہتا ہے۔ سب کی نظروں سے دور اور حضرت عیسیٰؑ اُس کے بیٹے ہیں۔'' ریٹا شاید صحیح کہتی ہے۔ مگر گوپی کے داؤ جی کہتے ہیں۔ ہمارا مذہب کروڑوں سال قدیم ہے۔ سب سے پرانا اور سچا مذہب ہے۔ دیپ نے جانے سے پہلے اُسے منع کیا تھا کہ۔ جب تک ریٹا اور آن ہیں'' وہ انکل رابرٹ کے پاس نہ جایا کرے۔

''دراصل وہ دونوں شیطان لڑکیاں ہیں۔ اور خواہ مخواہ تمہیں ورغلاتی ہیں۔'' ''دیپو! وہ بہت پیاری اور محبت کرنے والی لڑکیاں ہیں۔ اور تم یونہی اُن پر شبہ کرتے ہو'' اُس نے دیپ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''ٹھیک ہے تینو! لیکن تم مت جایا کرو اُدھر''

''اچھا بابا نہیں جاؤں گی۔'' اُس نے وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن اَب دیپ کو گئے اتنے روز ہو گئے تھے۔ اور اُس کے دل کی بے چینی ختم ہونے میں ہی نہ آ رہی تھی۔ اُس نے سوچا ایک بار پھر گوپی کے داؤ جی کی طرف جائے۔ ایک بار پھر اُن سے مذہب کے متعلق پوچھے۔ شاید یہ اضطراب ختم ہو جائے۔ چنانچہ اُس روز وہ کالج سے سیدھی گوپی کے گھر چلی گئی مگر گوپی کے دادا گھر پر نہیں تھے۔ چنانچہ جب وہ گوپی کے گھر سے نکلی تو خود بخود اُس کے قدم انکل رابرٹ کے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

''لڑکی تم غائب کہاں تھیں۔ اتنے دنوں سے۔ اور وہ دونوں تمہیں بہت یاد کر رہی تھیں۔''

''کہاں ہیں وہ؟'' رتن کور نے اِدھر اُدھر دیکھا'' وہ دونوں تو آگرہ گئی ہیں۔''

''اکیلی؟''

''نہیں بھئی اُن کا بھائی آیا ہے پاکستان سے اُس کے ساتھ۔''

''تب ہی انہوں نے میری خبر نہیں لی۔'' انکل رابرٹ نے غور سے اُسے دیکھا۔

''گئی تو تھیں وہ تمہاری طرف' تمہاری ماتا جی نے بتایا تھا کہ تم اپنی موسی کے پاس مراد آباد گئی ہو۔''

''کیا؟'' ایک لحہ کو وہ حیران ہوئی۔ مراد آباد میں تو کوئی بھی نہیں رہتا تھا۔ اور اُس کی تو کوئی موسی تھی بھی نہیں۔ یقیناً ماتا جی نے جھوٹ بولا ہوگا۔ شاید دیپو کی طرح ماتا جی بھی سمجھتی ہیں کہ مجھے ریٹا اور آن نے ورغلایا ہے۔ حالانکہ انہوں نے تو ایک جنرل بات کی تھی۔ سوالوں کے اژدھے تو خود میرے اندر سے اُٹھے تھے۔ جو جانے کب سے کنڈل مارے سوئے پڑے تھے۔

''کیا سوچنے لگیں گڈ گرل؟''

''کچھ نہیں انکل'' اُس نے چونکتے ہوئے کہا۔

''مراد آباد سے کب آئی ہو۔''

''میں کہیں نہیں گئی تھی انکل۔''

''ارے تو پھر ماتا جی نے جھوٹ کیوں بولا تھا۔''

''بس یونہی انکل۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

''شاید انہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی۔''

''ارے ہم کو ادھر وہ اتنا عرصہ سے جانتی ہیں۔ پھر کیسی غلط فہمی۔''

''دراصل اُن کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ شاید میں آپ کے مذہب سے متاثر ہو رہی ہوں۔''

انکل رابرٹ لحہ بھر کو چپ سے ہو گئے۔ پھر اُٹھ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''کیا بات ہے مائی چائلڈ۔''

‘‘کچھ نہیں بس۔’’ اور پھر اُس نے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات بتادی۔ آج پھر میں گوپی کے داوَجی کی طرف گئی تھی۔ لیکن وہ نہیں ملے۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ کرسچین کیوں ہیں۔’’

‘‘اس لئے مائی ڈیئر کہ میں ایک کرسچین ماں باپ کے گھر پیدا ہوا‘ اس لئے میں کرسچین ہوں۔’’

‘‘اور میں اس لئے ہندو ہوں کہ میرے ماں باپ ہندو ہیں۔’’

‘‘EXACT (درست) انکل رابرٹ نے کہا۔’’

‘‘تو پھر ہم یہ تو یقین سے نہیں کہہ سکتے نا کہ وہ مذہب جو ہمارے ماں باپ کا تھا وہی سچا ہے۔ ظاہر ہے‘ ہمارے ماں باپ کے ماں باپ کا بھی یہی مذہب ہوگا پھر اُن کے ماں باپ کا’’

‘‘میری بچی تم اتنا کیوں اُلجھ رہی ہو؟’’ انکل رابرٹ نے شفقت سے کہا۔

‘‘اُلجھ ہی تو گئی ہوں انکل اور کوئی سرا میرے ہاتھ میں آتا ہی نہیں ہے۔’’

‘‘مذہب کے متعلق زیادہ سوچ بچار مت کیا کرو۔’’

‘‘گوپی کے داوَجی بھی یہی کہتے ہیں۔ دیپو بھی یہی کہتے ہیں اور آپ بھی’’۔

‘‘سب عقلمند لوگ یہی کہیں گے اور ظاہر ہے۔ ہم تینوں عقلمند ہیں۔’’ وہ قہقہہ لگا کر ہنسے۔ لیکن رتن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہ آئی۔

‘‘کیا آپ کو اپنے مذہب سے بہت پیار ہے؟’’

‘‘ہوں’’

‘‘کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کا مذہب سچا ہے؟’’

‘‘ہوں’’ انکل رابرٹ نے پھر سر ہلایا۔

‘‘کیا یہ یقین آپ کو اس لئے ہے کہ یہ آپ کے ماں باپ کا مذہب ہے۔ یا آپ کے دل کو بھی اس پر یقین ہے۔؟’’ ‘‘میرے دل کو یقین ہے کہ میرا مذہب سچا ہے۔ اور اس یقین کو بائیبل نے تقویت بخشی ہے۔ وہ الہامی کتاب جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی۔’’

‘‘الہامی کتابیں تو ہماری بھی ہیں۔ گیتا۔ اپنشد وغیرہ مگر میرے دل سے یقین یکایک اُٹھ گیا ہے۔ آپ مجھے اپنے مذہب کے متعلق بتائیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق حضرت مریمؑ کے متعلق اور روح القدوس کے متعلق اور تثلیث کے متعلق سب کچھ۔’’

اور انکل رابرٹ نے ایک نظر اُس اُلجھی اُلجھی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اور پھر ہولے ہولے جتنا کہ وہ جانتے تھے۔ اُسے بتانے لگے۔ وہ دم بخود سی سنتی رہی پتا نہیں انکل رابرٹ کی آواز میں ہی کوئی سحر تھا یا اُن کی باتوں میں سچ مچ میں کوئی حقیقت تھی۔ کہیں روشنی کی کوئی کرن سی تھی کہ اسے یکا یک یوں لگا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کہیں روشنی کا کوئی در کھل گیا ہے۔

‘‘اور اگر تم مزید جاننا چاہتی ہو تو کسی روز میں تمہیں فادر شیلے کے پاس لے چلوں گا۔’’

‘‘میں ضرور آپ کے ساتھ جاؤں گی انکل۔’’ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

‘‘ارے ارے بیٹھو رتن بیٹا! آج تو تم نے چائے بھی نہیں پی۔’’

‘‘بس انکل اَب چلوں گی‘ کالج سے سیدھی آ گئی تھی۔ بھابھو انتظار کر رہی ہوں گی۔ وہ دونوں کب واپس آ ئیں گی؟’’

‘‘کل شام تک لوٹ آ ئیں گی۔’’

‘‘اچھا پھر کل آ ؤں گی اُن سے ملنے۔’’ وہ ٹاٹا کرتی ہوئی گیٹ کھول کر باہر نکل گئی۔ اور برآمدے میں ایزی چیر کی پشت سے سر ٹیکتے ہوئے مسٹر رابرٹ نے سوچا۔

کیا یہ لڑکی کرسچین ہو جائے گی۔ اور اگر یہ کرسچین ہو گئی تو میں اسے اپنی بیٹی بنا لوں گا۔ میری لیزا جو چند برس پیشتر اچانک ہی گھر چھوڑ گئی تھی۔ اور یہ بات صرف وہی جانتے تھے کہ وہ کہاں گئی تھی۔

یکا یک ہی اُنہیں لیزا یاد آ گئی۔ بے طرح اور وہ یونہی کرسی کی پشت سے سر ٹیکے رونے لگے۔ پہلے آہستہ پھر اونچی آواز میں۔ اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب اُنہیں لیزا کی یاد آتی تو وہ یونہی ہچکیاں لے لے کر رویا کرتے تھے۔ آج سے پہلے جب کبھی وہ روتے تھے تو جیکی بھی اپنا سر اُن کے قدموں پر رکھتا تھا۔ کبھی زبان سے اُن کے بازو۔ اور ہاتھ چاٹتا۔ اور وہ ہولے ہولے سنبھل جاتے مگر آج جیکی بھی نہیں تھا۔ اس لئے وہ روئے چلے جا رہے تھے۔ اور لمحہ بہ لمحہ اُن کی آواز اونچی۔۔ ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆

میں چاہتی ہوں مسز وہاب کو ڈنر پر انوائیٹ کر لوں۔’’ زینت مراد نے کوئی دسویں بار اپنی بات دہرائی تو مراد علی نے کسی قدر جھنجلا کر اُنہیں دیکھا۔

‘‘تو بھئی کر لو کسی دن جب تمہارا دل چاہے۔ یہ تمہارا اپنا بزنس ہے۔’’ ‘‘لیکن اس سلسلے میں کیا فنکشن ہو۔’’ ‘‘فنکشن بھئی فنکشن کی کیا ضرورت ہے۔ ایسے ہی بلا لو کسی دن کھانے پر۔’’ ‘‘نہیں۔’’ انہوں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ‘‘اس طرح بلانا ہوتا تو آپ سے مشورہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں چاہتی ہوں بہت شاندار قسم کا فنکشن ہو۔ بڑے بڑے لوگوں کو انوئیٹ کیا جائے۔ اور یہ فنکشن مدتوں یاد رہے لوگوں کو۔’’

‘‘وجہ؟ مراد علی نے بھنویں اُچکائیں۔ ‘‘وجہ کوئی خاص نہیں بس۔’’ وہ بات کرتے کرتے خاموش ہو گئیں۔

‘‘تمہارا اپنا ذہن بہت زرخیز ہے۔ خود ہی کوئی جواز ڈھونڈ لو۔’’ مراد علی اخبار ٹیبل پر پھینک کر کھڑے ہو گئے۔

‘‘میں پہلے ہی تبریز کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔’’

‘‘تبریز اَب بہت بہتر ہے’’ زینت مراد اُٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔

‘‘اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس لت سے چھٹکارا پا چکا ہے۔ آپ نے غور نہیں کیا اُس کی صحت پہلے کے مقابلے میں کافی اچھی ہے۔’’

‘‘ہاں لیکن اُس کی دوسری سرگرمیاں کچھ مشکوک سی ہیں۔’’

‘‘کیا۔’’ زینت مراد نے پلٹ کر اُنہیں دیکھا۔

‘‘کل شام بھی کچھ عجیب وغریب قسم کے لوگ اُس سے ملنے آئے ہوئے تھے۔’’

‘‘اوہ ناں سنس مراد۔ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ اتنا عرصہ وہ ADDIC (نشہ کا عادی) رہا ہے۔ اُس کا ملنا جلنا ایسے ہی لوگوں سے رہا ہوگا۔’’

‘‘نہیں وہ۔ ADDIC (نشہ باز) لوگ نہیں تھے۔ وہ کچھ اور طرح کے ہی لوگ تھے۔’’ مراد علی نے پریشانی سے کہا۔

‘‘بہرحال بات کروں گا تبریز سے اس سلسلے میں۔ میں ذرا میاں جی کے پاس جا رہا ہوں وہ بہت اپ سیٹ ہو گئے ہیں۔’’

‘‘یہ باصر کی غلطی ہے‘ میں اسے اتنا احمق نہیں سمجھتی تھی کہ تبریز کی موجودگی میں میاں جی کو ساتھ لے

کرآ جائے گا۔ تبریز کے سلسلے میں میاں جی کا حساس ہونا ایک فطری بات ہے۔'' زینت مراد نے جواب دیا او دوبارہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ مراد علی نے ایک نظر اُنہیں دیکھا۔ اور باہر نکل آئے۔

میاں جی تکیوں کے سہارے بیٹھے تھے۔ اور مدحت اُن کے پاس بیٹھی اُنہیں سوپ پلا رہی تھی۔

''آؤ بیٹا؟ مراد علی کو اندر آتے دیکھ کر وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اور ایک طرف ہو کر اُن کے بیٹھنے کیلئے جگہ بنائی۔

''ادھر آ جاؤ بیٹا! میرے پاس ہی۔''

''آپ کی طبیعت اَب کیسی ہے میاں جی؟''

''اللہ کا شکر ہے بیٹا؟'' میاں جی نے سوپ کا پیالہ مدحت کو پکڑایا۔ تو مدحت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مراد علی نے جاتی ہوئی مدحت کو دیکھا اور میاں جی کا ہاتھ بڑی عقیدت اور محبت سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''میاں جی آپ بتریز کے لئے پریشان نہ ہوں۔ وہ بہت بہتر ہے اَب۔ کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی اُس کے ساتھ۔ لیکن اَب وہ مکمل طور پر صحت مند ہے۔''

''میں پریشان نہیں ہوں بیٹا۔ بس وقتی طور پر رنج پہنچا تھا۔ مجھے۔ وہ خدا جو ہمیں آزمائشوں میں ڈالتا ہے۔ وہ ہمیں ان آزمائشوں سے نکال بھی تو لیتا ہے۔ بیٹا! وہ بڑا مہربان اور رحیم و کریم ہے کل سے میں نے سوائے تبریز بیٹے کی صحت اور بہتری کے۔ اور کوئی دُعا نہیں مانگی۔''

''میاں جی مجھ سے بڑی غلطی ہوئی' مجھے آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہئے تھا۔ میں آپ کو اُسی وقت باخبر کر دیتا تو شاید آپ کی دُعائیں اَب تک اُسے اس دلدل سے باہر لے آتیں۔''

مراد علی کو سچ مچ افسوس ہو رہا تھا کہ اُنہوں نے اَب تک میاں جی کو بتایا کیوں نہیں تھا۔ لوگ دور دور سے آتے تھے اُن کے پاس دُعائیں کروانے کے لئے اور من کی مرادیں لے کر جاتے تھے۔ اور ایک وہ تھے کہ بھرے ہوئے کنویں کے کنارے پیاسے کھڑے تھے۔

''میں کیا اور میری دُعائیں کیا بیٹا! وہ ربّ کریم تو سب کی سُنتا ہے۔ سب کو نوازتا ہے۔ سب کی جھولیاں بھر دیتا ہے۔ تم نے کبھی اُسے پکارا ہوتا تو اب تک۔''

''میاں جی!'' مراد علی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

میں واقعی بڑا ناشکرا ہوں' بڑا ناسمجھ ہوں۔ آپ کی گود میں پرورش پا کر بھی میں نے کچھ حاصل نہیں کیا۔ کچھ نہیں پایا۔ دنیا نے مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے۔ کئی دفعہ میرا دل چاہتا ہے۔ میاں جی کہ سب کچھ چھوڑ کر آپ کے پاس چلا آؤں۔ مگر دنیا مجھے چھوڑتی نہیں ہے۔ میاں جی۔

''دنیا تو کسی کو بھی نہیں چھوڑتی میاں۔ بندے کو خود ہی اپنے اندر حوصلہ پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اسے چھوڑنے کا۔ اتنا مت اُلجھا اپنے آپ کو بیٹا۔ تیرے پاس بہت وافر پیسہ ہے۔ اور کیا کرے گا۔ کچھ اپنے آپ کا اپنے لئے بھی بچا کر رکھ لے بیٹا۔''

''میاں جی دُعا کیا کریں میرے لئے'' پتا نہیں کیا بات تھی میاں جی کے پاس بیٹھتے ہی مراد علی سارے کاروباری جھمیلے بھول جاتے تھے۔ لیکن اُن کے پاس سے اُٹھتے تو پھر وہی کاروباری دنیا انہیں گھیر لیتی۔ کیا کرنا ہے۔ کہاں پیسہ انویسٹ کرنا ہے۔

کہاں سے زیادہ پرافٹ (منافع) حاصل ہو سکتا ہے۔ کون سے بندے سے تعلقات بڑھا کر فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

''میرے تو روئیں روئیں سے تمہارے لئے' تمہاری اولاد کیلئے دُعائیں نکلتی ہیں۔ بیٹا۔''

میاں جی نے اُن کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''تبریز کیسا ہے؟''

''آیا نہیں آپ کے پاس؟'' مراد علی نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں'' میاں جی کی آنکھوں میں اُداسی اور ملال کے رنگ اتر آئے۔

''دراصل وہ آپ سے شرمندہ ہے' آپ کا سامنا نہیں کر سکتا شاید اس لئے میں خود لے کر آتا ہوں۔ اُسے آپ کے پاس۔'' مراد علی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''رہنے دے بیٹا! جب اُس کا دل چاہے آ جائے گا۔''

''نہیں میں دیکھتا ہوں' اگر وہ گھر میں ہے تو۔''

مراد علی میاں جی کے منع کرنے کے باوجود باہر نکل گئے۔

سوپ کا خالی پیالہ اور چمچ کچن میں رکھ کر باہر آتی۔ مدحت نے مراد علی کو میاں جی کے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا۔

''آپ جا رہے ہیں۔ انکل میاں جی سو گئے کیا؟''

''نہیں' میں ذرا تبریز کو لانے جا رہا ہوں میاں جی سے ملانے کے لئے۔''

''اچھا'' وہ میاں جی کے کمرے کی طرف جاتے جاتے پلٹ آئی۔

تبریز سے ابھی تک اُس کی کوئی تفصیلی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بس اِدھر اُدھر جاتے ہوئے دو تین بار اُس نے تبریز کو دیکھا تھا۔ اگرچہ وہ کافی بہتر حلیے میں تھا اور شیو وغیرہ کئے ہوئے تھے۔ لیکن اُس کے چہرے پر عجیب سی وحشت برس رہی تھی۔ اور آنکھوں میں عجیب سی سرخی تھی۔ اُس نے بڑی اجنبی نظروں سے مدحت کو دیکھا تھا۔ باصر اور سونیا سے بھی اُس نے تبریز کو کوئی خاص بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ سونیا اور باصر خود ہی۔ زبردستی اُسے مخاطب کرتے تھے۔ وہ بہت اُلجھا اُلجھا دکھائی دیتا تھا۔ اُسے پتا نہیں کیوں اُس سے خوف سا محسوس ہوا تھا۔ تبریز بھائی میاں جی سے مل کر چلے جائیں تو پھر جاؤں گی میاں جی کے کمرے میں۔ اُس نے سوچا اور سونیا کے کمرے کی طرف چل دی۔

سونیا اپنے نوٹس بنا رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر اُس نے قلم اور فائل ایک طرف رکھ دی۔

''آؤ۔ آؤ مدحو۔''

''نہیں' آپ شاید پڑھ رہی ہیں۔ ڈسٹرب ہوں گی۔''

''اوہو یار کوئی ڈسٹرب نہیں ہوتی آ جاؤ۔ یوں بھی جب سے میاں جی آئے ہیں تم نے تو ہمیں بھلا ہی دیا ہے۔''

''نہیں تو۔ وہ دراصل میاں جی کی طبیعت خراب تھی ناں۔ اُس لئے میں زیادہ اُن کے پاس رہتی تھی۔''

''اَب میاں جی کیا کر رہے ہیں۔''

''انکل مراد اُن کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اور اَب شاید وہ تبریز بھائی کو بلانے گئے تھے۔''

''تبریز بھائی کو'' سونیا نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ گھر پر ہیں کیا؟''

''پتا نہیں انکل کہہ رہے تھے کہ وہ تبریز کو میاں جی کے پاس لے جا رہے ہیں۔''

''مدحو'' سونیا نے کچھ خیال نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں تبریز بھائی کیسے لگے؟"

"مجھے۔" مدحت نے حیرت سے پوچھا۔

"ہوں"۔

"جیسے آپ سب ہیں۔ ویسے ہی وہ بھی ہیں میرے لئے۔ آپ سب مجھے اچھے لگتے ہیں؟۔"

"باوجود اس کے کہ وہ قابلِ نفرت ہیں۔ نشہ کرتے رہے ہیں۔"

"وہ تو ایک بیماری ہے۔ ایک آزمائش ہے۔ اور انسان تو کبھی بھی قابلِ نفرت نہیں ہوتے۔ قابلِ نفرت تو اُن کے اعمال ہوتے ہیں۔"

سونیا نے پرستائش نظروں سے اُسے دیکھا۔

"مدحو! میاں جی نے تمہیں بہت اچھی اچھی باتیں سکھا دی ہیں۔ کاش میں نے بھی اُن سے کچھ سیکھا تا۔ اُن کے سائے تلے کچھ وقت گزارا ہوتا۔ تم بہت خوش قسمت ہو مدحو۔ اور مدحو میرا یہ بھائی بہت پیارا' بہت سیس انسان تھا۔ بہت مہربان اور شفیق۔ لیکن تم اس سے کبھی نفرت نہ کرنا۔"

"میں سونی! میں بھلا اُن سے کیوں نفرت کروں گی۔ میں نے تو کبھی کسی سے نفرت نہیں کی اور پھر یہ تو میرے ماموں کے بیٹے ہیں۔ میرے اپنے ہیں۔ اور میاں جی تو ان سے بہت پیار کرتے ہیں۔" اُس نے معصومیت سے کہا۔

"مدحو جب تبریز بھائی امریکہ جانے سے پہلے میاں جی سے ملنے جاتے تھے تو تب تو تمہیں یاد ہوگا۔ نا کہ وہ کتنے اسمارٹ ہنس مکھ اور خوبصورت لگا کرتے تھے۔ چھ سال پہلے تم بارہ تیرہ سال کی ہوگی لیکن تمہیں یاد تو ہوگا۔"

"مگر سونی میں نے تو اُنہیں کبھی نہیں دیکھا۔ دراصل میاں جی تو دن بھر مردانے میں رہا کرتے تھے اور وہاں ہی لوگ دن بھر آتے رہتے تھے۔ تبریز بھائی بھی وہیں سے آکر چلے جاتے تھے۔ کبھی کبھار میاں جی رات کو ذکر کرتے تھے کہ آج تبریز آیا تھا' چلا گیا۔"

"اچھا" سونیا کو حیرت ہوئی کہ امریکہ جانے سے پہلے تبریز مہینے میں ایک چکر تو ضرور لگاتا تھا۔ میاں جی کے پاس۔ اور مدحت نے ایک بار بھی اُسے نہیں دیکھا۔

"باصر بھائی تو بطورِ خاص اندر آتے تھے۔ اور سلام کر کے حال چال پوچھ کر جاتے تھے۔ اس لئے میں اُنہیں جانتی ہوں۔ رمیض کو بھی میں نے دس سال پہلے دیکھا تھا۔ اَب تو اُس کی شکل بھی مجھے یاد نہیں ہے۔"

"ارے ہاں"۔ سونیا نے بیڈ سے چھلانگ لگائی۔

"آج تو رمیض نے آنا تھا۔ رات اُس نے فون کیا تھا۔ ارے اُس کی فلائیٹ کا ٹائم ہو گیا ہے۔ پتا نہیں باصر اُسے لینے گیا ہے۔ یا نہیں۔ اوہ گاڈ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ باصر کو یاد دہانی کرا دوں' کوئی ائیر پورٹ پر نہ گیا تو وہ بہت خفا ہوگا۔ سب سے چھوٹا ہے ذرا ذرا سی بات پر روٹھ جاتا ہے۔ اور اُسے منانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔" اُس نے پاؤں میں چپل ڈالتے ہوئے کہا۔

"باصر تو ہاسپٹل سے آکر سو گیا تھا۔ اور تمہیں تو پتا ہے وہ گھوڑے بیچ کر سوتا ہے۔"

"اوہ گاڈ رمیض تو بہت خفا ہوگا۔" اُس نے پھر ہاتھ ملے اور تیزی سے باہر نکلی اور اندر آتے باصر سے ٹکرا گئی۔

"میں گھوڑے بیچ کر سوتا ہوں لیکن آج کم از کم گھوڑے بیچ کر نہیں سویا تھا۔"

"بھائی آج گدھے بیچ کر سوئے تھے" باصر کے پیچھے سے ایک فریش اور مسکراتا چہرا نظر آیا۔ چمکتی ہوئی ذہین آنکھیں۔ مسکراتے لب اور باصر سے قد میں قدرے لمبا۔

"ارے ریمی ریمی کے بچے' گدھے میں تمہیں بہت یاد کرتی تھی۔ کتنے دنوں بعد آئے ہو۔"

سونیا نے باصر کو ایک طرف ہٹایا۔ اور ایک دم دونوں بازو اُس کے گرد حمائل کر کے اس کے ہاتھوں کی پشت پر پیار کیا۔

"دیکھا بھائی"۔ رمیض نے باصر کی طرف دیکھا "یہ ہمیشہ ہماری اماں جان بنی رہتی ہیں۔ حالانکہ یہ فرض ماما کا تھا کہ وہ مجھے گلے سے لگا کر میری پیشانی چومتیں۔" اُس کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ در آیا تھا۔ حلانکہ وہ ہنس رہا تھا۔ لیکن مدحت نے اُس کے لہجے میں ہلکی سی تشنگی محسوس کی۔

"اور ماما نے تو جناب دور ہی سے ہیلو ہائے کر لی۔ حسبِ معمول"

"تمہیں پتا نہیں یار ماما جلدی میں تھیں۔ اُنہیں کہیں جانا تھا۔" باصر نے بھی اُسی انداز میں کہا بظاہر ہنستے ہوئے لیکن مدحت نے اُس کے لہجے کے کرب کو اپنے دل میں محسوس کیا۔

"ماما تو ہمیشہ جلدی میں ہوتی ہیں۔ اُنہیں ہمیشہ ہی کہیں جانا ہوتا ہے۔ یاد ہے نا بھائی! جس روز میں جا رہا تھا۔ اُس روز اُنہیں مجھے خدا حافظ کہنا بھی یاد نہیں رہا تھا۔"

"فار گاڈ سیک باصر اور ریمی' تم کم از کم اس وقت تو ماما کو ڈسکس نہ کرو۔ کم آن۔ بیٹھو آکر' سفر کر کے آئے ہو۔ میں چائے منگواتی ہوں۔ اور بھی بہت سی باتیں ہیں کرنے کو۔" سونیا کو بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ کہ مدحت کے سامنے کوئی اُنہیں ڈسکس کرے۔ وہ ایسی ہی تھیں' ہمیشہ سے اُن کا اپنا ایک Way of Living (زندگی گذارنے کا طریقہ تھا) اور اُنہیں کبھی بھی ماما کی مصروفیت سے کوئی شکایت نہیں رہی تھی۔ کیونکہ وہ اِسی طرز زندگی کے عادی تھے۔ مگر پتا نہیں کیا بات تھی۔ پچھلے دو تین سالوں سے باصر اور ریمی' ماما کے اس انداز سے اُلجھنے لگے تھے۔ پتا نہیں کیوں اُن کا دل چاہتا تھا کہ وہ اُن کو وقت دیا کریں۔ اُن کے پاس بیٹھا کریں۔

اور زینت مراد کا خیال تھا۔ کہ یہ سارا قصور اُن متوسط طبقے کے لڑکوں کا ہے۔ جو باصر اور رمیض کے دوست ہیں۔ اور یہ متوسط طبقے کے لڑکے جن کے نزدیک ماں کی محبت کا پیمانہ یہ ہے کہ وہ اُن کو وقت دے' اپنے ہاتھ سے سوئیٹر بنا کر بھیجے۔ جب وہ چھٹیوں میں گھر آئیں تو اپنے ہاتھ سے کھانے پکا کر کھلائے۔ اور واٹ آ نان سینس سونی اُنہیں سمجھاؤ۔ میں اس طرح کی محبت افورڈ نہیں کر سکتی۔ میری اپنی ایک دنیا ہے۔ میں اُن سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں جتنی کوئی بھی ماں اپنے بچوں سے کرتی ہے۔ لیکن ہمارے طبقے میں محبتوں کا اظہار اس طرح نہیں ہوتا۔ جب دیکھ بھال کے لئے آیا' کوکنگ کے لئے خانساماں موجود ہے تو مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں اپنا وقت ضائع کروں۔

سونیا اس بات کو سمجھتی تھی۔ لیکن باصر اور رمیض نہیں۔ اور یہ بھی حقیقت تھی کہ باصر اور رمیض کے گہرے دوست متوسط طبقے سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ اور باصر تو جب سے اپنے دوست ڈاکٹر احمد کے ہاں چھٹیاں گذار کر آیا تھا۔ اُس کے اندر ایک محرومی' ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا۔ ماما اُسے ماں لگتی ہی نہیں تھی۔ ماں کے تصور کے ساتھ ہی ڈاکٹر احمد کی والدہ کا سراپا اُس کے سامنے آ جاتا تھا۔ شفیق' مہربان' ہر لحہ اپنے بچوں کے لئے پریشان۔ اُن کے آرام کے لئے کوشاں عجیب مقدس سا لگتا تھا۔ اُن کا وجود انہوں نے باصر سے بھی کہا تھا۔

"بیٹا! میں تمہاری بھی ماں ہوں۔" اُن کے وجود سے ماں کی خوشبو آتی تھی۔ جبکہ ماما کے وجود کی مہک نہیں تھی۔

"آل رائیٹ بہنا۔"

رمیض نے سر جھکایا۔ اور مسکراتا ہوا آکر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اور بیٹھتے بیٹھتے اُس نے ایک نظر مدحت کی

طرف دیکھا۔ جو ایک کونے میں پڑی کرسی پر بیٹھی خاموشی سے اُن کی باتیں سن رہی تھی۔

''آپ غالباً مدحت ہیں۔'' اُس نے انگلی سے اُس کی طرف اشارا کیا۔

''جی'' مدحت نے آہستگی سے کہا۔

''اور میں رمیض ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

''میں غالباً نہیں بلکہ یقیناً آپ سے تین مہینے بڑا ہوں۔ اور میں آپ کو پہلے ہی اطلاع کر رہا ہوں کہ میں اس تین مہینے کی بڑائی کا پورا پورا فائدہ اُٹھاؤں گا۔ دراصل بچپن میں سونی آپی نے اپنی اس تقریباً دو سال بڑائی کا بڑا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر مجھے کان سے پکڑ کر پڑھانے کے لئے بٹھا کر 'زبردستی مووی بند کر کے وغیرہ وغیرہ۔ اور تب ہی میں سوچا کرتا تھا کہ اگر میری کوئی چھوٹی بہن ہوتی تو میں اُسے ڈانٹ کر اُس کے کان کھینچ کر سونی آپا کا بدلہ لے لیتا۔ اور جب سے مجھے پتا چلا ہے۔ کہ آپ آئی ہیں' تب سے میں سوچ رہا ہوں کہ اللہ میاں نے میری دعائیں سُن لی ہیں۔ اگرچہ دیر سے سنی ہیں۔ آپ کو منظور ہے میری چھوٹی بہن بننا؟''

''ہوں'' مدحت نے سر ہلا دیا۔ اُس کے گلابی لبوں پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ تھی۔ اُسے رمیض کا یہ بے تکلف انداز بہت اچھا لگا تھا۔ جب وہ گاؤں میں رہتی تھی۔ اور دن میں میاں جی باہر مردانے میں ہوتے تو اتنی بڑی حویلی میں اکیلے کبھی کبھی وہ بڑا گھبراتی تھی۔ اور سوچتی تھی کاش اُس کا کوئی بہن بھائی ہی ہوتا تو وہ دونوں خوب باتیں کرتے۔

''سوچ لیں اچھی طرح''۔ باصر نے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ''رمیض کی بہن بننے میں بڑا رسک ہے۔ یہ سونی آپا کے سارے بدلے اُتارے گا۔ کان بھی کھینچے گا اور۔''

''سوچ لیا ہے'' اُس نے محبت بھری نظروں سے رمیض کی طرف دیکھا۔ ''میرا خود بڑا دل چاہتا تھا کہ کوئی میرا بڑا بھائی ہو۔ جو مجھے ڈانٹے مجھ سے لڑے۔ اور میں روٹھ جاؤں تو مجھے منا لے۔''

''یعنی آپ روٹھیں گی بھی اور منانا بھی پڑے گا'' رمیض نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ اور پھر ہاتھ آگے بڑھایا۔

''چلیں منا لیں گے۔ اسی بات پر ہاتھ آگے بڑھائیں۔'' مدحت نے جھجکتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا۔

اُس کے چہرے پر ہلکی سی سُرخی تھی۔ اور پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ باصر نے لیٹے لیٹے دلچسپی سے اُسے دیکھا۔ اُسے مدحت کے چہرے پر ڈوبتے اُبھرتے رنگ بہت بھلے لگتے تھے' اتنی معصومیت اور حیا یہاں کسی لڑکی میں اُس نے نہ دیکھی تھی۔

سونیا چائے کا کہہ کر واپس آ گئی تھی۔ اور اَب رمیض کے پاس بیٹھ کر اُس سے وہاں کے حالات پوچھ رہی تھی۔

''کیسی لگی وہاں کی زندگی؟ سُنا ہے بہت ٹف ہوتی ہے؟'' ''شاید ہوتی ہو گی ٹف' مگر مجھے اچھی لگی۔ اپنے خواب کیسے بُرے لگتے ہیں۔ سونی آپی۔'' اور وہ اُسے وہاں کی تفصیل بتانے لگا۔ مدحت بھی بہت دھیان اور دلچسپی سے سُن رہی تھی کہ اچانک باصر نے تکیے سے سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔

''میاں جی کیسے ہیں۔ صبح سے ایسا کھن چکر بنا ہوں کہ اُن کی طرف جا ہی نہیں سکا۔ دن بھر کیسے رہے۔ آپ نے دوا دے دی تھی''۔

''جی'' اُس نے باصر کی طرف دیکھا۔ اور پھر نگاہیں جُھکا لیں۔

''دن بھر وہ بالکل ٹھیک رہے۔ بلکہ کہہ رہے تھے کہ ایک دو روز میں گاؤں چلا جاؤں گا۔''

''نہیں' ابھی اُنہیں گاؤں نہیں جانا چاہئے۔ ابھی تو اُن کی سانس درست نہیں ہے۔ وہاں زیادہ طبیعت خراب ہو جائے تو بروقت ڈاکٹر بھی نہیں مل سکتا۔''

''ہاں میں نے کہا تھا کہ وہ ابھی نہ جائیں بلکہ چھٹیاں ہوں گی تو میں بھی اُن کے ساتھ جاؤں گی۔''

''مگر چھٹیوں میں تو ابھی ایک مہینہ ہے۔ میاں جی ایک مہینہ کبھی بھی نہیں رکیں گے ناممکن۔''

سونیا نے سر ہلایا۔

''لیکن سونی! میاں جی کو اکیلا نہیں رہنا چاہئے۔ میں اُنہیں سمجھاؤں گا۔''

''لیکن کیا وہاں گاؤں میں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے''؟ رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک ڈاکٹر ہے۔'' مدحت نے بتایا۔

''پھر تو اُس کے بڑے عیش ہوتے ہوں گے۔ منہ مانگی فیس لیتا ہوگا۔''

''نہیں۔'' مدحت نے وضاحت کی۔ ''وہاں گاؤں میں بہت غربت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کبھی کسی سے فیس نہیں مانگی۔ بس لوگوں کے پاس جو کچھ ہوتا ہے ' وہ دے دیتے ہیں۔ اکثر لوگ تو فیس کی جگہ انڈے اور ایسی ہی چیزیں دے جاتے ہیں۔ جب ڈاکٹر صاحب کے پاس زیادہ انڈے جمع ہو جاتے ہیں۔ تو وہ میاں جی کی طرف بھیج دیتے ہیں کہ لنگر میں کسی دن انڈوں کا سالن بنوا دیجئے گا۔''

''اوہ۔'' رمیض کو بے حد حیرت ہوئی۔

''کیا اس دور میں اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں کہ ایک ڈاکٹر اور فیس کے طور پر انڈے وصول کر رہا ہے۔ بہت حیران کن بات ہے۔ یہ''

''دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ریمی جان۔'' باصر نے کہا۔

''اک دفعہ ڈاکٹر صاحب میاں جی کے پاس آئے تو میٹھی روٹی باجرے کی لے کر آئے۔'' مدحت نے مزید بتایا۔

''کہنے لگے آج پار والے گاؤں سے ایک بڑھیا آئی تھی۔ اُس کی بہو کو یرقان ہو گیا تھا۔ میں ساتھ گیا ' دیکھا' دوائیاں دیں تو اس نے یہ دو باجرے کی میٹھی روٹیاں دیں کہ ڈاکٹر صاحب یہ فیس کے طور پر رکھ لیں۔ میں نے شکریہ کہہ کر رکھ لیں نا۔

''لو بھلا روٹیاں لینے کی کیا ضرورت تھی۔ کچھ بھی نہ لیتے۔'' سونیا نے کہا۔

''دراصل ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ اس طرح مریض اپنے آپ کو زیر بار نہیں سمجھتا۔ اُس کی اَنا مجروح نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتا ہے کہ بہرحال اُس نے ڈاکٹر کی فیس اَدا کر دی ہے۔ تھوڑی یا بہت اپنی حیثیت کے مطابق اگر وہ بڑھیا سے روٹی نہ لیتے تو بڑھیا خواہ مخواہ اُن کی احسان مند رہتی۔''

THEN HE IS A GREAT MAN) تب وہ ایک عظیم آدمی ہیں)۔'' رمیض نے بے اختیار کہا۔ میں کبھی گاؤں آیا تو ملوں گا اُن سے''۔

''وہ تقریباً شام کو روز ہی میاں صاحب کے پاس آتے تھے۔ وہ اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے۔ بے بی تم بھی ڈاکٹر بن جاؤ۔ یہاں گاؤں میں بہت ضرورت ہے۔''

''تو پھر تم نے سائنس کیوں نہیں لی'''' وہاں کالج میں سائنس نہیں تھی۔''

''اور یہ عجیب بات نہیں ہے بھائی کہ گاؤں میں صرف ایک ڈاکٹر ہے۔ اور وہاں لڑکیوں کا کالج ہے۔''

''نہیں تو'' مدحت نے رمیض کی طرف دیکھا۔

''آپ کیا گاؤں کبھی نہیں گئے۔ شاہ پور تو بالکل چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اور وہاں تو صرف پرائمری تک اسکول ہے۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں تو قریبی قصبے کے اسکول میں پڑھتے ہیں۔ میں بھی قصبے کے اسکول میں اور پھر کالج میں پڑھتی رہی ہوں۔ لیکن قصبے میں بھی بس انٹر کالج تھا۔ وہاں شاہ پور سے سوزوکیاں آتی جاتی ہیں قصبے میں تقریباً پونے گھنٹہ کا راستہ ہے۔''

''پھر تو لوگ مریضوں کو قصبے میں لے آتے ہوں گے۔''

''ہاں زیادہ سیریس بات ہو تو۔ چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج تو ڈاکٹر شاہ خود ہی کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر شاہ کے پاس اردگرد کے گاؤں سے زیادہ مریض آتے ہیں۔ شاہ پور کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹے گاؤں ہیں۔''

''اوہ خدا! تم یہ کس قدر بور باتیں کر رہے ہو۔ رمیض کوئی اور بات کرونا۔'' سونیا نے جھنجلا کر کہا۔

''یار آپی! بور تو نہیں ہیں' معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بھائی آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ آپ اپنی ڈاکٹری کی دکان شاہ پور میں ہی کھول لیں۔'' رمیض سونیا سے بات کرتے کرتے باصر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تمہارے مشورے سے پہلے ہی یہ اپنی دکان وہاں کھولنے کا ارادہ کر چکا ہے۔'' سونیا نے جل کر کہا۔

''اوہ سچ مچ باصر بھائی یُو آر گریٹ۔'' ''مکھیاں مارے گا وہاں۔'' سونیا نے اُسی لہجے میں کہا۔ ''کیا ڈاکٹر شاہ وہاں مکھیاں مارتے ہیں۔'' رمیض نے مدحت سے پوچھا۔ ''نہیں اُن کے پاس بہت مریض آتے ہیں۔ دور دور کے گاؤں سے۔'' ''چلو ناشتے کے لئے انڈے خریدنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' سونیا کے ہونٹوں پر ایک تمسخرانہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''سونی'' باصر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''تم چاہے کتنی بھی جلی بھنی باتیں کیوں نہ کرو۔ میں اپنا ارادہ نہیں بدل سکتا۔ میں میاں جی سے اس مسئلے پر تفصیلی بات چیت کر چکا ہوں۔ اگر پاپا پیسہ خرچ نہیں کریں گے تو میاں جی خود ہی کچھ کر لیں گے۔ اور وہ ساری زمین میاں جی نے میرے نام کر دی ہے۔ کلینک بنوانے کے لئے۔''

''اوہ بھئی یہ کیا سسپنس ہے؟'' رمیض نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا''۔

''کوئی سسپنس نہیں رہی۔'' سونیا بھی سنجیدہ ہو گئی۔

''دراصل باصر نہر کے پیچھے والی خالی زمین پر اپنا ایک ہاسپٹل بنوانا چاہتا ہے۔ اور میں نے اس سے کہا تھا کہ پاپا اُس زمین پر انویسٹمنٹ نہیں کریں گے بس۔''

''کیوں؟'' رمیض نے حیرت سے پوچھا۔ ''پاپا ایسا کیوں نہیں کریں گے!'' ''پاپا گھاٹے کا سودا نہیں کرتے۔'' سونیا نے جواب دیا۔ باصر نے کہا۔

''لیکن پاپا نہیں جانتے یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ اردگرد کے دیہات کے لئے جو سہولت مہیا ہو جائے گی۔ کیا یہ گھاٹا ہے۔ ریمی تمہیں نہیں پتا میں نے دیکھا ہے وہاں لوگوں کو مناسب طبّی سہولتیں نہ ملنے کی وجہ سے مرتے ہوئے۔ پچھلے سال میں میاں جی کے پاس گیا ہوا تھا۔ اور اُن کے کسی کام سے نور پور چلا گیا۔ وہاں میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایک نوجوان لڑکے کو وقت پر طبّی امداد نہ ملنے کی صورت میں مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ لڑکا ٹریکٹر کے نیچے آ گیا تھا۔ اور اُس کا خون بہت تیزی سے ضائع ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے طور پر بہت کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ رات کے اُس وقت کوئی سوزوکی بھی قصبے جانے کے لئے نہیں مل رہی تھی۔ وہ صرف خون ضائع ہونے کی وجہ سے مر گیا تھا۔ جب اُس کے چھوٹے چھوٹے بچے رو رہے تھے۔ اور اُس کی نوجوان بیوی پاگلوں کی طرح اُس کا منہ تک رہی تھی تو اُس وقت میں نے عہد کیا تھا کہ میں ان لوگوں کے لئے کچھ کروں گا''۔

مدحت نے عقیدت بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔ اور یہ باصر انکل مراد سے کتنا مختلف ہے۔ بالکل

میاں جی کی طرح اُس کے دل میں سب کا درد ہے۔ اور ایک دم ہی وہ اُس کے دل میں اُتر آیا۔ نگاہوں میں عقیدت محبت' اور نہ جانے کون کون سے جذبے لئے وہ اُسے دیکھنے لگی۔ اور باتیں کرتے کرتے باصر نے اُسے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ مدحت کی نگاہیں جھک گئیں۔ اور رخسار تپ اُٹھے باصر لحہ بھر اُسے دیکھتا رہا۔

''کیوں مدحت! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں''۔ مدحت نے ذرا کی ذرا نگاہیں اُٹھائیں۔

''خدا آپ کو اپنے جذبوں اور فیصلوں میں محکم اور مضبوط رکھے' میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔''

''تھینک یو۔ تھینک یو مدحت''۔ وہ مسکرایا۔ اور پھر سونیا کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہاں تو سسٹر تمہاری چائے ابھی تک نہیں پہنچی۔''

''میں نے کریم سے کہا تھا۔ ساتھ میں کچھ شامی کباب وغیرہ بنا لے۔ صرف تلنے ہی تو تھے۔ صبح اُس نے بنا کر فریز کئے تھے۔ دیکھتی ہوں۔'' سونیا اُٹھ کر باہر چلی گئی۔

''آؤ رمیض میاں جی سے مل آئیں۔ جب تک سسٹر سونیا کی چائے آتی ہے۔ یہ باصر اُٹھ کھڑا ہوا اور مدحت کی طرف دیکھا۔

''میاں جی آرام تو نہیں کر رہے تھے؟''

''نہیں وہ تو انکل مراد اور تبریز بھائی بھی اُدھر ہی ہیں۔''

''تبریز بھائی۔'' باصر نے حیرت سے پوچھا۔

''تبریز بھائی میاں جی سے ملنے گئے ہیں؟''

''ہاں انکل مراد اُنہیں لے کر گئے تھے۔''

''مگر تبریز بھائی کیسے چلے گئے۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ اُنہیں نہیں ملنا میاں جی سے۔'' باصر نے اپنے آپ سے کہا۔ اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ رمیض بھی اُس کے پیچھے لپکا اور مدحت بالکل غیر ارادی طور پر باصر کے متعلق سوچنے لگی۔

☆☆☆☆

''ایسوع مسیح ہمارے نجات دہندہ بنکر دنیا میں آئے تھے۔ اور ظالم یہودیوں نے اُنہیں صلیب پر چڑھا دیا تھا۔ اور وہ وقتِ موعود پر زندہ ہو گئے تھے۔'' انکل رابرٹ ہولے ہولے بول رہے تھے۔ اور رتن بہت دھیان سے اُن کی بات سن رہی تھی۔ ایک ایک لفظ جیسے اُس کے دل میں اُتر رہا تھا۔ اُس کے اندر جیسے سکون اُتر آیا تھا۔ وہ اضطراب و بے چینی جو کئی دنوں سے اُس کے دل کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئی تھی۔ کچھ کم ہو گئی تھی۔

انکل رابرٹ کے بالکل ساتھ بیٹھا ہوا جان ڈیوی' بہت انہماک سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت خوبصورت نہیں تھی۔ لیکن اُس میں عجیب سی کشش تھی۔ گندمی چہرے پر سیاہ بڑی بڑی آنکھیں اُسے بے حد دلکش بنا رہی تھیں۔ اور اُس کے چہرے پر بلا کی ملاحت تھی۔ اور ابھی کل ہی تو وہ آگرہ سے واپس آیا تھا۔ اور ریٹا نے اُس کا تعارف کروایا تھا۔

''یہ تینو ہے۔ رتن کماری۔ اور ہماری اس سے بہت دوستی ہو گئی ہے۔''

''نہیں بھئی یہ میری بیٹی ہے'' انکل رابرٹ نے تصحیح کی۔

''تمہیں پتا ہے' دو دن سے میں بخار میں تپ رہا تھا۔ اور یہ میری خدمت کر رہی تھی۔ کالج بھی نہیں گئی۔ میں اُس کا احسان۔''

''انکل پلیز۔'' اُس نے انکل رابرٹ کی بات کاٹی۔

''بیٹی بھی کہہ رہے ہیں۔ اور احسان کی بات کرتے ہیں۔ بھلا بیٹیاں بھی کبھی والدین پر احسان کر
ہیں۔؟''

''سوری۔ سوری۔'' انکل رابرٹ نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ مسکرادی۔ اور وہ مسکراتی ہوئی اُسے بہ
اچھی لگی تھی۔

''اور یہ اچھی لڑکی ہے اور اس کے ساتھ اچھا وقت گذر سکتا ہے۔ اُس نے سوچا تھا اور اپنی اس سو
کا اظہار اُس نے ریٹا سے بھی کر دیا تھا۔ لیکن ریٹا نے اُسے تنبیہہ کی تھی۔

''یہ بہت مختلف لڑکی ہے جان اُسے روزی یا میری نہ سمجھنا۔''

''آہاہا۔ سسٹر۔'' وہ زور سے ہنسا تھا۔

''سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بس کچھ ایک نگاہ سے پگھل جاتی ہیں۔ اور کچھ ذرا دیر۔
MELT (پگھلتی ہیں۔) ہوتی ہیں۔ لیکن بالآخر سب SURRENDER کر دیتی ہیں۔ (ہتھیار ڈال دی
ہیں۔)''

''لیکن تم اُس کے ساتھ محبت کا کھیل مت کھیلنا۔'' آن نے بھی اُسے منع کیا تھا۔

''اُس کے من کو کوئی اور ہی لو لگی ہوئی ہے۔ اُس کی تلاش کوئی اور ہے۔ جان۔ پتا نہیں کیوں مجھ
یوں لگتا ہے۔ جیسے یہ لڑکی کوئی سینٹ ہو۔ اُس کے دل میں مذہب کی سچی تڑپ ہے۔''

اور اَب وہ دیکھ رہا تھا کہ آن نے صحیح کہا تھا۔ وہ بہت انہماک سے انکل رابرٹ کی بات سن رہی تھی
اور اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ جوں ہی انکل رابرٹ خاموش ہوئے اُس نے بڑی بے چینی سے کہا۔

''انکل پلیز مجھے کچھ اور بتائیں زیادہ تفصیل کے ساتھ زیادہ وضاحت سے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق
حضرت مریم کے متعلق اور۔ اور روح القدس کے متعلق' پلیز مجھے بتائیں۔ انکل خدا کے متعلق۔ کیا وہ ایک ہے۔ تم
ہے۔ اُس کا کوئی ثانی نہیں اور حضرت عیسیٰؑ' حضرت مریم روح القدس کیا یہ سب خدا کے روپ ہیں۔''

''ہاں بتاؤں گا بتاؤں گا۔ اچھی لڑکی بتاؤں گا تمہیں۔ مگر میرا اپنا علم بہت۔ محدود ہے۔ بہت کم جان
ہوں میں۔ دنیا دار آدمی ہوں مجھے یاد نہیں کہ اپنے ہوش میں آنے کے بعد کرسمس کے علاوہ میں کبھی چرچ گیا
ہوں۔ لیکن گڈ گرل میں تمہارے اندر ایک چراغ جلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ایک روشنی سی پھوٹ رہی ہے
تمہارے اندر سے 'فادر شیلے کسی کام سے کلکتہ گئے ہوئے ہیں۔ وہ آجائیں تو ہم اُن کے پاس چلیں گے۔ اور
پھر وہ تمہیں سب کچھ بتائیں گے۔ اُن کے پاس بہت علم ہے۔ بہت جانتے ہیں۔''

''وہ کب آئیں گے انکل؟'' اُس نے بے چینی سے پوچھا۔

''جلد ہی آجائیں گے۔ بس دو تین روز میں اور تم زیادہ سوچا نہ کرو بے بی۔''

جان اَب بھی خاموشی سے بیٹھا اُسے تک رہا تھا۔

''ہر لڑکی SURRENDER ہو جاتی ہے' کچھ جلدی اور کچھ دیر میں۔'' اُس نے ایک نظر اُسے
دیکھ کر سوچا۔

لیکن یہ لڑکی اس تک جانے کا راستہ ذرا مختلف ہوگا۔ چلو یہ بھی ایک ایڈونچر ہوگا۔ اسے فتح کرنا آہا۔
وہ دل ہی دل میں ہنسا۔ ایک دلچسپ ایڈونچر۔ اور وہ میری کتنا ہنتی تھی۔ کتنی پارسا اور نیک۔

''جان پلیز' میرے ہاتھوں کو نہ چھوڑ دو۔ میرے قریب نہ بیٹھو۔ IT IS A SIN (یہ گناہ ہے۔)

آہا۔'' اُس کے ہونٹ ذرا سے پھیل گئے۔ جب SURRENDER کر دیا (ہتھیار پھینک
دیئے) تو پھر گناہ و ثواب سارے چکر بھول گئی۔ راتوں کے اندھیرے بھی اُسے خوف زدہ نہ کر سکے۔ کیسے سب
سے چھپ چھپا کر اُس کے فلیٹ میں آجاتی تھی۔ اور کس قدر بھرپور لڑکی تھی' وہ یقیناً مجھے یاد کرتی ہوگی۔ پر حساس
لڑکی تھی۔ اپنے کیے پر نادم ہوتی تھی۔ روتی تھی' اور کبھی اُس سے نہ ملنے کا عہد کرتی تھی۔ لیکن ذرا وہ محبت سے
پکارتا تو بھاگی' چلی آتی تھی۔ ہاتھ لگاتے ہی ریت کی بھربھری دیوار کی طرح ڈھے جاتی تھی۔ اور اُس نے بھرپور
نظروں سے رتن کو دیکھا۔ اور اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

ابھی دس پندرہ دن مجھے یہاں رہنا ہے۔ اور کسی لڑکی کو ____ MELT (پگھلانے کے لئے)
کرنے کے لئے تو دو دن بھی کافی ہیں۔ اور اس لڑکی کی معیت میں انڈیا کی سیر کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ اگر دو
دن بھی اس کی رفاقت مل گئی تو بہت ہے۔

''ارے مجھے تو مسز ملہوترہ کے ہاں جانا تھا۔ اُن کا بلڈ پریشر چیک کرنا تھا۔ اور۔'' انکل رابرٹ ایک
دم کھڑے ہو گئے۔

''بھئی یہ مسز ملہوترہ کو تسلی نہیں ہوتی جب تک میں خود اُن کا بلڈ پریشر چیک کر کے انہیں تسلی نہ دوں
کہ نارمل ہے۔ ہر وقت انہیں خطرہ لگا رہتا ہے کہ اُن کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہو گیا ہے۔ دیکھ لینا 'ڈاکٹر ایک دن
یہ اتنا ہائی ہو جائے گا کہ ہمارا برین ہیمرج ہو جائے گا۔ اور سب لوگ خوشی سے تالیاں بجائے گا کہ ہم لوگ کا
بوڑھی کھوسٹ سے جان چھوٹ گیا۔ پر ہم ابھی نہیں مرے گا۔ ارے یہ سارا پیسہ ہمارا ہے۔ یہ لیدر کا فیکٹری
ہمارے باپ کا تھا۔ جو ہمیں ملا۔ ملہوترہ تو نرا پھوکٹ تھا۔ یہ گھر۔ باندرہ ہل والی کوٹھی سب ہمارا ہے۔'' ڈاکٹر
رابرٹ نے مسز ملہوترہ کی بات دہرائی اور پھر جان اور ریٹا کی طرف دیکھا۔

''یہ مسز ملہوترہ بھی بڑی دولت مند عورت ہیں۔ خاوند مر چکا ہے۔ تین بیٹے ہیں۔ بہوئیں اچھی اور
خدمت گذار ہیں۔ لیکن اُن کو کسی پر اعتبار نہیں ہے۔ میری بہت اچھی دوست ہیں۔''

''تو پھر انکل آپ اُن سے شادی بنالو' مفت میں دولت مل جائے گی۔ لیدر کی فیکٹری باندرہ ہل والی
کوٹھی۔ آہا۔'' جان نے قہقہہ لگایا۔

''ساری دنیا کی دولتیں تمہارے انکل کے خالی خزانے کو نہیں بھر سکتی ہیں۔ ہمارا دولت تو لیزا تھی
لیزا۔'' ڈاکٹر رابرٹ کی آواز بھرا گئی۔ اور وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔

دانکل کو لیزا سے بہت محبت تھی' رتن نے آہستگی سے کہا۔

''بھابھو کہتی ہیں' لیزا میں اُن کی روح اٹکی ہوئی تھی۔ اور وہ پیاری بھی بہت تھی۔''

''تم نے دیکھا تھا اُسے؟'' ریٹا نے پوچھا۔

''نہیں' مجھے یاد نہیں ہے۔ لیکن بھابھو کہتی ہیں جب میں چھ سال کی تھی تب لیزا ایک رات اچانک
غائب ہو گئی تھی۔''

''کیا؟'' آن نے آنکھیں پھاڑیں۔

''میں سمجھتی تھی' وہ مر گئی ہے''

''نہیں تو وہ چلی گئی تھی۔''

''اور پھر کبھی نہیں آئی؟''

''نہیں۔''

''انکل اُسے بہت یاد کرتے ہیں۔''
''نہیں کچھ زیادہ نہیں۔ بلکہ بھابھو کہتی ہیں لیزا کے جانے سے زیادہ انہیں جیکی کے مرنے کا دُکھ ہوا تھا
''انکل رابرٹ تمہارے سگے ماموں ہیں؟'' رتن نے پوچھا۔
''نہیں میری مدر کے چچا زاد بھائی ہیں'' ____ ریٹا نے بتایا۔ اور پھر جان کی طرف متوجہ ہوگئی۔
''اَب کیا پروگرام ہے۔''
''بھئی 'تم تو سارا بمبئی گھوم چکی ہو۔ اور میں اَب آیا ہوں 'آتے ہی تم مجھے قبرستانوں کی زیار کروانے لے گئیں اَب کچھ دن ذرا زندگی کا مزا تو اُٹھالیں۔''
رابرٹ نے آہستگی سے کہا۔ اور پھر رتن کی طرف اشارہ کیا۔
''اس سے پوچھ لو تفریحی مقامات کے متعلق۔ ظاہر ہے باقی کے دن یہاں انکل رابرٹ کے پا بیٹھ کر اُن کے جیکی کی خوبیاں تو نہیں سنیں۔''
''قسم سے'' آن ہنسی۔
''مجھے جیکی کی ایک ایک خوبی زبانی یاد ہوگئی ہے۔ اُس کے کانوں پر ایک دھبہ تھا۔ اُس کی پیشانی پر
''فارگاڈ سیک آن' اَب تم بور نہ کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ مرحوم میں کون کون سی خوبیاں تھیں۔ م رتن۔'' وہ رتن کی طرف متوجہ ہوگیا۔
''آپ پڑھتی ہیں؟''
''جی۔ بی۔ اے کر رہی ہوں۔''
''کیا مذہب کی طرف آپ کا رجحان شروع سے ہی ہے یا اَب اچانک ادھر دلچسپی بڑھی ہے۔''
''اچانک بالکل اچانک رتن کی آنکھیں چمکنے لگیں۔
''ایک دن بیٹھے بیٹھے نہ جانے کہاں سے یہ خیال میرے ذہن میں آ کر بیٹھ گیا کہ ہمارا دھرم نہیں ہے۔ اور یہ پتھر کے بھگوان۔ یہ دیوی دیوتا خدا نہیں ہوسکتے۔ اصل اور سچا خدا کوئی اور ہے۔ کہیں اور۔ جو سب سے ماورا ہے۔ جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے۔ یہ چاند سورج ستارے بنائے ہیں۔''
''ایسا بالکل ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ ایک بار۔'' جان نے کہا۔
''آپ کے ساتھ'' رتن نے حیرت سے پوچھا۔
''ہاں میرے ساتھ'' جان نے آہستگی سے کہا۔
''بس یوں ہی ایک دن بیٹھے بیٹھے میرے دل میں خیال آیا کہ میں عیسائی کیوں ہوں۔ کیا اس کہ میں نے ایک عیسائی ماں باپ کے گھر جنم لیا ہے۔ کیا میرا مذہب سچا ہے؟ کیا میں ایک سچے دین کا پیرو ہوں۔''
ریٹا اور آن آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔
''پھر پھر کیا کیا آپ نے''
''پھر۔'' جان اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے قریب ہی کارپٹ پر بیٹھ گیا۔
''پھر پھر کیا بتاؤں مس رتن دین کی تلاش میں' سچے مذہب کی کھوج میں کیا کیا دکھ نہ سہے۔ پوچھ لو اور آن سے کئی کئی دن تک میں گھر نہیں آتا تھا۔ مگر کوئی مجھے مطمئن نہیں کرتا تھا۔ عجیب سا۔ اضطراب تھا۔ بےچینی تھی جو میرے دل کو مسلے جاتی تھی۔'' وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ اور رتن کا چہرا سرخ ہو رہا تھا۔

''میں بھی۔ میں بھی بالکل ایسا ہی محسوس کرتی ہوں۔ جان بالکل ایسا ہی کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے۔ خوب چیخ چیخ کر رو دوں 'کوئی بھی مجھے مطمئن نہیں کرتا۔ گوپی کے دادا جی بھی نہیں۔ اور اَب انکل رابرٹ کہتے ہیں کہ فادر شیلے مجھے مطمئن کر دیں گے' وہ مجھے صحیح راستہ دکھا دیں گے۔ اُن کا وعظ خود بخود میرے لئے راستہ متعین کر دے گا۔ مجھے خود بخود پتا چل جائے گا کہ صحیح اور سچا دھرم کون سا ہے۔ لیکن جان آپ آپ کو اپنے سوالوں کا جواب ملا۔ آپ مطمئن ہوئے؟''
''ہاں مجھے اپنے سوالوں کا جواب ملا۔ اور میں مطمئن ہوگیا۔ میری بے چینی ختم ہوگئی مجھے پتا چل گیا کہ یہی سچا اور حقیقی مذہب ہے۔ اور بائبل سچی اور حقیقی روحانی کتاب ہے۔''
''کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ یہی مذہب سچا ہے؟'' اُس نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔
''ہاں۔'' جان نے ایک جذب کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں۔
''یہی مذہب سچا ہے''
''تو کیا میں اپنا دھرم چھوڑ دوں اور تمہارے مذہب کا دامن تھام لوں۔'' اُس نے تذبذب سے اُسے دیکھا۔
''نہیں۔ نہیں مس رتن'۔ جان نے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں۔
''پہلے آپ میرے مذہب کو سمجھیں۔ جانیں اور جب آپ کا دل مطمئن ہو جائے تو پھر بغیر جانے' بغیر سمجھے آپ نے دھرم چھوڑ دیا تو اطمینان آپ کو نہیں ملے گا۔''
''مگر کون' کون مجھے بتائے گا؟'' وہ بہت مضطرب ہو رہی تھی۔
''انکل رابرٹ ہیں۔ میں ہوں' اور پھر فادر شیلے کچھ دنوں میں لوٹ آئیں گے۔ وہ تمہیں مطمئن کر دیں گے۔ اُن کے پاس یقیناً فادر ولیم کی طرح ہر سوال کا جواب ہوگا۔''
''تم جان۔ تم بھی جب تک فادر شیلے نہیں آتے مجھے بتانا۔ اپنے مذہب کے متعلق سب کچھ اور مجھے اپنی تلاش کے سفر کی کہانی ضرور سُنانا'' اُس کی آواز بھرا گئی۔ اُس کے اندر آگ سی لگی تھی۔ کچھ جان لینے کی پالینے کی۔
"WHY NOT" کیوں نہیں میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔'' وہ مسکرایا تو ریٹا نے غصّے سے اُسے دیکھا۔ (آف کتنا بڑا ایکٹر ہے یہ جان بھی۔)
''میں اَب جاتی ہوں۔'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔
''بھابھو انتظار کرتی ہوں گی۔ اور ماں جی بھی غصہ ہوتی ہیں' زیادہ دیر رُکنے پر۔ کل آؤں گی تو تم مجھے بتانا۔ وہ سب کچھ جو تم نے جانا اور پایا ہے'' وہ ریٹا اور آن سے ہاتھ ملاتی ہوئی چلی گئی۔
''آہا۔ آہا۔'' جان نے قہقہہ لگایا۔ آن نے اُس کی پیٹھ پر مکہ مارا۔
''ہم نے تمہیں منع کیا تھا جان! وہ بہت معصوم لڑکی ہے۔ اُس کے ساتھ یہ کھیل مت کھیلو۔''
''تم نے تو بائبل کی شکل بھی نہیں دیکھی ہوگی۔ ساری زندگی میں۔'' ریٹا نے جل کر کہا۔

o☆o

اُسے کیا بتاؤ گے۔ پورے ایکٹر ہو تم۔"

"یہ سامنے سڑک کراس کرتے ہی کتابوں کی ایک بڑی دکان ہے۔ اور وہاں میں نے بائبل کا ترجمہ دیکھا ہے' آج رات پڑھوں گا۔ اور کل۔"

"تم بائبل کا ترجمہ پڑھو گے؟" آن نے حیرت سے پوچھا۔

"تم؟"

"ہوں میں' ایک بڑا PROFIT (منافع) حاصل کرنے کے لئے تھوڑی بہت انوسٹمنٹ تو کرنی پڑتی ہے۔ اور میں تو ہمیشہ تھوڑی انوسٹمنٹ کر کے زیادہ نفع حاصل کرتا ہوں مائی ڈیر سسٹرز۔"

"دیکھو جان! انکل رابرٹ اسے بالکل بھی پسند نہیں کریں گے۔ وہ تینو سے اپنی بیٹی کی طرح پیار کرتے ہیں۔ اور اس گھرانے سے اُن کے بہت اچھے تعلقات ہیں۔"

"تو بابا میں کیا کرنے لگا ہوں۔ ذرا سی انجوائے منٹ ہی تو کرتا ہوں۔"

"یہ ذرا سی انجوائے منٹ نہیں ہوتی جان! مجھے میری نے سب کچھ بتا دیا تھا۔"

"وہ احمق لڑکی۔" جان کو غصہ آ گیا۔

"میں نے اُس کی مرضی کے بغیر کبھی اُس کا ہاتھ بھی نہیں چھوا۔"

"فضول باتیں نہ کرو تم دونوں۔" آن نے اُنہیں ٹوک دیا۔

"ہمیں کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی چاہئے۔ جس سے انکل رابرٹ خفا ہوں۔ انہوں نے جس طرح محبت کا سلوک کیا ہے ہمارے ساتھ' اُس کا ہمیں یہ صلہ نہیں دینا چاہئے۔ کہ اُنہیں اپنے جاننے والوں سے شرمندگی ہو۔ تم تینو کو اُس کے حال پر چھوڑ دو۔"

"یہ کار ثواب ہے۔ ایک کافر کو دین انصار میں داخل کرنا اور مجھ جیسے گناہگار کو ایک ثواب کمانے کا

موقع ملا ہے تو اُسے کیوں گنواؤں۔" اُس نے بائیں آنکھ کو دبایا اور ہولے سے ہنسا۔

"اور جہاں تک مہمان داری کا اور محبت کا تعلق ہے تو ڈیر یہ ہندوستان ہے۔ کوئی لندن نہیں ہے۔ جہاں آنٹی مارگریٹ نے تم سے تمہارے بیڈ اور کھانے کے پیسے وصول کر لئے تھے۔"

"دیکھو جان فار گاڈ سیک تم تینو کو تنگ نہ کرنا۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہ لڑکی بہت معصوم لگتی ہے۔" ریٹا نے التجا کی اور میز پر پڑا ہوا البم اُٹھا کر دیکھنے لگی' جس میں جیکی کی تصویریں تھیں۔

"جیکی واقعی ایک شاندار کتا تھا۔" آن نے تبصرہ کیا۔

"تم دونوں جیکی کی خوبیوں پر تبصرہ کرو میں ذرا بائبل کا ترجمہ خرید لاؤں۔" جان نے کہا اور اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

سڑک کراس کرتے ہوئے اُس نے یونہی غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا تو ساتھ والے گھر کی گیلری میں کھڑی وہ اُسے نظر آ گئی۔ وہ اب بھی بہت بے چین اور مضطرب لگ رہی تھی۔ اور آنسو اُس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔

"تو یہ اس کا گھر ہے" جان نے سوچا اور ایک بار پھر مڑ کر اُسے دیکھنا چاہا۔ لیکن وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

جب بائبل کا ترجمہ خرید کر واپس آیا تو اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ انکل رابرٹ کے گھٹنے پر سر رکھے زار و قطار رو رہی تھی۔ اور انکل رابرٹ ہولے ہولے اُسے تھپک رہے تھے۔

وہ پھر واپس کیوں آ گئی تھی۔ کیا ہوا تھا اُسے کیا اتنی جلدی اُس نے اپنا مذہب چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ابھی اُسے گئے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ نہیں۔ شاید ایک گھنٹہ۔ وہ ترجمہ لیتے خریدتے سیلز گرل۔ سے گپ لگانے لگا تھا۔ اور پھر اُس نے اُس لڑکی کے ساتھ سامنے والے ریسٹورنٹ میں کولڈ ڈرنک پی تھی۔ اُس نے رسماً اُسے دعوت دی تھی۔ اور وہ فوراً تیار ہو گئی تھی۔ اور دوسری سیلز گرل۔ کو بتا کر وہ اُس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ کولڈ ڈرنک پیتے ہوئے باتیں کرتے کرتے ایک گھنٹہ تو ہو ہی گیا ہو گا۔ لڑکی پر کشش تھی۔ اور اُس نے اپنے بھرے بھرے ہونٹوں پر بہت تیز سرخ رنگ کی لپ سٹک لگا رکھی۔ وہ بہت تیز تھی اور جس طرح اُس نے خود اُسے ڈیوٹی آف ہونے کے بعد جوہو پر سیر کی دعوت دی تھی۔ جان لمحہ بھر کو حیران سا رہ گیا تھا۔ لیکن پھر کندھے جھٹک کر اُس نے اُسے خدا حافظ کہتے ہوئے وعدہ کر لیا کہ وہ ٹھیک ایک گھنٹے بعد اسی ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کرے گا۔ اور پھر وہ اکٹھے جوہو جائیں گے۔ لیکن یہاں رتن کو انکل رابرٹ کے گھٹنوں پر سر رکھے روتے دیکھ کر وہ وہیں دروازے میں کھڑا ہو گیا تھا۔

"تو کیا اس لڑکی نے ایک گھنٹے میں' صرف ایک گھنٹے میں اپنا مذہب چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور اب اپنا گھر' اپنا مذہب چھوڑ کر انکل رابرٹ کے ہاں آ گئی ہے۔" تصوراتی خاکے تیار کرنے میں اُس کا ذہن بہت تیز تھا۔ لمحوں میں وہ پوری کی پوری کہانی تیار کر لیتا تھا۔

اُس نے وہیں کھڑے کھڑے اُس مدراسی ____ سیلز گرل ____ پر لعنت بھیجی جس نے بہت تیز سرخ لپ اسٹک لگا رکھی تھی۔ اور جس کی باتوں میں عجب سا عامیانہ پن تھا۔

"آہا۔" اُس نے دل میں قہقہہ لگایا۔

"آج شام جوہو پر اگر رتن کا ساتھ ہو تو اور یہ ساتھ ضرور ہو گا۔" چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔

''کیا ہوا۔ کیا ہوا انکل؟ رتن کیوں رو رہی ہے؟'' ''کچھ نہیں' کچھ نہیں ہوا بیٹا! بچی۔ اپنے اندر کی کشمکش سے گھبرا گئی ہے۔'' انکل رابرٹ نے اُس کے بالوں پر جھک کر پیار کیا۔

''حوصلہ کرو بے بی۔ حوصلہ۔''

''انکل مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ خوف آ رہا ہے۔'' اُس نے روتے ہوئے انکل رابرٹ کے گھٹنے سے سر اُٹھایا۔

''میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھی۔ مگر میرا دم گھٹنے لگا۔ میرے سینے پر ایک دم بوجھ سا آ گرا۔ مجھے یوں لگا جیسے کمرے میں اَن دیکھی صورتیں' کریہہ شکلیں بے ہنگم رقص کر رہی ہیں۔ اور رقص کرتے کرتے وہ میرا گلا گھونٹ دیں گی۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ سب مل کر قہقہے لگا رہی ہوں۔ اونچے خوفناک بھیانک قہقہے۔ اور پھر ہولے ہولے قہقہے ختم ہو گئے۔ اور مجھے لگا جیسے میں تنہا رہ گئی ہوں۔ بالکل اکیلی میں نے بھابھو۔ وکرم۔ ماں جی بھاجی سب کو آوازیں دیں۔ لیکن ہر آواز میرے گلے میں ہی گھٹ گئی۔''

''تم شاید لمحہ بھر کے لئے سو گئی تھیں بے بی اور سوتے میں ڈر گئیں یہ لو۔'' انہوں نے اپنے گلے سے سونے کی ننھی سی صلیب اُتار کر اُسے دی۔

''اُسے اپنے گلے میں پہن لو۔ تمہیں ذرا بھی ڈر نہیں لگے گا۔ یہ اُن دیکھی غیر مرئی بلائیں تمہیں نہیں ڈرائیں گی۔''

''سچ انکل۔'' اُس نے ہاتھ بڑھا کر صلیب لے لی۔

''اِسے گلے میں پہن لو۔'' انکل رابرٹ نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''اَب جاؤ اپنے گھر' تمہاری ماں جی غصہ ہوں گی۔ پھر کہاں چلی گئی۔''

''میں پچھلے دروازے سے آئی تھی؟ وہ کھڑی ہو گئی۔

''ماں جی کو نہیں پتا۔''

''اَب پُرسکون ہو کر سو جاؤ۔ یہ صلیب تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے گی۔''

''اور ایسی ہی ایک صلیب لیزا کے گلے میں بھی تھی۔ لیکن وہ محفوظ نہ رہ سکی تھی۔ ان بلاؤں سے۔'' انکل رابرٹ نے سوچا اور سر کو زور سے جھٹکا۔

''گڈ نائیٹ' سویٹ ڈریمز۔''

''گڈ نائیٹ۔'' وہ صلیب کو بڑی عقیدت سے ہاتھوں میں تھامے واپس مُڑی۔ جان کے پاس سے گذرتے ہوئے اُس نے ذرا سا مسکرا کر جان کی طرف دیکھا۔ جو براؤن لفافے میں پیک بائبل کے ترجمے کو اپنے پیچھے چھپائے۔ لب بھینچے اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اُس کے جانے کے بعد اُس نے کتاب کارنس پر رکھی۔ اور سوچا۔ اَب وہ مدراسی لڑکی کچھ اتنی زیادہ بُری بھی نہ تھی۔

''ریٹا' سنو'' اُس نے آواز دی۔

''میں ذرا جوہو تک جاؤں گا۔ دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا۔''

''اکیلے'' انکل رابرٹ نے قہقہہ لگایا۔ ''نہیں مسز ملہوترہ کے ساتھ۔'' جواباً اُس نے بھی قہقہہ لگایا۔

''بہت زیادہ بوڑھی تو نہیں ہیں۔''

''نہیں بالکل نہیں۔''

انکل رابرٹ نے بدستور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

'' تو پھر ٹھیک۔ آہا۔ لیدر کی فیکٹری باندرہ ہل کی کوٹھی۔ ایک بڑا سینما ہال۔'' وہ انکل رابرٹ کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسا۔

''انکل میرے لئے کوشش کیجئے گا۔''

''ضرور'' انکل رابرٹ ہنسے۔

''میں کل ہی مسز ملہوترہ کو تمہارا پرپوزل دیتا ہوں۔''

''تھینک یو۔ انکل۔ اور اَب اجازت۔ میں ذرا تیار ہو جاؤں۔''

''ہوشیار رہنا بھانجے۔ جیب کا خیال رکھنا۔''

''تھینک یو ' انکل تھینک یو میں خیال رکھوں گا۔''

وہ ہنستا ہوا باہر چلا گیا تو انکل رابرٹ میز پر سے جیکی کی تصویروں والا البم اُٹھا کر دیکھنے لگے۔

☆☆☆☆

مراد ولا میں آج رنگوں اور روشنیوں کی برسات اُتر آئی تھی۔ پورا گھر رنگین قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ لان میں مہمانوں کے لئے کُرسیاں بچھا دی گئیں تھیں۔ باوردی بیرے کولڈ ڈرنکس لئے ادھر سے اُدھر چکرا رہے تھے۔ بظاہر یہ ڈنر پارٹی تبریز کے ایم۔بی۔اے کر کے ملک واپس آنے کی خوشی میں تھی۔ لیکن درحقیقت مسز زینت مراد نے یہ سارا بکھیڑا مسز وہاب کے لئے کیا تھا۔ اور اُن کے زرخیز ذہن نے واقعی ایک شاندار فنکشن کا جواز ڈھونڈ لیا تھا۔ مسز وہاب سے وہ بہت متاثر ہو گئی تھیں۔ یوں تو کئی وزراء کی بیویوں سے اُن کے تعلقات رہے تھے۔ اب بھی تھے۔ لیکن مسز وہاب کی شخصیت میں جانے کیا بات تھی کہ وہ ہر قیمت پر اُن سے تعلقات بڑھانا چاہتی تھیں۔ یہ صرف اس لئے نہیں تھا کہ وہ تیل اور گیس کے وفاقی وزیر کی بیوی تھیں۔ بلکہ اس میں پچاس فی صد مسز وہاب کی شخصیت کا بھی دخل تھا۔ اس لئے اُن کی پوری کوشش تھی کہ آج کی یہ پارٹی اتنی شاندار ہو کر مسز وہاب اُن سے بے طرح متاثر ہو جائیں۔ اس پارٹی میں شہر کے بڑے بڑے لوگوں کو بلا رکھا تھا۔ سابقہ وزیر' موجودہ وزراء' جاگیردار' بزنس مین۔ اُن کی فیملیز غرض مراد ولا میں رنگ و نور کا طوفان اُمڈا ہوا تھا۔ اور مسز مراد سفید سلکی ساڑھی میں ادھر سے اُدھر چکراتی پھر رہی تھیں۔ آنے والوں کو خوش آمدید کہتیں۔ موجود مہمانوں سے ہلکی پھلکی گپ شپ کرتی ہوئی وہ سب کا دھیان رکھے ہوئے تھیں۔ کچھ مہمان آ چکے تھے' کچھ آ رہے تھے۔ مسز وہاب ابھی نہیں آئی تھیں۔ مہمانوں کو کمپنی دیتے ہوئے بار بار اُن کی نگاہ گھڑی کی طرف بھی اُٹھ جاتی تھی۔ اور دل میں لمحہ بھر کے لئے وہم سا اُٹھتا۔

''کہیں مسز وہاب نہ آئیں تو۔ مگر نہیں۔''

وہ فوراً ہی دل کو تسلی دیتیں۔ اُنہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہاب صاحب نہ بھی آ سکے تو وہ ضرور آئیں گی۔ اُن کی نگاہیں بار بار گیٹ کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔

مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام اس طرح کیا گیا تھا کہ دونوں اطراف کے لانز میں ایک طرف مردوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ اور ایک طرف خواتین کے' البتہ ڈنر کا انتظام مکس ہی تھا۔ اندر بڑے سے ڈائننگ ہال میں ٹیبلز لگا دی گئی تھیں۔ کچھ بزنس مین قسم کے لوگ اندر سٹنگ روم میں تھے۔ اور کاروباری اُتار چڑھاؤ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مدحت کے لئے اس طرح کا فنکشن ایک بالکل نئی بات تھی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی سی تھی۔ مسز زینت مراد نے سونیا کے اور اُس کے لئے بوتیک سے نہایت خوبصورت ڈریس منگوایا تھا۔ ہلکے پنک رنگ کے لباس میں سادہ سے چہرے اور روشن آنکھوں کے ساتھ وہ بہت دلکش اور بہت منفرد لگ رہی تھی۔ کئی خواتین نے اُس کے متعلق پوچھا تھا۔ اور مسز زینت مراد نے بڑے فخر سے اُسے اپنی بھتیجی کہہ کر متعارف کروایا تھا۔ سونیا کو اپنی کچھ

دوست مل گئی تھیں۔ اس لئے مدحت گھبرا کر اندر کی طرف چلی آئی۔ کوریڈور میں اُسے باصر مل گیا۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مدحت نے نظر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ یکدم اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''مدحت''۔ باصر نے اُسے پکارا۔

''ادھر کہاں جا رہی ہو؟''

''بس یونہی کمرے میں جا رہی تھی تھوڑی دیر کے لئے' دل گھبرانے لگا تھا وہاں۔''

''کیوں تمہاری عمر کی لڑکیاں تو اس طرح کی پارٹیوں کو انجوائے کرتی ہیں۔''

''بس وہ۔ دراصل میں کسی کو جانتی نہیں ہوں۔ اور پھر یوں بھی اتنی گیدرنگ میں مجھے اُلجھن ہو رہی تھی۔''

''سونیا کہاں ہے؟''

''پتا نہیں' وہ اُن کی کچھ یونیورسٹی کی دوست مل گئی ہیں۔''

''میں آج صبح شاہ پور گیا تھا۔''

''اچھا' میاں جی تو ٹھیک ہیں ناں؟'' اُس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک۔ ایک دم۔ تمہیں بہت سارا پیارا بھیجا ہے انہوں نے۔ اور ڈاکٹر شاہ نے بھی تمہارے لئے گڈ وشز بھیجی ہیں۔''

''اچھا' میاں جی نے کچھ اور کہا تھا۔''

''نہیں'' باصر کی نگاہیں اُس کے چہرے پر تھیں''۔

''میاں جی بالکل ٹھیک تھے نا؟ ماسی خیراں سے کہا تھا آپ نے کہ اُن کا خیال رکھا کریں۔ آپ بتا کر جاتے تو فاطمہ کے لئے میرا پیغام لے جاتے۔ میں سمجھا کر تو آئی تھی ماسی خیراں اور فاطمہ کو۔ لیکن ایک بار پھر ذرا یاد دہانی کروا دیتی کہ میاں جی کی کن کن باتوں کا انہیں خیال رکھنا ہے۔''

''تم میاں جی کے لئے پریشان نہ ہوا کرو مدحت' وہاں سب اُن کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ بہر حال دو چار روز میں پھر میں وہاں جاؤں گا تو جو ہدایت تم نے دینی ہوں دے دینا۔'' باصر کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اور وہ بدستور اُسے دیکھ رہا تھا۔ یہاں اس وقت موجود تمام لڑکیوں میں اسے وہ سب سے منفرد اور سب سے الگ لگ رہی تھی۔ پاکیزگی' معصومیت اور دلکشی۔

''مدحت!'' بے اختیار بالکل غیر ارادی طور پر اُس کے لبوں سے نکلا۔

''تم۔ تم آج بہت۔ بہت اچھی لگ رہی ہو۔ بہت پیاری۔''

مدحت کے رخسار تپ اُٹھے۔ پلکیں بوجھل ہو کر جھک گئیں۔

جھکی جھکی پلکوں کے ساتھ وہ سیدھی اُس کے دل میں اُترتی گئی۔

''مدحت'' باصر کے دل پر گھبراہٹ سی طاری ہو گئی۔

''میرا خیال ہے۔ مدحت میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں۔ اور ابھی اِس وقت اس لمحے میرے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ تم زندگی کے سفر میں اگر میری شریک بن جاؤ تو زندگی بہت دلکش ہو جائے گی۔ شاید میرے لاشعور میں اندر کہیں گہرائیوں میں ایسا ہی ایک پیکر تھا جو آج یکایک مجسم ہو کر میرے سامنے آ گیا ہے۔ اس سے پہلے میں نے تمہارے لئے اس طرح کبھی نہیں سوچا' مدحو! لیکن آج مدحو کیا تم۔ کیا تم زندگی کے سفر میں میری شریک بننا پسند کرو گی پلیز۔'' باصر کی نگاہیں اُس کے چہرے پر جمی تھیں۔ اور اُس کا دل دھڑک رہا تھا' تیزی سے ہونٹ لرز رہے تھے۔

''پلیز مدحو! اگر تم نہیں چاہو گی تو میں یہ خیال دل سے نکال دوں گا۔''

''جی'' اُس نے بمشکل کہا۔

''اوہ تھینک یو مدحو۔ تھینک یو۔'' باصر نے بے اختیار اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور پھر فوراً ہی چھوڑ دیا۔

''سوری۔'' ایک خفیف سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر آ ٹھہری۔

''مدحو۔'' وہ شاید ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ اور مدحت کا دل دھڑک دھڑک کر سینے کی چار دیواری سے باہر آنے کو بے تاب ہو رہا تھا کہ اچانک سامنے سے رمیض آتا دکھائی دیا۔

''ڈنر شروع ہوا؟'' باصر نے اُسے آتے دیکھ کر پوچھا۔

''ابھی کہاں جناب! ابھی تو مسز وہاب کا انتظار ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے لگتا ہے۔ جیسے مسز وہاب نہیں آنے کی۔

تھی سب آرائش جس کے لئے
اُس نے تو ہمیں دیکھا ہی نہیں

''آخر میری سمجھ میں نہیں آتا ماما مسز وہاب سے اتنی متاثر کیوں ہیں۔'' باصر کو جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔

''ہفتوں سے پروگرام بن رہے تھے۔ اس ڈنر پارٹی کے اور اَب مسز وہاب ہیں کہ آ ہی نہیں۔''

''لوگ اَب بیزار ہو گئے ہیں'' رمیض نے کہا اور مدحت کی طرف دیکھا۔

''یہ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''بھاگ کر آئی ہے۔''

''دراصل ریمی! وہاں مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ اس لئے میں اپنے کمرے میں جا رہی تھی کہ یہ۔''

اُس نے نظر اُٹھا کر باصر کی طرف دیکھا۔ اور دھڑکنیں پھر بیتاب ہو گئیں۔ تب ہی زینت مراد تیزی کے قدموں سے چلتی ہوئی سٹنگ روم سے نکلیں اور وہاں تینوں کو کھڑا دیکھ کر ٹھٹکیں۔

''یہ تم تینوں یہاں کیا کر رہے ہو۔ مدحت تم چلو میرے ساتھ۔ ابھی ابھی مسز وہاب پہنچنے والی ہیں۔ ...ں نے فون کیا ہے' وہ گھر سے نکل پڑی ہیں۔ اور تم ریمی اوپر دیکھو شاید تیمی اپنے کمرے میں چلا گیا ہے۔ بلا لاؤ ...ے۔ لوگ اُس سے ملنا چاہ رہے ہیں۔ اور وہ غائب اور باصر تم بھی چلو اُدھر تمہارے پاپا تمہیں پوچھ رہے تھے۔ ...ل ہادی تم سے ملنا چاہ رہے تھے۔ دراصل تمہارے پاپا نے اُن سے ذکر کیا تھا۔ کہ وہ تمہارے لئے ایک ...ل بنوانا چاہ رہے ہیں۔ جو جدید سہولتوں سے مزین ہو۔ تمہیں پتا تو ہے جنرل ہادی کا اپنا کلینک ہے۔ بہت ...اندار۔ بیس بیڈ کا انتظام بھی ہے وہاں۔ میرا خیال ہے' وہ پارٹنر شپ کرنا چاہ رہے ہیں۔ اُن کا بیٹا ابھی کچھ ...ن ہوئے سرجری میں اسپشلائز کر کے آیا ہے۔''

باصر کے حلق میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ صاف صاف کہہ دے کہ پاپا اُسے اپنی فیکٹری ...ل مصنوعات میں سے نہ سمجھیں۔ لیکن زینت مراد تیز تیز بول کر مدحت کا ہاتھ پکڑے باہر لان کی طرف چلی گئیں۔ مسز ...اب کے ساتھ اُن کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بھی تھا۔ مسٹر اور مسز وہاب دونوں ہی بہت معذرت خواہ تھے۔

''دراصل ہم بالکل نکلنے ہی والے تھے کہ وہاب صاحب سے ملنے کے لئے کچھ اہم شخصیات آ ...گئیں۔ اور بس اُٹھتے اُٹھتے دیر ہو گئی۔''

''کوئی بات نہیں مسز وہاب۔'' زینت مراد نے خوش دلی سے اُن کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو سوچا اکیلی بچوں کے ساتھ آ جاؤں۔ لیکن وہاب صاحب بھی اس فنکشن کو مس نہیں کرنا

چاہ رہے تھے۔ کہیں مدتوں بعد تو اس طرح کسی خالص گھریلو تقریب میں دوستوں کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع ملتا ہے۔'' زینت مراد کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے وضاحت کی۔

مراد علی وہاب حسن کا ہاتھ تھامے۔ اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُنہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

مسز زینت مراد کھلی جارہی تھیں۔ اور بار بار مسز وہاب کا شکریہ ادا کررہی تھیں۔

''یہ نوریا اور سویرا ہیں۔ میری بیٹیاں'' مسز وہاب کو اچانک خیال آیا کہ ابھی تک انہوں نے اپنے بچوں کا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔

''ہاؤ کیوٹ۔'' مسز مراد نے باری باری دونوں کے رخساروں کو لبوں سے چھوا۔

''مسز وہاب! آپ کی بچیاں بھی آپ ہی کی طرح سحر انگیز شخصیت کی مالک ہیں۔'' مسز مراد نے۔۔ بے اختیار تعریف کی۔ اور یہ حقیقت بھی تھی۔ وہ خوبصورت بھی تھیں۔ اور اُن میں اپنی ماں جیسا ایک خاص طرح کا وقار بھی تھا۔ سادا سے لباس میں ہلکے سے میک اَپ کے ساتھ وہ بہت دلکش لگ رہی تھیں۔

''نوریا ایم بی۔ بی۔ ایس کے فائنل میں ہیں اور سویرا بی۔ اے کی طالبہ ہیں۔ اور یہ عبید ہیں۔ ہمارے بڑے صاحبزادے۔ وہاب صاحب اسے انجینئر بنانا چاہتے تھے۔ میری خواہش تھی کہ یہ ڈاکٹر بنے لیکن انہوں نے اپنے لئے الگ راستہ ہی منتخب کیا ہے۔ انگلش لٹریچر میں ایم۔ اے کرنے کے بعد آج کل یہ گورنمنٹ کالج میں پڑھا رہے ہیں۔''

عبید نے ہلکا سا سر خم کر کے مسز زینت مراد کو آداب کیا۔ عبید کی شخصیت میں بھی وہی وقار تھا۔ ہلکے ہلکے گھنگریالے بال کشادہ پیشانی۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں۔ مسز زینت مراد نے پسندیدگی کی نظروں سے اُسے دیکھا۔

''میں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ مجھے آپ سب لوگوں کے آنے سے کس قدر خوشی ہو رہی ہے۔''

زینت مراد نے اپنے دلی جذبوں کا اظہار کیا اور اپنی طرف آتے رمیض کی طرف دیکھا۔

''ماما وہ تبریز بھائی۔''

''یہ رمیض ہے میرا سب سے چھوٹا بیٹا۔ اس نے ایف۔ ایس۔ سی کے بعد آرمی میں کمیشن لے لیا تھا۔ آج کل کاکول میں ہے ٹریننگ کے لئے۔ کچھ دن قبل آیا ہے۔ چھٹیاں گزارنے۔''

رمیض نے ادب سے سلام کیا۔ اور پھر زینت مراد کی طرف دیکھا۔

''ماما وہ تبریز بھائی کہہ''

''میں دیکھتی ہوں تبریز کو۔ تم جاؤ یہ عبید بیٹے کو لے جاؤ اُدھر باصر کے پاس۔ بیٹا! باصر میرا بیٹا ہے ہاؤس جاب کررہا ہے۔ وہ تمہیں یقیناً بور نہیں ہونے دے گا۔''

''یہاں تو بور ہونے کا کوئی سامان نظر نہیں آتا۔''

وہ مسکرایا۔

''ڈنر کے بعد کچھ گانے وانے کا بھی پروگرام ہے۔''

''آنٹی کون کون آرہا ہے۔'' سویرا نے بیتابی سے پوچھا۔

''خلیل حیدر ہے۔ عدنان سمیع ہے۔ بھئی تم لوگوں کی پسند کے سب فنکار ہیں۔ نئی نسل کے 'الب... مراد صاحب کو عطاء اللہ بہت پسند ہے۔ انہوں نے عطاء اللہ کے لئے بھی کہا تو تھا۔ اَب ٹھیک سے پتا تو نہیں مجھ... بات طے ہوسکی تھی یا نہیں۔ دراصل مراد صاحب نے سب کام اپنے سیکرٹری کو سونپ دیے تھے۔ ایاز صاحب

پرانے آدمی ہیں۔ ایسے فنکشنز میں ساری ارینج منٹ وہ خود ہی کرتے ہیں۔ بھئی ہمیں تو پتا ہی نہیں ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بہت کام کے آدمی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں۔ خدانخواستہ ایاز صاحب نہ رہے تو ہمارا کیا بنے گا۔''

زینت مراد بولنے پہ آتیں تو مسلسل بولتی ہی چلی جاتی تھیں۔

رمیض 'عبید کو ساتھ لے کر دوسری طرف چلا گیا تھا۔ زینت مراد محفل میں موجود خواتین سے مسز وہاب کا تعارف کروانے لگیں۔ کچھ خواتین جو اُنہیں پہلے سے جانتی تھیں۔ بڑی گرمجوشی سے خوشدلی سے اُن سے ملنے لگیں۔ اچانک اُن کی نظر سونیا پر پڑی۔ جو مسز وہاب کی آمد سے قطعی بے نیاز ایک طرف کونے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ سر جوڑے بیٹھی تھی۔

''سونی۔ سونی۔ اِدھر آؤ۔ سونیا نے مُڑ کر انہیں دیکھا۔

''اِدھر آؤ بھئی یہ دیکھو کون ہے۔؟''

''جی۔!'' وہ اُن کے قریب چلی آئی۔

''یہ بہنیں ہیں نوریا اور سویرا۔ انہیں ساتھ لے جاؤ اپنے۔ کہاں ہم بڈھوں میں بور ہوں گی۔'' وہ خود ہی کھلکھلا کر ہنسیں۔

''جاؤ بچو یہ سونیا ہے' میری بیٹی۔'' انہوں نے مسز وہاب کو مخاطب کیا۔ جو بیگم لاثانی سے گلے مل رہی تھیں۔

''ایم۔ ایس۔ سی کر رہی ہے۔'' مسز وہاب نے سرسری نظروں سے اُسے دیکھا۔ اور مسکرائیں۔

''جیتی رہو۔''

''کیا سبجیکٹ ہے آپ کا؟'' نوریا نے پوچھا۔ اُس کی آواز میں ایک خاص ٹھہراؤ تھا۔

''فزکس۔'' سونیا مسکرائی۔ ہلکے ہلکے میک اَپ میں سونیا بھی بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''اور آپ؟'' سونیا کو یہ لڑکی بہت اچھی لگی۔ سنجیدہ اور باوقار سی۔

''میں میڈیکل میں ہوں۔ ایم۔ بی۔ بی ایس کے فائنل ایئر میں۔''

''یعنی مستقبل کی ڈاکٹر۔'' سونیا نے بے تکلفی سے کہا اور اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

''آئیں آپ کو اپنی فرینڈز سے ملواؤں۔ اور تم بھی آؤ پیاری گڑیا۔' سونیا نے سویرا کی طرف دیکھا۔

''میں اتنی گڑیا بھی نہیں ہوں۔'' سویرا نے شوخی سے کہا۔

''بی۔ اے کی طالبہ ہوں جناب۔''

''اچھا۔'' سونیا نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

''ہم تو سمجھ رہے تھے نرسری کی اسٹوڈنٹ ہے۔''

''ایویں ہی۔'' وہ شرما گئی۔ اور سونیا دونوں کا ہاتھ تھامے اپنی فرینڈز کی طرف چل دی۔

مسز وہاب بیگم لاثانی کے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔

''ہاں تو بیگم لاثانی۔ اس دفعہ آپ کی پروڈکٹ کا جو ایڈ آرہا ہے۔ ٹی۔ وی پہ وہ کچھ زیادہ اٹریکٹو نہیں ہے۔' اس سے تو بہتر وہ لان والوں کا ہے۔''

''بیگم لاثانی کے میاں سبحان محمد لاثانی کی اپنی ٹیکسٹائل ملز تھیں۔ اور دونوں میاں بیوی میں عجیب سی انکساری اور عجز پایا جاتا تھا۔ وہ فخریہ بتایا کرتے تھے کہ انہوں نے عملی زندگی کی ابتداء ایک چھوٹے سے کھوکھے سے کی تھی۔ اس وقت بھی وہ سادہ اسے کڑھائی والے سفید دوپٹے اور سفید ہی کاٹن کے سوٹ میں تھیں۔ اور

ہمیشہ کی سی انکساری سے مسز وہاب سے مخاطب تھیں۔

"ہاں جی سبحان بھی کہہ رہے تھے کہ کافی کمزور اشتہار ہے۔"

زینت مراد لمحہ بھر خاموش کھڑی رہیں۔ پھر اچانک اُنہیں تبریز کا خیال آ گیا۔ تبریز کا محفل میں ہ
بہت ضروری تھا۔ اور اُس نے وعدہ بھی کیا تھا اُن سے کہ وہ موجود رہے گا۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں چلا گیا تھا۔

"بیگم لاثانی آپ ذرا مسز وہاب کو کمپنی دیجئے میں ____ ایاز صاحب سے کھانے کے متعلق
پوچھوں۔"

"ضرور۔ ضرور جائیے مسز مراد اور بے فکر ہو کر جائیے۔ بیگم لاثانی سے پرانی دوستی ہے ہماری اور آ
تو بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی ہے۔ جی بھر کر باتیں کریں گے۔" مسز وہاب نے ہنستے ہوئے کہا۔

زینت مراد ڈائننگ ہال سے ہوتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف مڑ گئیں۔ تبریز اپنے بیڈ روم میں
تھا۔ اور جوتوں سمیت بیڈ پر ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ اور نگاہیں دیوار پر جمی تھیں۔

"تبی۔" زینت مراد نے دروازے کو کھولتے ہوئے پکارا۔ تو اُس نے یونہی لیٹے لیٹے مڑ کر
زینت مراد کو دیکھا۔

"تبی بیٹے! تم اوپر کیوں آ گئے۔ اور تم یہ سگریٹ۔"

"اوپر اس لئے آ گیا کہ وہاں مجھے اپنا وجود مس فٹ لگ رہا تھا۔ اور سگریٹ۔ یہ سادا سگریٹ ہے
میں کتنی بار آپ کو بتاؤں کہ میں نشہ نہیں کرتا۔ آپ کو پتا نہیں کیوں نہیں یقین آتا۔"

"یقین ہے۔ یقین کیوں نہیں ہے میری جان۔ بس میں تو چاہتی ہوں کہ تمہاری صحت ابھی
نہیں ہے۔ اور یہ سگریٹ بھی صحت کے لئے نقصان دہ ہے۔"

"تو ماما اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ میری ٹینشن کم ہوتی ہے سگریٹ پینے سے۔"

"پر بیٹا! یہ ٹینشن کیوں ہے کیوں ہوتے ہو ٹینس؟ کوئی پریشانی ہے تو مجھ سے کہو۔ اپنے پاپا
کہو۔ ہم تمہاری بہتری کے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں۔"

"پاپا۔" وہ طنزیہ سی ہنسی ہنسا۔

"پاپا مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔"

"وہ تم سے نفرت نہیں کرتے تبی۔ مان جاؤ۔ یقین کر لو۔ بس اُنہیں تم سے بہت سی اُمیدیں وابستہ
تھیں۔ بہت سے خواب انہوں نے تمہارے لئے دیکھ رکھے تھے۔ یہ امیدیں ٹوٹی ہیں۔ خواب بکھرے ہیں تو و
ہرٹ (دلبرداشتہ) ہوئے ہیں۔ بس۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"سب کیسے ٹھیک ہو گا ماما؟" وہ ہولے سے بڑبڑایا۔

"سب کچھ تو بگڑ گیا ہے۔ زندگی کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو گیا ہے۔ اور تبریز مراد علی۔ اَب کبھی
تبریز مراد علی نہیں بن سکتا مر کر بھی نہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو بیٹا!"

"آئیے بیٹھیے۔" مسز مراد نے نظر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

سیاہ ڈنر سوٹ میں وہ اچھا لگ رہا تھا۔ اگرچہ وہ پہلے کی نسبت بہت کمزور ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے
ابھی تک حلقے پڑے ہوئے تھے۔ پیشانی پر سلوٹیں سی پڑی ہوئی تھیں جیسے کچھ سوچ رہا ہو اور چہرے پر گہری سنجیدگی
کے پیچھے ہلکا سا ملال کا رنگ چھلک رہا تھا۔ جب سے وہ آیا تھا آج پہلی بار وہ یوں ڈھنگ سے تیار ہوا تھا۔

"نہیں نیچے سب مہمان آ چکے ہیں اور تم جانتے ہو، یہ پارٹی تمہاری کامیابی کی خوشی میں اور واپسی
میں دی ہے۔ لوگ تم سے ملنا بھی چاہیں گے۔"

"ماما۔" وہ ایک دم تلخ ہو گیا۔

"میں نے آپ کو منع کیا تھا۔ مت تماشا بنائیں۔ میری کامیابیوں کا۔ آگ لگا دیں میری ڈگریوں
کو۔ کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ کچھ فائدہ نہیں ہے۔ ان سب کا۔ میرا اُن سب لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔"

"بیٹا! غلطیاں انسانوں سے ہوتی ہیں۔ ایک بُری عادت پڑ گئی تھی تمہیں، ختم ہو گئی۔ یہ تو تمہاری
ہمت ہے، تمہارا حوصلہ ہے۔ تمہاری بہادری ہے۔ کہ تم نے اُس سے چھٹکارا پالیا۔ اور جہاں تک تمہاری کامیابی
کی بات ہے وہ تم حاصل کر چکے تھے۔ وہ جھوٹ نہیں ہے۔"

پتا نہیں کیا جھوٹ ہے اور کیا جھوٹ نہیں ہے ماما۔ میری تو اَب ساری زندگی ہی جھوٹ ہے۔ مگر
آپ نہیں سمجھیں گے۔ اُس نے دل ہی میں سوچا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"بیٹا چلو ناں۔"

وہ انکار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر ماما کے ملتجی چہرے پر نظر ڈال کر خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

"آپ چلیں میں آ رہا ہوں۔"

نیچے ویسے ہی رنگ و نور کا طوفان اُمڈا ہوا تھا۔ جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ بلند بانگ قہقہے۔ ہنسی مذاق۔
دبی دبی سرگوشیاں وہ ایک طرف باصر کے بالکل پیچھے ایک اندھیرے کونے میں کرسی پر ٹک گیا۔ زینت مراد
کے نیچے پہنچتے ہی ایاز صاحب نے ڈنر لگنے کی اطلاع دی۔ تو سب ڈنر کے لئے اُٹھنے لگے۔

ڈنر سے فارغ ہو کر سب لوگ پھر لان میں اکٹھے ہونے لگے تھے۔ بیرے وہیں قہوہ سرو کرنے لگے
تھے۔ اور اسٹیج سے پردہ ہٹا دیا گیا تھا۔ اور لان کی روشنیاں بجھا دی گئی تھیں۔ اَب ساری جگمگاہٹیں اسٹیج پر اتر آئی تھیں۔

"خواتین و حضرات آپکی دلچسپی کے لئے کچھ موسیقی کا پروگرام ترتیب دیا گیا ہے۔ اور ہمارے
ساتھ بہت اچھے فنکار موجود ہیں۔ جو آج آپ۔"

ایاز صاحب اعلان کر رہے تھے اور مسز زینت مراد نے مسز وہاب کی نہ جانے کس بات پر ہنستے
ہوئے سر اٹھایا تو اُن کی نگاہیں سویرا کی طرف اُٹھ گئیں۔ جو مدحت کا ہاتھ پکڑے تقریباً کھینچتی ہوئی اسے مسز
وہاب کی طرف لا رہی تھی۔

"ممی۔ ممی۔" اُس کے لہجے سے خوشی چھلک رہی تھی۔

"ممی! یہ ہے وہ لڑکی مدحت شیراز جس کے متعلق میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اس نے ہمارے کالج
میں ایڈمشن لیا ہے۔"

مسز وہاب نے دلچسپی اور اشتیاق سے اُسے دیکھا۔

"گڑیا اس کا ہاتھ تو چھوڑو۔ بیٹا، تم تو اسے پریشان کیے دے رہی ہو۔ ماشاءاللہ بہت پیاری ہے۔"

"میں نے آپ سے کہا تھا نا ممی! کہ آپ دیکھیں گی تو دیکھتی رہ جائیں گی۔" مسز وہاب
مسکرائیں۔

"بیٹا! یہ سویرا تو تمہاری دیوانی ہو گئی ہے۔ جس دن سے تم نے ____ ایڈمیشن لیا ہے۔ تمہاری
تعریفیں کر کر کے کان کھا گئی ہے۔"

مدحت شرما رہی تھی۔ اُس کے رخساروں پر دھنک سی اُتری ہوئی تھی۔ اور اُس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ

وہ مسز وہاب کی بات کا کیا جواب دے۔

''آنٹی یہ تو۔'' اُس نے سویرا کی طرف دیکھا۔

''میں کیا؟'' سویرا کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

''بیٹا! تمہاری امی بھی آئی ہوئی ہیں۔ ملواؤ نا اُس سے۔'' مسز وہاب نے نرمی سے کہا۔

''جی وہ'' مدحت گھبرا گئی۔

''میری بھتیجی ہے مسز وہاب۔'' زینت مراد نے مسز وہاب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''اور نند کی بیٹی بھی ہے۔ میری نند کا انتقال ہو چکا ہے۔ بھائی میرے فارن میں ہوتے ہیں۔ اور میرے پاس ہی رہتی ہے۔ پہلے شاہ پور میں تھی میرے سسر کے پاس۔ لیکن اَب میں اسے اپنے پاس واپس آئی ہوں۔ دراصل میں نہیں چاہتی تھی کہ وہاں گاؤں میں رہ کر یہ یہاں کے آداب سے واقف ہی نہ ہو سکے میرا بڑا بیٹا ہے نا تبریز جس کے اعزاز میں آج کا فنکشن ارینج کیا گیا ہے۔ اُس کے ساتھ بچپن میں ہی میا جی میرے سُسر نے اُس کی منگنی کر دی تھی۔''

حسب معمول مسز زینت مراد نے تفصیل بتائی۔

''اوہ۔'' مسز وہاب نے ایک گہرا سانس لیا۔ سویرا نے غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ چھوڑ د اور مسز زینت مراد کو یوں لگا جیسے لمحہ بھر کے لئے اُس کا چہرہ بجھ سا گیا ہو۔ مدحت ساکت کھڑی تھی۔ پتا نہ کیسے پتا نہیں کب وہ وہاں سے پیچھے ہٹی تھی۔ اور اندھیرے میں ایک طرف گھاس پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

یہ کیا ہوا تھا' یہ مسز مراد نے کیا کہا تھا۔ ابھی ابھی کچھ دیر پہلے۔ ہاں چند لمحے پہلے ہی تو اُس کے دل ایک کونپل پھوٹی تھی۔ پیار کی کونپل' محبت کی کلی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ ایک بہت پیارا بہت دلکش شخص اُس سے مح کا اعتراف کر رہا تھا۔ اور اُس نے عمر بھر کے سفر میں اُس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اے کاش باصر نے اُس کچھ نہ کہا ہوتا یا پھر ابھی تو محبت کے اُس پہلے پہلے اعتراف سے وہ جی بھر کر خوش بھی نہیں ہو سکی تھی۔ ابھی تو اُس اپنے دل پر ہاتھ رکھا ہوا تھا کہ کہیں کوئی اُس کے دل کی دھڑکنوں سے اُس کا راز نہ پا لے۔ کہیں اُس کی آنکھیں سے کچھ کہہ نہ دیں۔ کہیں دمکتا چہرہ اُس محبت کی کہانی عام نہ کر دے جس نے ابھی ابھی کچھ دیر پہلے اُس کے دل جنم لیا تھا۔ وہ تو سونیا سے بھی چھپتی پھر رہی تھی۔ اُس کا کتنا دل چاہ رہا تھا کہ جلدی سے یہ سب ہنگامہ ختم ہو اور وہ ا بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند کر باصر کے متعلق سوچے' وہ گہری نظروں سے اُسے تکتا ہوا اُس کی آنکھوں میں آئے۔ ابھی تو اُس نے باصر کے حوالے سے ایک خواب بھی نہیں دیکھا تھا کہ اُس کے سارے خواب مر گئے سارے سپنے آنکھوں میں ہی کرچی کرچی ہو گئے تھے۔ اور اَب یہ کرچیاں چبھ رہی تھیں دل میں اُتری جا رہی تھیں اُس کا دل چاہا اپنی اس نوخیز محبت کی موت پر وہ زور زور سے چیخ چیخ کر روئے۔ لیکن اُس نے اپنی چیخوں کو اند روک لیا۔ ہونٹ بھینچ لئے اور دونوں بازوؤں کو سختی سے اپنے گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیا۔ اور آنسو قطرہ قطرہ کر بڑی آہستگی سے' بڑی نرمی سے اُس کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔

☆☆☆☆

اور یہ کتنی لمبی اور طویل رات ہے' اپنے کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے رتن نے سوچا۔

اور خدا کرے اس رات کی کبھی صبح نہ ہو___ اُس کے لاشعور کے اندر سے ایک خواہش اُبھری جو اُسے سب سے جدا کرنے والی تھی___ دیپو' بھابھی' ماں' کرم' اور بھابھو۔ ان سب سے ان سب ہستیوں سے' وہ ٹہلتے ٹہلتے رُک گئی۔ اُس نے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر باہر جھانکا۔ سیاہ آسمان روشن ستا

بھرا ہوا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی۔

یہ کمرہ' یہ کھڑکی' یہ شیلف' یہ بیڈ کیا وہ ان سب کو کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ کبھی نہیں۔ اُس نے کمرے کی دیواروں پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرا۔ ہلکا پنک ڈسٹمپر بلو اور پنک بڑے بڑے پھولوں والے پردے۔ یہ کلر کمبینیشن ڈھونڈنے کے لئے اُسے اور بھابھی کو پورا دن بازار میں پھرنا پڑا تھا۔ تب کہیں جا کر بلو اور پنک پھولوں والا یہ کپڑا ملا تھا۔ اور جس دن بھابھو نے پردے سی کر کمرے میں لٹکائے تھے یوں لگتا تھا جیسے کمرے میں ایک دم سے بہار اُتر آئی ہو۔

کمرہ کتنا روشن روشن ہو گیا تھا۔ اور پھر یہ خوبصورت بیڈ کور پنک رنگ کا اور بھابھی نے اس پر اپنے ہاتھ سے پنک کے پھول کاڑھے تھے چھوٹے چھوٹے پھول اور شیلف۔ یہ بے انتہا خوبصورت شیلف۔ سیاہ آبنوس کی لکڑی کا تھا اور اس پر چھوٹے چھوٹے سنہرے پھول تھے۔ یہ شیلف بھاجی' اُس کے کمرے کے لئے خود لائے تھے۔

''منو کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ اُس کے کمرے میں شیلف تو ضرور ہونا چاہئے۔'' پہلے وہ ماں جی کے کمرے میں سوتی تھی۔ پھر جب بھاجی کا ہاتھ تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ تو انہوں نے اوپر دو بیڈ روم بنوا دیئے تھے۔ ایک اُس کا ایک دیپو کا' دونوں کو پڑھنا ہوتا ہے۔ اُن کے لئے الگ کمرے ضروری ہیں۔ کمروں کے ساتھ گول صورت میں گیلریاں تھیں اور وہاں ماں جی نے پھولوں والے گملے رکھوائے تھے۔ سب نے کتنے شوق سے مل کر اُس کا کمرہ سجایا تھا۔ وہ شیلف کے پاس رُک گئی تھی۔ اُس نے شیلف کے اوپر والے تختے پر سجی ہوئی گڑیا کو' کرشن جی کی لکڑی کی مورتی کو دیکھا۔ اور اُس خوبصورت سی گولڈن گھڑی کو جس کے اوپر والے حصے میں ایک لڑکی سی پری مسلسل دائرے میں گھوم رہی تھی۔ پھر اُس نے نیچے سے ایک کتاب کھینچ لی۔ یہ ہارڈی کا کوئی ناول تھا۔ یہ ساری کتابیں دیپو اُس کے لئے خریدتا تھا۔ دیپو۔ اور اَب وہ دیپو کو کبھی نہیں دیکھ سکے گی۔ اُس سے ملے بغیر چلی جائے گی۔ اُس نے اپنے رخسار کتاب پر ٹیک دیئے اور آنسو اُس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ بہت دیر تک وہ یونہی آنسو بہاتی رہی پھر کتاب کو یونہی ہاتھوں میں پکڑے وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی اپنے بیڈ کے پاس آئی اور کتاب بیڈ پر رکھ کر وہ وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اُس نے اپنے بازو بیڈ کے کناروں پر رکھ لئے۔ اور اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔ مبادا چیخیں نہ نکل جائیں۔

''ماں جی!'' اُس نے ہولے سے سسکی لی۔ ماں جی اُس سے کتنا پیار کرتی تھیں۔ وہ اگرچہ مزاج کی تیز تھیں چھوٹی سی بات پر اُن کو غصہ آ جاتا تھا۔ لیکن انہوں نے اُسے کبھی نہیں ڈانٹا تھا۔ اُسے یاد تھا۔ بچپن میں وہ اُس کے سر پر تیل لگاتی تھیں۔ اور کنگھی کرتی تھیں۔ تو اُسے نیند سی آ جاتی تھی۔ اَب بھی کبھی کبھی وہ تیل لے کر اُن کے پاس چلی جاتی۔

''ماں جی! لگا دیں اچھی طرح سے مالش کریں۔''

اور جب ماں جی کی اُنگلیاں اُس کے بالوں سے اُلجھتیں تو اُسے نیند سی آنے لگتی تھی اور۔ اور۔ ماں جی کو اُس کی کتنی فکر رہتی تھی۔ کسی دن وہ ناشتا کر کے اسکول نہ جاتی تو وہ اُس کے پیچھے ہی اسکول پہنچ جاتی تھیں۔ اور مس کی منتیں کرتیں۔

''مس جی! اسے تھوڑی سی دیر کو چھٹی دے دیں۔ ناشتا کرا دوں ناشتا کر کے نہیں آئی نا تو پھر بیمار ہو جائے گی۔ سر چکرانے لگے گا'' اور مس ہنس کر کہتی تھیں۔

''جاؤ رتن! تمہاری ماتا جی آئی ہیں۔'' اور وہ ماں جی کو باہر چپڑاسی والے بینچ پر بیٹھے دیکھ کر بہت جھلاتی تھی۔

''ماں جی! مجھے بھوک نہیں ہے' آپ جائیں۔'' ''واہ کیسے بھوک نہیں ہے۔ بیمار پڑنا ہے۔___ مجھے تو تیری بھابھو نے اَب بتایا ورنہ میں تجھے آنے دیتی ایسے۔'' وہ پوری کا ٹکڑا توڑ کر___ جلدی سے اُس کے ہاتھ میں پکڑا تیں۔

''ماں جی۔'' اُس نے ہولے سے سسکی لی۔

ایک ایک کر کے تمام چہرے اُس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ باپو کو اُس نے ہوش مین دیکھا نہیں تھا۔ اُسے کچھ یاد نہیں تھا۔ البتہ بھاجی تھے۔

باپو کی جگہ' بہت نرم خُو' بہت مہربان اور شفیق' بہت آہستگی اور نرمی سے باتیں کرتے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال کرتے۔ وہ دیپو کو اور اُسے بہت زیادہ پڑھانا چاہتے تھے۔ خود باپو کی بیماری کی وجہ سے وہ پڑھ نہیں سکے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے سارے خواب اُن کی طرف منتقل کر دیئے تھے وہ ایک باپ کی طرح شفیق تھے۔

دبلے پتلے سے' اُن کے چہرے پر ہمہ وقت ایک شفیق سی مسکراہٹ رہتی تھی۔ کبھی جو وہ بیمار ہو جاتی تھی تو کتنے پریشان ہو جاتے تھے۔ وہ دفتر سے چھٹی لے کر آ جاتے۔ اُس کے سرہانے بیٹھے رہتے۔ ابھی ایک ڈاکٹر کی دوا لے کر آتے' تو اُس کا اثر دیکھے بغیر کسی دوسرے ڈاکٹر کو پکڑ لاتے۔

''ڈاکٹر صاحب! یہ میری بیٹی ہے تینو۔ تین دن سے اس کا بخار نہیں اُتر رہا۔ پلیز اسے کوئی اچھی دوا دیں۔'' ماتا جی کتنا چڑتی تھیں۔ اُن کی اس عادت سے۔

''لو ابھی پچھلی دوا حلق سے نیچے نہیں اُتری تو اور لے آیا ہے' بگڑ جائے گا اس کا بخار۔''

مگر اُنہیں تو کسی پل چین نہیں آتا تھا۔ اُس نے پھر ایک سسکی لی۔

''بھاجی۔ بھاجی میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں بے حد۔'' اُس نے ہولے سے اپنا سر پلنگ کی پٹی سے ٹکرایا۔ ''اور بھابھو سے بھی۔'' بھابھو کتنی اچھی ہیں۔ اُس کی سہیلی' اُس کی بہن' اُس کی ماں سب کچھ۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی تھیں۔

جب وہ چھوٹی سی تھیں تو اُس کے لئے پیارے پیارے ڈیزائنوں کے فراک سیتی تھیں۔ گڑیا بناتی تھیں اور پھر گڑیا کا جہیز بناتیں۔ گڑیا کے کپڑوں پر خود اپنے ہاتھوں سے سلمے ستارے ٹانکتیں۔ اور جب کبھی وہ گڑیا کی شادی کرتی تو گڑ والے چاول پکا کر دیتیں۔ ہر معاملے میں اُس کا ساتھ دیتی تھیں۔ اَب وہ بڑی ہو گئی تھی۔ تو اَب بھی اُس کے لئے خود جا کر___ کپڑے خریدتی تھیں۔ میچنگ جیولری' جوتے اور___ اپنے ہاتھوں سے اُسے ساڑھیوں پر کڑھائی کر کے دیتی تھیں۔ بھلا کب کسی کی ایسی بھابھو ہوں گی۔ اُس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔

اور۔ اور وکرم تھا۔ اُس کا لاڈلا۔ اُس کا پیارا۔ وہ کالج سے آ کر سارا وقت اُس کے ساتھ گذارتا تھی وہ کیسے اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر اُس کے رخساروں پر پیار کرتا تھا۔ وہ جب کبھی جھوٹ موٹ ہی سے خفا ہو جاتی تو ننھے منے ہاتھ جوڑ کر اپنے رخسار اس کے رخساروں پر رکھ دیتا تھا۔ اَب وہ چلی جائے گی تو وہ کس کے ساتھ کھیلے گا۔ کس سے لاڈ کرے گا۔ وہ بھابھو سے چوری چوری اُسے آئسکریم کھلانے لے جاتی۔ کھٹے لے کر دیتی۔ وہ دونوں اکثر شام کو ٹہلتے ہوئے بہت آگے تک نکل جاتے تھے اور وہ کبھی کبھی اُسے انکل رابرٹ کی طرف لے جاتی تھی۔ انکل رابرٹ کے جیکی سے کھیل کر وہ کتنا خوش ہوتا تھا۔ وکی۔ وکی بھلا میں اسے بھول سکوں گی' اسے چھوڑ سکوں گی۔ اُس کے آنسو اور زیادہ روانی سے بہنے لگے۔

اور پھر دیپو تھا۔ اُس کا عکس۔ اُس کا ہمراز اُس کا جڑواں بھائی کس قدر چاہتا تھا وہ اُسے کتنا پیار

تھا وہ اُسے' بچپن سے ہی وہ اس کی تقلید کر رہا تھا۔ وہ جو کچھ کہتی وہ اُس پر عمل کرتا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آتے تو وہ بھی رونے لگتا تھا۔ وہ بیمار ہوتی تو وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر پراتھنا کرتا کہ وہ بھی بیمار پڑ جائے۔

اور اَب اُسے ان' ان سب کو چھوڑنا پڑے گا۔ وہ ان سب سے دور چلی جائے گی۔ ان ساری محبتوں سے دور اور پھر___ زندگی میں کبھی بھی وہ یہ چہرے نہ دیکھ سکے گی۔

وہ ہولے ہولے پلنگ کی پٹی پر سر مارنے لگی۔ اور رونے لگی۔

آخر یہ سب لوگ۔ اُس سے محبت کرنے والے سب لوگ' ساری زندگی اُس کی ضدیں ماننے والے۔ اب اُس کی بات کیوں نہیں تسلیم کر رہے تھے۔ کیوں اُس کے اندر جھانک کر نہیں دیکھتے تھے۔ کاش اے کاش وہ لمحہ اُس کی زندگی میں نہ آتا جب اچانک اُس کے دل میں خیال آیا تھا کہ خدا ان پتھر اور لکڑی کی مورتوں میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ کوئی اور ہی ہستی ہے۔ ان سب سے ماورا۔ کوئی اور ہستی کوئی بلند ہستی' پھر اُسے اپنا مذہب جھوٹ لگنے لگا تھا۔ اور گوپی کے دادا اُس کے من میں بھڑکتی آگ کو بجھا نہ سکے تھے۔ ہاں انکل رابرٹ کی باتیں اس آگ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے بن کر پڑتی تھیں۔ من میں جلتی آگ ٹھنڈی سی پڑ جاتی تھی۔

اور پھر جان تھا۔ جس کے پاس بے حد حساب علم تھا۔ وہ اُسے انجیل مقدس کی آیات سُناتا۔ اور ان کا ترجمہ۔ اور اُس کے اندر روشنی سی اُترتی جاتی تھی۔ اُسے لگتا تھا جیسے برسوں سے قفل لگے دروازے ہولے ہولے کھل رہے ہیں۔ پھر جان نے اُسے اپنی تلاش کے سفر کی کہانی سنائی تھی۔

یہ سفر کتنا تکلیف دہ اور کتنا طویل تھا۔ بتاتے بتاتے جان کی آواز بھرا جاتی تھی۔ اُس نے تقریباً دنیا کے ہر مذہب کو کھنگالا تھا اور تب جا کر اُس پر آگہی کا در کھلا تھا کہ سچا اور اصلی مذہب یہی ہے۔ حق اور سچ کی راہ یہی ہے۔ اور وہ تو خوش قسمت تھی کہ اُسے طویل سفر نہیں کرنا پڑا تھا۔ حق کی راہ فوراً ہی اُسے مل گئی تھی۔ وہ انکل رابرٹ اور جان کی بہت ممنون تھی۔ جنہوں نے اُسے حق کا اصل راستہ دکھایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کسی روز انکل رابرٹ کے ساتھ فادر شیلے کے پاس جا کر عیسائیت قبول کر لے۔ ابھی اُس کے اندر بہت سے سوال بند تھے۔ ابھی اُسے اُن کے جواب بھی چاہئے تھے اور انکل رابرٹ نے کہا تھا۔ فادر شیلے اُس کے ہر درد کا مداوا کر دیں گے۔ اُن کے پاس ہر سوال کا جواب ہے۔ وہ بالکل مطمئن' بالکل شانت ہو جائے گی۔

مگر جب اُس نے بھابھو کو چپکے سے بتایا تھا کہ اُس نے حق کا راستہ تلاش کر لیا ہے۔ وہ عیسائی ہونا چاہتی ہے تو بھابھو کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اور ماتا جی نے اُسے دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالا تھا۔ اور جب وہ تھک گئی تھیں۔ تو پھر اُنہوں نے کپڑے دھونے والی لکڑی اُٹھا لی تھی۔

''اُف'' اُس نے بے اختیار اپنا ہاتھ پیچھے پیٹھ پر رکھا۔ اُس کے بازوؤں پر اُس کی پیٹھ پر نیل پڑ گئے تھے کہیں کہیں سے کھال بھی پھٹ گئی تھی۔ اور جب وہ نڈھال ہو کر گرنے لگی تھی تو بھابھو نے ماں جی سے لکڑی چھین لی تھی۔ اور جب بھاجی کو پتا چلا تھا تو اُنہیں جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔

''رتو! یہ کیا سُن رہا ہوں میں''۔

''بھاجی'' اُس نے بڑی خود اعتمادی سے کہا تھا۔

''میں ایک پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہوں۔ میں صرف اس لئے کسی غلط بات کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ میرے بڑے وہ کام کرتے رہے ہیں۔ میری عقل مجھ سے جو کہتی ہے' میں وہی کرنا چاہتی ہوں۔ میرے ذہن میں بے شمار سوال اُٹھے تھے۔ بھاجی لیکن آپ میں سے کوئی بھی حتیٰ کہ گوپی کے دادا جی بھی مجھے مطمئن نہ کر سکے' تب میں نے انجیل مقدس پڑھی۔''

''کسی نے پڑھائی' کہاں سے لی تم نے۔'' غصّے کی شدت سے بھاجی کی آواز حلق میں ہی پھنس رہی تھی۔

'' بک سیلرز کے پاس اس کا ترجمہ ہے' میں نے اسے پڑھا اور جانا کہ حق اور راستی یہی ہے۔' اُ
میں نجات ہے۔ بھاجی آپ بھی اسے پڑھیں۔'' اُس نے شیلف پر پڑی ہوئی انجیل مقدس کا انگریزی ترجم
جو جان نے اُسے دیا تھا۔ اُٹھا کر بھاجی کو دیا۔

''آپ بھی بھاجی جان لیں گے کہ ہمارا مذہب جھوٹ ہے۔''

''تتنو۔'' بھاجی کا ہاتھ بے اختیار اُٹھا تھا۔ اور اُن رخساروں پر جنہیں بچپن میں انہوں نے بار ہا چو
تھا۔ اُنگلیوں کے نشان چھوڑ گیا۔

''خبردار تُو نے اَب ایک لفظ بھی کہا۔ اور تو عیسائی ہو جائے گی۔ اپنا مذہب چھوڑ دے گی۔ نہیں ر
اگر تو ایسا کرے گی تو پہلے میں تجھے ماروں گا۔ اور پھر خود کو مار ڈالوں گا۔'' وہ تیزی سے اُس کے کمرے سے نکل
گئے تھے اور وہ ساکت بیٹھی رہ گئی تھی۔

اُف یہ کیسی مشکل راہ ہے کس قدر ''اوکھی'' شاید وہ کبھی حق اور راستی کی راہ اختیار نہیں کر پائے گی۔
شاید وہ ہمیشہ یونہی تڑپتی رہے گی۔ یونہی تشنہ اور پیاسی رہے گی۔ نور کی کرنیں کبھی اُس کے اندر نہیں
اُتر سکیں گی۔ وہ جانتے بوجھتے یہ زہر پیتی رہے گی۔ اگر ایسا ہی ہونا تھا تو بھگوان تُو نے میرے دل میں حق
تلاش کی یہ شمع کیوں جلائی تھی۔ کیوں آگ لگائی تھی میرے اندر۔ کیوں؟

آنسو خود بخود ہی اُس کے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔ تب اُس دوپہر جب سب سو رہے تھے
چپکے سے پچھلے دروازے سے نکل کر انکل رابرٹ کے پاس چلی آئی تھی۔ اور اُن کے گھٹنوں پر سر رکھ کر بے اختیا
رو دی تھی۔

''انکل' انکل میں کیا کروں' میں حق کا ہاتھ تھامنا چاہتی ہوں۔ لیکن میرے گھر والے' وہ نہیں مان
وہ کسی بھی صورت میں نہیں مانیں گے انکل وہ مجھے مار ڈالیں گے۔''

اور انکل رابرٹ نے اُسے جو راستہ دکھایا تھا ' وہ بہت مشکل تھا۔ بہت کانٹوں بھرا تھا۔

''نہیں۔'' اُس نے انکار کر دیا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ کسی کو نہیں چھوڑ سکتی ' وہ ان سب کے
زندہ نہیں رہ سکتی۔

''حق کی تلاش آسان تو نہیں ہے۔ بے بی۔ اور حضرت عیسیٰؑ جو ہم سب کے گناہوں کی پاداش م
صلیب پر چڑھ گئے تھے۔ انہوں نے بھی اُس راہ میں بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ حق کے راستوں پر چلنے والوں
لئے تمام مادی رشتے تمام محبتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ بے بی۔ میں تمہارے دل میں ان مادی رشتوں کو ختم ہوتے د
رہا ہوں۔ تُو تو سینٹ ہے ' ولی۔ تیرا مرتبہ بہت بڑا ہے بے بی۔ راہِ حق کے مسافروں کا بڑا بلند مقام ہوتا ہے۔
دنیاوی رشتوں سے کٹ کر تو اُسے پالے گی جس کی تجھے تلاش ہے۔' خداوند کو جو اوپر آسمانوں میں رہتا ہے۔
اور جو سب سے ماورا ہے' سب سے الگ ہے۔''

اُس روز وہ روتی رہی تھی۔ اُس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر پھر ہولے ہولے انکل رابرٹ نے اور ج
نے اُس کے دل میں یہ خیال پختہ کر دیا تھا۔ کہ اگر اُسے خدا کی تلاش ہے تو پھر اُسے ان سب سے ان
اپنوں سے رشتہ توڑنا ہوگا۔

''بھاجی مجھے مار ڈالیں گے میں جہاں بھی چھپی اور پھر خود کو بھی۔ وہ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں
''تم جان' ریٹا اور آن کے ساتھ پاکستان چلی جاؤ۔''

''پاکستان؟'' وہ حیران سی انکل رابرٹ کو دیکھتی رہ گئی۔

''ہاں پاکستان' جان وہاں تمہارے رہنے کا بندوبست کر دے گا۔ جان کا باپ پادری ہے۔ گرجے میں۔''

''مگر جب میرا ویزا ختم ہو جائے گا تو مجھے واپس آنا پڑے گا۔''

''اور اس کا بہترین حل یہ ہے کہ تم جان سے شادی کر لو۔''

''نہیں۔'' اُس نے جان کو اس طرح کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ ہی اُس کے متعلق اس طرح سوچا تھا۔

''کوئی بات نہیں میری بچی تم پاکستان جا کر۔ علیحدگی لے لینا۔''

جان اس بات کے لئے بمشکل رضامند ہوا تھا۔ وہ پاؤں میں زنجیریں ڈالنے کا قائل نہیں تھا۔ اُس
نے اتنی محنت صرف وقتی انجوائے منٹ کے لئے کی تھی۔ اُس نے تو سوچا تھا کہ دو چار دن میں وہ اُس کی قربت
میں پگھل جائے گی۔ اور پھر بقیہ دن خوب رنگین ہوں گے۔ مگر اُس کے دل کو تو کچھ اور ہی لگی ہوئی تھی۔ نہ تو اس
نے جان کی آنکھوں کو پڑھا تھا نہ اُس کے معنی خیز جملوں کا مطلب جان سکی تھی۔ وہ تو بس ہتھیلیوں پر ٹھوڑی
ٹکائے۔ اُس کا وعظ سنتی رہتی۔ اور اُس کی آنکھیں نم ہوتی رہتی تھیں اور کبھی چھلک اُٹھیں۔

''نو انکل' مجھے اس مذہبی لڑکی کے ساتھ شادی منظور نہیں۔''

''وہ بہت پیاری ہے' بہت اچھی لڑکی ہے۔ جان بالکل میری لیزا کی طرح معصوم اور سادا تم بہت
خوش رہو گے۔'' پہلے پہلے انکل رابرٹ نے سمجھایا۔ پھر مذہب کا حوالہ دیا۔

''عمر بھر کے گناہ بخشے جائیں گے جان ڈارلنگ کہ تم نے ایک کافر لڑکی کو حق کا راستہ دکھایا۔''

اور گناہ تو اُس نے بہت کئے تھے۔ سو وہ مان گیا۔ لیکن ساتھ ہے اُس نے یہ بھی کہہ دیا کہ جب اُس
کا دل بھر جائے گا تو وہ اُس سے علیحدگی حاصل کرے گا۔

اور پھر کئی دن کی کشمکش کے بعد رتن کماری نے فیصلہ کر لیا وہ حق کی خاطر سب کو چھوڑ دے گی۔ اور خدا
کے پیارے بندوں نے ہمیشہ ہی حق کی خاطر اپنا ملک اور اپنے لوگ چھوڑے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰؑ نے بھی اپنے
حواریوں کیساتھ۔'' انکل رابرٹ بولتے چلے جاتے اور وہ دم بخود سی سنتی رہتی۔ پھر ایک دن وہ ہار سی گئی۔

''ٹھیک ہے انکل! مجھے یہ راہ منظور ہے''۔

اور پھر انکل رابرٹ خود اُن کے ساتھ گئے تھے۔ اُس نے فادر شیلے کے سامنے' اپنا مذہب چھوڑنے کا
اور اُن کا مذہب اپنانے کا عہد کیا تھا۔ اور وہاں ہی گرجے میں انکل رابرٹ نے اُس کا نام لیزا رکھا تھا۔ اور پھر
جان اور رتن کو لے کر انکل رابرٹ نے کورٹ سے شادی کا اجازت نامہ لیا تھا۔ اور یوں گھر میں کسی کو خبر بھی نہ
ہوئی تھی۔ اور وہ رتن کماری سے لیزا جان بن گئی تھی۔ اُس کے اندر کہیں کوئی جذبہ نہیں تھا۔ کوئی امنگ نہیں تھی۔
جان بے چین ہو رہا تھا۔

''لیزا اَب تم میری بیوی ہو' میرا حق ہے تم پر' کچھ وقت مجھے دو۔'' لیکن وہ پریشان تھی۔ انکل رابرٹ
نے اُس سمجھایا۔ ''اُس وقت اسے تنگ مت کرو ورنہ۔''

اور جان بُرا سا منہ بنا کر رہ گیا تھا۔ زندگی میں کبھی کسی لڑکی کے لئے اُسے اتنی محنت نہیں کرنا پڑی
تھی۔ کیسے راتوں کو جاگ جاگ کر اُس نے انجیل کا ترجمہ پڑھا تھا۔ بلکہ رٹا تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ اُس مدراسی سیلز
گرل کے ساتھ وقت اچھا گذر جاتا تھا۔ ورنہ بمبئی کا یہ قیام بور ہی ہوتا۔ انکل رابرٹ نے خود ہی اُس کا
پاسپورٹ بنوایا تھا۔ اور ساری بھاگ دوڑ وہ خود ہی کر رہے تھے۔ وہ تو بس زیادہ تر گھر میں رہتی اور فادر شیلے کے
دیے ہوئے لٹریچر کا مطالعہ کرتی رہتی۔ کتنے ہی کتابچے اور پمفلٹ اُنہوں نے اُسے دیے تھے۔ وہ سب کچھ جان

لینا چاہتی تھی۔ خدا کی حقیقت' حق کی اصل کائنات' کائنات میں موجود ہر چیز کے متعلق۔

گھر میں ایک سکوت طاری تھا۔ سب نے ایک بار پھر اُس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ کوئی اُسے نا
لئے نہیں بلاتا تھا۔ کھانے پر اُس کا انتظار نہیں کرتا تھا۔ کوئی اُس کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ وکرم کھا
میں لگا کر اُس کے کمرے کے دروازے پر رکھ دیتا تھا۔ اُسے بھوک لگتی تو کھا لیتی نہیں تو وہاں ہی پڑا رہتا تھا۔

یہ سب کیا ہو گیا تھا؟ کبھی کبھی گھبرا کر وہ شام کو انکل رابرٹ کی طرف چلی جاتی تھی' کوئی اُس
نہیں پوچھتا تھا۔ کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ نہ ماتا جی' نہ بھابھو' نہ بھاجی۔ شاید وہ اُسے' اُس کے صبر کو آزمار
کہ وہ اُن کی بے نیازیوں' بے اعتنائیوں سے اُن کے ان پتھر رویوں سے گھبرا کر اپنا ارادہ ترک کر دے گ
ہاں شاید ایسا ہی ہوتا اگر انکل رابرٹ اُسے ہر روز حوصلہ نہ دیتے' اُس کی ہمت نہ بڑھاتے تو
چاپ اپنے سوالوں کو اپنے اندر ہی دفن کر لیتی مگر اَب۔ اَب تو سب کچھ ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ اُس کا بیاہ بھی۔
جی اور بھابھو کو کتنا شوق تھا اُس کے بیاہ کا۔ ماتا جی نے کتنی ہی چیزیں اُس کے لئے جمع کر رکھی تھیں۔ اور ز
بہت سا زیور تھا۔ پھر بھی چپکے چپکے کمیٹیاں ڈال ڈال کر کچھ نہ کچھ اُس کے لئے بنواتی رہتی تھی۔ کانوں کے
بالے۔ مگر جھمکے (یہ بڑے بڑے' ان کے اپنے جہیز کے جو انہوں نے ریتو کے لیے سنبھال کر رکھ لئے
سنگھار پٹی' گلوبند' کنگن' کڑے' چوڑیاں' پائلیں' تعویذ' جانے کیا کیا۔ اور کتنے مشکل لمحے آئے تھے۔ مگ
نے اُس کے لئے رکھا ہوا زیور فروخت نہیں کیا تھا۔

"نہ بھئی کیا پتا کب حالات کیا ہوں میں اپنی تینو کا زیور تو کبھی بھی نہ بیچوں گی۔" اور بھابھو بھی فار
میں اُس کے لئے کچھ نہ کچھ بناتی رہتی تھیں۔ کڑھائی والی چادریں جن کے کناروں پر کروشیے کی بیلیں تھیں۔ م
تکیئے' شالیں۔ دوپٹے اور جانے کیا کیا۔ جب بھی فارغ ہوتی تھیں۔ سوئی دھاگہ یا کروشیا لے کر بیٹھ جاتی تھیں

"توبہ بھابھو! یہ کیا ہر وقت آپ کا ہاتھ چلتا رہتا ہے" وہ کبھی کبھی اُنہیں ٹوکتی تھی۔

"مجھے پتا ہے نا تو نے کچھ نہیں کرنا۔ بس ہر وقت پڑھتی ہی رہے گی۔" وہ مسکرا کر کہتیں۔

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ اعتراف کرتی۔ اُسے تو کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ ایک ٹانکا تک نہیں لگا سکتی
اور بھابھو نے پورا بکس بھر کے رکھا ہوا تھا۔ ایک سے ایک خوبصورت بیڈ کور۔ میز پوش۔ ٹکوزیاں کشن۔ او
کیا کیا بنا کر۔ بھابھو کتنا چھیڑتی تھیں۔ اُسے کتنا تنگ کرتی تھیں۔ لیکن اَب' اَب کیا ہوا تھا۔ نہ شگن ہو
وہ دلہن بنی تھی نہ پھیرے لئے تھے اُس نے اور ایک بالکل اجنبی شخص کے ساتھ عمر بھر کا بندھن باندھ لیا تھا
اور صبح اُسے چلے جانا تھا۔ کل شام ہی تو انکل رابرٹ نے اُسے بتایا تھا کہ ٹکٹ آ گئے ہیں۔

اور صبح پہلی فلائیٹ سے انہوں نے چلے جانا ہے۔

"تم لو پھوٹتے ہی آ جانا' یہاں سے ہم سویرے ہی نکل کھڑے ہوں گے"۔

اور صبح' صبح ہونے سے پہلے یہ گھر اُس سے چھوٹ جائے گا ہمیشہ کے لئے۔ اُس نے جل
آنکھوں سے ایک بار پھر کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ اور اُس کا دل چاہا کہ وہ کمرے کی ایک ایک
لپٹ کر روئے۔ چیخ چیخ کر روئے۔ وہ ہولے ہولے بیڈ کور کے پھولوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اور ہاتھ
پھیرتے وہ بیڈ سے لپٹ گئی۔ کبھی تکیے بازوؤں میں بھر لیتی۔ کبھی بیڈ کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرتی"۔

نہیں۔ وہ اس گھر سے جدا نہیں ہو سکتی۔ وہ مر جائے گی' سب سے بچھڑ کر۔ سب سے جدا
نہیں پائے گی۔ اُس کے من میں حق کی سچی لگن نہیں ہے۔ تمہیں کہیں کھوٹ ہے اُس کے من میں کوئی میل
اور انکل رابرٹ کہتے تھے' تو سینٹ ہے۔ ولی ہے' سب دیناوی رشتوں سے کٹ کر تو اُ

گی۔ مگر وہ تو پہلے ہی مقام پر ہمت ہار بیٹھی ہے۔ وہ نہیں چل سکے گی ان پُر خار راہوں پر اور جان کہتا ہے۔

"اس راہ میں بہت آبلے ہیں' بہت کنکر ہیں۔"

"نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ اُس نے پلنگ کی پٹی" سے سر ہٹاتے ہوئے کہا۔ اور ہاتھوں کی پشت
سے اپنے آنسو صاف کیے۔ اور اُٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا باہر ابھی تک تاریکی تھی۔

کاش اس رات کی کبھی صبح نہ ہو' کبھی اُس نے بے اختیار دُعا کی۔ سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ اور
واپس آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

میں انکل رابرٹ سے کہہ دوں گی کہ وہ جان سے کہہ کر مجھے طلاق دلوا دیں۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا
۔ میں کن راہوں سے پلٹ کر آئی ہوں۔ پھر میں بھاجی کے قدموں میں گر کر اُن سے معافی مانگ لوں گی۔
ماتا جی کو منا لوں گی۔ مجھے پتا ہے وہ سب مجھے معاف کر دیں گے۔ بھاجی گلے سے لگا لیں گے۔
ماتا جی ماتھا چومیں گی۔ بھابھی خوش ہو کر بازوؤں میں بھینچ لیں گی۔ اور پھر سب کچھ پہلے جیسا ہی
ہو جائے گا۔

"خداوند مجھے معاف کر دینا۔ میں بہت کمزور ہوں' تیرے راستے پر ثابت قدم نہیں رہ سکی۔"

وہ آنسو اُس کی پلکوں پر جانے کب اُلجھ گئے تھے۔ اُنگلی کی پوروں سے اُس نے اُنہیں پونچھا اور تکیئے
پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

اور پھر شاید وہ خواب ہی تھا۔ اُس نے دیکھا وہ لق و دق صحرا میں اکیلی کھڑی ہے۔ تیز ہوائیں چل
رہی ہیں۔ اور فضا میں عجیب سا شور ہے۔ بار بار اُس کی آنکھوں میں ریت بھر جاتی ہے۔ شاید اُس کی آنکھیں
زخمی ہو گئی ہیں۔ مگر وہ اکیلی کیوں ہے۔ بھاجی۔ ماتا جی۔ دیپو اور بھابھو کہاں ہیں۔

دیپو۔ دیپو۔

وہ دیوانہ وار ادھر سے اُدھر بھاگ رہی ہے۔ دیپو کو' بھابھو کو' بھاجی کو سب کو آوازیں دے رہی ہے۔ مگر کوئی
اُس کی آواز نہیں سن رہا۔ کبھی کبھی دیپو کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ریتو' ریتو وہ اُسے پکار رہا ہے۔ وہ آنکھیں مل مل کر دیکھتی
ہے تو دھند کی چادر میں کبھی بھابھو کا' کبھی بھاجی کا اور کبھی دیپو کا چہرا دکھائی دیتا ہے۔ اور جب وہ اُن کی طرف بھاگتی ہے
تو درمیان میں اَن دیکھی دیواریں حائل ہو جاتی ہیں۔ وہ پریشان ہو کر رونے لگتی ہے۔ اور تھک کر بیٹھ جاتی ہے۔ پھر یکا
یک ہی تیز بارش شروع ہو جاتی ہے۔ اور پھر ایک نرم آواز اُس کے کانوں میں آتی ہے۔

"اُٹھو بیٹی۔ اُٹھو بیٹی۔" پھر کوئی اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھا دیتا ہے۔

وہ ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر دیکھتی ہے۔ بارش بند ہو چکی ہے۔ اور کسی اَن دیکھی ہستی نے اُس
کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔

"چلو منزل زیادہ دور نہیں ہے"

"مگر ماتا جی۔ بھاجی۔"

"وہ سب بھی مل جائیں گے۔ راستے میں آ ملیں گے۔"

"مگر۔"

وہ جھجک رہی ہے۔ ڈر رہی ہے' پھر نہ جانے کہاں سے انکل رابرٹ آ جاتے ہیں۔

"ریتو' خداوند یسوع مسیح' خود تمہاری رہنمائی کے لئے آئے ہیں۔"

"نہیں۔" وہ کانپنے لگتی ہے' لرزنے لگتی ہے۔

ہاں شاید یہ خواب ہی تھا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ ابھی تک وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اُس کا پورا جسم پسی
ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بار بار انگلیوں سے سینے پر صلیب کا نشان بنانے لگی۔ مگر اُس کی کپکپی دور نہ ہوئی یوں ہی کانپتی ہو
اُٹھی۔ لڑکھڑاتے قدموں سے کھڑکی تک آئی۔ باہر اندھیرا چھٹ رہا تھا۔ اور ہلکی سی روشنی پھیل گئی تھی۔ وہ یونہی ڈ
قدموں سے واپس مُڑی بیگ اُٹھایا جسے اُس نے دو روز پہلے سے ہی تیار کر لیا تھا۔ اور لرزتے ہاتھوں سے درواز
کر باہر نکل آئی' کوئی غیر مرئی قوت اُسے کشاں کشاں انکل رابرٹ کے گھر کی طرف لے جا رہی تھی۔

☆☆☆☆

انکل رابرٹ بے حد خوش خوش گھر میں داخل ہوئے۔

''آہا۔ ہا۔'' انہوں نے جان کی طرح قہقہہ لگایا۔

''آج میں بہت خوش ہوں۔ جیکی۔ جیکی۔ مائی ڈیر میرے بُچّے' میرے بیٹے۔''

انہوں نے جیکی کی تصویروں کا البم اُٹھایا اور اُس کی تصویروں کو چُومنے لگے۔ اُن پر ا
رگڑنے لگے۔

''آج میری لیزا واپس آ گئی ہے۔ اتنے سالوں بعد۔ ایسی ہی ایک صبح کو وہ گھر چھوڑ کر چلی گ
اور اُس نے اُس میک اَپ مین ہندو چھوکرے سے شادی بنالی تھی۔'' اور تب سے لے کر اَب تک وہ تڑپ
تھے۔ آج اُن کی تڑپ میں سکون آ گیا تھا۔ آج اُن کے زخموں پر پھاہے رکھے گئے تھے' ورنہ اتنے سالو
ان زخموں سے خون رس رہا تھا۔ بلکہ اُبل رہا تھا۔ اور اُن کے اندر ایک تالاب بن گیا تھا۔ جو اُس خون سے
رہا تھا آج وہ لیزا کے بدلے میں لیزا کو واپس لے آئے تھے۔

ایک لیزا برسوں پہلے رتن کماری بن گئی تھی۔ آج ایک رتن کماری کو اُنہوں نے لیزا بنا دیا تھا۔

''آہاہاہا۔'' اُنہوں نے پھر قہقہہ لگایا اور البم کو اُچھال دیا۔ جو کمرے کے وسط میں گرا پڑا۔

جب سے ریتو نے اُن کے مذہب میں اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ جب سے اپنا مدعا اُن سے بیان
تب سے اُن کے وجود میں یہ خواہش پرورش پا رہی تھی کہ وہ اپنے دین کو اس کی لیزا واپس لوٹا دیں۔ آج و
رو ہو گئے تھے۔

''نہیں۔'' وہ چلتے چلتے رُک گئے۔ البم کمرے کے عین وسط میں کُھلی پڑی تھی۔ اور تصویر میں ج
ساتھ تینو اور دیپو کھڑے تھے۔ وہ ایک ٹک اُس کی تصویر کو دیکھنے لگے۔ وہ کس قدر معصوم تھی۔ اُس کے ہونٹ
رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ چہرے پر روشنی تھی۔ وہ ایک ہاتھ جیکی کی پیٹھ پر رکھے' دیپو کی طرف
رہی تھی۔ اور اَب پچھلے کئی دنوں سے اُس کی آنکھیں کیسی بجھ گئی تھیں۔ چہرا کتنا پھیکا پڑ گیا تھا۔ آج صبح بھی
آئی تھی تو کثرتِ گریہ سے اُس کی آنکھیں کُھل نہیں رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ خواب کے سے عالم ہو۔

''یہ میں نے کیا کیا۔ یہ میں نے کیا کیا۔'' اُنہوں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ اور و
کے پاس کمرے کے وسط میں بیٹھ گئے۔

''یہ میں نے لیزا سے ایک بار پھر اُس کا گھر چھین لیا۔ ایک بار پھر اُسے وہ جان تو درندہ ہے
ہے۔ اور میری لیزا تو معصوم ہے۔ اور وہ میک اَپ مین چھوکرا اُسے اپنے ساتھ دہلی لے گیا تھا۔ کلکتہ لے
پھر انہوں نے ایک دن اخبار میں ایک تصویر کے ساتھ ایک چھوٹی سی خبر دیکھی تھی۔ ایک نوجوان لڑکی کی ل
لاش ملی تھی۔ جانے کون اسے مار کر ریلوے لائن پر پھینک گیا تھا۔ اور وہ بلاشبہ اُن کی لیزا تھی۔ انہوں نے
لیا تھا۔ اُس کی دائیں انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی سے جو اُنہوں نے اُس کی سولہویں سالگرہ پر اُسے دی

اُس کی پیشانی کے زخم سے جو چاند جیسی شکل میں اُس کی بائیں آبرو پر تھا۔ ایک دفعہ وہ سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ اوہ خداوندا! یہ میں نے کیا کیا۔ میں اُسے روک لیتا ہوں۔ واپس لے آتا ہوں۔ یہ میں ہی تو تھا جو' جس نے اُس کے دل میں یہ ساری باتیں بٹھائی تھیں''۔ وہ اُٹھکر دروازے کی طرف بھاگے۔

''مگر نہیں۔'' وہ دروازے کا ہینڈل پکڑے پکڑے رُک گئے۔ جہاز تو اُن کے سامنے ہی پرواز کر گیا تھا۔ اور اَب تک' اب تک۔ وہ ہینڈل پکڑے پکڑے بیٹھ گئے۔ اور لیزا کو' تینوں کو اور جیکی کو پکارتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

☆☆☆☆

رات پارٹی کا ہنگامہ جانے کب ختم ہوا تھا۔ مدحت کو کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ تو بس تھوڑی دیر بعد ہی چپکے سے پیچھے پیچھے سے ہوتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اُس وقت عطاء اللہ اسٹیج پر آیا تھا۔ اور لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر اور کھڑے ہو کر اُسے خوش آمدید کہا تھا۔ اور وہ اسی ہنگامے میں اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ جانے کب تک گاتا رہا تھا۔ شاید آدھی سے زیادہ رات گذر گئی تھی۔ جب سب اپنے اپنے کمروں میں آئے تھے۔ اس وقت نو بج رہے تھے' سب ابھی تک سو رہے تھے۔ مدحت نے اُٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ اور سوئی تو وہ بھی نہیں تھی۔ ایک پل کے لئے بھی نہیں کیسی بے چینی تھی' کیسی آگ تھی جو اُس کے من میں لگی ہوئی تھی۔

یہ باصر کا خیال کیوں اُس کے دل میں آیا تھا۔ اور باصر نے اُسے کیوں سوچا تھا۔ میاں جی نے اُسے کیوں نہیں بتایا۔ اور سونیا نے بھی نہیں۔ اُس نے بھی تو صرف اتنا ہی کہا تھا کہ اُس قصرِ مراد کی بہو بننا ہے۔ اور اُس کے دل نے خود ہی سوچ لیا تھا کہ باصر۔ عمر کے لحاظ سے وہ باصر کے ساتھ ہی سوٹ کرتی تھی۔ مگر میاں جی نے اُس کے لئے تبریز کو چُنا تھا تو یقیناً کوئی خاص بات ہوگی۔ وہ میاں جی کی کسی بات کو رَد کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ میاں جی کے لئے تو وہ زندگی بھی قربان کر سکتی تھی۔ مگر کاش کاش سونیا نے اُسے بتا دیا ہوتا تو وہ۔

وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی گھٹنوں پر سر رکھے رونے لگی۔ روتی رہی۔ اور اُس کے لئے کتنا مشکل ہو رہا تھا خود کو سنبھالنا۔ ایک انجانا سا درد رہ رہ کر اُس کے دل کو چھیل رہا تھا۔ گہرا اور شدید درد' اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا۔ ایک ایک کر کے بہت سی باتیں اُس کے سامنے آ رہی تھیں۔ میاں جی کی آمد پر سونیا کا گھبرانا۔ میاں جی کا رونا۔ سارا وقت اُسے اپنے پاس بٹھائے رکھنا۔ اور اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بار بار اُن کی آنکھوں کا بھر آنا۔ اور پھر آپ ہی آپ اُسے تسلی دینا۔

''میری بچی گھبرانا نہیں' سب ٹھیک ہو جائے گا سب۔'' اور تبریز۔ تبریز کو تو اُس نے آج تک دھیان سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ پہلے دن ہی اُس کے دل میں عجیب سا خوف بیٹھ گیا تھا۔ اُسے نشہ کرنے والوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ بہت خوف آتا تھا۔ لیکن سونیا کہہ رہی تھی کہ اَب وہ صحتمند ہے اور آنٹی بھی یہی کہہ رہی تھیں۔ پھر۔ آج وہ محفل میں موجود تھا۔ سب کے ساتھ' اور بالکل نارمل لگ رہا تھا۔ سونیا ٹھیک ہی کہتی ہے۔ مگر میں۔ اُف میں اس دل کا کیا کروں۔ اُس نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ آج وہ رولے جی بھر کر اپنی اس نوخیز محبت کا ماتم کر لے۔ پھر اُس کے بعد نہیں۔ کبھی نہیں۔ وہ میاں جی کی بیٹی ہے۔ وہ اُن کا مان نہیں توڑے گی۔ وہ اُن کے فیصلوں کو مان کر اُنہیں سرخرو کر دے گی۔ ہاں وہ باصر کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھے گی بھی نہیں کہ کہیں نگاہیں بددیانتی نہ کر بیٹھیں۔

جانے پل بھر کے لئے وہ سوئی تھی یا نہیں۔ مگر صبح فجر کی اذان کے ساتھ ہی اُٹھ بیٹھی تھی۔ نماز پڑھ کر اُس نے باہر کا ایک چکر لگایا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ حتیٰ کہ ملازم بھی کل کے تھکے ہارے سو رہے تھے۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ چھٹی کے دن تو یوں بھی سب نو بجے ہی ناشتا کرتے تھے۔ اور آج تو سب تھکے ہوئے بھی تھے۔

پھر نہ جانے کب اُٹھیں گے۔ اُس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ کنپٹیوں میں جیسے کوئی میخیں ٹھونک رہا ہو۔ آنکھوں کے اندر سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی اور ایک کپ چائے بنانے کے خیال سے باہر آ گئی۔

''شاید چائے پینے سے سر کا بوجھل پن دور ہو جائے۔''

چائے کو کپ میں ڈال کر وہ واپسی کے لئے مُڑی تو دروازے پر اُس نے تبریز کو کھڑے دیکھا۔ وہ کرتے شلوار میں تھا۔ اُس کی آنکھیں بے حد سُرخ ہو رہی تھیں۔ شاید اُسے بھی رات بالکل نیند نہیں آئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور وہ ہاتھوں سے ہولے ہولے اپنی کنپٹیوں کو دبا رہا تھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر اُس نے ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی اس کی طرف ... تو اُ ... حیرت سے اُسے دیکھا۔

''یہ غالباً آپ نے اپنے لئے بنائی تھی۔''

اُس کی آواز میں ایک سوز تھا۔ ذرا ذرا سی بھرائی ہوئی آواز۔ اتنے سارے دن ہو گئے تھے۔ اُسے آتے جاتے گزرتے ہوئے اُس نے کئی بار تبریز کو دیکھا تھا' لیکن آج تک بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ کسی سے بات کرتا بھی نہیں تھا۔ جتنی دیر گھر پر رہتا اپنے کمرے میں بند رہتا۔ ناشتا اور کھانا بھی اُس نے کبھی کسی کے ساتھ نہیں کھایا تھا۔ سونیا نے اُسے بتایا تھا کہ سوائے ماما کے اُس نے کسی کو اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ حتیٰ کہ باصر کو بھی نہیں۔ حالانکہ امریکہ جانے سے پہلے اُس کی اور باصر کی بہت دوستی تھی۔

''جی!'' مدحت نے سر اُٹھا کر پہلی بار اُ... سے دیکھا۔ اُس میں باصر اور رمیض کی خاصی مشابہت تھی۔

''لیکن قہوہ ہے' میں اپنے لئے اور بنا لیتی ہوں۔'' ''تھینک یو'' تبریز نے پیالی اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ ''تم مدحت ہو۔'' ''جی۔'' مدحت نے آہستگی سے کہا تو ہولے سے سر ہلا کر وہ پیالی ہاتھ میں اُٹھائے واپس مُڑ گیا۔ لیکن پھر اچانک پلٹ آیا۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو' میاں جی کو چھوڑ کر؟''

''جی' وہ آنٹی نے کہا تھا پڑھنے کے لئے۔''

''تمہیں میاں جی کو اس عمر میں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہئے تھا۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ۔'' اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور پلٹ گیا۔

وہ بھی تو نہیں آنا چاہتی تھی مگر میاں جی کا حکم تھا۔ اصرار تھا کہ وہ چلی جائے۔ اور علم حاصل کر لے۔ وہ چلی آئی تھی۔ اور یہ تبریز تھا۔ لیکن اپنی گفتگو اور لہجے سے وہ بالکل نشہ کا عادی نہیں لگ رہا تھا۔ ٹی۔ وی ڈراموں میں اُس نے دیکھا تھا۔ نشہ باز لوگ کس طرح رُک رُک کر بولتے تھے۔ کیسے جملے اُن کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلتے تھے۔

سونیا نے صحیح کہا تھا' آنٹی بھی صحیح کہتی تھیں۔ لیکن یہ دل اس میں کوئی دھڑکن بیدار نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی تبریز کی آنکھوں میں اُسے کوئی جذبہ نظر آیا تھا۔ عام سی نظر تھی۔ سپاٹ سا لہجہ تھا۔ شاید تبریز کو معلوم نہیں۔ شاید وہ بھی اُس کی طرح بے خبر ہے۔ اُس نے سوچا اور چائے لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ چائے پی کر اُس نے یوں ہی سر تکیے پر رکھا تھا۔ اور آنکھیں موند لی تھیں۔ کہ شاید اس طرح سکون ملے گا۔ لیکن نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔ اور جانے وہ کتنی دیر سوئی تھی۔ مہرو اُسے اُٹھانے آئی تھی۔

''ناشتے پر سب انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی تھی۔ اُس کی نگاہیں سامنے کلاک کی

طرف اُٹھ گئیں۔

اُف گیارہ بج رہے تھے۔ اور اَب گیارہ بجے سب ناشتا کرنے لگے ہیں۔ اور وہاں شاہ پور میں ماسی خیراں گیارہ بجتے ہی تنور میں روٹیاں لگانے لگتی تھی۔ اور بارہ بجے تک وہ دن کے کھانے سے فارغ بھی ہو جاتے تھے۔

اُس نے جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور تکیے کے پاس پڑا ہوا دوپٹہ گلے میں ڈالتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ناشتے کی ٹیبل پر تبریز کے سوا سب ہی موجود تھے۔ شگفتہ ترو تازہ چہرے طویل نیند نے اُن کی تھکن دور کر دی تھی۔ وہ نہا دھو کر فریش چہروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مدحت دو گھنٹے سونے کے باوجود بھی مضمحل مضمحل سی لگ رہی تھی۔ شدتِ گریہ سے اُس کی آنکھیں بے انتہا سوجی ہوئی تھیں۔ چہرا ستا ہوا تھا۔ سونیا نے اُسے دیکھا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے مدحو۔ رات بھی تم شاید جلدی اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ نوریا' سویرا تمہیں پوچھ رہی تھیں۔''

''بس ہلکا سا سر میں درد تھا۔ اَب تو ٹھیک ہوں۔'' وہ بیٹھ گئی۔ باصر نے نگاہ اُٹھا کر اُسے دیکھا تو اُس کے تھکے تھکے چہرے کو دیکھ کر بے چین ہو گیا۔

''ناشتا کر لو' پھر میں تمہیں ٹیبلٹ دیتا ہوں۔''

''جی'' اُس نے نگاہ اُٹھا کر باصر کی طرف نہیں دیکھا۔ اور آملیٹ اپنی پلیٹ میں رکھنے لگی۔

''مدحو بھئی یہ پائے لو اور نان' ہمارا خانساماں پائے بہت مزے کے پکاتا ہے۔'' زینت مراد نے محبت سے کہا۔

''جی آنٹی اس وقت طبیعت نہیں چاہ رہی۔''

''نہیں کچھ کھا لو۔ ایسے خالی پیٹ تو ٹیبلٹ نہیں کھانی۔'' باصر نے پھر اُسے مخاطب کیا۔ لیکن مدحت نے اس بار بھی سر اُٹھا کر اُسے نہ دیکھا۔ شرما رہی ہے۔ شاید''

باصر کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اور اُس نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لئے چہرا جھکا لیا۔ رمیض معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا

''رات کا فنکشن کیسا رہا مراد۔'' زینت مراد نے پلیٹ میں سالن ڈال کر مراد علی کی طرف دیکھا۔

''بس ٹھیک ہی تھا۔'' انہوں نے اخبار پڑھتے پڑھتے ڈونگا اپنی طرف کھسکایا۔

''کم از کم ناشتا کرتے ہوئے تو اخبار رکھ دیا کریں''۔ زینت مراد جھنجھلا سی گئی تھیں۔

''تمہیں پتا ہے' یہی وقت ہوتا ہے میرے پاس اخبار دیکھنے کا۔''

''مگر آج تو چھٹی کا دن ہے۔''

''اوہ' ہاں چلو کہو کیا کہہ رہی تھیں۔'' مراد علی نے اخبار رکھ دیا۔

''وہاب صاحب سے کیا گفتگو ہوئی۔''

''کیا گفتگو ہونی تھی' بھئی وہی عام موضوعات۔ سیاست حکومت' اپوزیشن' وغیرہ وغیرہ مراد علی نے لیموں کا ٹکڑا اُٹھایا۔

''کوئی خاص بات نہیں ہوئی؟'' زینت مراد مایوس نظر آنے لگیں۔

''آپ کے حسنِ انتظام کی داد دے رہے تھے۔''

''اچھا'' زینت کھل اُٹھیں۔

''مسز وہاب نے بھی بہت تعریف کی۔ کھانوں کی تو بہت ہی تعریف کر رہی تھیں۔ میں نے بتا[یا] یہ باورچی گوجرانوالہ سے آئے تھے۔ اور بہت ماہر ہیں۔ ہمارے فنکشنز میں بھی ہمیشہ کھانے بناتے ہیں۔''

''چلیں' آپ کی محنت وصول ہوگئی۔'' زمیض کی بھوری آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

''آپ ملے تھے عبید سے۔ بہت سنجیدہ اور سلجھا ہوا بچہ ہے۔'' زینت مراد نے مراد علی کی طرف دیکھ[ا]۔

''بہت اچھا بچہ ہے۔ سمجھدار اور ذہین۔''

''اولاد کے معاملے میں مسز وہاب بہت خوش قسمت ہیں۔ بچیاں بھی دیکھی تھیں اُن کی ماشا[ءاللہ] بہت پیاری اور سلجھی ہوئی۔''

''اولاد کے معاملے میں تو آپ بھی کچھ کم خوش قسمت نہیں ہیں۔ ماما'' زمیض نے شوخی سے کہا۔

''ہم سب ہی ماشاءاللہ'' اور تب ہی مراد علی کی نگاہ باہر دروازے کے پاس سے گذرتے تبریز پر پڑی۔

''ہاں واقعی ہماری خوش قسمتی میں کوئی شک نہ تھا اگر تبریز۔'' زینت نے تیز نظروں سے انہیں د[یکھا] اور آواز دی۔

''تبریز۔ تیمی بیٹے اِدھر آؤ۔'' وہ سر جھکائے اندر چلا آیا۔

''اِدھر بیٹھو بیٹا ناشتا کرلو۔'' انہوں نے اپنے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''ماما مجھے کام سے جانا تھا۔''

''بیٹا دو نوالے تو لے لو' تمہیں پائے کتنے پسند ہوا کرتے تھے۔''

اُسے کیا پسند تھا۔ اور کیا نہیں۔ اَب اسے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ زندگی کا سارا چلن ہی بدل گیا تھا۔ وہ ماما کے خیال سے خاموشی سے بیٹھ گیا۔

''بیٹا! کبھی کبھی ہمارے ساتھ بھی بیٹھ جایا کرو'' زینت نے آہستگی سے کہا۔

''جی بہتر۔'' اُس نے یونہی سر جھکائے جھکائے پلیٹ اپنی طرف کھسکالی۔

''تم کیا کرتے پھرتے ہو۔ پاپا کے ساتھ جایا کرو۔''

''میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ میں اپنا کام کر رہا ہوں۔'' اُس نے اتنی آہستگی سے کہا کہ صر[ف] زینت ہی سُن سکیں۔

''ہاں بیٹا یاد آیا کسی دن وقت نکال لو تو۔ مسز وہاب کے ہاں چلیں گے۔ بہت کہہ رہی تھیں۔ کہ [آپ] لوگ آؤ۔ تم بتادو جس دن تمہیں فرصت ہو تو سب پروگرام بنالیں گے۔''

''آپ لوگ چلے جایئے گا۔ مجھے فرصت نہیں ہوتی۔'' وہ دو نوالے لے کر کھڑا ہو گیا

''چائے تو پی لو۔''

''پی لی تھی صبح۔'' اُس کی نگاہ پل کے پل مدحت کے چہرے پر ٹھہری۔

''اَب اجازت۔''

''ارے ہاں ٹھہرو تیمی۔ ایک بہت اہم مسئلے پر تم سے بات کرنا تھی۔''

''جی۔'' وہ جاتے جاتے پلٹ پڑا۔

''میں چاہتی ہوں' ایک چھوٹا موٹا فنکشن کر کے منگنی کا اعلان کر دوں۔''

کیا؟'' مراد علی نے حیرت سے پوچھا۔

''دراصل کل سب ہی مدحت کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ بیگم لاثانی' مسز وہاب سب ہی۔''

''مدحو لگ بھی تو بہت پیاری رہی تھی۔'' سونیا نے پیار سے اُسے دیکھا۔

''میں چاہتی ہوں کہ لوگوں کو ہمارے ملنے جُلنے والوں کو پتا چل جائے کہ مدحت تبریز کی منگیتر ہے؟۔

باصر کے ہاتھ سے چمچ گر پڑا۔ اُس نے۔۔ بے اختیار مدحت کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن وہ سر [جھک]ائے چائے کی پیالی میں چمچ ہلا رہی تھی اور اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ لیکن باصر کا دل جیسے کسی نے [مٹ]ھی میں جکڑ لیا تھا۔ اور ہولے ہولے بھینچ رہا تھا۔

تبریز لب بھینچے کھڑا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ کس طرح اُس کے راستے بالکل مختلف ہو گئے تھے۔ یہ صحیح [ت]ھا کہ یہ میاں جی کی خواہش تھی اور میاں جی کی۔ خواہش کو اُس نے اپنے دل کی آرزو بنالیا تھا اور یہ اُس کی اوّلین [خ]واہشات میں سے ایک خواہش تھی لیکن اب۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔

وہ میاں جی کی پیاری لاڈلی تھی۔ اُن کی روح اس میں اٹکی ہوئی تھی۔

اور وہ______!

اُس کے راستے تو بڑے خاردار ہو گئے تھے۔

وہ تو اجنبی راہوں کا مسافر بن گیا تھا۔

اُس کے تو اپنے تلوے لہولہان ہو گئے تھے۔ روح تک پر آبلے پڑ گئے تھے۔

وہ اس نازک بدن' شیشہ دل لڑکی کو کیسے ان راہوں کا مسافر بنا سکتا تھا۔

اُس کی تو کوئی منزل نہیں تھی۔ اور اگر کوئی منزل تھی تو موت کی منزل تھی۔ کیسے سنگلاخ اور پتھریلے راستے اُس کا مقدر بن گئے تھے۔ وہ بڑی پتھریلی راہوں سے چل کر آیا تھا۔ اور آگے بھی بس سنگلاخ زمینیں [ت]ھیں۔ تپتی دھوپ کا سفر تھا۔

اور کہیں کوئی سائبان نہیں تھا' کوئی چھاؤں نہیں تھی۔

وہ تو میاں جی کا سامنا کرنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اُن سے نظریں تک نہیں ملا سکتا تھا۔

کیسے ملاتا اُن سے نظریں؟

کیسے اُن کے پاس بیٹھتا؟

سارے وعدے جو اُس نے اُن سے کیے تھے' سب خاک میں مل گئے تھے۔ اس روز بھی جب مراد علی زبردستی اسے میاں جی کے پاس لے کر گئے تھے' تو وہ چپ چاپ نگاہیں جھکائے بیٹھا رہا تھا۔ ایک لفظ بھی اس نے زبان سے نہیں نکالا تھا۔

مراد علی سرزنش کرتے رہے تھے۔

وہ چُپ بیٹھا رہا تھا۔

اور میاں جی نے بھی تو اُس سے کچھ نہیں کہا تھا۔

نہ کوئی سوال نہ کوئی سرزنش' نہ کوئی گلہ' نہ کوئی شکوہ۔

بس خاموشی سے اُس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اُسے آنکھوں سے لگایا تھا۔ ہونٹوں سے چھوا تھا اور اُس کے اندر سے جیسے کچھ باہر نکلنے کو بے تاب ہونے لگا تھا۔ کتنا جی چاہا تھا کہ وہ میاں جی کے قدموں سے لپٹ جائے۔ خوب زور [ز]ور سے روئے اور اُنہیں بتائے کہ وہ راہ سے نہیں بھٹکا تھا۔ بس اُس کے راستے کھوٹے کر دیئے گئے تھے۔

بلا جواز

بلا وجہ۔

اُس کی راہوں میں کانٹے بچھا دئے گئے تھے اور یہ کانٹے تو اَب بھی اُس کی راہوں میں بچھے ہوئے تھے اور وہ ان خار خار راستوں پر اُسے' اُس نازک لڑکی کو کیسے لے کر جا سکتا تھا۔ سو اُس نے تو ایک بار بھی اُسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اُس کے لئے پرائی تھی۔

ایک بار بھی اپنائیت کی نظر اُس پر نہیں ڈالی تھی۔ لیکن وہ یہاں ان سب کو کیسے بتا سکتا تھا۔ بس کسی دن وہ ہمت کر کے میاں جی کے پاس چلا جائے گا اور انہیں بتا دے گا کہ وہ اس اعزاز کے قابل نہیں ہے۔

اس لائق نہیں ہے۔

''ٹھیک ہے نا' مراد۔''

زینت نے مراد علی سے تائید چاہی۔

''ابھی کل کے فنکشن سے آپ تھکی نہیں ہیں۔ ماما۔

پتا نہیں آپ کو فنکشن ارینج کرنے کا اتنا شوق کیوں ہے۔''

وہ ہنسی سے بولتا ہوا باہر چلا گیا۔

''ارے بھئی! کل جیسا فنکشن تھوڑا ہی ہوگا' صرف گھریلو سا فنکشن ہوگا۔ بہت قریبی جاننے والوں کو مدعو کریں گے۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے۔''

مراد علی جانے کیا سوچ رہے تھے۔

''میں تو میاں جی کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ اُن کی بڑی خواہش تھی کہ ____''

ساکت بیٹھے باصر کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میاں جی کی خواہش؟

مگر اُس سے کبھی کسی نے ذکر نہیں کیا۔

کبھی بتایا ہی نہیں۔ یہ ظلم تھا اس معصوم لڑکی کے ساتھ۔

سونیا نے بھی نہیں۔ یہ کیا ہو گیا تھا' یہ کیا کر دیا تھا اُس نے اس معصوم لڑکی کے دل میں کیسا احساس جگا دیا تھا۔

اُف کتنی بڑی غلطی ہو گئی تھی۔۔ کتنی بڑی۔

اگر اُس کے دل میں کوئی جذبہ پیدا بھی ہوا تھا تو وہ خود کو روک لیتا۔ اندر ہی کہیں اس جذبے کو چھپا لیتا کیا سوچتی ہوگی۔۔ مدحت کیا کہتی ہوگی دل میں؟

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ سونیا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

وہ چائے کی بھری پیالی چھوڑ کر چلا گیا۔

''باصر کو کیا ہوا؟''

سونیا نے حیرت سے پوچھا۔

رمیض لمحوں میں ساری حقیقت پا گیا تھا۔ رات اُس نے دونوں کے چہروں پر دھنک رنگ کھلتے دیکھ لیے تھے۔ آنکھوں کے چمکتے جگنو اُسے بتا گئے تھے کہ کچھ ہے کوئی جذبہ ہے دونوں کے درمیان

''بھائی نے تو آج بہت ضروری کام سے جانا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے پہنچنا تھا وہاں۔ شاید اچانک یاد آ گیا ہے۔''

رمیض نے فوراً سب کا دھیان بٹایا۔

''اوہ ہاں۔''

زینت مراد نے اپنے لئے چائے بنائی۔

''مدحو! تم بھی جا کر آرام کرو۔ بہت تھکی تھکی لگ رہی ہو' یا شاور لے لو' تازہ دم ہو جاؤ گی۔''

اُنہوں نے اُس ہدایت دی۔

''دراصل تمہارے لئے ایسے فنکشن بہت تھکا دینے والے ہوں گے۔ وہاں شاہ پور میں تو تم لوگ بہت جلد سو جاتے ہو گے۔

''جی' مدحت نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''عشاء کی نماز کے فوراً بعد سونے کے لئے لیٹ جاتے تھے۔''

''اور یہاں تو فنکشن ہی نو بجے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ جانو عادت ڈالو۔''

مدحت سر جھکائے باہر چلی گئی۔

''سونی بیٹا! دیکھنا اگر باصر چلا نہ گیا ہو تو اُس سے ٹیبلٹ لے کر مدحو کو دے دو۔''

'' اور یہ ماما مدحت کا بڑا خیال کرتی ہیں۔''

رمیض نے سوچا اور ایک دم کھڑا ہو گیا۔

''میں دے دیتا ہوں سونی آپی! تم آرام سے اپنی چائے ختم کرو۔''

مراد علی نے پھر اخبار اُٹھا لیا تھا۔

زینت مراد نے ایک نظر اُنہیں دیکھا اور اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں ذرا ٹیلر کے پاس جاؤں گی۔ سونی' تم نے کچھ دینا ہو تو ____!

''نو ماما! فی الحال کچھ نہیں''۔

'' اوکے!''

وہ باہر چلی گئیں اور سونیا چائے پینے لگی۔

رمیض نے باصر کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ لیکن باصر وہاں نہیں تھا۔ وہ اُسے دیکھنے کے لئے باہر نکلا تو وہ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔

''اوہ تو شاید بھائی کو کوئی کام ہی تھا۔''

رمیض مطمئن ہو کر ٹی وی لاؤنج کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆☆

باصر بہت دیر تک یوں ہی گاڑی لے کر گھومتا رہا۔

اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ذہن و دل کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ کیا کہتی ہو گی مدحت اپنے دل میں کیسے سامنا کرے گا وہ اس لڑکی کا۔

کیا سوچتی ہو گی کہ میں نے بھائی کی منگیتر سے ____

مگر مجھے کیا خبر تھی' کب جانتا تھا میں؟

کب پتا تھا مجھے؟

اور اگر مجھے پتا ہوتا تب ____

تب کیا اُس کی محبت میرے دل میں پیدا نہ ہوتی ____ ؟

شاید تب اس محبت کا رنگ مختلف ہوتا۔

تب___!

مگر نہیں محبت تو ایک بے اختیار جذبہ ہے۔

یہ تو خود بخود صبح کی پہلی کرن کی طرح دل سے پھوٹ پڑتا ہے۔

بالکل اچانک۔

بالکل غیر متوقع۔

پتا نہیں یہ محبت کیا ہے؟

محبت دل پہ دستک ہے۔

اُس کے لب ہولے سے ہلے۔

بدن کو روح کا رستہ دکھاتی ہے۔

محبت اِک دعا ہے جو ہمیشہ ساتھ رہتی ہے۔

محبت ٹھنڈی چھاؤں ہے' جو صحرا کے سفر میں کام آتی ہے۔

اور مدحت شیراز!

تمہاری محبت بھی اِک دعا بن کر ہمیشہ میرے سنگ رہے گی۔

کئی گھنٹوں کی بے مقصد ڈرائیونگ کے بعد اُس نے گاڑی کا رُخ گھر کی طرف موڑ دیا۔

بہر حال جو ہوا تھا وہ غلط تھا۔ اگر اُسے علم ہوتا تو وہ اس محبت کو لفظوں کا روپ کبھی نہ دیتا۔ اور مجھے مدحت سے معذرت کر لینی چاہئے۔

اُس نے فیصلہ کر لیا اور سیدھا مدحت کے کمرے میں گیا۔

مدحت آنکھیں موندے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ لحہ بھر وہ یونہی کھڑا پردہ اُٹھائے اسے دیکھتا رہا۔

کل رات اُس کے گالوں پر شفق کھیل رہی تھی۔ اور ایک ہی رات میں اُس کے گالوں کے گلاب مُرجھا گئے تھے۔ پلکیں بھیگی بھیگی لگ رہی تھیں۔ شاید وہ روتی رہی تھی۔

بظاہر یہ ایک معمولی سی بات تھی کہ کل رات کسی نے اُسے اپنی محبت کا یقین دلایا تھا اور آج وہ یقین ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن در حقیقت یہ بہت بڑا حادثہ تھا۔ اُس جیسی نازک دل لڑکی کے لئے۔

''مدحو!''

بے حد نادم اور شرمندہ ہو کر اُس نے ہولے سے اُسے آواز دی۔

مدحت نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور اپنے سامنے باصر کو کھڑا دیکھ کر یک دم کھڑی ہو گئی۔

''آپ؟''

''سوری مدحت! میں مخل ہونے کی معافی چاہتا ہوں' لیکن میں تمہارے پاس آنا چاہتا تھا اور تم سے معذرت کرنا چاہتا تھا۔

وہ پردہ چھوڑ کر اندر آ گیا اور بالکل اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''کل رات جو کچھ میں نے تم سے کہا تھا' وہ قطعی لاعلمی میں کہا تھا۔ مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ میاں جی تمہارے متعلق اس طرح کا کوئی فیصلہ کر چکے ہیں اگر مجھے علم ہوتا تو میں___!''

اُس نے بات ادھوری چھوڑ کر مدحت کی طرف دیکھا۔ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں اُس کی پلکیں لرز رہی تھیں اور وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کچل رہی تھی۔

''میں نے جو کچھ کہا تھا مدحو! اُس میں کہیں کسی جھوٹ کی آمیزش نہ تھی۔ وہ میرے دل کا سچ تھا' مگر میں تم سے نادم اور شرمندہ ہوں کہ میں نے انجانے میں تمہیں ڈسٹرب کیا۔ تمہاری اُلجھن کا سبب بنا۔ میں جانتا ہوں میرے لئے ہی نہیں تمہارے لئے بھی میاں جی کا فیصلہ بہت محترم ہوگا۔''

آنسو بڑی آہستگی سے مدحت کے رخساروں پر پھسل آئے۔

باصر بے چین ہو کر ایک قدم آگے بڑھا' پھر پیچھے ہٹ گیا۔

''میں جانتا ہوں مدحو! کہ تمہارے دل کو بہت تکلیف پہنچی ہے۔ بہت اَپ سیٹ ہو رہی ہو تم۔۔۔ اور اس کے لئے میں خود کو قصور وار سمجھتا ہوں' اگر کل رات میں اپنے جذبوں کا اظہار نہ کرتا تو شاید تمہارے دل کو اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ مگر ایسا ہی ہونا تھا شاید بہت آگے جا کر پیچھے پلٹنا بہت مشکل ہو جاتا ہے مدحو! اور شکر ہے کہ ابھی ہم بہت آگے نہیں گئے تھے۔ ابھی تو ہم پہلی سیڑھی پر کھڑے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہلے قدم سے ہی واپسی کا سفر آسان ہوتا ہے۔ مدحو! ہاں آگے جا کر پلٹنا شاید ناممکن ہو جاتا ہے۔''

مدحت نے بھیگی بھیگی پلکیں اُٹھا کر باصر کو دیکھا اور سوچا۔

''اب۔ اب بھی اتنا آسان تو نہیں ہے۔''

اور باصر نے شاید اس کے دل کی آواز سن لی۔

''اب بھی شاید اتنا آسان نہیں ہے' لیکن نا ممکن اور مشکل بھی نہیں ہے مدحو!''

اُس کے مسلسل بہتے آنسوؤں کو پونچھنے کی خواہش کو دل میں دبائے باصر نے بھاری آواز میں کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت دُہرے عذاب سے گزر رہی ہو۔ تمہارے دل میں تبریز بھائی کے متعلق بہت سے خدشات پیدا ہو رہے ہوں گے' لیکن مدحو! یقین کرو' میاں جی کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ بلاشبہ تبریز بھائی اس قابل تھے کہ تمہارے جیسی لڑکی اُن کی شریک زندگی بنتی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک کرائسس سے گزرے ہیں اور اس کرائسس کے آثار ابھی بھی ہیں۔ ابھی تک وہ سنبھل نہیں پائے ہیں' لیکن مجھے یقین ہے مدحو کہ ایک دن وہ مکمل طور پر اُس کرائسس سے نکلیں آئیں گے اور بالکل پہلے جیسے تبریز بھائی بن جائیں گے اور تم اُن کی رفاقت پر فخر کرو گی اور تم___ تمہیں یاد بھی نہ رہے گا کہ___''

اُس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھلنے لگی۔

''ایک رات کسی نے تمہیں___!''

وہ کچھ دیر کے لئے رُکا۔

''AND I HOPE (اور مجھے اُمید ہے)'' اُس نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔

''AND I PRAY'' (اور میری دُعا ہے) کہ وہ ایک رات___ اور اُس رات کی گفتگو زندگی کے کسی موڑ پر کسی بھی لمحے تمہیں کبھی یاد نہ آئے' کبھی نہیں۔''

وہ یک دم پلٹا اور باہر نکل گیا۔ مدحت کو یوں لگا جیسے کسی نے اُس کا دل کسی تیز دھار آلے سے چیر دیا ہو۔ وہ یوں ہی دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھتی چلی گئی۔ اور پتا نہیں کتنی دیر تک وہ یونہی بیٹھی رہی۔ اُس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا تھا' اور روئے چلی جا رہی تھی۔ پتا نہیں کتنے آنسو تھے' جو ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ باہر سے گزرتے تبریز نے کھلے دروازے سے اُسے یوں گھٹنوں پر سر رکھے دیکھا۔ تو بے اختیار ایک دم آگے بڑھا۔

اُس کے لانبے سیاہ بالوں نے جو اُس کے اردگرد بکھرے ہوئے تھے۔ بتا دیا تھا کہ مدحت ہے سونیا نہیں۔
چند لمحے وہ یونہی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے کھڑا رہا۔
"شاید وہ رو رہی ہے۔ مگر کیوں، کہیں میاں جی۔"
"اوہ نہیں۔" دروازہ چھوڑ کر وہ اندر آ گیا۔
"مدحت!"
مدحت نے چونک کر سر اُٹھایا۔ آنسوؤں سے دُھلا بھیگا بھیگا چہرا___ تبریز کا دل یکدم زور
دھڑکا، لیکن اُس نے فوراً نگاہیں جھکا لیں۔
"نہیں، مجھے اس چہرے پر نظر ڈالنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"
"آپ؟" وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔
"خیریت! میاں جی تو ٹھیک ہیں۔؟"
وہ بدستور نگاہیں جھکائے ہوئے تھا۔
"جی۔۔ وہ میاں جی ٹھیک ہیں، بس یونہی دل بھر آیا تھا۔"
"بھلا یوں ہی دل بھر آتا ہے؟"
غیر ارادی طور پر اس نے پھر نگاہیں اُٹھائیں، اور اس کی بھیگی پلکوں سے اُلجھ گئیں۔ وہ نچلے ہون
دانتوں تلے کچل رہی تھی۔
"وہ میاں جی یاد آ رہے تھے۔"
"اچھا تو چند دنوں کے لئے میاں جی سے مل آؤ۔"
"جی!"
"سوری میں بغیر اجازت اندر آ گیا۔ دراصل دروازہ کُھلا تھا اور آپ رو رہی تھیں۔"
وہ یونہی سر جھکائے ہونٹ کچلتی رہی۔
"مدحت! آپ پریشان نہ ہوا کریں۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ گھبرائیں نہیں
کی باتوں کا کچھ خیال نہ کیا کریں۔"
بات مکمل کر کے اُس نے ایک نظر اُس کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھا اور پھر باہر نکل گیا۔ مدح
سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اُس نے ایسا کیوں کہا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیا ٹھیک ہو جائے گا، کیا تمر
جائے گا، مگر وہ بدل ہی گیا ہے۔ سب کہہ رہے ہیں کہ اب وہ اس کرائسس سے نکل آیا ہے اور میاں جی
میری قسمت کا فیصلہ کر دیا ہے اور وہ سمجھتے تھے، کہ تبریز۔ مگر باصر۔۔۔
اُف مجھے کیوں اچھا لگا۔۔۔ کیوں؟
اور کیوں میں نے اعتراف محبت کیا۔
اور کیا کبھی دل سے درد کا یہ کانٹا نکل سکے گا۔ شاید نہیں۔
اُس کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اُس نے دروازہ بند کیا اور ایک بار پھر پھوٹ پھو
رونے لگی۔

O☆O

"یہ کیسی بے چینی ہے اور کیسا اضطراب ہے، جو ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا۔"
تبو نے اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے سوچا۔
"اَب تو یہ اضطراب ختم ہو جانا چاہئے ناں، اب تو حق کی تلاش کا سفر ختم ہو گیا ہے۔ اب تو میں منزل پہ
آ چکی ہوں۔ اب تو سیدھا راستہ پا لیا ہے۔ میں نے، پھر یہ بے چینی کیوں ہے یہ اضطراب کس لئے؟
شاید یہ سب سے بچھڑنے کا دکھ ہے۔
دیپو سے، بھاجی سے، بھابھو سے، وکرم اور ماتا جی اور ___ اور اُس گھر سے، اُن گلیوں سے جہاں
اُس کا بچپن گذرا تھا، جہاں کھیل کود کر وہ بڑی ہوئی تھی اور ___ اور پھر اُس نے وہ گھر، وہ گلیاں سب چھوڑ دی
تھیں۔ یہ کیسی طلب اُس کے اندر جاگ اُٹھی تھی۔ یہ کیسی آگ تھی جو اُسے سُلگائے دے رہی تھی، جس نے
اُس سے سب کچھ چھڑوا دیا تھا اور پتا نہیں اُن سب پر کیا گذری ہوگی۔ جب اُنہیں پتا چلا ہوگا کہ میں نہیں ہوں۔
بھاجی تو بالکل خاموش ہو گئے ہوں گے۔ بالکل ساکت۔
اور ماتا جی نے واویلا کرنا شروع کر دیا ہوگا۔
خوب خوب زور زور سے بین کر کر کے روئی ہوں گی اور اُسے خوب بُرا بھلا کہا ہوگا اور بھابھو___!
اُن کے آنسو آہستگی سے اُن کے رخساروں کو بھگوتے جا رہے ہوں گے اور وکی اپنے موٹے
موٹے گدگدے ہاتھوں سے اُن کے آنسو پونچھتا جا رہا ہوگا اور ساتھ ساتھ کہتا جاتا ہوگا۔
"بھابھو! روتی کیوں ہو؟"
وہ بھی میری طرح اُسے بھابھو ہی کہتا ہے۔
اور دیپو___ جب دیپو کو پتا چلے گا تو وہ___!
وہ پتہ نہیں کیا سوچے گا۔ شاید وہ دیر تک اُس کے کمرے میں بیٹھ کر چپکے چپکے اُس سے تصور میں

باتیں کرتا رہے۔ اُس سے شکوہ کرے گا کہ وہ اُسے بتائے بنا' اُس سے مشورہ کئے بنا کیوں چلی گئی۔ اور پھر شا
اُس کی کتابوں کو چھوتے ہوئے اُس کی چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے اُسے وہ خط مل جائے۔ وہ خط جو اُ
نے دیپو کے لئے ہی تو لکھا تھا۔

دیپو!

ہمیشہ خوش رہو!

میرے من میں جو آگ جل اُٹھی ہے' وہ بجھتی ہی نہیں۔ میرے دل کو یہ یقین ہے کہ یہ سب کچھ
ہے۔ داوٗجی نے جو کچھ بتایا ہے' وہ سب جھوٹ ہے۔ اور اگر جھوٹ نہیں ہے تو سچ بھی نہیں ہے سچ کہیں
ہے۔ دیپو کچھ اور۔۔۔ اس سب سے مختلف اور منفرد۔۔۔ اس سچ کی ایک جھلک مجھے نظر آئی ہے اور میں اُسی رو
کی طلب میں سب کچھ چھوڑ کر جا رہی ہوں' اس لئے کہ یہاں رہ کر میرے لئے اس سچ کو پانا ناممکن ہو گیا ہے
سب نے میرا جینا مشکل کر دیا ہے۔ دیپو۔۔۔! میں نے تم سب کو جو دُکھ دیا ہے' اُس کے لئے مجھے معاف
دینا۔"

اور پھر شاید دیپو یہ خط سب کو پڑھا دے' لیکن کیا وہ اُسے معاف کر دیں گے اور کیا معاف کر دینا ا
کے لئے آسان ہوگا۔

شاید نہیں۔ بھاجی کی تو گردن ہی جھک جائے گی۔

اور وہاں سب کتنی باتیں کریں گے۔

اور وہ مسز مہتا اپنی کھڑکی سے آدھی لٹک کر مہندر کی ماں کی بُلائیں گی۔

"اے سُنو ریتو بھاگ گئی ہے۔"

"ہائے نہیں۔"

مہندر کی ماں سینے پر دو ہتڑ ماریں گی۔

(اور اُن کی تو عادت ہی ہے ہر بات پر سینے پر ہاتھ مارنے کی)

بالکل سچ!"

"پر کس کے ساتھ؟"

مہندر کی ماں کی آواز سرگوشی میں ڈھل جائے گی۔ اور پھر یہ سرگوشیاں ساری گلی میں پھیل جا
گی۔ کتنی کہانیاں بنی ہوں گی۔

اور کتنے ہی دنوں تک مسز مہتا اور مہندر کی ماں نے کھڑکیوں میں لٹک لٹک کر اس تازہ واردات
تبصرہ کیا ہوگا۔ اور ماتاجی!

اُف! وہ بھلا کیسے برداشت کرتی ہوں گی یہ باتیں' کیسے باہر نکلتی ہوں گی۔ اور بھاجی کو تو بالکل
چُپ لگ گئی ہو گی۔ اور بھابھو____!

شاید بھابھو نے سب کو بتایا ہو کہ میں کسی کے ساتھ بھاگ کر نہیں گئی ہوں بلکہ____ ہاں
کہتی____ ہوں گی۔

"ریتو تو پاگل ہے بالکل۔ کہتی ہے' سچا مذہب ڈھونڈنے جا رہی ہوں۔ اُسے مذہب کا جنون
تو داوٗجی کے نزدیک دیوی ہے۔ اُس کا پمان مت کرو۔"

پر کون سُنتا ہوگا اُن کی باتیں۔ سب چُھپکے چُھپکے ہنستی ہوں گی اور بے چاری بھابھو____!

اُف! یہ میں نے کیا کیا؟ کیوں کیا؟

میں واقعی پاگل تھی۔ میں نے کچھ بھی تو نہیں سوچا کہ میں اُن سب کو جیتے جی مار آئی ہوں۔

پر من کی مراد' حق کا راستہ یونہی تو نہیں ملتا اور انکل رابرٹ کہتے تھے۔

"یہ بڑا مشکل سفر ہے تینو۔ جس پر تو چلنا چاہتی ہے کانٹوں بھرا راستہ ہے۔ اپنا من مارنا پڑتا ہے بی بی'
رشتوں کو چھوڑنا پڑتا ہے' تب تجھے خدا ملے گا۔"

اور اُس نے بھی چھوڑ دیا تھا۔ سب کچھ۔

دل میں سب کی جُدائی کے کانٹے چبھ رہے تھے۔ پر اس نے حق کے راستے پر قدم رکھ دیا تھا۔ مگر یہ
طراب اور بے چینی کیوں ختم نہیں ہوتی۔ اور داوٗجی نے کہا تھا۔

کہ جب من کی شکتی مل جاتی ہے تو ساری بے چینیاں اور سارے اضطراب ختم ہو جاتے ہیں۔"

اُسے یہاں آئے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ مگر اضطراب یونہی روزِ اوّل کی طرح تھا وہ دن میں کئی
ر روتی اور پھر خود ہی چُپ ہو جاتی تھی۔ یہ کراچی تھا اور اس گھر میں ریٹا کی ممی رہتی تھی۔

ریٹا اور آن تھیں اور جان تھا۔ جان کراچی پہنچتے ہی اگلے روز اسلام آباد چلا گیا تھا۔ ریٹا نے بتایا تھا
کہ اُسے کوئی بہت ضروری کام ہے وہاں ریٹا اور اس میں دو تین روز آرام کرنے کے بعد اپنے کاموں میں
مصروف ہو گئی تھیں۔

آن ایک اسکول میں پڑھاتی تھی اور ریٹا موسیقی سیکھ رہی تھی۔ وہ دن بھر گھر میں اکیلی ہوتی اور ریٹا
کی ممی سے باتیں کرتی رہتی۔ وہ بہت کچھ جاننا چاہتی تھی۔ لیکن اُسے لگتا تھا جیسے ابھی تک اُس نے کچھ بھی نہیں
نا کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔

ممی کو کچھ زیادہ پتا نہیں تھا۔

"مذہب کی طرف توجہ دینے کا ہمیں ہوش ہی کہاں تھا بے بی۔ سب بے بی لوگ بہت چھوٹا چھوٹا تھا
جب ان کا فادر مر گیا۔ پھر ہم کو بڑا محنت کرنا پڑا۔

سخت جدوجہد کیا' نوکری کیا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر سوئیٹر بنایا' کاغذ کا پھول بنایا' پھر بھی بڑا بیٹا مر
گیا' اس لئے کہ ہمارے پاس دوا کا پیسہ نہ تھا۔ اور ڈاکٹر لوگ کا دل پتھر کا بنا ہوتا ہے۔ ایک دم ہارڈ' پگھلتا ہی
نہیں' ہم بڑا رویا' اُس کا پاؤں پکڑ لیا' پر وہ بولا۔

"آپریشن کرنا پڑے گا۔ اتنا فیس ہوگا۔ پہلے بندوبست کرو____ پھر____!

ہم پیسہ کہاں سے لائیں؟ سو وہ مر گیا۔

اور دوسرا بیٹا اٹھارہ سال کی عمر میں ہی ایک بحری جہاز پر لوڈر بھرتی ہوا' یونان چلا گیا۔ پتا نہیں کہاں
کہاں جاتا ہے۔ کدھر کدھر دھکے کھاتا ہے۔ مہینوں سمندر میں رہتا ہے اور پیسہ کماتا ہے' اب ہمارے پاس پیسہ
ہے۔ اب ہم ڈاکٹر کا فیس دے سکتا ہے' پر ہمارا چارلس تو مر گیا ناں۔ وہ تو اب نہیں آئے گا۔ اب ہمارا دل
چاہتا ہے۔ ہم اُس ڈاکٹر لوگ کا کلینک میں جائے اور اُس کو بولے۔

"یہ لے اپنا فیس' اور ہمارا چارلس ہم کو واپس لا دے۔"

اُن کے اپنے دُکھ تھے۔

اپنی کہانیاں تھیں۔ اُنہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق____ حضرت مریمؑ کے متعلق اور
ا کے متعلق۔

وہ اُسے ساتھ لے کرا تو ارکوگر جا گھر بھی گئی تھیں۔ مگر اُس کی بے چین روح کو سکون نہیں مل سکا

''تم نے بے بی بڑا غلط کیا' تم کو اِدھر نہیں آنا تھا۔

اُدھر تمہارا اماں تمہیں یاد کرتا ہوگا' روتا ہوگا۔ تم نے بالکل اچھا نہیں کیا۔''

ریٹا کی ممی اُس کو چپ چپ دیکھ کر کہتیں۔

''جان اپنا بچہ ہے' پر وہ تم کو ڈیزرو نہیں کرتا۔ تم اتنا معصوم ہے' اتنا پیارا ہے اور وہ تو پکا فراڈ دم گندا آدمی۔''

ممی کو اُس سے ہمدردی ہوگئی تھی شاید۔

پر اس نے تو ایک بار بھی جان کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ وہ تو بس ایک سنگ میل تھا۔

انکل رابرٹ نے ہی کہا تھا۔

''بے بی! جب آدمی کسی بڑے سفر پر نکلتا ہے تو راستے میں کئی سنگِ میل آتے ہیں۔ آدمی پڑاؤ ڈالتا ہے۔ ٹھہرتا ہے' مگر اصل منزل تو کہیں آگے ہوتی ہے ناں۔ تم سمجھ لینا یہ جان بھی ایک سنگ میل پڑاؤ ہے' دل چاہے تو پاکستان جا کر اپنی مرضی کی زندگی گذار لینا۔ چاہو تو نن بن جانا۔ کسی گرجا گھر سے منسلک کر لینا۔ وقف کر دینا خود کو دین کی خدمت کے لئے۔''

اُس نے سارے رشتے چھوڑ دیئے تھے' جنہوں نے اُسے جنم دیا تھا' پالا تھا' اُس سے محبت اُسے چاہا تھا' اُس کے لئے خواب دیکھے تھے۔ وہ سب کچھ تیاگ چکی تھی۔

پھر جان کون تھا' کیا تھا' اُسے اس سے کوئی غرض نہ تھی۔

وہ تو ایک وسیلہ تھا۔

سچ تک پہنچنے کا۔

سو اُس نے جان کے متعلق ممی کی کہی ہوئی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا' پھر بھی اُسے انتظار تھا۔

اُسے گئے ہوئے چودہ دن ہو گئے تھے۔

اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُسے بہت کچھ بتائے گا۔ ابھی تو اُس کے دل کے پیالے میں ایک پڑا تھا اور اُس کی پیاس بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے پیالے کو بھر لینا چاہتی تھی۔ کتنی تشنگی تھی' کتنی پیاس تھی۔

اتنا لمبا سفر طے کیا تھا۔

اتنی اذیت اُٹھائی تھی۔

اتنی محبتوں اور رشتوں کو چھوڑا تھا' پھر بھی ابھی تک تشنگی جوں کی توں تھی۔ اضطراب یوں ہی تھا ٹہلتے ٹہلتے تھک کر وہ بیڈ کے کنارے پر ٹِک گئی۔ یہ ریٹا کا کمرا تھا۔

جب سے وہ آئی تھی ریٹا کے کمرے میں ہی ٹھہری ہوئی تھی۔ ریٹا اُس سے ہمدردی کرتی تھی دل بہلانے کو دیر گئے تک اُس سے باتیں کرتی تھی۔ وہ اس بات پر خوش تھی کہ اُن کی وجہ سے ایک لڑکی مذہب میں داخل ہوئی ہے اور اس بات پر یسوع مسیح بہت خوش ہوں گے اور خداوند اُس کے سارے گن دے گا۔ سو وہ اُس کی دلجوئی کرتی تھی۔

آن اسکول سے آ کر تھک جاتی تھی۔ آرام کرتی اور پھر رات کو ٹی۔ وی۔ دیکھتے ہوئے بھی وہ اس کا حال دریافت کر لیتی تھی۔

بیڈ کے کنارے پر ٹکے ٹکے اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں دو بیڈ تھے۔ سائیڈ پر ایک رائٹنگ ٹیبل اور دو کرسیاں تھی۔ کارنس پر ایک خوبصورت گڑیا اور ایک سنگ مرمر کے تاج محل کا ماڈل تھا اور ایک چھوٹے سے فریم میں چارلس کی تصویر تھی۔ تیرہ چودہ سال کا دبلا پتلا سا لڑکا جو ریٹا سے کافی ملتا جلتا تھا اور کارنس کے اُوپر دیوار پر سُنہری فریم میں حضرت مریم کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ پھولوں میں ڈھکی ہوئی سولی کو حضرت مریم نے اپنے سینے سے لگا رکھا تھا اور اُن کے چہرے پر کتنا سکون تھا' کتنی طمانیت تھی' کتنا حُسن' پاکیزگی اور معصومیت۔ وہ اُٹھی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کارنس کے پاس رُک گئی اور کارنس پر کہنیاں ٹیک کر سر اُٹھا کر تصویر کو دیکھنے لگی۔

''پاک مریم''

اُس کے ہونٹ ہلے اور کانپنے لگے۔

''مجھے۔۔ مجھے بھی یہ سکون عطا کر دے میں۔۔۔؟ یکا یک اُس نے اپنا سر کارنس پر رکھ دیا اور رونے لگی تھی۔

''لیزا۔۔!''

ریٹا پتا نہیں کب اندر آئی تھی۔ اُسے خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔

اُس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''تم پھر رو رہی ہو''

اُس نے مُڑ کر ریٹا کو دیکھا اور ہاتھوں کی پُشت سے آنسو پونچھے۔

''کیا تمہیں اپنے فیملی کے لوگ یاد آ رہے ہیں۔''؟

''پتا نہیں''۔ اُس نے آہستگی سے کہا۔

ریٹا لمحہ بھر یونہی اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اُسے دیکھتی رہی۔

''کیا جان یاد آ رہا ہے؟''

''نہیں۔'' اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اور اُس کا ہاتھ کندھے سے ہٹاتے ہوئے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

''لیزا!''

ریٹا اُس کے سامنے والے بیڈ پر نیم دراز ہوگئی۔

کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟''

''میں نے؟''

رتن کماری نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

''ہاں تم نے''

''ہاں' دیپو سے' بھاجی سے' بھابھو سے' وکرم اور ماتا جی سب سے محبت کی ہے میں نے''

''اوہ نہیں ڈیر' آئی مین سم ون اور میرا مطلب ہے کوئی اور) کسی خوبصورت ہینڈسم لڑکے سے؟''

''نہیں''

''کیا جان سے تم نے محبت نہیں کی؟''

''نہیں''

وہ کھوئی کھوئی سی تھی۔

"وہ تو بس ایک وسیلہ ہے' ذریعہ ہے اُس تک پہنچنے کا۔"

"اوہ گاڈ!"

ریٹا اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم نے سچ مچ' تم نے جان سے محبت نہیں کی ذرا سی بھی نہیں؟"

"نہیں"

"تو پھر تم نے اُس سے شادی کیوں کی؟"

"انکل رابرٹ نے کہا تھا کہ بس یہی راستہ ہے۔

تمہارے پاس۔"

"اوہ گاڈ! میں سمجھ رہی تھی' تمہیں جان نے اپنی لچھے دار باتوں میں پھنسالیا ہے اور تم جان نے وہ بڑا مکار ہے۔ یہاں اِدھر کراچی میں بھی اُس نے دولڑکیوں کو پھنسا رکھا ہے۔

لیزا! سچ سچ بتاؤ' کیا تم___ کیا تم صرف اس لئے ہمارے ساتھ چلی آئی ہو کہ تمہیں سچ کی تھی۔ تمہیں اپنا مذہب جھوٹ لگتا ہے اور تمہارے خیال میں ہمارا مذہب سچا تھا۔"

"ہاں"

"کیا تمہیں جان سے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی؟"

"کیا تمہیں یقین ہے لیزا۔ کہ ہمارا مذہب سچا ہے اور یہی حق ہے۔"

"پتا نہیں ریٹا!"

اُس نے ایک گہرا سانس لیا۔

"جب میں وہاں تھی اور انکل رابرٹ نے مجھے بتایا تھا کہ کس طرح یسوع مسیح ہم سب کے جزا پاداش میں صلیب پر چڑھ گئے تو مجھے یوں لگا تھا جیسے یہ سب سچ ہے اور میرے اندر سکون سا اُتر آیا تھا۔

لیکن جب سے یہاں آئی ہوں پھر وہی بے چینی اور اضطراب ہے۔ ایسا لگتا ہے' جیسا میرا یقین اور بے یقینی کے درمیان پنڈولم کی طرح لٹک رہا ہے۔"

"تمہیں انکل رابرٹ نے عقیدہ تثلیث کے متعلق کچھ بتایا تھا؟"

"ہاں تھوڑا سا"۔

"تمہیں پتا ہے ناں لیزا کہ ہم ایک خدا کو مانتے ہیں۔"؟ "ہاں' اس بات پر میرا دل بھی یقین ہے۔ میرے اندر سے کوئی آواز اُٹھتی ہے کہ خدا ایک ہے۔ بھگوان بہت سے نہیں ہیں۔ بس وہ کوئی ایک سب سے ماورا ہے' سب سے بلند۔" تینو نے بڑے جذب سے کہا۔

"ہاں"

ریٹا اپنے بیڈ سے اُٹھ کر اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

"میرا دل بھی گواہی دیتا ہے۔ خدا ایک ہے۔' لیکن پھر وہ جو ہماری کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں اور روح القدس بھی خدا ہے۔ خدا ایک ہے تو پھر روح القدس اور حضرت عیسیٰؑ لیزا طرح میرا ذہن بھی اُلجھ گیا ہے اور وہ کیفی ہے ناں' وہ کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بندے اور پیغمبر تھے۔"

"کیا؟"

رتن کماری اُلجھی سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی بے کلی بڑھ گئی تھی۔ ریٹا نے اُس کے ذہن کو اُلجھا

اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے آگہی کا وہ ایک قطرہ جو اُس کے دل کے پیالے میں پڑا تھا ایک دم تیز دھوپ کی تپش سے خشک ہو گیا ہو۔

"کیفی کون ہے؟"

اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔

"کیا اُس کے پاس بہت علم ہے' کیا وہ سب کچھ جانتا ہے۔ کیا اسے پتا ہے کہ اصل کیا ہے' سچ کیا ہے"؟

"کیفی!"

ریٹا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُس کے رخساروں پر سرخی سی دوڑ گئی۔

"کیفی میرا دوست ہے' اور میں اُس سے محبت کرتی ہوں۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ اُس کے پاس کتنا علم ہے۔ اور اُسے سچ کے متعلق کچھ پتا ہے یا نہیں' لیکن آج ہم یون ہی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ بہت خوبصورت باتیں کرتا ہے لیزا۔ وہ شاعر ہے' بہت مقبول ہے خوبصورت شاعری کرتا ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں' لیکن ہم دونوں کا مذہب مختلف ہے۔ ہمارے درمیان مذہب کے متعلق کبھی بات نہیں ہوئی۔ آج پتا نہیں کیوں میں نے اُس سے پوچھ لیا کہ وہ یسوع مسیح کو خداوند کا بیٹا کیوں نہیں مانتے' تو تب اس نے مجھ سے کہا۔

"کہ اللہ ایک ہے' نہ اُس کا کوئی باپ ہے نہ بیٹا اور ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے بندے اور پیغمبر ہیں اور یہ کہ جب حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھایا گیا تو اللہ نے اُنہیں زندہ اُوپر اُٹھالیا اور۔

اور پتا ہے لیزا! کیفی کی باتوں سے یک دم میرے اندر سوالوں کے کانٹے اُگ آئے۔ یہ بڑے بڑے سوال اور میرا دل اندر ہی اندر گواہی دینے لگا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے تمہاری روح میرے اندر حلول کر گئی ہے' مجھے تمہاری طرح سینٹ نہیں بننا۔ میں تو بس زندگی کی خوشیوں سے اپنا دامن بھر لینا چاہتی ہوں۔ جی بھر کر خوش ہونا چاہتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے میرے اردگرد خوشیوں کے ڈھیر لگے ہوں اور میں ان خوشیوں کو مٹھیاں بھر بھر کر پھینکتی رہوں۔ اِدھر اُدھر اور خود ان خوشیوں کے ہجوم میں ڈوبی رہوں گردن گردن تک' سو میں نے ان سوالوں کو اپنے اندر ہی ختم کر ڈالا میں نے اُس سے مزید کچھ نہیں پوچھا اور ضد کر کے اُس کے ساتھ سمندر پر چلی گئی۔ پھر ہم دیر تک ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ریت پر چلتے رہے۔ کاش تینو وقت وہیں کہیں تھم جاتا۔"

"وہ کیفی۔۔ کیا وہ؟"

"وہ مُسلمان ہے' میں کرسچین ہوں۔ ہم دونوں اہل کتاب ہیں اور ہماری شادی ہو سکتی ہے۔ اور یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں جاذب کیفی کی بیوی بنوں۔ سچ کیا ہے' کس کا مذہب سچا ہے' کس کا جھوٹا' مجھے ان ساری باتوں کی پروا نہیں ہے۔ اگر کیفی نے کہا کہ میں مسلمان ہو جاؤں تو میں مسلمان ہو جاؤں گی۔ اپنا مذہب چھوڑ دوں گی' مجھے صرف اُس کا ساتھ چاہئے۔ بس۔"

"تم اپنا مذہب چھوڑ دو گی۔"

رتن نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں"

ریتا نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔
''تم نے بھی تو چھوڑ دیا ہے۔ ناں''
''مگر میں نے تو۔۔۔'' وہ سٹپٹائی۔
''میں نے تو اس لئے چھوڑا ہے کہ مجھے سچے دھرم کی تلاش ہے اور۔۔۔!''
''لیکن تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے لیزا کہ تم نے جو دھرم اپنایا ہے' وہ سچا ہے۔ اب
کچھ دیر پہلے میں نے خود تمہاری آنکھوں میں بے یقینی کے سائے ڈولتے دیکھے ہیں۔''
''مگر وہ انکل رابرٹ کہتے تھے کہ یہی سچا دھرم ہے اور یہی حق ہے۔'' اُس نے کمزور سی آواز میں ک
'' اسی طرح تمہارے بھاجی نے اور تمہارے اُس گوپی کے داجی نے بھی یہی کہا ہوگا کہ ہمارا د
سب سے اچھا ہے۔''
''ہاں۔'' اُس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا اور اُس کی طرف دیکھا۔
''پھر بھی۔۔۔ پھر بھی تمہیں محبت کے لئے صرف محبت کی خاطر اپنا دھرم نہیں چھوڑنا چاہئے۔''
''یہ تم اس لئے کہہ رہی ہو کہ تم نے محبت نہیں کی۔
محبت سے بڑھ کر کچھ بھی پاورفل نہیں ہوتا لیزا ڈیر۔''
''کیا ممی' جان اور آن تمہیں اجازت دے دیں گے۔ کیا انہیں پتا ہے کہ تم۔۔۔؟
''نو ڈیر! ابھی میں شادی تو نہیں کرنے جا رہی۔ ابھی تو کیفی کی دو بڑی بہنیں ہیں۔ اُن کی شاد
ہونا ہیں۔ کیفی ابھی شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور جب وقت آئے گا تب۔ مجھے ممی جان یا آن کی
پرواہ نہیں ہوگی۔''
رتن نے سر جھکا لیا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے سوالوں کے وہ کانٹے جو ریتا کے دل میں اُگے
اُس کے دل سے اُکھڑ کر اُس کے حلق میں آ گئے ہوں۔
''تمہیں کیا خبر لیزا ڈارلنگ! یہ محبت کتنی ظالم شے ہوتی ہے'' ریتا نے اُس کے بیڈ سے اُٹھتے ہو
کہا۔
''اور یہ حق کی طلب بھی۔''
رتن نے اپنی اُنگلی کی پور سے آنکھوں کے کنارے پر جگمگاتے ہوئے آنسو کے اُس قطرے
جانے کب سے وہاں اٹکا ہوا تھا پونچھتے ہوئے سوچا۔
پتا نہیں حق کی طلب زیادہ ظالم ہے یا محبت۔ اُس نے حق کی طلب میں سارے رشتے توڑ
تھے۔ اور ریتا اپنی محبت پانے کے لئے سب کچھ چھوڑنے کو تیار تھی۔
''محبت اس کا پلو ہے۔''
ریتا نے ٹیبل پر سے اخبار اُٹھاتے ہوئے جگمگاتی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ یہ کسی اخبار کا اد
تھا۔
''سنو! اُس نے اخبار اپنے سامنے کر لیا۔
''محبت اُس کا پلو ہے۔
جہاں اُمید کے کچھ لفظ باندھے ہیں۔
محبت اُس کی آنکھیں ہیں کہ جن میں خواب آ گئے ہیں۔

محبت اُس کا چہرا ہے۔
کہ جس کی تہ میں رکھے دل میں خواہش سانس لیتی ہے۔''
پڑھتے پڑھتے ریتا نے سر اُٹھایا۔
''تم اُردو پڑھ لیتی ہو؟''
''نہیں۔''
''مگر تم بولتی تو اُردو ہو۔''
''ہاں' لیکن پڑھ نہیں سکتی۔''
''ایسا کرو لیزا! یہاں ایک ادارہ ہے' جو غیر ملکیوں کو اُردو لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے۔ پروفیسر رب نواز
نے یہ ٹیوشن سینٹر کھولا ہے' اُردو سیکھ لو۔ یہاں اردو میں تمہیں مختلف مذاہب کے متعلق بہت سی کتابیں مل جائیں
گی۔ پھر تم کھوجتی رہنا کہ اصل اور سچا دھرم کون سا ہے۔؟
''کیا انگریزی میں ایسی کتابیں نہیں ہیں۔؟''
''ہوں گی' مگر مجھے معلوم نہیں۔ میں کیفی سے پوچھوں گی۔''
''تم مجھے کیفی سے ملوا دو ریتا' میں اُس سے اُس کے مذہب کے متعلق پوچھوں گی۔''
''اچھا!''
ریتا پھر نظم پڑھنے لگی۔
محبت دل پہ دستک ہے۔
محبت ٹھنڈی چھاؤں ہے۔
''ریتا۔۔۔ ریتا ڈارلنگ! دیکھو تو باہر بیل ہو رہی ہے۔'' ممی نے باہر برآمدے سے آواز دی تو ریتا
اُٹھ کر باہر چلی گئی۔
''شاید آن ہوگی۔''
رتن نے سوچا۔
آج ریتا جلدی آ گئی تھی' ورنہ تو آن ہمیشہ پہلے آتی تھی۔ پتا نہیں' اُس نے دیر کیوں کر دی تھی' مگر
نہیں باہر سے تو جان کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ تو جان آ گیا۔
وہ وہیں بیٹھی رہی۔
نہ اُس کا دل دھڑکا نہ ہی اُس کے دل میں اُٹھ کر باہر جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اُس نے ریتا کا
چھوڑا ہوا اخبار اُٹھا لیا اور یونہی تصویریں دیکھنے لگی۔
بہت دیر تک باہر جان کے قہقہوں کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنس رہا تھا اور
اُونچی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ ممی نے شاید اُس کے لئے چائے بنائی تھی۔ باہر سے ریتا نے آواز دی۔
''لیزا ڈیر! باہر ہی آ جاؤ۔ ممی نے چائے بنائی ہے۔''
وہ اپنے بیڈ سے اُٹھ کر دروازے تک آئی۔
''مجھے چائے نہیں پینی۔'' یہ کہہ واپس پلٹ گئی۔
جان نے بہت گہری نظروں سے اُسے دیکھا اور خباثت سے ہنسا۔
'' وہاں اسلام آباد میں بھی یہ لڑکی میرے حواسوں پر چھائی رہی ہے اور۔۔۔!''

"نان سنس۔"
ریٹا نے بُرا سا منہ بنایا۔
"اب یہ تمہاری بیوی ہے۔ اُس کیلئے اچھے الفاظ استعمال کرنا۔"
"آہا!" وہ ہنسا۔
"وائف (بیوی) جان پاؤں میں زنجیریں نہیں ڈالتا ریٹا ڈیر یہ تو انکل رابرٹ نے۔۔۔ پر کچھ دن
عیش کرلوں۔"
"اوگاڈ!" ممی نے چائے لاتے ہوئے اُس کی بات سُنتے ہوئے کہا۔
"تم۔۔۔ جان! گندے لڑکے اس معصوم لڑکی کے ساتھ کوئی ظلم نہ کرنا۔ وہ تو سینٹ ہے۔ اُس نے
خود کو دین کے لئے وقف کر دینے کا سوچا ہے۔ میں اُسے فادر کے پاس لے جاؤں گی۔ وہ کلیسا کی خدمت کرے
گی۔"
"وہ میری وائف ہے ممی ڈیر! ہم نے کورٹ میرج کی ہے۔"
"تم نے اُس سے جھوٹی شادی رچائی ہے۔"
"ایک دم سچی شادی ہے یقین نہ آئے تو کاغذات دیکھ لو۔"
وہ ایک آنکھ بند کر کے مسکرایا اور چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر اُس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
"ہیلو لیزا ڈارلنگ! کیا ہو رہا ہے؟"
اُس نے شوخی سے کہا اور کپ ہاتھ میں لیے لیے اُس کے قریب چلا آیا۔
"لیزا!" اُس نے محبت پاش نظروں سے اُسے مخاطب کیا۔
"وہاں ایک پل بھی تمہارا تصور میرے ذہن سے نہیں گیا۔"
تنزو نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ سپاٹ نظر میں کوئی جذبہ نہیں تھا۔ بالکل سپاٹ۔
"جان! تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم سچ کی تلاش میں میری مدد کرو گے؟"
"تو سچ تو پا لیا تم نے، یہی سچا اور اصل دین ہے۔"
"لیکن میں اس کا یقین کرنا چاہتی ہوں۔"
"یہ یقین کیسے حاصل ہو گا تمہیں؟"
"جیسے تمہیں حاصل ہوا تھا۔ تم نے کہا تھا نا کہ تم نے بڑے کٹھن سفر کیے، تب کہیں جا کر یقین کی
منزل پر پہنچے تھے۔ مجھے بھی اُن راستوں پر لے چلو۔"
"آہا۔" جان نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اور ہاتھ میں پکڑا ہوا کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔
"شاید میں نے ایسا کہا ہو۔"
"آہا!" وہ پھر ہنسا۔
"مجھے کسی یقین کو حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیزا ڈیر! جب میں پیدا ہوا تب سے ہی مجھے
یقین تھا کہ میرے ماں باپ کا مذہب سچا مذہب ہے۔"
پھر وہ تھوڑا سا جھکا اور اپنے ہاتھ اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔
"کیا تم سچ مچ اتنی بے وقوف ہو کہ محض ایک بے بنیاد بات کے لئے گھر چھوڑ بیٹھی ہو؟"
تنزو نے آہستگی سے اُس کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیے۔

"کیا تم نے وہ سب جھوٹ بولا تھا۔ وہ حق کی تلاش سچے مذہب کو کھوج لینے کی خواہش، وہ بھگوان کو
پانے کی تمنا، کیا وہ سب جھوٹ تھا؟"
اُس نے حیران نظروں سے اُس دیکھا۔
"آہا!" جان پھر ہنسا۔
تب ہی باہر سے ریٹا نے آواز دی۔
"تمہارا فون ہے۔"
"میں ابھی آرہا ہوں۔"
وہ تیزی سے باہر لپکا۔
تنزو اُس کا انتظار کرتی رہی، لیکن وہ باہر سے ہی فون سُن کر کہیں چلا گیا۔
تنزو کا ذہن ایک بار پھر اُلجھ گیا تھا۔ ریٹا نے اور پھر اب جان نے اُسے اُلجھا دیا تھا۔
کیا یہ سارا سفر؟
یہ جدائی اور اذیت کا سفر رائیگاں گیا۔
کیا سچ کہیں سے نہیں ملے گا؟
کیا کبھی مجھے پتا نہیں چلے گا کہ اصل اور سچا دھرم کون سا ہے؟ یہ کائنات، یہ زمین، یہ آسمان، یہ چاند
تارے کس نے بنائے ہیں۔ کون ہے وہ۔
خداوند۔
خداوند یسوع مسیح۔
روح القدس۔
"اُف!"
اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔
"کیا ہے لیزا؟" ریٹا نے اندر آتے ہی پوچھا۔
"کچھ نہیں، بس یوں ہی تھک سی گئی ہوں۔"
"تھوڑا سا سو جاؤ، صبح سے یونہی اسی کیفیت میں بیٹھی ہو۔"
"ہاں۔"
وہ لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔
ریٹا کچھ دیر تک آرگن بجاتی رہی پھر اُس نے بانسری نکال لی۔ آج کل وہ بانسری بجانا سیکھ رہی تھی
اور اچھی خاصی بجا لیتی تھی۔ وہ کوئی بہت اُداس دُھن تھی۔ تنزو سُنتے سُنتے سو گئی۔
جب اُس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا اور باہر سے جان کے اُونچا بولنے کی آوازیں
آرہی تھیں۔
"اُسے میرے کمرے میں ہونا چاہئے، وہ میری وائف ہے۔"
"مگر جان! وہ اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کی پیپر میرج تھی۔ وہ صرف اس لئے اس
شادی پر رضامندی ہوئی تھی کہ اس طرح وہ پاکستان میں رہ سکے گی۔ وہ میرے خیال میں۔۔۔"
"آہا! اپنا خیال اپنے پاس رکھو۔" جان نے ریٹا کی بات کاٹ دی۔

''اُس سے کہو کہ جب تک میں یہاں ہوں' اُسے میرے کمرے میں ہونا چاہئے۔ جب میں جا۔ لگوں۔گا تو وہ آزاد ہو جائے گی۔

''مگر یہ ظلم ہے جان'' ممی نے بھی اعتراض کیا۔ وہ اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی تھی اور اُس کا رنگ ذرد ہو تھا۔

''دیکھو جان! ہم اُس سے بات کرتا ہے''۔ممی نے کہا۔

''پھر ہم تمہارا شادی کا پارٹی کرے گا۔ اُس کو دُلہن بنائے گا۔''

''نان سنس!'' اُس نے ممی کی بات کاٹ دی۔

''کوئی پارٹی وارٹی نہیں۔ آن ڈیر! اُسے تیار کر کے میرے کمرے میں بھیج دو۔''

آن اُٹھ کر اندر چلی آئی۔

''لیزا! جان آ گیا ہے اور تمہیں اپنے کمرے میں بُلا رہا ہے۔ یوں بھی تم اُس کی بیوی ہو اور ا تمہیں اُس کے ساتھ ہی رہنا چاہئے۔''

''نہیں پلیز نہیں۔'' اُس نے خوفزدہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''میں نے ابھی اس طرح نہیں سوچا۔''

اور میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں تمہاری سوچ کا انتظار کروں۔ مجھے واپس جانا ہے۔ بہت اور میں نے تمہارے لئے اتنا تردد یوں ہی نہیں کیا بلا وجہ کہ تمہیں چھوئے بغیر چھوڑ دوں۔ تم قانوناً میری بیو ہو۔''

جان بھی آن کے پیچھے آ گیا تھا۔

آن وہیں دروازے سے پلٹ گئی۔

''چلو اُٹھو!'' جان نے ایک قدم آگے بڑھ کر اُسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

''نہیں پلیز نہیں۔'' اُس نے احتجاج کیا۔ اور پلنگ کے کنارے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

لیکن وہ ایک دھان پان سی لڑکی تھی اور جان مضبوط ہاتھ پاؤں والا مرد وہ اُسے کھینچتے ہوئے باہر آیا۔

''ممی!'' اُس نے روتی ہوئی آواز میں پکارا۔

وہ نیچے دیکھنے لگیں۔ ریٹا اور آن رُخ موڑے کھڑی تھیں۔ آنسو اُس کے رخساروں پر تیزی پھیل رہے تھے۔ اور جان اُسے کھینچتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف لے جا رہا تھا اور وہ گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆

مدحت بہت دیر سے ٹی وی لاؤنج میں اکیلی بیٹھی تھی۔ گھٹنوں پر تھوڑی رکھے وہ کارپٹ پر تھی۔

بظاہر اُس کی نگاہیں ٹی۔وی پر جمی تھیں۔ لیکن اُسے کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ عجیب سی اُدا جس نے اُس کے سارے وجود کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ نہ کالج میں اُس کا دل لگتا' نہ گھر میں دو دن سے تو وہ کالج نہیں جا رہی تھی۔

باصر کی آج کل نائٹس تھیں۔ وہ وہیں اسپتال میں ہی کسی دوست ڈاکٹر کے پاس رہ جاتا تھا دن کے بعد اُس نے باصر کو نہیں دیکھا تھا۔ تبریز بھی تین دن سے غائب تھا۔ نہ جانے بغیر بتائے کہاں چ

تھا۔ اُس کے اس طرح جانے سے گھر کی فضا میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا اور نہ ہی کسی نے کسی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ شاید اب وہ سب اُس کے اس رویے کے عادی ہو گئے تھے۔ سونیا نے چپکے سے اُسے بتایا کہ تبریز بھائی کہیں چلے گئے ہیں۔

''کہاں؟'' اُسے حیرت ہوئی تھی۔

''اب تو وہ بالکل ٹھیک تھے ناں؟''

''ہاں ممکن ہے کسی کام سے گئے ہوں۔''

سونیا نے بظاہر لاپروائی سے کہا تھا' لیکن مدحت نے اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی تشویش دیکھی تھی۔

''تو اُنہیں بتا کر جانا چاہئے تھا ناں۔''

''شاید اب وہ ایسا ضروری نہیں سمجھتے۔'' سونیا نے کندھے اُچکائے اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ان دونوں وہ بہت مصروف نظر آ رہی تھی۔

یونیورسٹی سے آتے ہی اپنے کسی دوست کے ساتھ چلی جاتی تھی جس کی عنقریب شادی ہونے والی تھی اور وہ اُس کے ساتھ مل کر شاپنگ کر رہی تھی رمیض الگ جھنجلایا جھنجلایا پھر رہا تھا۔

''یہ کیا مصیبت ہے' سب اتنے مصروف ہیں اور میری صرف چند چھٹیاں رہ گئی ہیں۔''

اس وقت بھی وہ خوب شور مچا کر مسز زینت مراد کے کمرے میں چلا گیا تھا اور یقیناً وہاں بول بول کر اپنا غصہ نکال رہا ہوگا۔''

مدحت نے سوچا۔

سونیا یونیورسٹی گئی ہوئی تھی۔

باصر اسپتال میں تھا۔ انکل مُراد اپنے آفس میں

اور رمیض اپنی ممی کے کمرے میں بیٹھا اُن سے اُلجھ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اُسے زبردستی اُس کے کمرے سے کھینچ کر باہر لایا تھا۔

''چلو کوئی اچھی سی فلم دیکھتے ہیں۔''

اگرچہ اُس کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ رمیض کی خاطر چلی آئی تھی اور اب وہ مووی لگا کر خود غائب ہو گیا تھا۔ بس بیٹھے بیٹھے اُسے اُبال اُٹھا تھا۔

''مدحو! تم دیکھو' میں ذرا ماما سے گپ شپ لگا آؤں۔''

''کتنی اُداسی ہے۔'' مدحت نے گھٹنوں سے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''پتا نہیں شہروں میں اتنی اُداسی کیوں ہوتی ہے۔''؟

اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

''کیا گاؤں میں اُداسی نہیں ہوتی؟''

رمیض نہ جانے کب اُس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس نے چونک کر پیچھے دیکھا تو رمیض ہنس دیا۔

''تم اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہو۔''

''نہیں تو''۔ وہ جھینپ سی گئی۔

''بس ایسے ہی خیال آیا تھا ایک۔''

''تمہیں خیال بھی اُونچی آواز میں آتے ہیں۔'' رمیض پھر ہنسا۔

"پھر ہنسا۔

"اچھا یہ بتاؤ۔ اُداس کیوں ہو؟"

"میں۔۔ نہیں تو میں تو اُداس نہیں ہوں۔ میں تو کہہ رہی تھی' شہروں میں اتنی اُداسی کیوں ہوتی ہے؟"

"اُداسی کا تعلق شہروں یا قصبوں سے نہیں ہوتا بی بی' یہ تو بس آدمی کے اپنے من میں ہوتی ہے۔ اب سیدھی طرح بتاؤ تم کیوں اُداس ہو؟"

"میں۔۔ پتا نہیں۔"

اُس نے رمیض کی طرف دیکھا' جو کشن کھینچ کر اُس کے قریب ہی کارپٹ پر بیٹھ گیا۔

"دراصل تم یہاں خوش نہیں ہو؟" رمیض نے غور سے اُسے دیکھا۔

جس روز وہ آئی تھی' اُس روز اُس کا چہرا دمک رہا تھا۔ رخساروں پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد سُرخی آ جاتی تھی اور اس وقت اُس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔

"نہیں تو۔"

"تو پھر کیا بات ہے' بیمار ہو؟"

"نہیں' بیمار بھی نہیں۔" اُس نے بے بسی سے رمیض کی طرف دیکھا۔

"خوش رہا کرو مدحو! شاید تم کچھ اَپ سیٹ ہو۔

ماحول ایک دم سے چینج ہو (بدل جائے) تو آدمی۔۔ اَپ سیٹ ہو جاتا ہے۔ تم ایک بالکل مختلف ماحول سے آئی ہو۔ سونی آپی نے مجھے بتایا ہے کہ تم بہت چُپ رہتی ہو اور میاں جی کو بہت یاد کرتی ہو۔ شاید یہاں کوئی میاں جی جیسی محبت تم سے نہ کرتا ہو' لیکن یقین کرو ہم سب تمہیں چاہتے ہیں' تم سے محبت کرتے ہیں حتیٰ کہ ماما بھی تمہارا خیال رکھتی ہیں۔ حالانکہ اُنہوں نے کبھی اس طرح کسی کا خیال نہیں رکھا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے مدحو کہ تمہارا وہ کس قدر خیال رکھ رہی ہیں۔ اب بھی تین بار اُنہوں نے مجھ سے پوچھا ہے کہ مدحت کیا کر رہی ہے۔

اُسے کمپنی دو'

بور ہو رہی ہو گی۔

کالج کیوں نہیں گئی؟

اتنی تشویش تو اُنہوں نے سگی اولاد کے لئے بھی کبھی نہیں کی۔"

اُس کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

"مجھے پتا ہے سب میرا خیال رکھتے ہیں۔"

اُس کی آواز رُندھ گئی۔

"تو پھر یہ منہ کیوں بنائے رکھتی ہو۔ تمہاری مسکین سی شکل دیکھ کر خواہ مخواہ ہی مجھے اپنے سارے پروگرام ختم کرنے پڑے۔"

"کیسے پروگرام؟" اُس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہی تمہارے کان وغیرہ کھینچنے' تم پر غصہ ہونے اور تم سے لڑنے کے۔"

"میں نے تو منع نہیں کیا۔" وہ بے اختیار مُسکرا دی۔

تب ہی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

"دیکھو۔" رمیض نے کاہلی سے اُسے دیکھا۔

"کس کا ہے۔"

"تم خود ہی دیکھ لو نا ریمی۔"

دراصل جب سے وہ آئی تھی۔ ایک بار بھی اُس نے خود سے کبھی فون اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے یہ اُس کا گھر نہیں تھا' اگر میاں جی کا فون ہوتا تو کوئی نہ کوئی اُسے بُلا لیتا۔

"اچھا" رمیض کاہلی سے اُٹھا۔ اور پھر زور سے چیخا۔

"اوہ! باصر بھائی آپ!"

"باصر۔۔۔ باصر!" اُس کا دل تیزی سے دھڑک اُٹھا۔

"اوہ نہیں یہ غلط ہے۔ بہت غلط۔"

اُس نے دل پر ہاتھ رکھ لیا' تو وہ جو اتنے دنوں سے سمجھ رہی تھی کہ اُس کے دل سے باصر کا خیال نکل گیا ہے' تو یہ اُس کی سوچ غلط تھی۔ کیسے نکلے گا۔ یہ خیال؟

اُس نے بے بسی سے ہونٹ کاٹے۔

اور شاید اس کا نام محبت ہے۔

وہ ایک رات۔۔ اُس ایک رات کی گفتگو جسے بُھلانے کی دُعا باصر نے کی تھی۔ وہ اُسے بھولتی ہی نہ تھی۔ ان بیتے دنوں میں ایک رات بھی تو وہ سکون سے نہ سوئی تھی۔ ذرا ذرا دیر بعد چونک کر اُٹھ جاتی گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔

اُس کی گھمبیر آواز اُس کے کانوں میں گونجنے لگتی۔

"مدحو میں۔۔۔!"

مگر وہ سب گفتگو محض ایک غلط فہمی تھی۔ ایک غلط قدم تھا اور باصر نے کہا تھا کہ پہلے قدم سے پلٹ جانا آسان ہوتا ہے اور وہ پلٹ نہیں رہی تھی لگتا تھا جیسے پتھر کی ہو گئی ہے اور اب کون ہے جو اُس پر طلسمی پانی چھڑکے اور اُس کے وجود میں زندگی کی لہر دوڑا دے۔ وہ وہیں کھڑی تھی' اُسی قدم پر' اُسی انداز میں حیرت سے آنکھیں کھولے۔

شاید تبریز۔۔ شاید تبریز کے پاس وہ طلسمی پانی ہو اور وہ واپس پلٹ سکے۔ وہ بار بار باصر کا خیال جھٹک کر ذہن میں تبریز کی صورت بٹھانے کی کوشش کرتی۔ لیکن اُس کا چہرا تصور کی گرفت میں آتا ہی نہ تھا اور پتا نہیں وہ کہاں کھو گیا تھا۔

"تین دن ہو گئے تھے۔"

اُس نے کسی کو کچھ نہ بتایا تھا۔

اور کیا خبر وہ پلٹ کر نہ آئے اور۔۔۔!

اُس کے لاشعور میں ایک خواہش اُبھری۔

اور پھر باصر۔ ہاں وہ باصر کے ساتھ آگے ہی آگے چلی جائے' اسے پلٹنا ہی نہ پڑے۔

"اوہ خدا نہ کرے۔"

وہ اپنی اس سوچ پر شرمندہ سی ہو گئی۔ اُس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی اور ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ گئیں۔ اُس نے رمیض کی طرف دیکھا' جو باصر سے اُلجھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ اپنی نانسنس بھگتائیں۔ مجھے بھی نہیں رہنا یہاں' میں جا رہا ہوں واپس کسی کو

میرا خیال نہیں ہے“۔

”یار! خفا کیوں ہوتے ہو؟“

باصر کی آواز ایئرپیس سے باہر آ رہی تھی۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ پتا نہیں کیا ہو رہا تھا۔ عجیب سی سن
ہو رہی تھی۔ اُس نے قدم اُٹھایا۔ ایک قدم۔ دوسرا قدم۔۔۔!

رمیض نے مُڑ کر اُسے دیکھا اور اشارے سے رُکنے کے لئے کہا اور پھر باصر سے کچھ کہنے ا
اُسے لگا‘ جیسے رمیض کی آواز بہت دور سے آ رہی ہے۔ اور اُس کا چہرا دُھندلا دُھندلا سا نظر آ رہا ہے۔ اُ
آنکھوں کو رگڑنا چاہا‘ لیکن پھر سب کچھ گڈمڈ ہو گیا۔ اُس نے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ سہارے کے لئے
اُدھر ہاتھ پھیلائے‘ لیکن آس پاس کچھ نہ تھا۔ اُس لہراتے دیکھ کر رمیض ریسیور چھوڑ کر اُس کی طرف لپکا۔

”مدحت۔۔۔ مدحت!“

مگر اُس کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ گر چکی تھی۔

”رمی۔۔۔ رمی! کیا ہوا؟“

باصر کی آواز ماؤتھ پیس سے آ رہی تھی۔

اُس نے مدحت کی بند آنکھوں کو دیکھا اور چونک کر ریسیور اُٹھایا۔

” وہ۔۔۔ وہ بیمار ہے۔ بہت دنوں سے‘ لیکن وہ بتا نہیں رہی تھی۔“

”کون؟“ باصر نے پوچھا۔

”مدحت۔۔۔ مدحوشی از ناٹ ویل۔“ ؟(وہ ٹھیک نہیں ہے) رمیض گھبرایا ہوا تھا۔

”اور اب ___ اب اچانک کھڑے کھڑے وہ گر گئی ہے‘ بے ہوش ہو گئی ہے آپ۔۔۔ آ
ڈاکٹر کرمانی کو رنگ کر دیں۔ اوگاڈ۔ ماما۔ ماما۔

وہ چلانے لگا تو باصر نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

”وہ بیمار ہے‘ وہ ٹھیک نہیں ہے۔“ اُس نے زیرِ لب کہا۔

”کیا وہ ابھی تک سنبھلی نہیں ہے؟ کیا وہ ابھی تک۔“

”اور تم۔۔۔ کیا تم سنبھل گئے ہو؟“

اُس نے اپنے بڑھے ہوئے شیو پر ہاتھ پھیرا۔

”اوہ وہ تو پھر ایک‘ نازک دل لڑکی ہے‘ جس کے دل کا آئینہ ابھی پختہ نہیں ہوا‘ جس نے
صرف محبتیں ہی دیکھی ہیں۔ میاں جی‘ ماں جی کی محبتیں اور جو۔۔۔ یقیناً وہ ابھی تک اَپ سیٹ ہے۔
لگے گا سنبھلنے میں۔“

اُس نے ایک گہرا سانس لیا۔

”اور میں اسی لئے تو اسپتال چلا آیا تھا کہ اُسے سنبھلنے میں دقت نہ ہو۔ میں سامنے نہیں ہوں گا تو
کتنا خفا تھا مجھ سے کہ میں اپنی ڈیوٹی تبدیل کیوں نہیں کر لیتا‘ مگر یہ کتنا مشکل ہے‘ ہر روز اس کا سامنا کرنا۔
وقت تک جب تک ہم دونوں دل سے اس حقیقت کو قبول نہیں کر لیتے اور کتنے دن ہو گئے تھے‘ وہ گھر نہیں گیا تھا
پر ہی ماما سے‘ سونیا سے اور رمیض سے بات کر لیا کرتا تھا۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا اور آج دو دن سے تو اُس
نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ ڈاکٹر احمد کے کمرے میں سستی سے لیٹا ہوا تھا کہ رمیض کی خفگی کے خیال

فون کر لیا تھا۔ اُس کے جانے میں اب دن ہی کتنے رہ گئے تھے اور وہ اپنے اندر ہمت نہیں پا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اُسے لگتا
تھا جیسے اُسے دیکھتے ہی اُس کا ضبط پارا پارا ہو جائے گا۔ دو بار تو وہ بالکل گھر کے پاس سے پلٹ آیا تھا۔ وہ جوائنٹ اینٹ
کر کے ضبط کی دیواریں کھڑی کرتا تھا لمحوں میں ڈھے جاتی تھیں۔ احساسِ ندامت بھی تھا۔

محبتوں کا پہلے ہی قدم پر لُٹ جانے کا احساس بھی۔ اور کیا یہ ضروری تھا کہ اُس کے دل میں مدحت کا
ہی خیال آتا۔ کسی اور لڑکی کی محبت بھی تو اُس کے دل میں پیدا ہو سکتی تھی۔ یہاں کتنی لڑکیاں تھیں اُس کے ارد گرد۔

ڈاکٹر حرا اور اُس کی بہنیں کس طرح اُس پر پروانہ وار نثار ہوتی رہتی تھیں۔ اور ڈاکٹر حرا نے خود کتنی
بار اُس سے اپنی بہن سمیرا کے لئے کہا تھا۔ سمیرا دلکش لڑکی تھی۔ سانولی سی‘ پُرکشش سی۔

اُسے بات کرنے کا قرینہ آتا تھا۔

اچھی طرح ڈریس اَپ ہوتی تھی۔

سوشیالوجی میں ایم۔ اے کر رہی تھی۔

ڈاکٹر حرا کے کہنے پر اُس نے ایک بار سمیرا کے لئے سوچا ضرور تھا‘ لیکن اُس کے دل میں ایسی کوئی
کونپل نہیں پھوٹی تھی۔ بس سرسری سا خیال آیا تھا اُس کے دل میں اور اُس نے اس خیال کو جھٹک دیا تھا۔ جب
وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔

ابھی تو اُس کا شادی کا ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔

ابھی تو تبریز بھی اُس سے بڑا تھا۔ اور اُس نے ڈاکٹر حرا کو بتا دیا تھا کہ فی الحال چھ سات سال تک
اُس کا شادی کا کوئی پروگرام نہیں۔

اور وہ ڈاکٹر اسماء کتنی بے تحاشا خوبصورت تھیں۔

اُن کی بے حد سفید رنگت!

اُن کی خوبصورت براؤن آنکھیں۔

دلکش سراپا۔ اور خاندانی۔

اور شاندار پس منظر۔

ڈاکٹر ماں باپ کی ڈاکٹر بیٹی۔

وہ سب دوست جب مل بیٹھتے تو ڈاکٹر اسماء کا ذکر ضرور ت چھڑتا تھا۔ ڈاکٹر طلحہٰ اور ڈاکٹر زبیر تو
اب ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتے۔۔۔ مگر ایک بار بھی ڈاکٹر اسماء کو دیکھ کر اُس کا دل نہیں دھڑکا۔ ایک بار بھی کوئی
خیال اُس کے دل میں نہیں آیا۔

مگر یہ سادہ سی مدحت!

چمکتی آنکھوں والی۔ ذرا سی بات پر سُرخ پڑتے رخساروں کو ہاتھوں سے چھپاتی بار بار پلکیں جھپکتی کیسے
اچانک اُس کے دل میں اُتر آئی تھی۔ اور اگر ایسا ہو ہی گیا تھا۔ تو کیا یہ ضروری تھا کہ وہ تبریز سے منسوب ہوتی۔

اُس نے زور سے میز پر مُکا مارا تو جیسے اچانک اُسے یاد آیا کہ وہ بیمار ہے‘ وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔

”اوہ گاڈ!“ اُس نے جلدی سے ڈاکٹر کرمانی کا نمبر ملایا۔

”ڈاکٹر پلیز‘ آپ جلدی گھر پہنچیں۔“

”خیریت‘ مسز مراد تو ٹھیک ہیں۔“

”ہاں وہ مدحت‘ مدحت بے ہوش ہو گئی ہے۔“ ڈاکٹر کرمانی جو اُن کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ ابھی تک وہ

مدحت سے متعارف نہیں ہوئے تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ جب سے وہ آئی تھی اُن کا۔۔مراد ہاؤس میں جانا نہیں ہوسکا تھا۔ورنہ ہفتے دو ہفتے بعد اُنہیں زینت مراد کا بلڈ پریشر چیک کرنے جانا ہی پڑتا تھا۔

''میری کزن ہے''

''تم نے بی۔پی چیک کیا؟''

''میں ہاسپٹل میں ہوں۔ابھی رمیض نے فون کیا ہے۔''

''ارے ریمی آیا ہوا ہے۔''

''جی۔!'' باصر نے تیزی سے اُن کی بات کاٹی۔

''آپ پلیز جلدی سے گھر پہنچیں۔میں بھی آرہا ہوں۔''

ریسیور کریڈل پر ڈال کر ایک نظر اُس نے اپنے کپڑوں پر ڈالی۔شکن آلود ملگجے سے کپڑے' دو دن سے وہ ہاسپٹل نہیں جا رہا تھا۔یونہی بستر میں پڑا تھا۔ماما ضرور ٹوکیں گی۔

''مگر۔!''

ہاتھوں سے کپڑوں کی شکنیں درست کرتا میز سے گاڑی کی چابی اُٹھا کر وہ باہر نکل آیا۔وہ اور ڈاکٹر کرمانی آگے پیچھے ہی پہنچے تھے۔وہ جب پہنچا تو ڈاکٹر کرمانی اُس کا بی۔پی چیک کر رہے تھے۔اور وہ نادم صوفے پر بیٹھی تھی۔

''میں۔میں بالکل ٹھیک ہوں۔بس یونہی چکر آ گیا تھا۔'' اُس نے از حد شرمندگی سے کہا اور رمیض نے یونہی آپ کو بلا لیا۔''

''بی۔پی کتنا ہے؟''

باصر نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔وہ ڈاکٹر کرمانی کو دیکھ رہا تھا۔

''نارمل ہی ہے۔فکر کی کوئی بات نہیں۔''

پھر وہ مدحت کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

''ڈائٹنگ تو نہیں ہو رہی تھی۔''

''نہیں۔'' اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کھایا پیا کرو بے بی۔''

''جی !'' زینت مراد باصر کو دیکھ رہی تھیں۔

بڑھا ہوا شیو' ملگجے کپڑے' کہیں کہیں یہ بھی تو تبریز کی طرح۔

''یہ' یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے تم نے؟''

اُنہوں نے قدرے اونچی آواز میں کہا تو مدحت نے جو دانستہ باصر کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی چونک کر اُسے دیکھا۔

وہ بے حد تھکا تھکا اور مضمحل لگ رہا تھا۔

تو وہ بھی۔وہ بھی سوچ رہا ہے وہ بھی پریشان ہے جب ہی تو وہ گھر نہیں آرہا تھا۔

کاش۔اے کاش میں یہاں نہ آتی تو یہ اتنا اچھا' اتنا پیارا شخص یوں پریشان نہ ہوتا۔ندامت' پچھتاوا' شرمندگی بہت سارے احساسات نے مل کر ایک بار پھر اُس کے ذہن پر بوجھ ڈال دیا۔اُس نے پلکیں جھکا لیں۔

''سوری ماما۔'' وہ نڈھال سا صوفے پر گر پڑا۔

''کل نائیٹ کر کے ___ آیا تو پھر بستر سے اُٹھا ہی نہیں۔یوں ہی سُستی سی ہو رہی تھی۔''

''اوہ اچھا۔!''

اُنہوں نے ایک طویل سانس لیا۔طمانیت بھرا۔تبریز نے اُنہیں کتنا بزدل اور کمزور بنا دیا تھا۔ورنہ وہ کم ہی سوچتی تھیں۔

''تم گھر کیوں نہیں آتے' رمیض بہت محسوس کر رہا ہے''۔

تھک جاتا ہوں ماما۔اور پھر ایسا بے خبر ہو کر سوتا ہوں کہ۔''

''ایسا کرو دو چار روز کی چھٹی لے لو۔رمیض بہت تنہائی محسوس کر رہا ہے۔''

رمیض نے جو مدحت کے بالکل قریب بیٹھا اَب بھی اُس تشویش سے دیکھ رہا تھا۔چونک کر زینت مراد کی طرف دیکھا۔

''چلو ماما نے اتنا تو محسوس کیا۔''

اُس نے باصر کی طرف دیکھا۔اُترا اُترا چہرا آنکھوں میں ہلکی ہلکی سُرخی۔

''کیا آپ کچھ بیمار رہے ہیں۔بھائی۔''

وہ مدحت کے پاس سے اٹھ کر باصر کے پاس آ بیٹھا تھا۔زینت مراد ڈاکٹر کرمانی سے باتیں کرنے لگیں تھیں۔

''نہیں۔نہیں تو یار۔''

''تو پھر یہ کیا ہے؟''

اُس نے اُس کے حلیے کی طرف اشارہ کیا۔

''کچھ نہیں یار! ابھی بتایا تو ہے ماما کو تھکن ہوگئی ہے۔''

''مگر آپ اتنے تھکنے والے تو نہیں۔''

وہ جرح کر رہا تھا۔

کبھی ہو جاتی ہے تھکن اور پتا ہے' ایک لڑکی کا کیس ہے ایکسیڈنٹ کا' گوجرانوالہ کی یہ لڑکی بی۔ایس۔سی کی اسٹوڈنٹ ہے۔ماں باپ کی اکلوتی۔بیٹی۔اچھی خوش شکل بلکہ خوبصورت ہے۔اُس کی ٹانگیں بالکل کچلی گئی ہیں۔نچلا دھڑ سمجھو ختم ہو گیا ہے۔ابھی اُسے کچھ پتا نہیں ہے۔بڑی زندگی سے بھرپور باتیں کرتی ہے۔اُس کا سوچ سوچ کر بہت اَپ سیٹ ہوتا ہوں کہ جب اُسے پتا چلے گا تو اُس کی کیا فیلنگز (احساسات) ہوں گی۔''

اُس نے رمیض کا دھیان بٹانے کے لئے اتنی لمبی بات کی۔اُسے پتا تھا کہ رمیض بال کی کھال نکالتا ہے۔اور اکثر تہہ تک پہنچ بھی جاتا ہے۔

اور یہ بھی حقیقت تھی کہ اُس لڑکی کی ٹریجڈی کا سوچ کر اُسے بہت دُکھ ہوتا تھا' جب بھی وہ اُس کے کمرے میں جاتا اور وہ اُس سے پوچھتی ڈاکٹر صاحب میں کب اُٹھوں گی۔کیا میں چل سکوں گی۔تو اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اُسے کیا کہے۔اور جب ڈاکٹر زبیر نے اُس کے باپ کو بتایا تھا تو وہ کس طرح دھاڑیں مار مار کر رو دیا تھا۔

''ہاسپٹلز میں تو بڑی بڑی ٹریجڈیز دیکھنے میں آتی ہیں۔آپ کا دل اتنا کمزور ہے تو پھر آپ کر چکے ڈاکٹری' دل مضبوط کریں۔'' رمیض مسکرایا۔

''انسان ہوں ناں بابا! کبھی کبھی متاثر ہو جاتا ہوں ورنہ دل تو مضبوط ہی ہے۔''

باصر نے آنکھیں موندتے ہوئے صوفے سے ٹیک لگالی۔

''زیبی!'' مسز زینت مراد نے کولڈ ڈرنک سرو کرتی ہوئی زیبی کو پکارا۔

''مدحو کو اس وقت ایپل جوس دے دو اور آج سے یہ تمہاری ڈیوٹی ہے کہ دو تین بار اسے دن میں جوس یہ پسند کرے دیا کرو۔ اور مدحت تم چاہو تو اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔''

''جی۔!'' اُس نے اُٹھنا چاہا۔

ارے نہیں مدحو! بیٹھو یہ مووی تو میں اسپیشل تمہارے لئے لایا تھا۔''

رمیض نے اُسے اُٹھتے دیکھ کر کہا۔

مدحت وہاں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ اُس کا دل بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر خوب سار چاہتی تھی۔ تاکہ دل پر چھایا غبار چھٹ جائے۔ زینت مراد کے ہمدردانہ لہجے نے اُس کے دل کو اور گداز تھا۔ اُس کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہو رہی تھیں۔ اور آنٹی اُس کا کتنا خیال رکھتی ہیں۔

حالانکہ باصر اور رمیض کو شکوہ تھا۔ کہ وہ ماں کی طرح فکر نہیں کرتی ہیں۔ میں تو اُن کی بیٹی بھی ہوں پھر بھی۔ پھر بھی وہ کس طرح زیبی کو تاکید کر رہی تھیں۔ کہ مجھے جوس بنا کر دیا کرے۔

وہ ذرا سا اُٹھی لیکن اُسے لگا جیسے اُس کی ٹانگیں کانپ رہی ہوں۔ وہ چلی تو پھر گر جائے گی۔ پہلا وہ نادم تھی۔ کیسے اُس نے سب گھر والوں کو پریشان کر ڈالا تھا۔ یہ وقت زینت مراد کی ایکسرسائز کا تھا۔ وہ ر کے اصرار کے باوجود بھی باہر نہیں آئی تھیں۔ اور اَب۔

''بیگم صاحبہ! آپ کا بلڈ پریشر اَب تو نارمل ہے بالکل۔''

ڈاکٹر کرمانی کھڑے ہو گئے تھے۔

''احتیاط بھی تو بہت کرتی ہوں۔'' زینت مراد بھی کھڑی ہو گئی تھیں۔

''احتیاط اچھی چیز ہے۔''

ڈاکٹر کرمانی ہنسے۔ مدحت کا ضبط جواب دے گیا اور آنسو رخساروں پر پھسل آئے تھے۔ اُس کن اکھیوں سے باصر کی طرف دیکھا۔ جو آنکھیں موندے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز سا رمیض اُس کی طرف پشت کیے فلم ریوائنڈ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کرمانی اور زینت مراد باہر جا رہے تھے۔ اُسے ا اوپر اختیار نہیں رہا تھا۔ ایک بار جو آنسوؤں نے حد توڑی تو پھر بس بہتے ہی جا رہے تھے۔ وہ ہاتھوں کی پشت اُنہیں پونچھتی جا رہی تھیں۔ مگر وہ بڑی روانی سے بہے۔ چلے جا رہے تھے۔

اندر داخل ہوتے تمریز کی نگاہ اُس پر پڑی تھی' خاموشی سے آنسو بہاتی۔ اُس روز جب اُس اُسے دیکھا تھا تب بھی وہ رو رہی تھی۔ اور آج بھی اُس کی آنکھوں میں حیرت سی۔ اُتر آئی تھی۔ وہ ایک آگے بڑھا اور اُسی لمحے زینت مراد کی نگاہ اس پر پڑی۔

''تمریز! کہاں چلے گئے تھے تم بغیر بتائے''

اُن کی آواز گو آہستہ تھی لیکن لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

''میں میاں جی سے ملنے گیا تھا۔ اُنہوں نے پھر آنے ہی نہیں دیا۔''

''کم از کم بتا کر تو جاتے' تمہارے پاپا پریشان ہو رہے تھے۔''

زینت مراد کے اندر یہاں سے وہاں تک یکدم طمانیت اور سکون سا بھر گیا۔ بے شک وہ اظہار نہیں تھیں۔ اُن کے روزمرہ معمول میں بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ لیکن اندر سے وہ پریشان تھیں۔ کہ کہیں تمریز پھر اعتبار تھا۔ ڈاکٹر کرمانی نے بھی تو کہا تھا کہ ایسا شخص۔ زندگی میں پھر کبھی بھی اچانک نشہ شروع کر سکتا ہے۔

''ہیلو۔!'' ڈاکٹر کرمانی نے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''وہ السلام علیکم!'' تمریز نے چونک کر اُنہیں دیکھا۔

''سب خیریت تو تھی۔؟''

''ہاں وہ ذرا مدحت کی طبیعت اَپ سیٹ تھی۔''

زینت نے بتایا۔

''مدحت!'' اس کی نگاہیں پھر مدحت کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ اسی طرح ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے بے آواز رو رہی تھی۔

''کیا ہوا؟''

وہ بے اختیار دو تین قدم آگے مدحت کی طرف بڑھا۔

عین اسی وقت باصر نے بھی آنکھیں کھول کر تمریز کو اور پھر آنسو بہاتی مدحت کی طرف دیکھا۔ ض بھی بھائی کی آواز سُن کر پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگا تھا اور پھر دونوں کی زبان سے بیک وقت نکلا۔

''کیا ہوا مدحو؟''

اور دونوں ہی ایک ساتھ مدحت کی طرف بڑھے تھے۔

اور ضبط کی لگامیں مدحت کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر زور زور رونے لگی۔ اونچا اونچا' ڈاکٹر کرمانی بھی پلٹ آئے تھے۔ تمریز وہیں حیران سا کھڑا تھا۔ رمیض بالکل اُس قریب بیٹھ گیا تھا۔ اور اُس نے اپنا' ایک بازو اُس کے گرد حمائل کر دیا تھا۔

''کیا ہوا مدحو۔ کہیں تکلیف ہے۔ بتاؤ نا پلیز۔'' ڈاکٹر کرمانی نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ اُسے نے دیں۔

''اس کے دل پر شاید کوئی بوجھ ہے۔ رونے سے ہلکا ہو جائے گا۔''

''شاید وہ میاں جی کو مس کرتی ہے''

بیگم زینت مراد نے بتایا۔

''بچپن سے اُن کے پاس رہی ہے اور اَب پڑھائی کے لئے یہاں آئی ہے''۔

''تو اسے کچھ دن کے لئے شاہ پور بھجوا دیں۔''

ڈاکٹر کرمانی نے مشورہ دیا۔

''ہاں لیکن اُس کی پڑھائی کا حرج ہوگا۔ چھٹیوں میں چلی جائے گی۔''

''کیا بات ہے بیٹا! کچھ بتاؤ کیا ہو رہا ہے۔ کہیں درد ہے؟''

تھوڑی دیر بعد جب اُس کے آنسو تھمے ڈاکٹر کرمانی نے پوچھا۔

''نہیں' درد نہیں ہے۔ بس پتا نہیں کیا ہو رہا ہے''

اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے شرمندگی سے کہا۔

''سوری میں نے آپ کو پریشان کیا''۔

''ارے کوئی بات نہیں بیٹا۔ تمہیں کوئی پریشانی ہے تو کسی نے کہہ دو۔ یہ سب تمہارے بہن بھائی ارے سونی بیٹی نظر نہیں آ رہی۔''

وہ یونیورسٹی گئی ہے'' رمیض نے بتایا۔

''میں اَب جاؤں بیگم صاحب۔''

ڈاکٹر کرمانی نے اجازت چاہی تو بیگم زینت مراد نے مدحت سے پوچھا۔

''تم اَب بالکل ٹھیک ہونا۔ ریلیکس ہوجاؤ جان۔ اگر میاں جی کے لئے اُداس ہوتو رمیض کے ساتھ دو دن کے لئے چلی جاؤ۔''

''نہیں۔ نہیں، ابھی تو میاں جی مل کر گئے ہیں میں اَب بالکل ٹھیک ہوں۔ بس پتا نہیں کیوں رہا تھا۔''

''یہ فلم دیکھو۔ دل کا گھبرانا سب ختم۔''

رمیض نے اُسے ہنسانے کی کوشش کی۔

''دیکھو تو ہیرو کیسے ناچ ناچ کر ہیروئن کو اپنی محبت کا یقین دلا رہا ہے۔ کیا محبت کا یقین دلانے کے لئے ناچنا بہت ضروری ہوتا ہے باصر بھائی؟''

بات کرتے کرتے وہ باصر کی طرف مڑا جو ابھی تک مدحت سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا گلدان کے پھولوں کو گھور رہا تھا۔ رمیض کی بات پر اُس نے چونک کر رمیض کی طرف دیکھا۔

''اور کیا آپ نے بھی کبھی کسی کو' کسی حسین لیڈی ڈاکٹر کو اپنی محبت کا یقین یوں ناچ ناچ کر دلایا ہے۔''

باصر کی نگاہیں بے اختیار مدحت کی نظروں سے اُلجھیں جس کی آنکھیں پھر جھلملا گئی تھیں۔ دل لمحہ بھر کو بے اختیار سا ہوا لیکن پھر وہ سنبھل گیا۔

''برخوردار! تم ایسا ہی کرنا۔''

وہ پیچھے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''آپ کھڑے کیوں ہیں۔ تبریز بھائی بیٹھ جائیں نا۔''

''اوہ ہاں!'' وہ چونک کر بیٹھ گیا۔

مدحت کیوں رو رہی تھیں۔ اُس دن بھی اور آج بھی۔ میں نے اُسے کہا تو تھا کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ پھر شاید وہ میری بات نہیں سمجھتی۔ وہ اسی لئے پریشان ہوگی۔ ڈاکٹر کرمانی بھی تو کہہ رہے تھے کہ بوجھ ہے۔ ذہن پر۔ ماما کی بات نے اُسے یقیناً پریشان کر رکھا ہے۔ سوچتی ہوگی کیسے شخص کو میرے لئے منتخب کیا جارہا ہے۔ جو عادی ہے اور وہ اسی لئے تو میاں جی کے پاس گیا تھا۔ کہ اُنہیں شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ بتادے۔ جو کے ساتھ بیتا تھا۔ سب کچھ وہ بے قصور تھا۔ لیکن اَب وہ اُس جال میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ اُس نے سوچا میاں جی سے درخواست کرے گا۔ کہ وہ ماما سے کہہ دیں۔ کہ مدحت اور تبریز کا اَب کوئی جوڑ نہیں۔ اور یہ کہ وہ۔

اُس نے نگاہ اُٹھا کر مدحت کی طرف دیکھا۔ یہ معصوم سی سادا دل لڑکی۔

رونے سے جس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ اور رخسار سرخ ہو رہے تھے۔

اس لڑکی کو اُس نے بچپن میں دیکھا تھا۔

اور جب وہ یہاں سے گیا تھا تب بھی وہ کوئی اتنی بڑی نہیں تھی یہی گیارہ بارہ برس کی ہوگی۔ جب سے میاں جی نے مراد علی اور زینت مراد سے کہا تھا کہ مدحت اُن کی بہو بنے گی۔ تبریز اُنہیں بہت عزیز تھا۔ اور ماما اور ڈیڈی نے میاں جی کی بات کو بخوشی مان لیا تھا۔ تب سے اس نے اُسے دیکھا نہیں۔ وہ میاں جی سے ملنے جاتا تھا لیکن باہر باہر سے ہی مل کر چلا آتا تھا۔

اور میاں جی نے بھی کبھی نہیں کہا تھا۔ خود اسے میاں جی کا لحاظ تھا۔ اور یوں اُس کے دل میں کبھی اُسے دیکھنے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ بس اسے یقین تھا کہ میاں جی کے زیر سایہ۔ پلنے والی مدحت بہترین شریک زندگی ہوگی۔ ہاں ایک بار ایک بار جب وہاں نیوجرسی میں اپنے اپارٹمنٹ میں احسن ملک کی فضول بکواس سے تنگ آکر اُس نے کہا تھا کہ وہ انگیجڈ ہے۔ اور یہ کہ وہ کسی جینی مِنی کی وقتی رفاقت حاصل کر کے اپنی منگیتر کے ساتھ DISHONESTY بددیانتی نہیں کر سکتے تو احسن ملک اُن کے کان کھا گیا تھا پوچھ پوچھ کر کہ وہ کیسی ہے۔؟''

یقیناً بہت خوبصورت ہوگی

کسی ماورائی حسن کی مالک تب ہی تو تم اتنی دور ہو کر بھی اُس کے سحر میں ہو۔''

اور وہ اُسے کچھ نہیں بتا سکا تھا۔ تب بے اختیار اُس کا جی چاہا تھا کہ وہ اُسے دیکھے کہ اَب وہ کیسی ہو گئی ہے۔ بچپن میں تو بہت پیاری ہوا کرتی تھی۔ اور اَب جب کہ اُس نے اُسے دیکھا تھا تو اُس کے دل میں اُس کے لئے وہ جذبے نہیں تھے۔ بلکہ اُس نے خود اس جذبہ کو پیدا ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ خود کو ہرگز ہرگز اُس کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن یہ بات وہ میاں جی سے نہیں کہہ سکا تھا۔

حالانکہ بطورِ خاص وہ اس لئے شاہ پور گیا تھا مگر میاں جی اُسے دیکھ کر اتنا خوش ہوئے تھے کہ وہ اُن کی خوشی مٹانے کی ہمت نہ کر سکا تھا وہ کتنے سالوں بعد شاہ پور گیا تھا لیکن شاہ پور بالکل ویسا ہی تھا۔ میاں جی بالکل پہلے کی طرح دری پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے تھے اور اُن کے پاس اُن کے عقیدت مند تھے۔ اور وہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں ہولے ہولے بول رہے تھے۔ اور عقیدت مند دھیان سے سن رہے تھے۔ وہ کوئی گدی نشین پیر نہ تھے۔ لیکن پھر بھی دور دور کے گاؤں تک سے لوگ آتے تھے۔ اور لنگر چلتا رہتا تھا۔ قیام اور طعام کا بندوبست تھا۔ ہمیشہ کی طرح میاں جی اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا تھا۔ اُس کی پیشانی چومی تھی۔ اور ہاتھ پکڑے اُسے اندر لے آئے تھے۔

''تم بیٹھو ادھر میں دو نفل شکرانے کے پڑھ لوں۔''

وہ اُس کے آنے پر کتنا خوش تھے۔ ڈاکٹر شاہ کو اُنہوں نے کوئی تین بار بتایا تھا۔ تبریز کتنے سالوں بعد ادھر آیا ہے اور وہ اُن کی خوشی کو قتل نہ کر سکا۔ اُس نے میاں جی کو برسوں بعد اتنا خوش دیکھا تھا۔

جب سے ماں جی کا انتقال ہوا تھا تب سے وہ کچھ چُپ چُپ رہنے لگے تھے۔ لیکن ماں جی کے انتقال کے بعد پہلی بار اُس نے اُنہیں گنگناتے ہوئے سُنا تھا۔ وہ رات کو چارپائی پر لیٹے تو بڑے جذب سے گا رہے تھے۔

اک الف پڑھو چھٹکارا اے

اک الفوں دو تین چار ہوئے

پھر لکھ کروڑ ہزار ہوئے !

پھر اوتھوں باجھ بے شمار ہوئے

اک الف دا نکتہ نیارا اے

وہ اُن کے ساتھ والی چارپائی پر آنکھیں موندے چپ چاپ اُنہیں غلام فرید کا کلام گاتے سُنتا رہا۔ اور لفظ ڈھونڈتا اور سوچتا رہا۔ پھر یونہی سوچتے سوچتے سو گیا۔

جب ماں جی زندہ تھیں۔

اور وہ یا ڈیڈی گاؤں جاتے تھے تو میاں جی بہت خوش ہوتے تھے۔ اور رات کو یونہی چارپائی پر لیٹ کر بڑے جذب سے گاتے تھے۔ اک الف پڑھو چھٹکارا اے۔''

اُن کی آواز میں بڑا سوز تھا۔ اور جب گاتے گاتے اچانک رُک جاتے تو ماں جی ذرا سا انتظ[ار]
کرتیں۔

"آپ چپ کیوں ہوگئے" میاں جی؟"

"ہاں" وہ چونک کر پھر گانے لگتے تھے تین دن اسی کشمکش میں گذر گئے تو اُس نے سوچا چلو پھر کبھی
پھر کبھی دو چار روز بعد آ کر میاں جی سے بات کروں گا۔ اور جب وہ واپس آ رہا تھا۔ تو میاں جی نے پہ[لی]
بار مدحت کی بات کی تھی۔

"مدحت کو میں نے تمہاری ماں اور باپ کے اصرار پر وہاں بھیج دیا ہے۔ تعلیم اچھی چیز ہے۔ ا[ور]
مدحت پر مجھے اعتبار ہے"۔

"میاں جی!"

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اُنہوں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"فکر نہ کر بیٹا! سب ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ دُعائیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ سُننے
والا سُنتا ہے۔"

میاں جی کیسے تھے۔؟"

بیگم زینت مراد ڈاکٹر کرمانی کو خدا حافظ کہہ کر پلٹ آئی تھیں۔

"ہاں!" اُس نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک تھے بالکل۔"

"آپ' آپ شاہ پور گئے تھے۔"

مدحت نے جھلملاتی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

"ہاں اور میاں جی بالکل ٹھیک تھے اور خوش۔ میں تین دن اُن کے پاس رہا۔ ڈاکٹر شاہ محمد تمہیں یا[د]
کرتے تھے۔"

"اچھا!" وہ ایک دم خوش نظر آنے لگی۔

"اور وہ بھاگاں کیسی تھی؟"

"اور بابا رحمت؟"

"اور وہ؟"

وہ ایک ایک کا نام لے کر اشتیاق سے پوچھ رہی تھی اور تبریز سب کے بارے میں بتا رہا تھا۔ بیگ[م]
زینت مراد نے گہری نظروں سے تبریز کی طرف دیکھا۔ صاف ستھرے بے شکن لباس میں وہ پچھلے کئی دنوں کی
نسبت بہت بہتر لگ رہا تھا وہ جو ہر وقت اُس کی پیشانی پر فکر و تردد کی لکیریں چھائی رہتی تھیں اس وقت نہیں تھیں
وہ بہت دلچسپی سے مدحت کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔

اور یہ اُن کا سب سے خوبصورت' سب سے ذہین بیٹا تھا۔ اور جانے اُس کو کسی کی نظر لگ گئی تھی۔
اُس کے چہرے کی صحت مندانہ چمک ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ ابھی بھی اُس کی آنکھوں کی [...]
میں تھکن تھی۔ اور بیزاری سی۔ لیکن پھر بھی وہ پہلے سے بہتر تھا۔ بہت بہتر اگرچہ آنکھوں کے حلقے ابھی کم نہیں
ہوئے تھے۔ لیکن چہرے کی زردی میں کچھ سرخی جھلکنے لگی تھی۔ اُن کے دل میں درد سا اُٹھا۔
پتا نہیں یہ کس جرم کی سزا ملی تھی اُنہیں۔

جب میاں جی نے کہا تھا مدحت کے لئے تو وہ انکار نہ کرسکی تھیں۔ لیکن دل میں اُنہوں نے سوچا
[ض]رور تھا کہ اُن کے اتنے خوبصورت' اتنے لائق بیٹے کے لئے مدحت کسی صورت مناسب نہیں۔ کیسا شہزادوں
[جیس]ا لگتا ہے۔ ہاں باصر یا رمیض جو بھی ہو۔ لیکن دل کی بات اُنہوں نے زبان سے نہیں نکالی تھی۔ سوچا تھا۔
[و]قت آنے پر دیکھا جائے گا۔

کیا خبر خود تبریز ہی انکار کردے اور وہ!

مگر اَب!

اُنہوں نے ایک نظر پھر مدحت پر ڈالی۔

مدحت سے بہتر اور کوئی لڑکی نہیں تھی۔ جو تبریز کا ساتھ دے سکتی۔ کیا خبر کب تبریز اُن کے ہاتھوں
سے نکل جائے کب پھر۔ اس لئے وہ چاہتی تھیں کہ تبریز اور مدحت کی منگنی کا جلد از جلد اعلان ہوجائے اُنہوں
نے مسز وہاب کی آنکھوں میں مدحت کے لئے پسندیدگی دیکھی تھی کیا خبر مراد علی کے دل میں بھانجی کی محبت جوش
مارنے لگے اور وہ تبریز کو اُس کے لئے مناسب نہ سمجھیں کیا پتا میاں جی ہی انکار کردیں۔

تھی تو وہ اُن کی بھی بھتیجی لیکن وہ جذباتی محبتوں سے دور رہی تھیں۔

بہتر ہے منگنی پر ہی نکاح بھی کردیا جائے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اُنہوں نے سوچا اور طمانیت سے
مسکراتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ماما! بیٹھیں نا۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ سب بیٹھے ہوئے ہیں۔ تبریز بھائی بھی ہیں۔"

رمیض نے بچوں کی طرح ضد کی۔

"فضول باتیں نہ کیا کرو۔ ریمی! ابھی مجھے اپنی ایکسر سائز کرنی ہے۔"

زینت مراد اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئیں۔ تو رمیض نے بُرا سا منہ بنا کر مدحت کی طرف دیکھا۔

اگر بھاگاں کی بھینس' رجو کی مرغیوں' رحمت بابا کی بکریوں کی خیریت پوچھی جاچکی ہو تو ہم بھی کچھ
پوچھ لیں۔" وہ جھینپ گئی۔

"ایویں ہی میں نے کب مرغیوں اور بکریوں کا حال پوچھا ہے۔" تبریز نے سوالیہ نظروں سے اسے
دیکھا۔

"آپ ڈاکٹر شاہ سے ملے تھے؟"

"ہاں۔" تبریز نے جواب دیا۔

"کیا وہ سچ مچ فیس کی جگہ انڈے وصول کرتے ہیں؟"

"تمہیں یقین کیوں نہیں رمیض؟"

مدحت نے اُس کی طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر شاہ بہت گریٹ انسان ہیں اور بہت دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔" باصر نے رائے دی۔

"وہاں بہت غربت ہے۔ ریمی!"

تبریز کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ اُس نے میاں جی کے ساتھ کیا کیا پروگرام نہیں بنائے تھے۔ وہا[ں]
لڑکیاں گھروں میں قالین بنتی تھیں۔ یہاں لاہور سے قالینوں کے بڑے تاجر اُنہیں سامان دینے آتے تھے۔
اور وہ کئی کئی سالوں کی محنت سے ایک قالین تیار کرتی تھیں۔ اور اُنہیں اس محنت کا کتنا کم معاوضہ دیا جاتا تھا۔ اور
وہ قالین یہاں لاہور میں تیس تیس' بیس بیس ہزار کا فروخت ہوتا تھا۔ وہ سوچتا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر وہ یہاں

قالین بانی کا ایک کارخانہ بنوائے گا۔

اوران لڑکیوں کو ان کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا جائے گا۔ وہ یہاں ایک انڈسٹریل ہوم قائم کر
گا۔ اور نہ جانے کیا کیا۔

''یہ فلمیں کس قدر مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ تیمی بھائی۔''

رمیض اس سے کہہ رہا تھا۔

''ہاں!'' اُس نے چونک کر اُسے دیکھا۔

مدحت ہنس رہی تھی۔ باصر کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

اور یہ ماحول۔ اس طرح سب بہن بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر ہنسنا بولنا۔ کیسا خواب وخیال ہو گیا
اور وہاں امریکہ میں اکثر وہ ریمی اور باصر کی باتیں یاد کر کے ہنسا کرتا تھا۔ سونیا اور ریمی کی جھڑپیں۔ آگے آ
ریمی ہوتا اور پیچھے پیچھے سونی اُس کا کان پکڑنے کے لئے بھاگ رہی ہوتی تھی۔ اور آج اتنے سارے سا
بعد وہ اُن سب کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ مگر شاید ہمیشہ ایسا نہ ہو۔ کسی دن ہاں کسی دن وہ اُن سب کے درمیا
سے اچانک چلا جائے گا۔ کسی نامعلوم منزل کی طرف شاید موت کی منزل۔

دنیا کے کسی بھی ملک کی کسی جیل میں یہ موت اُس کی منتظر تھی۔

اور وہ۔

نہ جانے کس قصور کی سزا ملی تھی اُسے۔ وہ قصور، سزا و جزا کے متعلق سوچ سوچ کر تھک گیا تھا۔ اُ
کچھ سمجھ نہیں آتا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ بغیر کسی قصور کے مارا گیا تھا۔

بغیر کسی جواز کے

اُن دنوں وہ کتنا خوش نظر آتا تھا۔

امتیازی حیثیت کے ساتھ ایم بی۔ اے کرنا اُس کا خواب تھا۔ اور یہ خواب پورا ہو گیا تھا۔ اور ا
اس نے یورپ کی سیر کا پروگرام بنا لیا تھا۔ مراد علی نے بخوشی اُسے اس کی اجازت دے دی تھی۔ اُس کا دو
احسن ملک واپسی کی تیاریاں کر رہا تھا۔

''چلو یار! آج تم بھی قسم توڑ ہی دو۔''

بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے احسن ملک نے اُس کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب؟''

''ذرا جینی کی طرف چلتے ہیں۔ جینی نے بطور خاص تمہیں لانے کیلئے کہا تھا۔ اُس کے ہاں
پارٹی ہے۔''

''تم ہو آؤ یار۔''

اُس نے بیزاری سے کہتے ہوئے کمبل اوڑھ لیا۔

''جینی کے ہاں کی پارٹیاں بہت پر لطف ہوتی ہیں یار! پچھلے سال ہیپی نیو ایر کے سلسلے میں پار
کبھی نہیں بھولوں گا۔ چلو نا تبریز!''

احسن نے ضد کی۔

''اب کون سا تمہیں پڑھنا ہے۔ فارغ ہو کل پرسوں یہاں سے چلے جاؤ گے۔ کون سا جینی یا
کی فرینڈز تمہارے ساتھ چپک جائیں گی۔''

''یار! موڈ نہیں ہو رہا''

اُس نے کروٹ بدل لی۔

''یار تبریز!''

احسن نے اُس کا کمبل کھینچ لیا۔

''یہاں میری آخری رات ہے' کل صبح میں چلا جاؤں گا۔ اُٹھو نا۔ کیا بیزاری پھیلا رہے ہو۔ چلو باہر
ہیں۔ ذرا گھومتے پھرتے ہیں۔ پھر رات کو تم مجھے جینی کی طرف ڈراپ کر کے واپس آ جانا۔ صبح دس بجے تو
ٹ ہے میری میں صبح صبح پہنچ جاؤں گا۔ پیکنگ میں نے کر لی ہے۔ ساری۔''

اور وہ احسن کے بے حد اصرار پر اُس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ وہ دیر تک گھومتے رہے تھے۔ احسن نے
ی بہنوں کے لئے کچھ اور شاپنگ کی تھی۔ پھر جب رات گہری ہونے لگی تھی تو وہ اُسے جینی کے ہاں ڈراپ کر
واپس آ رہا تھا اور ڈرائیو کرتے ہوئے اچانک ہی اُسے مدحت کا خیال آ گیا تھا۔

مدحت! اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

تو پاکستان جا کر زندگی کا نیا باب شروع ہو گا۔

اور وہ کتنی خوش ہو گی جب میں اُسے بتاؤں گا کہ میں نے اپنے اس پانچ سالہ قیام میں ایک دن بھی
اُس کے ساتھ DIS HONESTY (بددیانتی) نہیں کی۔ حتیٰ کہ مارتھا جیسی لڑکی کو بھی دھتکار دیا تھا۔ حالانکہ
ن اور ناصر نے اُسے کتنا اُکسایا تھا۔

''یار تمہارا کیا جاتا ہے' بے چاری کے ساتھ ہنس بول لیا کرو۔ کیسے بھاگ بھاگ کر تمہاری طرف
ی ہے۔''

اور یہ تھی بھی حقیقت کہ اُسے دیکھتے ہی مارتھا کی آنکھیں چمک اُٹھتی تھیں۔ والہانہ نظروں سے وہ
دیکھتی اُس سے کھلے لفظوں میں اظہار محبت کرتی تھی۔ وہ گھبرا جاتا۔

جینی نے اُس سے مارتھا کا تعارف کروایا تھا۔ پتا نہیں وہ وہاں پڑھتی تھی یا جینی کی سہیلی تھی۔ اُس
اُس کے بارے میں جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ جینی اُن کی کلاس فیلو تھی اور احسن کی دوست وہ اکثر
کے اپارٹمنٹ میں آ دھمکتی۔ وہ بہت چڑتا تھا۔ اُسے مارتھا جیسی لڑکیاں بہت بُری لگتی تھیں۔

کئی بار اُس نے نرمی سے اُسے سمجھایا تھا۔ کہ وہ لڑکیوں سے دوستی پسند نہیں کرتا۔ کئی بار تو مارتھا کے
سے باہر سے وہ کمرا لاک کروا دیتا۔ اور خود اندر بیٹھ کر پڑھتا رہتا تھا۔ احسن اور ناصر اُس کی اس حرکت پر
ہنستے تھے۔

''یار! اتنی پیاری تو ہے مارتھا۔ تم خواہ مخواہ ہی اُس سے ڈرتے ہو۔ انجوائے کرو ڈیر۔''

''تم اس پیاری لڑکی سے میرا پیچھا نہیں چھڑوا سکتے!''

اور تب اُس کے کہنے پر احسن نے جینی سے کہا تھا کہ وہ مارتھا کو منع کر دے کہ وہ تبریز کے اپارٹمنٹ
نہ آیا کرے۔

اور جینی کے منع کرنے پر ہی شاید وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اُس کے کمرے میں آئی تھی۔

''تم۔ تم غلیظ مشرقی۔ تم چیز کیا ہو۔ تم نے میری توہین کی ہے۔ میں تمہیں اس کا مزا چکھاؤں گی۔
تمہیں بتاؤں گی کہ مجھے ٹھکرانے کا کیا مطلب ہے۔''

وہ حیران سا اُس کا لال بھبھوکا چہرا دیکھتا رہا تھا اور سوچتا رہا تھا کہ شاید وہ نشے میں ہے۔ اس لئے

استنے غصے میں ہے۔

اور پھر بہت دیر تک اُلٹی سیدھی ہانکنے کے بعد پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی تھی۔ اور اُس کے
کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ اور اس بات کو سال سے زیادہ کا عرصہ ہونے والا تھا۔

مارتھا بدصورت نہ تھی۔ اچھی شکل کی بلکہ دلکش لڑکی تھی۔

لیکن اُس نے اپنے آپ کو کتنا کم قیمت کر رکھا تھا لیکن ہر مغربی لڑکی مارتھا نہیں ہوتی۔ اُس
ساتھ کئی لڑکیاں پڑھ رہی تھیں۔ سلجھی ہوئی سمجھدار۔

مگر مدحت۔ مدحت تو ان سب سے مختلف ہوگی۔

کسی کے ایک وعدے پر
کئی بانہوں کو چھوڑا ہو
کئی خوابوں کو توڑا ہو

وہ ہولے ہولے گنگناتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا کہ وہ لڑکی ایک دم ہی سامنے آ گئی۔ گھبرا کر اُس نے بریک
لگائی تھی اور دروازہ کھولا۔ اور دروازہ کھلتے ہی دو ہاتھوں نے اُسے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔ پہلا خیال جو اُس کے ذہن میں
وہ یہی تھا کہ شاید یہ کالے ہیں جو اُس لُوٹ کر یہاں اس ویران علاقے میں پھینک کر چلے جائیں گے۔ ایسے کیس
ہوتے رہتے تھے۔ احسن کے ایک پاکستانی دوست کے ساتھ جو ٹیکسی چلاتا تھا پچھلے دنوں ایسا ہی ایک واقعہ پیش آ چکا
نہ صرف یہ کہ ان آوارہ کالوں نے اُس سے ساری نقدی چھین لی تھی بلکہ اُسے زخمی کر کے سڑک پر پھینک گئے تھے
ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اُن سے کیا معاملہ کیا جائے کہ پیچھے سے کسی نے اُس کے سر پر زوردار ضرب لگائی اور وہ لہرا کر
گر پڑا۔ اور جب دوبارہ اُس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ لمحہ بھر تو وہ یونہی حیران حیران سا لیٹا رہا
اُسے گذشتہ رات کو واقعہ یاد آیا۔ وہ احسن کو جینی کے گھر چھوڑ کر آ رہا تھا اور بے اختیار اُس کا ہاتھ سر کے پیچھے گیا۔ درد کی
ایک ٹیس سی اُٹھی۔ سر کے پیچھے ایک اور سر نمودار ہو چکا تھا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

وہ وہاں سڑک پر گر گیا تھا۔ یقیناً یہ کالوں کی شرارت ہوگی۔ اُنہوں نے اُسے لوٹ کر وہیں پھینک دیا ہو
گا۔ اور وہاں سے کوئی شریف آدمی اُسے اُٹھا لایا ہوگا۔ لیکن پھر اُس کی نظر اپنی گھڑی پر پڑی جو اسی طرح کلائی پر
تھی۔ اُس نے اپنی پاکٹ کو ٹٹولا۔ پرس جیب میں موجود تھا۔ بے اختیار نکال کر کھولا۔ رقم اسی طرح محفوظ تھی۔ پھر

وہ بیڈ سے نیچے اُتر آیا۔

اُسے زخمی کرنے والے کون لوگ تھے۔؟

اور وہ کہاں ہے۔؟

اُس نے اُٹھ کر دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ باہر سے لاک تھا۔

اوہ تو کیا وہ قیدی ہے؟

لیکن کن لوگوں کا؟

اُس کا تو کوئی دشمن نہ تھا۔

پھر اس اجنبی ملک میں جہاں اُسے کوئی جانتا بھی نہ تھا' اپنے ملک میں ہوتا تو سوچتا کہ شاید اُسے
برائے تاوان کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر وہ واپس بیڈ پر بیٹھ گیا۔ پتا نہیں کتنا وقت گذر گیا
اُس نے وقت دیکھا۔ چار بجے تھے صبح ہونے والی تھی۔

احسن اسے نہ پا کر کس قدر پریشان ہوگا۔

اُسے اُس کے ساتھ ایئر پورٹ بھی جانا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ سات بجے نکل پڑیں گے۔ پتا نہیں
احسن کیا سوچے گا۔ اُسے تلاش کریگا یا چلا جائیگا۔ احسن کے جانے کے بعد اُس کا اپنا ارادہ بھی تو فرانس جانے کا
تھا۔ اور اپنے فرانس کے پروگرام کے متعلق وہ گھر لکھ چکا تھا۔

پتا نہیں کون لوگ ہیں۔ اور کس غلط فہمی میں اُسے پکڑ لائے ہیں۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ کبھی
وہ ٹہلنے لگتا کبھی بیٹھ جاتا۔ سر میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

خدا خدا کر کے باہر آہٹ ہوئی۔ پھر دروازہ کھلا۔ اندر آنے والا ایک سیاہ فام ہی تھا۔ موٹے
موٹے ہونٹ' غلیظ آنکھیں۔ گھنگریالے بال۔

اُس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ جس میں چائے کا ایک کپ اور دو سلائس رکھے ہوئے تھے۔

وہ بے اختیار آگے بڑھا۔

''تم تم لوگ مجھے یہاں کیوں لے آئے ہو۔

میرے پاس پانچ سو ڈالر ہیں اور یہ میری ریسٹ واچ بھی بہت قیمتی ہے۔ یہ تم لے لو اور مجھے
جانے دو۔''

وہ ہاتھ سے گھڑی اُتارنے لگا۔

لیکن وہ سیاہ فام ٹرے اُس کے بیڈ کی سائیڈ پر رکھ کر بنا جواب دیئے واپس مُڑ گیا۔

''سنو۔ سنو۔!''

وہ اُس کے پیچھے لپکا۔ لیکن اُس نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

اُس نے غصے سے دروازے پر مکے برسائے۔ زور زور سے اُسے آوازیں دیں۔ لیکن اُس کے
قدموں کی آہٹ ہولے ہولے دُور ہوتی گئی۔ وہ جھنجلا کر واپس بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔

لمحہ بھر چائے کے کپ کو دیکھتا رہا اور پھر اُسے اُٹھا لیا۔ اِس وقت اُسے چائے کی ضرورت محسوس ہو
رہی تھی۔

چائے پیتے ہی اُس کا سر چکرانے لگا تھا۔ دو منٹ وہ اپنے گھومتے ہوئے سر کو پکڑ کر بیٹھا رہا۔ پھر
لیٹ گیا اور جلد ہی اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

اَب کے اُس کی آنکھ باتوں کی آواز سے کھلی تھی۔ اُس کے بالکل سامنے بیڈ کے پاس کرسی رکھے
یقیناً وہ مارتھا ہی بیٹھی تھی۔ نیلی جینز سُرخ شرٹ اور سرخ ہی اسکارف باندھے وہ بہت ہی فریش لگ رہی تھی۔
اُس کے قریب ہی دو ادھیڑ عمر کے امریکی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ یکدم اُٹھ بیٹھا۔

''مارتھا تم؟''

''تم نے پہچان لیا؟''

اُس کے لبوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ تھی۔

''میں تو سوچ رہی تھی کہ شاید مجھے اپنا تعارف کروانا پڑے گا۔''

''نہیں خیر میری یادداشت اتنی بھی کمزور نہیں۔''

وہ مسکرایا۔ مارتھا کو دیکھ کر اُس کے اندر سکون سا اُتر آیا تھا۔

''تم اچانک کہاں چلی گئی تھیں۔ اور اَب یہاں کیسے ہو؟ کیا تم مجھے سڑک سے اُٹھا کر لائی تھیں؟ کچھ
لٹیرے شاید مجھے لوٹنا چاہتے تھے۔ لیکن شاید تم لوگوں کو آتے دیکھ کر وہ بھاگ گئے ہوں گے۔

تھینک یو مارتھا۔ تھینک یو ویری مچ۔ اَب مجھے اجازت دو' آج احسن کی فلائیٹ تھی۔ وہ پریشان رہا ہوگا۔"

وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

"میں ایک چھوٹے سے جرم کی پاداشت میں جیل چلی گئی تھی۔ اور دو روز قبل ہی رہا ہوئی ہوں۔"

"کیا جرم!"

"ایک معمولی سا روڈ ایکسیڈنٹ اور شکر ہے تم ابھی تک یہاں ہی ہو۔ میری خواہش تھی کہ جیل سے نکلنے۔۔ کے بعد تم سے ملاقات ضرور ہو۔"

"اوہ مارتھا!" وہ ہنس دیا۔

"اس ایک سال نے تمہیں ذرا بھی نہیں بدلا۔" جواب میں وہ اُسے گھورتی رہی۔ اُس کی آنکھوں میں کتنی نفرت' کتنا غصہ تھا۔ کتنی تپش تھی۔ تبریز نے جھرجھری سی لی۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔"

"نہیں۔" وہ غرآئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" میں تمہیں اس لئے نہیں اُٹھوا کر لائی کہ تمہیں واپس بھیج دوں تبریز علی۔

"مارتھا! کیا یہ مذاق ہے۔؟"

"نہیں۔" اُس کی آنکھوں میں نفرت ہی نفرت تھی۔

"تم نے میری توہین کی تھی۔"

"نہیں۔ نہیں تو۔"

تبریز کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مارتھا نے اُسے کیوں اُٹھوایا ہے اور اَب وہ اُس کے ساتھ کیا کرے گی۔ کیا مار ڈالے گی۔ قتل کر کے لاش کہیں پھینکوا دے گی۔ اور اخباروں میں چھپے گا کہ ایک پاکستانی کو کسی نے قتل کر دیا۔ اور اس کے ماما' پاپا' باصر' رمیض' سونیا سب انتظار کرتے رہ جائیں گے۔

اور وہ کبھی لوٹ کر نہیں جائے گا۔

کبھی نہیں۔

میاں جی اور مدحت۔

اُس لمحے اُس کی آنکھوں کے سامنے سب کے چہرے باری باری آنے لگے۔

اُس اجنبی ملک میں وہ مر جائے گا۔ اور کسی کو خبر تک نہ ہوگی۔

کیا خبر احسن نہ گیا ہو۔ اُس نے سیٹ کینسل کروا دی ہو۔ اور اخبار میں میری تصویر دیکھ کر میرے قتل کی خبر پڑھ کر مجھے پہچان لے اور پھر گھر خبر کر دے۔ اور وہاں وہ سب ماما' پاپا' باصر' رمیض سب کے سب؟

"کیا تم مجھے قتل کر دو گی۔"

"نہیں" اُس نے تبریز کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں زندگی کو تمہارے لئے سزا بنا دوں گی۔

ایسی سزا کہ تم موت کی تمنا کرو گے اور موت تم سے دور بھاگے گی۔"

کیا ایسا ممکن تھا۔ اُس روز جو اُس نے سمجھا تھا کہ وہ نشے میں انتقام لینے کی بات کر رہی ہے۔ تو وہ نشے میں نہیں تھی۔ اور کیا اتنی سی بات پر کوئی یوں اس طرح انتقام لے سکتا ہے۔ کہانیوں اور افسانوں میں تو ایسا ہو

۔ لیکن کیا عام زندگی میں بھی یوں ہی ہو سکتا ہے۔ کیا وہ سچ مچ اُس کی زندگی اُس کے لئے عذاب بنا دے گی۔

اُس نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

"مارتھا تم۔"

مارتھا مُڑ کر دوسرے شخص کی طرف دیکھنے لگی تھی پھر شاید اُس نے اُسے کوئی اشارہ بھی کیا تھا کہ وہ اُٹھ کر الماری میں سے کچھ نکالنے لگا۔ جب مُڑا تو اُس کے ہاتھ میں سرنج تھی۔ اور وہ تبریز کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"یہ۔ یہ کیا ہے۔؟"

وہ غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ۔" مارتھا ہنسی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔

"یہ میرا انتقام ہے۔"

"کیا زہر کا انجکشن۔"

اُس نے سوچا۔ اور ارد گرد دیکھا' بھاگنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ دروازہ بند تھا۔ اور بند دروازے سے ٹیک لگائے صبح والا سیاہ فام کھڑا تھا۔ اُس کے دونوں طرف دونوں سفید فام تھے۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ اُس نے مچل کر بازو چھڑانا چاہا لیکن بے سود۔ دوسرے شخص نے سوئی اُس کے بازو میں اُتار دی۔ اور وہ زیرِ لب کلمہ پڑھنے لگا کہ شاید وقت آخرت ہے۔

لیکن وہ مرا نہ تھا اور مارتھا نے واقعی زندگی کو اُس کے لئے عذاب بنا دیا۔ اُسے خبر نہیں تھی کہ وہ کتنا عرصہ اس چھوٹے سے کمرے میں بند رہا تھا۔ صبح شام اُسے انجکشن لگائے جاتے تھے۔ پتا نہیں کب وہ کھانا کھاتا۔ کب چائے پیتا اُسے کچھ ہوش نہ تھا۔ زیادہ تر تو وہ نشے میں رہتا تھا۔ شروع شروع میں وہ مداخلت کرتا تھا۔ چیختا چلاتا لیکن پھر ہولے ہولے وہ عادی ہوتا گیا۔ انجکشن لگنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو اُس کا جسم ٹوٹنے لگتا۔ درد شروع ہو جاتا گھبراہٹ اور بے چینی ہونے لگتی۔ دل چاہتا' دروازوں سے سر پٹخنے کبھی کبھی وہ اونچا رونے لگتا اُسے اپنے کسی بھی عمل پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ اور پھر ایک دن کوئی بھی اُسے انجکشن لگانے نہ آیا۔ وہ تڑپتا رہا۔ سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ سیاہ فام ملازم چائے اور کھانا لے کر آیا تو وہ اُس کے آگے ہاتھ جوڑنے لگا کہ اُسے انجکشن لگایا جائے۔ انجکشن کے بعد وہ کتنا پُر سکون اور مطمئن ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ کھانا رکھ کر چلا گیا۔ وہ دن بھر نشے کی طلب میں تڑپتا رہا۔ مگر کوئی اُس کی چیخ و پکار پر اندر نہ آیا۔ شام کو مارتھا آئی۔ اُس روز کے بعد اب نظر آئی تھی۔ نشے کی طلب میں وہ پاگل ہو رہا تھا۔

"پلیز' پلیز مارتھا۔" وہ گڑگڑایا۔

بھکاریوں کی طرح اُس سے انجکشن طلب کیا۔ یہاں تک کہ اُس کے پاؤں پر گر پڑا۔ لیکن اُس نے پاؤں کی ٹھوکر سے اُسے پیچھے ہٹا دیا۔

"جاؤ اَب اسے آزاد کر دو۔"

"نہیں پلیز پلیز۔"

وہ گڑگڑاتا رہا' روتا رہا لیکن وہ دونوں سفید فام زبردستی اُسے ایک بڑی شاہراہ پر اُتار آئے۔ کتنی دیر وہ یونہی فٹ پاتھ پر بیٹھا رہا تھا۔ پھر ایک چھوٹا سا یہی کوئی سولہ سترہ سال کا سیاہ فام لڑکا اُس کے پاس آیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا اُسے نشے کی طلب ہو رہی ہے۔؟

"ہاں" اُس نے جواب دیا۔

''روپیہ ہے۔'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں'' ۔اُس کا پرس اُس کے پاس تھا اور اُس میں پانچ سو ڈالر تھے۔

اور پھر خود بخود ذرائع بنتے رہے۔ اُسے نشہ ملتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک روز پانچ سو ڈالر گھڑی سب ختم ہو گئے۔ اُس کی جیب خالی تھی۔ اور وہ ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے کھڑا خالی خالی نظروں سے شو دیکھ رہا تھا کہ اندر سے ناصر نکلا۔

ناصر پاکستان نہیں گیا تھا۔ اور اُس نے وہاں ہی جاب کر لی تھی۔

''ناصر۔'' وہ بے اختیار اُس کی طرف لپکا۔ کتنے دنوں بعد اُس نے کوئی اپنا دیکھا تھا۔

''تبریز۔''

ناصر کو اُسے پہچاننے میں دقت ہوئی۔ ''تم اور یہ حال۔''

اُس کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی اور وہ رونے لگا۔

ناصر اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔ کئی ماہ تک اُسے ایک ڈاکٹر کے زیرِ علاج رکھا۔ پھر پاکستان بھی ناصر کو بھی اُس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ اچھا ہونا چاہتا تھا۔ اندر سے اُس کی خواہش تھی کہ وہ یہ لت چھوڑ دے ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ اس لئے ناصر نے مراد علی کو ساری تفصیل لکھ کر اُسے گھر بھجوا دیا تھا۔

پاکستان میں بھی اُسے ایک پرائیویٹ کلینک میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ لیکن وہ کیا کرتا۔ ایک اُسے چپکے سے ہروئن کی پڑیا لا دیتی اور وہ جو امریکہ سے قدرے بہتر ہو کر آیا تھا۔ پھر اس لت میں گرفتار جب وہ کلینک سے گھر آیا۔ تب بھی کہیں نہ کہیں سے اُس کے نشے کی طلب پوری ہو جاتی تھی۔

تب ایک روز اس نرس نے اُس سے پچاس ہزار کا مطالبہ کر دیا۔ مراد علی کی سیف سے روپے اُس نے نرس کو دے دیئے تو مراد علی اُس کی کڑی نگرانی کرنے لگے۔ تب وہ ایک بار پھر گھر سے چلا گیا۔

اَب کے وہ بہت دن اینجل کے گھر رہا۔ اینجل اُس نرس کا نام تھا جو کلینک میں اُسے نشہ مہیا کرتی

''سنو!'' ایک روز اینجل نے کہا۔

''اگر تم چاہتے ہو کہ تم باقاعدگی سے نشہ حاصل کرتے رہو تو پھر واپس اپنے گھر چلے جاؤ۔ تم ڈیڈی امیر آدمی ہیں اور تمہارے پاس پیسے کی کمی نہیں ہوگی۔ دوا اور لو۔''

چنانچہ وہ پھر واپس آ گیا۔

اَب کے پھر اسے ایک کلینک میں داخل کروایا گیا۔ جہاں اُس کی شدید نگرانی ہوئی۔ اور وہ سنبھلتا چلا

''تمہارے اندر قوتِ ارادی ہے اور تم یہ بد عادت چھوڑ سکتے ہو۔''

ایک ڈاکٹر ہر روز اُس سے کہتا۔

ہولے ہولے اُس کی طلب کم ہونے لگی۔ جسم کی اینٹھن اور درد کی شدت بھی پہلے جیسی نہ تھی شاید اُس کی سزا ختم ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اُسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ پھر ایک دا علی کے ساتھ ان کے آفس چلا گیا۔ اگرچہ اَب بھی کبھی کبھی جسم اینٹھنے لگتا تھا۔ اور نشے کی طلب جاگ اُ لیکن وہ ڈاکٹر کی دوائی استعمال کرتا اور خواہش دبا دیتا۔

''یہ تمہارا آفس ہے۔'' مراد علی نے اُسے بتایا۔ ''اور تمہیں کیا کرنا ہے۔ یہ تمہیں صفدر صا دیں گے۔'' اور ابھی اُسے آفس جاتے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ ایک روز وہ اجنبی اُس سے ملنے

''تبریز علی؟'' ''جی۔'' وہ اجنبی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''یہ۔'' اُس نے ایک لفافہ اُس کے سامنے رکھ دیا۔ ''یہ کیا ہے۔'' اُس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ ''کھول کر دیکھ لیں۔''

اُس نے لفافہ کھولا اور تصویریں اُس کے ہاتھ سے گر پڑیں اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اتنا عرصہ تک نشہ کرنے کی وجہ سے اُس کے اعصاب کمزور ہو گئے تھے۔

یہ کیسی تصویریں تھیں۔؟ کب کھینچی گئی تھی۔؟

اُسے کچھ خبر نہیں تھی۔ ایک تصویر میں وہ ریوالور ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ اور نیچے کوئی شخص اوندھا پڑا تھا۔ باقی تصاویر دیکھنے کی وہ ہمت نہ کر سکا۔

''تصاویر ہی نہیں وڈیو بھی ہیں۔'' وہ شخص مسکرایا۔ ''یہ تصاویر؟'' اُس کی نگاہ ایک تصویر پر پڑی۔ یہ صوفہ اینجل کے گھر میں تھا۔ شاید یہ تصاویر وہاں ہی بنائی گئی تھیں۔ اور یہ شخص جو اوندھا پڑا تھا۔ کیا واقعی مر چکا تھا اور کیا اُس نے اُسے قتل کیا تھا۔ اُس نے اُلجھ کر اجنبی کی طرف دیکھا۔ ''کیا چاہتے ہو؟ روپیہ؟''

''نہیں۔'' اجنبی نے تصاویر سمیٹ کر لفافے میں رکھ لیں۔

''ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ مل کر کام کرو۔ ہم میں شامل ہو جاؤ۔''

اور اگر میں نہ شامل ہوں تو؟ تمہاری بات نہ مانوں تو کیا تم مجھے جیل بھجوا دو گے تو بھجوا دو۔''

''نہیں۔'' وہ شخص پھر مسکرایا۔ ''پھر''

اگرچہ اُس کے جسم پر ابھی تک کپکپی طاری تھی۔ لیکن وہ مضبوط لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''یہ تصاویر تو محض ایک جھلک ہے۔ تمہارے سارے راستے بند کر دیئے گئے ہیں۔ اور تمہارے پاس ہماری بات ماننے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا۔ تمہارے پاس کوئی چوائس نہیں ہے۔ ہمارے ساتھ شامل ہو کر ہمارے لئے کام کرو۔ اُس میں تمہارے لئے باعزت اور نارمل زندگی ہے۔ تم اپنے گھر میں رہو' اپنے باپ کا بزنس سنبھالو۔ اور جب ہم تمہیں بلائیں آ جاؤ۔ یہ تصاویر تمہاری موت اور رسوائی کا سامان ہیں۔ تمہاری ذرا سی غلط حرکت تمہیں جیل بھجوا سکتی ہے۔ بصورتِ دیگر ہم تمہیں پھر سے۔'' وہ بات چھوڑ کر پھر خباثت سے مسکرایا۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اس لت کو اگر ہم نہ چاہتے تو چھوڑ سکتے تھے۔ ہم دوبارہ تمہارا وہی حالت کر دیں گے۔ تم نشے کے لئے تڑپو گے۔ غلیظ نالیوں میں پڑے رہو گے۔''

غلیظ نالیوں میں پڑے رہو گے۔'' ''نہیں'' اُس نے جھرجھری سی لی۔ اور اجنبی کی طرف دیکھا۔ ''مگر تم میرے ساتھ ایسا کیوں کرو گے' میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔'' ''یہ میڈم مارتھا کا حکم ہے۔''

''مارتھا۔'' وہ اُچھل پڑا۔

''ہاں میڈم کا تو حکم تھا کہ تمہیں ہر صورت نشہ مہیا کیا جائے اور کسی بھی علاج کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے لیکن پھر مس اینجل نے تمہاری سفارش کی۔ اُس کا خیال تھا کہ تم ایک پڑھے لکھے آدمی ہو اور اُن کے بہت کام آ سکتے ہو۔ اور اگر کبھی پکڑے گئے تو پھر باقی ماندہ زندگی جیل میں گزار دو گے۔ اور میڈم مارتھا اینجل کی بات رد نہیں کرتیں۔''

اور اُس نے اُس کی بات مان لی۔ اُن کے لئے کام کرنے کی۔

وہ دوبارہ نشہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے بڑے دُکھ اُٹھائے تھے۔ بڑی اذیت سہی تھی نشے کی طلب میں اُس کی جو حالت ہوئی تھی وہ خود ہی جانتا تھا۔

اور ابھی پچھلے دنوں وہ ہیروئن کی ایک بڑی مقدار لے کر نیویارک گیا تھا۔ اور چند دن قبل ہی واپس آیا تھا۔ اور وہاں نیویارک میں ہی اُسے پتا چلا تھا کہ مارتھا کا تعلق ڈرگ مافیا سے ہے۔

اور اَب یہ زندگی اُس نے گذارنی تھی۔ خوف کے لبادے میں لپٹی ہوئی
سنگلاخ زمینوں اور پتھریلے راستوں پر چل کر۔'' ہر لمحے موت کے خوف میں اذیت ناک مو
اور کہیں کوئی راہِ نجات نہیں تھی۔

اور ماما اس معصوم صورت فرشتہ صفت لڑکی کو اُس کی زندگی کا ساتھی بنارہی تھیں۔

اُس زندگی کا جو اَب اُس کی اپنی نہیں تھی۔

جسے اُس نے رہن رکھ دیا تھا۔ بے گناہ ' بے قصور۔

اُسے بہرحال میاں جی سے بات تو کرنی تھی۔ آج نہیں تو کل۔ اور اگر میاں جی مان جا

باصر۔ ہاں باصر۔

اپنے خیالات سے چونک کر اُس نے باصر کی طرف دیکھا۔ جو آنکھیں موندے صوفے پر
تھا۔ شاید سوگیا تھا۔ اور مدحت رمیض کی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔

وہ یکدم کھڑا ہوگیا۔

''ارے تبریز بھائی! آپ بیٹھیں ناں کہاں چلے۔ ڈاکٹر صاحب تو سو گئے ہیں۔ آیئے ہم
کھیلتے ہیں۔''

''نہیں رمی میں تھکا ہوا ہوں۔ آرام کروں گا۔''

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''تیمی بھائی! رمیض اُٹھ کر اُس کے قریب چلا آیا۔

''تیمی بھائی آپ کا اس طرح یہاں بیٹھنا اور باتیں کرنا بہت اچھا لگا۔ اتنے دنوں بعد۔'' اُ
آواز بھر آئی۔

''آپ چُپ بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے تب بھی اچھا لگ رہا تھا۔ آپ ہم سب کے پاس آ کر
کریں جو گذر گیا اُس بھول جائیں۔''

جو گذر گیا تھا وہ اُسے کیسے بھول سکتا تھا۔

اُس نے رمیض کی طرف دیکھا جو آنکھوں میں نمی لئے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''تیمی بھائی' تیمی بھائی۔''

اُسے اپنی طرف دیکھتا پاکر وہ بے اختیار اُس سے لپٹ گیا اور شاید رونے لگا۔

تبریز نے اُسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اور ہولے ہولے اُسے تھپکنے لگا۔ یہ بظاہر ہر دم ہنسنے ہنسا
کھلنڈرسا لڑکا اندر سے کتنا گداز دل رکھتا تھا۔

''آپ آپ تیمی بھائی وعدہ کریں۔ کہ آپ ہمارے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ لگا کریں۔ ہمیں
امریکہ کی باتیں بتایا کریں گے اور پہلے جیسے بالکل پہلے جیسے ہوجائیں گے۔ پلیز تبریز بھائی وعدہ کریں۔ پلی

''ہاں ہاں وعدہ۔!''

تبریز کا دل جیسے پانی ہوکر پگھلنے لگا۔ اُس نے اپنے ہونٹ رمیض کے گھنے بالوں پر رکھ د
اُسے اپنے ساتھ بھینچ کر اپنے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆☆

''جان آج رات کی فلائیٹ سے نیویارک جارہا ہے۔''

ریٹا نے گھر میں قدم رکھا تو ممی نے اطلاع دی۔

''یہ جان کی سرگرمیاں کچھ پُر اسراری نہیں ہیں ممی۔''

''پورا خبیث ہے۔''

آن نے کچن سے باہر آتے ہوئے کہا۔

اُس نے آج اسکول سے چھٹی کی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی باسکٹ ممی کے سامنے رکھتے ہوئے وہ
کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

''ممی پلیز یہ مٹر چھیل دیں۔ میں اتنے میں چاول صاف کرتی ہوں۔''

''اچھا'' ممی نے نٹنگ کو شاپنگ بیگ میں ڈالا۔

''ممی! تم یہ ہر وقت کیا نٹنگ کرتی رہتی ہو۔

اَب کوئی نہیں پہنتا ہاتھ کے بُنے ہوئے سوئیٹر۔ اور پھر یہاں کراچی' میں اتنی سردی کہاں ہوتی ہے۔''

ریٹا مٹر چھیل کر منہ میں چالتے ہوئے بولی۔

''فارغ نہیں بیٹھا جاتا ہم سے اور پھر تم نہ پہننا ہاتھ کا بنا' یہ تو میں اپنی لیزا کے لئے بنارہی ہوں۔''

''ارے ہاں لیزا کہاں ہے۔؟'' ریٹا نے چھلکا باسکٹ میں پھینکا۔

''تمہارے کمرے میں ہے۔''

''بہت اُداس رہنے لگی۔ ہے۔ بالکل چُپ رہتی ہے بات نہیں کرتی۔'' آن نے واپس کچن کی طرف
تے ہوئے کہا۔

''ارے کتنا دل تھا' ہمارا ہم اُس کی شادی کا پارٹی کرتا۔ اُس کی دلہن بناتا۔ اتنا پیارا بچی ہے۔ پر یہ
ن گندا لڑکا۔ اُس نے بات ہی نہیں سُنی۔''

''جان نے اُس کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ ممی۔''

''ارے نہیں زیادتی نہیں۔ وہ اُس کا وائف ہے اور پھر اُس نے اپنی مرضی سے اس کے ساتھ شادی
ہے۔'' ممی نے مٹر چھیلتے ہوئے کہا۔

O☆O

''بس وہ جلد باز ہے۔ ہر کام کی جلدی پڑی رہتی ہے۔ بس اَب تم لوگ بھی شادی بناؤ۔ بوڑھی ممی کی زندگی میں کچھ تو خوشی آئے۔ کوئی چھوکرا لوگ نہیں ملتا تمہیں۔''

''چھوکرا لوگ تو بہت ملتا ہے ممی پر جو دل کو بھایا ہے۔ وہ نہیں ملتا۔''

ریٹا اور آن بہت صاف اُردو بولتی تھیں۔ لیکن ریٹا نے اس وقت ممی کے لہجے کی نقل کی۔ ممی ا[illegible] انڈین تھیں۔ اور پاکستان بننے سے پہلے بمبئی میں رہتی تھیں۔

''تیرے دل کو کون بھایا ہے۔ بول ہم کو ہم اُس سے بات کرے گا۔''

''ارے ممی۔''

وہ ہنس دی۔

''پہلے آن کی شادی بناؤ وہ بڑی ہے۔''

''وہ۔ وہ شادی نہیں کرے گی۔ ریٹا۔ سٹریل ہے ایک دم دیکھ لینا۔ ساری زندگی ایسے ہی گذار د[illegible] گی۔ اپنی ممی کی بات یاد رکھنا۔''

''اور میں۔''

ریٹا شرارت کے موڈ میں تھی۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ آج کیفی کے ساتھ اُس نے بہت سا[illegible] گذارا تھا۔ بہت اچھی اچھی باتیں کی تھیں۔ کیفی نے اُسے اپنی کئی غزلیں سُنائی تھیں۔ اور بتایا تھا کہ اُس نے پہلی کتاب کا انتساب اُس کے نام کیا ہے۔

''تم!'' ممی نے اپنی عینک ٹھیک کر کے ناک پر جمائی۔

''تم آن سے بہت مختلف ہے۔ تمہاری آنکھوں میں جو چراغ جلتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یا تم LOVE (محبت) کیا ہے۔ یا LOVE (محبت) کرنا مانگتا ہے۔''

''او ممی۔ اوہ۔'' ریٹا نے جُھک کر اُنہیں بانہوں میں لیتے ہوئے اُن کی پیشانی چوم لی۔

''تم تو نجومی ہو ہاں میں Love (محبت) کرنا مانگتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کوئی مجھ سے بہت [illegible]کرے، بہت محبت' اتنی کہ میں اس محبت کی پھوار میں بالکل بھیگ جاؤں تن من سے بے خبر ہو جاؤں۔ اس محبت کے بوجھ سے جُھک جاؤں' پھولوں سے بھری ہوئی شاخ کی طرح۔ لیکن پھر بھی میرا دل [illegible]کہ اس بوجھ میں اضافہ ہو جائے۔ یہ بڑھتی جائے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ پہلے سے زیادہ ہوتی جائے۔''

اُس نے آنکھیں بند کر کے ممی کے سینے پر سر ٹیک دیا۔

''ممی!''

اُس نے آنکھیں بند کئے کئے پوچھا۔ کیا سب لڑکیوں کے دل میں ایسی ہی خواہش ہوتی [illegible] یونہی چاہے جانے کی میری طرح۔''

''ہاں شاید سب کے ہی دل میں یہ خواہش چُھپی ہوتی ہے۔ بس کبھی کسی دل میں جلدی جاگ [illegible]ہے۔ کسی دل میں دیر سے جاگتی ہے۔ پر ہوتی ضرور ہے۔''

''اور آن کیا اُس کے دل میں بھی یہ خواہش چُھپی ہے۔'' ریٹا نے اُن کے سینے سے سر ہٹا کر پوچھا۔

''آن بھی لڑکی ہے۔ تیری طرح۔''

ممی پھر مٹر چھیلنے لگیں۔

''زندگی میں کوئی لمحہ آئے گا اُس کے پاس بھی جب تیری طرح اُس کا بھی دل چاہے گا کہ کوئی اُسے [illegible]ی پھوار میں بھگو دے' تیرے سے زیادہ چاہے گا۔ پر تب تب محبت کرنے والا کہاں سے آئے گا۔''

''مسز نیلسن کی طرح تب آن بھی پچاس سال کی عمر میں شادی کرے گی۔

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ آج خواہ مخواہ ہی اُس کا ہنسنے کو جی چاہ رہا تھا۔ آج کیفی نے کتنی ہی بار اُس کا [illegible]کر کہا تھا۔

''I LOVE YOU (میں تم سے محبت کرتا ہوں۔) BELEVE ME I LOVE YOU [illegible]کرو میں تم سے محبت کرتا ہوں۔)

اور اُس کا دل چاہا تھا وہ بار بار یہی کہتا رہے اور وہ سُنتی رہے۔ اُس کے اندر یونہی سنسنی ہوتی رہے۔ [illegible] یونہی کنول کھلتے رہیں اور بس وقت یہیں کہیں تھم جائے رُک جائے'

''سُن ریٹا!''

وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے اُٹھی تو ممی نے کہا۔

''اُس سے شادی کر لے۔''

''کس سے ممی۔''

اُس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

''اسی سے جس کی محبت کا چراغ تیری آنکھوں میں جلتا ہے۔''

''یس ممی۔!''

I WILL TRY MY BEST (میں اپنی پوری کوشش کروں گی۔)

اور تم بھی اپنی ریٹا کے لئے دُعا کرتی رہنا سویٹ ممی۔'' گاڈ تمہارا ہیلپ کرے گا ڈارلنگ۔''

''تھینک یو ممی۔''

''وہ لہراتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو آن نے کچن کے دروازے سے اُسے آواز دی۔

''سنو ریٹا تم ذرا سلاد بنالو۔''

''تم خود ہی بنالو ڈیر! میں ذرا لیزا کے پاس جا رہی ہوں۔'' اُس نے رُک کر اونچی آواز میں کہا اور پردہ اُٹھا کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ رتن کماری آنکھوں پر ہاتھ رکھے چُپ لیٹی تھی۔

''لیزا۔'' اُس نے آہستگی سے پکارا۔

''سنو سو رہی ہو۔''

''نہیں۔''

اُس نے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ بیٹھی۔ اُس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور چہرے پر اُداسی سی تھی۔

''سنو تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے جان آج رات کی فلائیٹ سے نیو یارک جا رہا ہے۔''

''اچھا۔!'' اس نے ذرا کی ذرا پلکیں اُٹھا کر ریٹا کی طرف دیکھا اور پھر پلکیں جھکا لیں۔ اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔

''کیا تم اُس کے جانے سے خوش نہیں ہوئی ہو۔ مجھے پتا ہے' تم اُسے پسند نہیں کرتی ہو۔ لیکن تم اُس کی وائف ہو۔ اور تم نے اپنی خوشی سے اُس کے ساتھ شادی کی ہے' اپنی مرضی سے اچھا خوش ہو جاؤ نا۔ وہ نیو یارک گیا تو ایک ماہ سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ وہ تمہیں تو ساتھ لے کر نہیں جا رہا؟''

اچانک ہی ریٹا کو خیال آیا۔

''نہیں۔''

''سنو لیزا۔''

ریٹا نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے سرگوشی کی۔

''تم اگر واپس جانا چاہو تو میں کیفی سے کہہ کر انتظام کر سکتی ہوں۔ جان چلا جائے نا تو پھر۔۔۔''

''اب واپس جا کر کیا کروں گی۔'' تینو نے آہستگی سے کہا۔

''ہاں تم واپس جاؤ گی تو شاید تمہاری ماتا جی بھابھو اور بھاء تمہیں قبول نہ کریں۔''

''ہاں پتا نہیں۔'' اُس نے سوچا اور وہ ریٹا کے چہرے کو یونہی بے دھیانی میں دیکھے گئی۔

''کیا دیکھ رہی ہو۔''

''کچھ نہیں۔''

اُس نے نگاہیں جھکا لیں۔

''یونہی کچھ سوچ رہی تھی۔''

''کیا۔ یہ کہ تمہاری بھابھو۔''

''نہیں۔''

اُس نے ریٹا کی بات کاٹ دی۔

''شاید وہ مجھے نہ ہی قبول کریں۔ شاید کر لیں کہ وہ ایک شخص جس کا نام دیپو ہے۔ اور جس کے ہاتھ کی لکیریں دوسرے ہاتھ سے بالکل میل نہیں کھاتیں۔ بالکل میرے ہاتھوں کی طرح''

اُس نے اپنے ہاتھ ریٹا کے سامنے پھیلائے۔ وہ مجھے سینے سے لگا لے گا اور میری اس غلطی کو اس طرح بھول جائے گا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کی غلطی کو بھول کر اُسے سینے سے لگا لیتی ہے۔''

''ارے واقعی تمہارے ایک ہاتھ کی لکیریں دوسرے ہاتھ سے بالکل مختلف ہیں۔''

ریٹا جھک کر اُس کا ہاتھ دیکھی رہی تھی۔

''پر میں کہاں جاؤں ریٹا میں آگے جانا چاہتی ہوں۔

بہت آگے مجھے پیچھے نہیں پلٹنا انکل رابرٹ نے کہا تھا۔ جب ایک بار راہِ حق میں قدم اُٹھا لینا تو پھر پیچھے پلٹ کر نہ دیکھنا مشکل مرحلہ تو پہلا قدم اُٹھانا ہی ہوتا ہے نا۔ تو وہ تو اُٹھا لیا ریٹا۔ اَب واپس کیوں جاؤں۔''

''لیکن تمہیں جان اچھا جو نہیں لگتا۔'' ریٹا نے کسی قدر حیرت سے کہا۔

''اُس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو محض ایک پڑاؤ ہے میں نے تمہیں بتایا تھا نا ریٹا۔ اور جب آدمی سفر پر نکلتا ہے تو راستے میں پتھر بھی ہوتے ہیں اور کانٹے بھی پاؤں میں آبلے بھی تو پڑ جاتے ہیں ریٹا اور آدمی راہ کے کانٹوں اور پتھروں سے ڈر کر سفر ملتوی تو نہیں کر دیتا۔ اگر اُسے منزل پر پہنچنا ہے تو اُسے چلنا تو پڑے گا ہی نا۔ اور میرا سفر تو اور بھی کٹھن ہے۔''

''تم لیزا پتا نہیں تم کیا ہو۔ لیکن میں تمہیں بتاؤں' جان تمہیں ایک دن چھوڑ دے گا۔ وہ ایسا ہی ہے۔ وہ بس تمہیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تم اُسے یوں حاصل نہیں ہوئیں تو اس طرح سہی وہ اسے بھی ایک ایڈوانچر سمجھتا ہے۔ وہ زیادہ دیر تک تمہیں ساتھ نہیں رکھے گا۔''

'' وہ تو اُس کی نیت ہے میری نیت تو میرے ساتھ ہے۔ میں نے تو اُس کا ساتھ اس لئے نہیں چاہا تھا کہ وہ ہمیشہ میرا ساتھ دے''۔

دیکھو لیزا تم ایسا کرنا نن بن جانا۔ گرجا سے منسلک ہو جانا جب وہ تمہیں چھوڑ دے تب یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمہیں ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے میں تمہیں یہ مشورہ دے رہی ہوں۔ نہیں لیزا جان میں یہ صرف اُس لئے کہہ رہی ہوں کہ تم جیسی سوچ رکھنے والی لڑکی کے لئے وہی جگہ مناسب ہے۔''

رتن کچھ نہ بولی سر جھکائے بیڈ کی چادر پر اُنگلی پھیرتی رہی۔

''ارے ہاں یاد آیا۔''

ریٹا نے اچانک چونکتے ہوئے کہا۔

''میں نے کیفی سے تمہارا ذکر کیا تھا۔ اور اُس نے یہ ایک کتاب بھی دی تھی مجھے۔''

''کیسی کتاب؟'' رتن نے پوچھا۔

''پتا نہیں' تم خود ہی دیکھ لو''

ریٹا نے کتاب نکال کر اُسے دی رتن بے چینی سے اُس کے صفحے پلٹنے لگی۔

''کیا اُس سے مجھے کچھ پتا ملے گا''

معلوم نہیں تم خود پڑھ کر دیکھ لو نا اور ہاں وہ کیفی کو تم سے ملنے کا بہت اشتیاق ہو رہا تھا۔ کسی دن چلو نا میرے ساتھ۔

اُس کے پاس بہت علم ہے' ممکن ہے وہ تمہارے سوالوں کے جواب دے دے۔ ممکن ہے وہ تمہارے دل میں چھپے شک کے کانٹے نکال دے۔''

''اچھا تم کسی دن کیفی کو لے آنا ادھر یا پھر مجھے لے جانا'' وہ بڑے انہماک سے کتاب دیکھ رہی تھی۔

یہ کتاب اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا لکھا ہے۔

''ابھی اس کتاب کو رکھ دو لیزا! رات کو آرام سے پڑھنا'' آن مٹر چاول پکا رہی ہے۔ تمہیں پسند

ہیں۔ناں'' ''ہاں''

رتن نے بڑی سعادت مندی سے کتاب بند کر کے تکیے کے نیچے رکھ دی۔اور ریٹا کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

''تم آج بہت خوش ہو ریٹا۔''

''ہاں''۔

اُس نے اپنی آنکھیں موندتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی اور آگے پیچھے جھولنے لگی۔

''بہت۔میں بہت خوش ہوں لیزا۔آج پہلی بار کیفی نے لفظوں میں اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔اُس نے مجھ سے کہا ہے لیزا۔آئی۔لو یو۔۔ہم کتنے عرصہ سے مل رہے ہیں۔لیکن ایک بار بھی اُس نے اس طرح اظہار نہیں کیا۔اور وہاں لیزا! اتنے سارے دنوں میں جان ایک دن بھی تمہیں۔باہر لے کر نہیں گیا۔ڈارلنگ تم نے اُس سے کہنا تھا نا کہ وہ تمہیں گھمانے لے جائے۔''

رتن نے کوئی جواب نہ دیا وہ سامنے کارنس پر رکھی حضرت مریمؑ کی تصویر کو دیکھنے لگی۔

''لڑکیاں تو قربت کے لمحوں میں اپنے شوہروں سے بہت سی باتیں منوا لیتی ہیں۔تم اتنی سی بات بھی نہیں کہہ سکتیں۔''

''میرا دل ہی نہیں چاہا کہیں جانے کو۔''

''تم سچ مچ نن ہو' سادھو ہو لیزا! انکل رابرٹ صحیح کہتے تھے تمہارے اندر ایک سادھو کی روح ہے۔''

ریٹا اُٹھ کر اُس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''کرسمس کے بعد میں تمہیں فادر سے ملواؤں گی۔

تم اُن سے پوچھنا وہ سب جو تم جاننا چاہتی ہو کیفی سے بھی ملواؤں گی۔پھر جہاں تمہارا یقین ٹھہر جائے۔''

''تھینک یو ریٹا! تم میرا اتنا خیال کرتی ہو' اور بھابھو کا ماتا جی کا' حتیٰ کہ دیپو کا بھی خیال تھا تم۔تم اور آن مجھے بھٹکا رہی ہو۔''

''ہم'' ریٹا نے کھوجتی نظروں سے اُسے دیکھا۔

''میں آج تمہیں ایک سچ بتاؤں۔یہ یہ جو جان ہے نا اس کو مذہب کا اتنا بھی پتا نہیں جتنا مجھے اور آن کو پتا ہے۔اور یہ اپنی ساری زندگی میں ایک دو بار سے زیادہ دفعہ چرچ میں نہیں گیا۔اُس نے وہاں تم سے جو باتیں کی تھیں نا' وہ سب تمہیں پھنسانے کے لئے کی تھیں۔وہ محض تمہیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔وہ وہاں کے قیام کو دلچسپ اور رنگین بنانا چاہتا تھا۔لیکن تم تم اور ہی مزاج کی تھیں۔تم اُس کے جال میں نہیں پھنسیں اور اس روز جب انکل رابرٹ نے اُس کے سامنے یہ منصوبہ رکھا کہ وہ تم سے شادی کرے تو اُس روز وہ بہت چڑ چڑا ہو رہا تھا۔اُس نے انکل رابرٹ کی بات مان لی۔اُس کا خیال تھا پاکستان آ کر عیش کر کے وہ تمہیں چھوڑ دے گا۔سوری لیزا ہم نے انجانے میں اُس کا ساتھ دیا۔''

''کوئی بات نہیں ریٹا۔''

رتن نے نرمی سے کہا۔

''اور مجھے اس سچ کا بہت دنوں سے پتا ہے۔اُس دن سے جب جان مجھے زبردستی اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔''

''کیا جان نے تمہیں بتایا تھا۔''

نہیں خود بخود ہی مجھ پر اس سچ کا ادراک ہو گیا تھا۔پر میں نے تم سے کہا ہے نا ریٹا یہ کوئی آسان سفر نہیں ہے۔اور شاید ایسا ہی ہونا تھا۔میرا دل کہہ رہا ہے۔ریٹا کہ میری منزل کہیں بہت آگے ہے اور یہ کہ میں نامراد نہیں ہوں گی' بیٹھے بیٹھے میرے دل میں جو خیال اُگ آیا تھا تو یہ خود بخود نہیں اُگا تھا کوئی ماورائی طاقت میری رہنمائی کر رہی ہے۔مجھے آگے کی طرف دھکیل رہی ہے۔ایک یقین سا ہے کہ بالآخر میں حق کو پا لوں گی۔''

''لیزا! سنو اگر تم اپنے مذہب کی طرف واپس لوٹ جاؤ۔تو جان کے ساتھ شادی ختم ہو جائے گی۔وہ اہل کتاب ہے نا اور اُس کی شادی کسی کافر لڑکی سے نہیں ہو سکتی۔اس طرح تم واپس جا سکتی ہو۔''

ریٹا' ابھی تک اُلجھی ہوئی تھی۔

''پتا ہے لیزا! میں کبھی کبھی بہت گلٹی فیل (GUILTY FEEL) کرتی ہوں۔تمہیں گھر سے بے گھر کرنے میں ہمارا بھی ہاتھ ہے۔لیزا! تم واپس چلی جاؤ۔تم نے کہا تھا نا دیپو تمہیں تمہاری ہر خطا معاف کر کے گلے سے لگا لیگا۔

وہاں شاید بھابھو بھی مجھے معاف کر دے اور ماتا جی بھی۔''

اُس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

اور مجھے یقین ہے بھابھو' مسز مہتا اور مہندر کی ماں بلکہ گلی کی ساری عورتوں سے میری خاطر لڑ پڑے گی۔ اس کا بس چلے تو وہ تو مسز مہتا کی آنکھیں ہی نوچ لے۔وہ ہر ایک پر ہنستی ہوئی اُن کا مذاق اُڑاتی ہوئی آنکھیں۔اور مہندر کی ماں تو بھابھو کو زہر لگتی ہے۔کہانیاں بنانے میں تو اُسے کمال حاصل ہے۔اور انکل رابرٹ کی لیزا کے بارے میں سب سے زیادہ کہانیاں تو وہی سُناتی تھی۔اپنے پاس سے گھڑ گھڑ کر کے مگر بھابھو تو ایک ہی وار میں اُسے چت کر دیتی ہے۔صرف اتنا کہہ کر پتا جی بتایا کرتے تھے کہ تم مہندر کے ابو کے ساتھ کلکتہ سے بھاگ کر آئی تھیں۔اور تین مہینے لوگ ادھر اُن کے پاس دہلی میں چھپے رہے تھے۔پتا جی دہلی میں ریلوے میں ملازم تھے۔اور وہیں رہتے تھے اور یہ کہ مہندر ایک سینما گھر میں ٹکٹ کیپر تھا اور۔اور مہندر کی ماں ڈر کر خوفزدہ ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

''چپ چپ'' اور پھر وہ خود ہی سب سے کہتی پھرے گی۔

''ارے ریتو تو دیوی ہے۔اُس کا اپمان نہ کرو۔وہ تو بھگوان کو تلاشتی پھر رہی ہے۔'' پر۔پر میں نے نہیں جانا ریٹا میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے۔''

اُس نے قطعیت سے کہا۔

''اچھا بابا' نہ جاؤ میں کل تمہیں کیفی سے ملوانے لے چلوں گی۔کل تو جان بھی نہیں ہوگا۔ورنہ مجھے اس سے خوف آتا ہے۔ڈر لگتا ہے۔''

''لیزا ریٹا' باہر آؤ۔''

ممی نے باہر سے آواز دی۔

''آن کھانا لگانے لگی ہے۔؟

''کم آن لیزا۔''

وہ دونوں اُٹھ کر باہر آ گئیں۔لیزا نے ابھی کھانا لگایا ہی تھا کہ جان آ گیا اور پھر سب کی طرف دیکھے بغیر کمرے میں چلا گیا۔اور وہاں سے اپنا بریف کیس اُٹھا کر باہر آ گیا۔

''جان! آؤ کھانا کھا لو۔'' ممی نے اسے پکارا۔

''آن نے مٹر چاول پکائے ہیں۔''

''نہیں! مجھے کھانا نہیں کھانا۔ میں جا رہا ہوں۔'' اُس نے ایک نظر سب پر ڈالی۔
''لیکن تمہاری فلائیٹ تو رات کی ہے۔ رات بارہ بجے کی ہی بتایا تھا تم نے۔''
''ہاں لیکن میں داؤد کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ بھی میرے ساتھ جا رہا ہے۔''
''جان! تم لیزا کو بھی ساتھ کیوں نہیں لے جاتا تمہارا ہنی مون ہڑپ ہو جاتا یہ۔''
''لیزا کو؟''

جان نے نظریں جھکائے چاول کھاتی لیزا کو دیکھا۔
یہ معصوم بھیڑوں جیسی شکل والی لڑکی۔
اُس کا خیال تھا کہ جانے سے پہلے وہ اس سے پیچھا چھڑا لے گا' لیکن ابھی تو ایک ہفتہ بھی اُس کی رفاقت میں نہیں گذرا تھا کہ داؤد خان نے اسے باس کا حکم سُنا دیا۔
''ہاں جان! تمہیں چاہیے تھا لیزا کو بھی ساتھ لے جاتے۔'' آن نے بھی ممی کی تائید کی۔
''لے جاؤں گا۔''
اُس کی آنکھیں یکا یک کسی خیال سے چمکنے لگیں۔
''لے جاؤں گا۔ اگلی بار ضرور لے جاؤں گا۔''
''آہا!'' اُس نے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا۔ ''How innocent she is'' (یہ کتنی معصوم ہے اور ایسی لڑکیاں۔ ایسی معصوم صورت۔''
''آہا!'' اُس نے پھر قہقہہ لگایا اور جُھک کر ممی کے رخساروں کو چوم لیا۔
''ممی! تم بھی کبھی بڑے پتے کی بات کرتی ہو۔ اچھا بائے۔''
اُس نے بریف کیس ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔
''کب آؤ گے؟''
''جب دل چاہا۔'' اُس نے پھر رتن کماری کی طرف دیکھا۔
''گڈ۔ گڈ آئیڈیا۔''
عین اسی لمحے رتن نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا تو اُس نے بائیں آنکھ دباتے ہوئے زور سے قہقہہ لگایا اور پھر گنگناتے ہوئے باہر نکل گیا۔
''میں جان کے ان ٹرپس کو کبھی سمجھ نہیں پائی۔'' آن نے اُس کے جانے کے بعد کہا۔
''جان اور اُس کے ٹرپس سب فراڈ ہیں۔ صرف اپنی اہمیت جتانے کے لئے وہ نیویارک' انگلینڈ اور فرانس کا ذکر کرتا ہے۔ ورنہ میرے خیال میں وہ ڈیڑھ دو مہینے لاہور یا اسلام آباد گذار کر آ جاتا ہے۔'' ریٹا نے رائے دی۔
''شاید تم سچ کہتی ہو۔'' آن نے اتفاق کیا۔
''بہر حال جو بھی ہے کچھ دنوں کے لئے لیزا کی جان اس وحشی سے چھوٹ گئی ہے۔''
آن بظاہر خاموش اور سخت مزاج دکھائی دیتی تھی' لیکن اندر سے اُس کا دل بھی بے حد نرم تھا۔ لیزا سے بہت شرمندہ تھی اور اس کا اظہار ریٹا کے سامنے کئی بار کر چکی تھی کہ اُن سے غلطی ہوئی۔ اُنہیں جان جیسے کمینے کا ساتھ نہیں دینا چاہیے تھا۔ لیکن اُس وقت انہیں یہ جوش چڑھا ہوا تھا کہ ایک لڑکی اُن کا مذہب اختیار کر رہی ہے۔ اور یہ بہت بڑا اعزاز ہے اور کیا خبر اسی طفیل یسوع مسیح کی رحمتیں اُن پر نازل ہو جائیں۔ مگر اب وہ دکھی اور شرمندہ تھی۔

''ریٹا! آج ہمیں مسز شیر دل کے ہاں جانا ہے۔ یاد ہے ناں تمہیں۔ اُن کے بیٹے کی سالگرہ ہے۔''
...تن میٹتے ہوئے آن نے یاد دلایا۔
''اوہ ہاں مجھے تو بالکل خیال ہی نہیں رہا۔''
ریٹا بھی اُس کی مدد کر رہی تھی۔
''لیزا! تم بھی ہمارے ساتھ چلنا۔'' آن نے اُسے دعوت دی۔
''مسز شیر دل میری کولیگ ہیں۔ ویری نائس لیڈی۔'' شادی کے پندرہ سال بعد اُن کی اولاد ہوئی ہے۔ وہ ہر سال اپنے بیٹے کی سالگرہ بڑی دھوم سے مناتی ہیں۔ تمام اسٹاف کو مدعو کرتی ہیں اور بھی بہت لوگ ...تے ہیں۔'' آن نے تفصیل بتائی۔
''ہاں۔'' ریٹا نے تائید کی۔
''تم ضرور چلنا' سچ بہت مزا آتا ہے۔ موسیقی کا پروگرام بھی ہوتا ہے اور بہت اچھے لوگ ہوتے ہیں وہاں ...ے عالم قسم کے۔ دراصل مسز شیر دل کے میاں یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔''
''مگر میں کیا کروں گی جا کر۔'' رتن نے انکار کیا۔ ''اوہ بے وقوف لڑکی! یہاں بیٹھے بیٹھے تو منزل ...ہیں نہیں مل جائے گی ناں' گھر سے باہر نکلو گی' لوگوں سے ملو گی تو صحیح راستے کا تعین کر سکو گی۔ کیا خبر اسی پارٹی ...ں کوئی رہنما تمہیں مل جائے۔ کوئی سچا راہبر۔۔!''
''ہاں یہ تو ہے۔'' رتن کی آنکھیں چمکنے لگیں۔
''تو چلو اُٹھو پھر' ذرا میرے ساتھ بازار تک چلو' گفٹ بھی خرید لیتے ہیں اور تم اپنے لئے کوئی اچھا سا ...ا لے لینا۔''
''میرے پاس ہیں تو سہی اتنی اچھی اچھی ساڑھیاں۔'' ''چھوڑو ساڑھی کو بابا' پیارا سا خوبصورت سا ...لوار قمیض کا سوٹ لاتے ہیں۔ کم آن۔'' ریٹا نے بڑی اپنائیت سے کہا' تو وہ آنکھوں میں آنسو چھپائے اُٹھ ...ڑی ہوئی۔
''اے خدا! پیارے خُدا!
بہشت سے ہم پر رحمتیں نازل فرما۔
اور ہمیں اپنی دعوت میں بلا۔''
ریٹا اونچی آواز میں گاتے ہوئے جلدی جلدی جوتوں کے اسٹریپ باندھنے لگی۔ رتن کماری کچھ ...ی گھبرائی اور خوفزدہ سی تھی جب سے وہ آئی تھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ ریٹا نے اُس کے منع کرنے کے ...و دو اُس کے لئے گرین رنگ کا موتیوں کے ہلکے ہلکے کام والا کرتا شلوار کا سوٹ خریدا تھا۔
''فکر نہ کرو میں اس کے پیسے جان سے وصول کر لوں گی۔'' اُس نے رتن کو تسلی دی۔
جان کتنا بھی بُرا سہی' لیکن پیسے خرچ کرنے کے معاملے میں بہت فراخ دل ہے اور پتا ہے ہمارے ...ا جانے کا سب خرچ اُسی نے برداشت کیا تھا۔''
اُس نے پھر میچنگ سینڈل' چوڑیاں اور گرین نگوں والا لاکٹ سیٹ خریدا تھا۔ بڑے بڑے دمکتے نقلی ...وں والے جھمکوں نے اُس کے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔ ہلکے ہلکے میک اَپ میں وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ ...ت آنکھوں میں حزن تھا۔
اور چہرے پر ایک عجیب سی اُداسی اور معصومیت تھی۔ مسز شیر دل کے ہاں سب نے ہی اُسے سراہا۔

"یہ لیزا ہے ہماری بھابھی۔" آن نے مختصراً تعارف کروایا۔
"بہت اٹریکٹو (پرکشش) ہے۔"
آن کی سب کولیگز کی متفقہ رائے تھی۔
"آج کی تقریب میں لوگ فنکار بھی مدعو ہیں۔ شوکت علی' اقبال باہو اور نہ جانے کون کون۔"
مسز رافعہ نے ریٹا کو بتایا۔
"عطا اللہ کو نہیں بُلایا۔"
"پتا نہیں شاید بلایا ہو اور وہ نہ آ سکا ہو۔"
"بہر حال شوکت علی کا تو مجھے مسز شیر دل نے خود بتایا تھا۔ اقبال باہو کو ابھی میں نے خود دیکھا
مسز رافعہ نے وضاحت کی۔
"اقبال بھائی میرے میاں کے دوست ہیں۔ انہیں کے ساتھ آئے ہیں۔" پاس بیٹھی ایک خ
نے جتایا۔ مسز رافعہ نے اُن کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔
"ارے لیزا بیٹھو ناں۔" اُس نے مڑ کر آن کی طرف دیکھا۔
"ہاں بیٹھو ناں لیزا۔" آن نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ چپ چاپ مسز رافعہ کے ساتھ
کُرسی پر بیٹھ گئی۔
"تمہاری بھابھی بہت کم گو ہیں۔"
"ہاں۔"
آن اُن کی بات کا جواب دے کر مسز شیر دل کی طرف چلی گئی تو اُس نے ریٹا کو دیکھنے کے لئے
اُدھر نگاہ دوڑائی' لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔
"ہال بھرا ہوا تھا' لیکن ابھی لوگ آ رہے تھے۔ ہال کے دوسرے حصے میں مرد حضرات تھے۔ خ
کی طرح وہ بھی تعداد میں کچھ کم نہ تھے۔ کچھ خواتین بھی مردوں والی طرف تھیں۔ اور تب ہی اُسے ریٹا بھی
طرف نظر آئی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی اور کسی مرد کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔
"پتا نہیں کون ہے یہ شخص۔" رتن نے سوچا۔
"شاید ان کا کوئی جاننے والا ہے۔"
اُسی لمحے ریٹا نے اُس کی طرف دیکھا اور پھر اشارے سے اُسے اپنی طرف بلایا۔ اور مُڑ کر
کھڑے مرد سے کچھ کہا۔ اب مرد بھی اُسی کی طرف دیکھنے لگا تھا۔
رتن گھبرا کر نیچے دیکھنے لگی تو ریٹا تیز تیز چلتی ہوئی اُس کے قریب آئی اُس کی آنکھیں چمک
تھیں۔ اور چہرا گلابی ہو رہا تھا۔
"لیزا۔ لیزا! اِدھر آؤ میرے ساتھ۔"
اُس نے دبے دبے جوش کے ساتھ کہا اور
اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"آؤ میں تمہیں کیفی سے ملواؤں اور دیکھو ناں' یہ کیسا! اتفاق ہے کہ وہ یہاں مل گیا' مجھے گمان
تھا۔ اس سے پہلے کبھی میں نے اُسے یہاں نہیں دیکھا تھا۔"
وہ کھڑی ہو گئی۔

"تو یہ کیفی ہے۔ کس قدر عام سا مرد ہے۔ کوئی خصوصیت نہیں۔ اس شکل وصورت کے سینکڑوں
لوگ نظر آتے ہیں۔ بظاہر کوئی انفرادیت نہیں' لیکن ریٹا' اُس کی کتنی تعریفیں کرتی ہے۔"
اُس نے سوچا اور پھر خود ہی اپنی سوچ کی سطحیت پر شرمندہ ہو گئی۔ محبت میں بھلا شکل وصورت کا کیا۔
اور پھر کیا پتا وہ اندر سے بہت خوبصورت ہو۔
اُس کی ذات کی ساری خوبصورتی اُس کا کردار' اُس کی سیرت' اُس کی گفتگو ہو۔ یا پھر سب سے
زیادہ پاور فل (طاقت ور) اُس کی محبت ہو۔ وہ محبت جو وہ ریٹا سے کرتا ہے اور اس محبت سے ریٹا کو اسیر کیا ہو۔
"یہ لیزا ہے۔" ریٹا نے تعارف کروایا۔
"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" اُس کی آنکھوں میں واضح ستائش تھی۔
"آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا مجھے۔"
"کیفی! میں نے تمہیں بتایا تھا ناں یہ اسلام کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہے۔ تم اسے مطمئن کر
سکتے ہو۔"؟
"وائی ناٹ۔" (کیوں نہیں)
"آیئے پلیز' اُدھر چل کر بیٹھتے ہیں۔" اُس نے ایک الگ گوشے کی طرف اشارا کیا۔
"جی' اب پوچھیے' کیا پوچھنا ہے۔" اطمینان سے بیٹھنے کے بعد اُس نے غور سے رتن کو دیکھا۔
"جی۔" اُس کے اس طرح دیکھنے پر وہ گھبرا گئی۔
"کیا پوچھوں' میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"
"پوچھ لو ناں وہ سارے سوالات جو تمہارے ذہن میں آتے ہیں۔" ریٹا نے اُسے سہارا دیا۔
"میں جاننا چاہتی ہوں کہ سچا اور اصل مذہب کون سا ہے' خدا یا بھگوان کیا ہے۔"؟ اُس نے جھجکتے
جھجکتے پوچھا۔
"خدا کی عظمت کا ادراک شعور کو نہیں ہو سکتا بی بی"۔
کسی نے بالکل اُن کے قریب آ کر کہا تو کیفی یک دم کھڑا ہو گیا۔
"السلام علیکم سر!"
"کیا حال ہے میاں کیفی"؟ آنے والا کُرسی گھسیٹ کر اُن کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔
"یہ پروفیسر احسان فتح پوری ہیں۔" کیفی نے تعارف کروایا۔
"اور یہ لیزا اور ریٹا ہیں۔"
"جیتی رہو۔"
اُن کے لہجے میں شفقت تھی۔ کلین شیو' اونچی روشن پیشانی' سر کے بال کہیں کہیں سے اُڑے
ہوئے۔ عمر بھی کوئی پچاس پچپن کے قریب شخصیت میں ایک غیر معمولی کشش تھی۔ مخاطب اُن کے لہجے کے سحر
میں ڈوب جاتا تھا۔
"کہاں رہے میاں اتنے دن پھر نظر نہیں آئے۔؟"
"بس سر! کچھ جاب کی مصروفیت تھکا دیتی تھی حاضر نہ ہو سکا۔"
"جاب کے علاوہ اور بھی مصروفیات اس عمر میں آدمی کو اُلجھائے رکھتی ہیں۔ صاحبزادے۔ ہاں وہ
تمہارے سوشلسٹ دوست پھر تشریف نہیں لائے میاں لاتے اُن کو کسی دن۔ اُن سے بحث کر کے پھر انہیں لا

جواب ہوتے دیکھ کر بڑا مزا آتا ہے۔"

"وہ اِدھر آئے ہوئے ہیں۔ لیجئے۔ وہ اِدھر ہی آرہے ہیں۔ اور اُن کے ساتھ صاحبزادہ اکرام صاحب ہیں۔ کیفی نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم اُدھر چلیں ریٹا پھر کبھی کیفی سے بات کرلیں گے۔" رتن نے آہستگی سے کہا۔

"نہیں لیزا! بیٹھو اُدھر اب جگہ کہاں ہے۔ ابھی ذرا دیر بعد ڈنر کے لئے اُٹھ جائیں گے سب۔"

وہ شاید کیفی کا ساتھ چھوڑنا نہ چاہتی تھی۔

السلام علیکم کی زوردار آواز کے ساتھ تین چار حضرات مزید وہاں آکر براجمان ہوگئے' تو ریٹا رتن نے اپنی کُرسیاں قدرے پیچھے کرلیں' اور آپس میں ہولے ہولے باتیں کرنے لگیں۔

ریٹا ہال میں موجود مختلف خواتین کے بارے میں ہولے ہولے اُسے بتا رہی تھی۔

"وہ بیگم رازی ہیں اُن کے میاں کسٹم میں ہیں۔ اُوپر کی کمائی بہت ہے۔ دیکھو ڈائمنڈ پہنے ہو ہیں' اور وہ فلاں بیگم۔۔۔ اور فلاں بیگم۔"

رتن کو کسی بھی خاتون کے ذاتی حالات سے کوئی بھی دلچسپی نہ تھی' لیکن وہ غور سے ریٹا کی باتیں سُن رہی تھی۔

"دراصل ہم چیزوں کو مکس اَپ (ملا) کردیتے ہیں۔ کلیئر اور DISTINCT (صاف الگ) نہیں کرتے پھر ٹیکنیکل اپروچ۔۔۔۔ تو بڑی جامد ہے' جو عقل اور استدلال سے وابستہ ہے' باقی سب کچھ اموشنل اپروچ میں آتا ہے۔"

پروفیسر احسان الحق فتح پوری کہہ رہے تھے۔ رتن اُن کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں صدیقی صاحب! درخت میرے دائیں طرف پر ہے۔ اِس اپنے طور پر کوئی مطلب نہیں کہ درخت کہاں ہے۔ میں تو اپنی پوزیشن کے لحاظ سے سمجھتا ہوں کہ درخت کہاں ہے میرا اپنا احساس ہے اور جب یہ احساس تقویت پاتا چلا جاتا ہے کہ خدا شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے تو ایمان آتا ہے۔ یہی تو عقیدہ ہے کہ دیکھے بغیر ایمان لایا جائے۔ فرشتوں پر' آسمانی کتابوں پر پیغمبروں اور روزِ حساب پر۔"

وہ دم بخودی اُن کی باتیں سُن رہی تھی۔

"مادیت پسند کہتے ہیں کہ دکھاؤ' دلیل سے ثابت کرو۔ LAWS OF WITNESS کے تحت کچھ کر چکھ کر محسوس کیا تو یہ مشاہدہ ہے' ایمان نہیں' ایمان تو یہ ہے کہ دیکھے بغیر تسلیم کیا جائے۔ اس کائنات کا خالق و مالک اللہ ہے۔ باقی سب نظر کا دھوکا ہے اور اس کو تسلیم کرنے والا مسلم ہے۔"

پروفیسر صاحب جو کچھ کہہ رہے تھے' وہ دل میں تو اُتر رہا تھا' لیکن ذہن اُسے کیچ نہیں کر رہا تھا۔ کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا' بس دماغ میں ایک ہلچل سی مچل گئی۔

یہ تو طے تھا کہ پتھر اور مٹی کے دیوی' دیوتا' خدا نہیں تھے۔ خدا کو دیکھے' چھوئے بغیر محسوس کرنا مگر۔۔۔!

اور اس مگر کے آگے بہت سے سوالیہ نشان تھے۔ اُس کا دل چاہا' وہ پروفیسر صاحب سے پوچھے وہ کچھ کہہ رہے تھے' اُسے دوبارہ بتائیں۔ زیادہ آسان لفظوں میں۔ زیادہ کھول کر کہ وہ جاننا چاہتی ہے' اس بھی زیادہ' لیکن اُسی وقت سب کو کھانے کے لئے بُلایا جانے لگا۔ ریٹا کے ساتھ وہ بھی کھڑی ہوگئی۔ کھانے سے پہلے مسز شیردل کے بیٹے نے کیک کاٹا تھا۔

خوبصورت سا' ہنستا مسکراتا' بچہ دیکھ کر اُسے وکرم یاد آگیا۔ اُس کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی لیکن اس نے آنسوؤں کو باہر نہ نکلنے دیا۔

کھانے کے بعد موسیقی کا پروگرام تھا۔ ایک دوسرے ہال میں کارپٹ پر سفید چادریں بچھی تھیں۔ لوگ اُٹھنے لگے تھے۔ کئی مہمان کھانے کے بعد چلے گئے تھے۔ ریٹا وغیرہ کا جانے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔

"یہ مسز شیردل ہیں تو اسکول ٹیچر' لیکن یہ ٹھاٹ باٹ۔" اُس نے دل ہی دل میں سوچا اور ریٹا کے ساتھ ہال میں آگئی۔

ریٹا کو کوئی دوست مل گئی تھی' وہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی وہاں آ بیٹھی جہاں اُس سے آگے پروفیسر صاحب بیٹھے تھے۔ اُس نے اپنا پورا دھیان اُن کی طرف لگایا ہوا تھا' لیکن اب اُن کے درمیان سیاست پر گفتگو ہو رہی تھی۔ پھر موسیقی کا پروگرام شروع ہوگیا۔ پتا نہیں کون کون کیا کیا گا رہا تھا' اُس کا ذرا بھی دھیان نہ تھا' بس اس کے تو ذہن میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔ گڈمڈ' وہ پروفیسر صاحب کے لیکچر کو یاد کرنے کی کوشش کرتی تو سب ذہن سے نکل جاتا۔ بس ایک جملہ ذہن میں رہ گیا تھا کہ اس کائنات کا خالق و مالک اللہ ہے اور باقی سب دھوکا ہے' لیکن کیسے؟

اُس نے اُلجھ کر پروفیسر صاحب کی پیٹھ پر نظریں جما دیں۔

؟"حقیقت ایک سچائی ہے۔ جس کا وجود ہے۔"

شوکت علی لوگوں کی تحسین وصول کرکے اُٹھا تو پروفیسر صاحب نے پاس بیٹھے شخص سے کہا۔

"اور لا الٰہ الا اللہ کا مطلب بھی یہی ہے کہ بس ایک حقیقت ہے' اس کے سوا تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"مگر۔۔۔!" ساتھ والے شخص نے کچھ کہا۔

"او میاں۔۔۔ او میاں صدیقی مت اُلجھا اپنے دماغ کو' یقین۔۔۔ یقین لازمی ہے۔ عقل اور حواس سب دھوکا ہیں اور دیکھ سُن شاید اقبال ہیر گانے لگا ہے۔ کیا غضب کی ہیر گاتا ہے۔"

"مگر پروفیسر صاحب! وہ تو انکار کر رہا تھا۔"

"پر اب مجبور کر دیا ہے سب نے۔"

پروفیسر صاحب' ہیر سُننے لگے تھے۔ اُس کا دھیان بھی اُدھر چلا گیا۔

واقعی آواز خوبصورت تھی۔ پورے ہال میں خاموشی تھی۔ وہ بھی دھیان سے سُننے لگی۔

بناں مُرشد راہ نہ ہتھ آدے

دودھاں باجھ نہ رجھدی کھیر سائیں

(بغیر مُرشد کے راستہ نہیں ملتا اور دودھ کے بغیر کھیر نہیں پکتی)

"سُن رہی ہو لیزا۔" کیفی نہ جانے کب اُس کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا اور اب بڑی بے تکلفی سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کہہ رہا تھا۔

اُس نے نرمی سے اُن کا ہاتھ کندھے پر سے ہٹا دیا۔

"مرشد بغیر راستہ نہیں ملتا۔ ہمیں اپنا مُرشد بنالو لیزا' سارے شکوک ختم کر دوں گا' ساری اُلجھنیں دور کر دوں گا۔"

اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی اور لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"یہ کیفی کچھ عجیب عجیب سا نہیں لگ رہا؟"

اُس نے سوچا۔

اور ریٹا پتا نہیں کہاں ہے۔؟

بناں مُرشد راہ نہ ہتھ آوے

اقبال باہو گا رہا تھا۔

اور راہبر کون بنے اور بغیر راہبر کے بھلا منزل کیسے ملے گی۔ اور راہبر۔۔ راہنما۔۔

اُس کی نگاہیں پروفیسر احسان الحق کی طرف اُٹھ گئیں۔

''لیزا!'' کیفی کی سرگوشی بالکل قریب سے آئی۔

''مجھے اتنی زیادہ معصومیت اور دلکشی کا اندازہ نہیں تھا۔ تم تو بہت۔۔''

وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔

''یہ ریٹا پتا نہیں کہاں ہے۔''؟ اُس نے اُونچی آواز میں کہا۔

کونے میں بیٹھی آن نے اُسے دیکھ کر بُلایا۔

''اِدھر آ جاؤ لیزا! بس اب چلتے ہیں۔''

اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی آن کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆☆

''سونی بیٹا! تم تیار نہیں ہوئیں ابھی۔''

بیگم زینت مراد نے کوئی چوتھی بار سونیا کے کمرے میں جھانکا۔

''ابھی تو بہت وقت پڑا ہے ماما۔'' سونیا نے یونہی بیڈ پر لیٹے لیٹے کروٹ بدل کر اُنہیں دیکھا۔

''مسز وہاب نے ڈنر پر ہی بُلایا ہے۔ ناں اور ابھی تو پانچ بھی نہیں بجے۔''

''اچھا تم وقت پر تیار ہو جانا یہ تو نہیں ہے نا کہ ہم عین وقت پر پہنچیں۔ پھر مسز وہاب نے کسی کو بُلایا ہی نہیں۔ صرف ہم ہی ہیں اور اُنہوں نے تاکید کی تھی کہ ذرا جلدی گھر سے نکلیں۔''

''جی ماما!''

''اور ہاں سُنو' میں ذرا فیشل کروانے جا رہی ہوں' گھنٹے تک آ جاؤں گی' تب تک تم دونوں اور مدحو ہے کدھر؟''

''وہ سو رہی ہے۔''

''جگا دو اب اُسے اور ذرا باصر کو بھی فون کر دینا۔ وقت پر پہنچ جائے۔ اُدھر۔ تمہارے پاپا کو تو فون کر دیا تھا اور ہاں اگر تبریز آ جائے تو اُس کو بھی بتا دینا مسز وہاب کی دعوت کا۔''

''لیکن یہ تبریز بھائی گئے کدھر ہیں۔؟''

''کسی کام سے پشاور گیا ہے۔ تین دن کا کہہ کر گیا تھا۔ آج آنا تو تھا اُسے۔ پتا نہیں ابھی تک نہیں آیا۔''

مسز زینت چلی گئیں تو سونیا اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ قریب مدحت سو رہی تھی۔

''مدحو یار! اُٹھ جاؤ اب۔''

مدحت شاید جاگ رہی تھی۔ اُس سے آنکھیں کھول کر سونیا کو دیکھا۔

''کیا میرا جانا ضروری ہے۔ سونی؟''

''ضروری تو نہیں' لیکن ماما نے کہا ہے ناں پھر مسز وہاب نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ سب لوگ آئیں۔''

''مگر سونی! میرا دل نہیں چاہتا مجھے اجنبی لوگوں میں گھبراہٹ ہوتی ہے۔''

''وہاں زیادہ لوگ تھوڑا ہی ہوں گے۔ مدحو بس مسز وہاب کی ہی فیملی ہوگی اور اُن لوگوں سے تم مل چکی ہو' کس قدر محبت کرنے والے ہیں سب' پھر سویرا تو تمہاری کلاس فیلو ہے۔''

''ہاں وہ تو ہے لیکن۔۔۔''

''لیکن ویکن کچھ نہیں' چلو شاباش اُٹھو اور کپڑے وغیرہ نکال لو۔'' سونیا نے پیار سے اُس کے رخسار کو تھپکا۔

''خوش رہا کرو مدحو''

''خوش ہی رہتی ہوں۔''

''کہاں خوش رہتی ہو' ہر وقت اُداس اور چپ چپ سی لگتی ہو۔ لڑکیوں کو آخر ایک دن اپنا گھر چھوڑنا ہی ہوتا ہے ناں! تم نے بھی سدا میاں جی کے پاس تو نہیں رہنا تھا ناں۔''

مدحت کی آنکھیں نم ہوگئیں' لیکن مدحت نے سونیا سے آنکھوں کی نمی چھپا لی اور اُٹھ کر وارڈروب سے کپڑے نکالنے لگی۔

''میں ذرا شاور لے لوں' اتنے میں تم کپڑوں کا سلیکشن کر لو۔''

''سلیکشن کیا کرنا ہے کون سا کوئی بڑا فنکشن ہے یہ وائٹ کاٹن کا سوٹ ٹھیک رہے گا۔''

''ارے نہیں' نہیں ماما کا موڈ خراب ہو جائے گا۔ وہ فیروزی سِلک کا سوٹ نکال لو جو اُس دن ماما لائی تھیں۔''

سونیا نے باتھ روم کی طرف جاتے جاتے کہا۔ تو مدحت نے خاموشی سے فیروزی سِلک کا سوٹ نکال کر آئرن اسٹینڈ پر رکھا تب ہی فون کی بیل بج اُٹھی۔ دوسری طرف باصر تھا۔

''ہیلو۔''

''ہیلو۔'' اُس نے آہستگی سے کہا۔

''یہ تم ہو مدحت' ماما اور سونی کہاں ہیں۔''؟

''آنٹی تو پارلر گئی ہیں۔ اور سونی نہا رہی ہے۔''

''اچھا دیکھو تم ماما کو بتا دینا یہاں کچھ ایمرجنسی ہے۔ میرا انتظار نہ کریں' میں اگر فارغ ہوگیا۔ تو سیدھا مسز وہاب کے ہاں ہی آ جاؤں گا۔''

''جی بہتر۔''

''مدحو'' لمحہ بھر بعد باصر کی آواز آئی۔

''اپنا خیال رکھا کرو اور خوش رہا کرو۔''

''جی۔''

''مدحو! میں صرف تمہارے لیئے تمہاری آسانی اور سہولت کے لئے ہاسپٹل میں رہ رہا ہوں تا کہ تمہیں میری ذات سے کوئی ڈسٹربنس نہ ہو۔''

''مجھے کوئی ڈسٹربنس نہیں ہے۔ آپ پلیز' میرے لئے گھر نہ چھوڑیں۔ آپ گھر آ جائیں۔ میں نے

بھلا دیا ہے۔' بھول چکی ہوں۔ اُس روز کی بات کو' میرے لئے میاں جی کا فیصلہ ہر بات سے افضل ہے۔''

''گڈ۔'' باصر نے آہستگی سے کہا۔

''مجھے پتا تھا' مجھے یقین تھا مدحو کہ تم میاں جی کے لئے اپنی ذات کی نفی کر سکتی ہو۔''

اور اس کے ساتھ ہی اُس نے ریسیور رکھ دیا۔

مدحت خالی خالی نظروں سے ریسیور کو دیکھ رہی تھی۔ اور کیا میں نے واقعی اُس رات کی بات کو ؟ ہے۔ کیا وہ کونپل جو اُس رات خود بخود پھوٹ پڑی تھی۔ میرے دل میں مر چکی ہے اور کیا۔ تبریز۔۔ تبر لئے میرے دل میں وہ جگہ بن گئی ہے جو باصر کے لئے تھی۔ وہ کتنی کوشش کرتی تھی کہ اُس کے دل میں تبر لئے محبت۔ اُس محبت کا چشمہ پھوٹ پڑے۔ جو باصر کے لئے اُس کے دل میں تھی' لیکن کوئی جذبہ بیدار نہیں تھا' اُس لئے کہ محبت کا عمل کوشش سے جاری نہیں ہوتا بلکہ یہ تو پہاڑوں سے پھوٹ پھوٹ کر بہہ آنے والے چشموں کی طرح خود بخود دل سے پھوٹتا ہے۔

''کس کا فون تھا مدحو؟''

سونیا تولئے سے بالوں کو جھٹکتے ہوئے اُس کے قریب چلی آئی۔

''ہوں۔'' مدحت نے چونک کر اسے دیکھا اور ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

''باصر کا۔''

''کیا کہہ رہا تھا؟'' سونیا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر چہرے پر کولڈ کریم لگانے لگی۔

''وہ کہہ رہے تھے کوئی ایمرجنسی ہے' شاید دیر ہو جائے اس لئے سیدھا اُدھر ہی چلا آؤں گا۔''

''اچھا''۔

سونیا نے مُڑ کر ایک نظر اُس کے چہرے پر ڈالی۔ بُجھی بجھی سی آنکھیں' تھکا تھکا چہرا۔ جب پورے آئی تھی تو اس طرح تو نہ تھی۔ کیسی چمک تھی چہرے پر' کتنی زندگی تھی آنکھوں میں' مگر اب۔۔۔!

''مدحو! کیا تم کچھ بیمار ہو۔''

''نہیں تو۔'' وہ زبردستی مُسکرائی۔

''چلو کل شاہ پور چلتے ہیں۔ کل جمعہ ہے ناں چُھٹی ہے۔ باصر سے کہیں گئے' لے چلے' میاں جی خوش ہو جائیں گے اور تم بھی ہماری بھی آؤٹنگ ہو جائے گی۔ مجھے تو عرصہ ہی ہو گیا ہے' شاہ پور گئے ہوئے۔''

''ٹھیک ہے'' مدحت نے سر ہلایا۔

''اچھا اب فٹافٹ تیار ہو جاؤ بلکہ باتھ لے لو اتنی گرمی ہے نا۔ حالانکہ ابھی اپریل کا مہینہ ہے گرمی ابھی سے پڑنے لگی ہے۔''

مدحت کپڑے اُٹھا کر باتھ روم میں چلی گئی۔ اور سونیا ہولے ہولے گنگناتے ہوئے تیار ہونے لگی۔ زینت مراد کی واپسی تک دونوں تیار تھیں۔

سونیا نے بھی سِلک کا جامنی رنگ کا سُوٹ پہنا تھا اور بہت دلکش لگ رہی تھی۔ زینت مراد نے دونوں کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔

''گڈ! تم تیار ہو' میں ابھی پندرہ منٹ میں تیار ہو کر آتی ہوں اور سونی تم ذرا اپنے پاپا کو پھر فون کرو ابھی تک آئے کیوں نہیں؟''

وہ اُسے ہدایت دے کر اپنے ڈریسنگ روم میں چلی گئیں۔

''ماما کے پندرہ منٹ ایک گھنٹے سے کم نہیں ہوتے۔''

سونیا نے اُن کے جانے کے بعد ہنستے ہوئے کہا اور فون کرنے لگی۔

''لیجئے پاپا بھی سیدھے اُدھر ہی جائیں گے۔''

اُس نے مُڑ کر مدحت کو اطلاع دی اور دوبارہ نمبر ملانے لگی۔

شاید کسی دوست سے بات کرنے لگی تھی۔ مدحت نے ایک نظر اُسے دیکھا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

پتا نہیں کیوں اُسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آنٹی اُسے ساتھ نہ لے جاتیں۔۔ اب اس کا جانا کوئی ایسا ضروری بھی نہیں تھا۔ مسز وہاب نے دعوت پر بُلایا تھا اور اگر گھر کا ایک آدھ فرد دعوت میں شریک نہ بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا تھا۔ اور پتا نہیں یہ دعوت کس سلسلے میں تھی۔ آنٹی نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا۔ ٹی وی لاؤنج میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے مدحت نے سوچا۔

اندر سے سونیا کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

''یار! تم بھی کیا کرتی ہو۔ ایک ہی بار فیصلہ کیوں نہیں کر لیتیں خواہ مخواہ بے چارے کو سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ وہ چلتے چلتے لحہ بھر کو رُکی۔

''کیا ایک بار فیصلہ کر لینے کے بعد آدمی مطمئن ہو جاتا ہے اور کیا سونی کی دوست مطمئن ہو جائے گی اپنے فیصلے سے۔''؟

''مجھے کیا؟''

اُس نے کندھے اُچکائے اور دروازہ کھول کر باہر لان میں آ گئی۔ اگرچہ شام ہو رہی تھی' لیکن پھر بھی فضا میں ہلکی سی تپش تھی۔ خلیل نے اُسے لان میں آتا دیکھ کر پیڈسٹل لگا دیا۔

''ابھی کافی تپش ہے۔ بی بی۔''

''ہوں۔'' مدحت نے یونہی سرسری نظروں سے اُسے دیکھا۔

خلیل زیادہ تر گیٹ کے پاس ہی رہتا تھا۔ یعنی ایک طرح سے وہ چوکیدار تھا صبح سے شام تک وہ ڈیوڑھی میں چارپائی پر بیٹھا رہتا تھا' جب انکل مراد یا کوئی بھی گھر آتا تو اُٹھ کر گیٹ کھول دیتا۔ شام کو اگر لان میں بیٹھنا ہوتا تو برآمدے میں سے پیڈسٹل اُٹھا کر لان میں لگا دیتا۔ کبھی کبھی شام کو لان میں پانی لگاتا اور بس اس کے علاوہ تو اس کا کوئی کام نہیں تھا۔ رات کو سرونٹ کوارٹر میں جا کر سو جاتا۔ وہ اور نصیر ڈرائیور دونوں سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے۔ نصیر کے بیوی بچے گاؤں میں رہتے تھے۔ جب کہ خلیل کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ مدحت نے اکثر ہی اسے اخبار یا کوئی رسالہ پڑھتے دیکھا تھا۔ اُس وقت بھی اُس کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا۔

''خلیل! تم پڑھے لکھے ہو۔''؟ مدحت نے یوں ہی وقت گزاری کے لئے پوچھا۔

''جی بی بی جی! آٹھ جماعت پڑھا ہوں۔''

''بہن بھائی اور ماں باپ ہیں تمہارے؟''

''ماں باپ تو جی مر گئے ہیں۔ بہن بھائی البتہ اُدھر پیچھے گاؤں میں رہتے ہیں۔ دو بہنیں ہیں میری اور سات بھائی ہیں۔ سوتیلے ہیں سب۔ باپ کے مرنے کے بعد اُن سب نے مجھے اور میری ماں کو گھر سے نکال دیا۔ میری ماں نے تو کہہ دیا تھا کہ مر کر ہی اس گھر سے نکلوں گی۔ بھائیوں نے دھکے دیے۔ اُن کی بیویوں نے مارا' پر جی اُس نے کہہ دیا تھا کہ جیتے جی تو وہ نہ نکال سکیں گے اُسے' پر میں تو بھاگ آیا۔ اِدھر لاہور میں آ کر مزدوری کرنے لگا۔ تین چار سال بعد گیا تھا گاؤں۔۔ تو پتا چلا کہ ماں مر گئی ہے پھر اُس دن کے بعد نہیں گیا۔ دن

کو مزدوری کرنے لگا' رات کو یوں ہی اِدھر اُدھر کسی زیرِ تعمیر کوٹھی میں یا اسٹیشن پر جا کر سو جاتا تھا۔ اِدھر بھی کرنے ہی آیا تھا جی یہ کوٹھی جب بنی تو میں اِدھر ہی مزدوری کرتا تھا اور رات اِدھر ہی پڑ کر سو جاتا تھا۔ پھر جی نے مجھ سے پوچھا کہ چوکیداری کرو گے تو بی بی جی بس اِدھر کا ہی ہو گیا۔ اب تو بیس سال ہو گئے اِدھر۔''

وہ بہت خوش خوش بتا رہا تھا۔ مدحت بھی۔۔۔ دھیان سے سُن رہی تھی کہ اچانک گیٹ کے گاڑی کے رُکنے کی آواز آئی اور پھر ساتھ ہی بیل بھی ہوئی خلیل گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

''شاید انکل گھر ہی آ گئے ہیں۔''

مدحت نے سوچا۔ وہ گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ خلیل نے گیٹ کھول دیا تھا' لیکن سفید کر آنے کی بجائے ٹرن لے کر واپس مُڑ گئی تھی اور تبریز گیٹ سے اندر آ رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں بریف کیس بے حد تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ یوں ہی سر جھکائے مدحت کی طرف دیکھے بغیر وہ اندر چلا گیا۔

مدحت۔ وہیں لان چیئر پر بیٹھ گئی اور وہ میز پر کہنیاں ٹیکتے ہوئے خلیل کو گیٹ بند کرتے دیکھنے لگی۔ خلیل گیٹ بند کر کے پھر لان میں آ گیا۔ اور مدحت کے قریب ہی ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

''بی بی! آپ نے دیکھا تھا اُس عورت کو' جو گاڑی چلا رہی تھی۔''؟

''نہیں'' مدحت نے چونک کر اُسے دیکھا۔

''کیا کوئی خاتون ڈرائیو کر رہی تھی؟''

''ہاں جی' پہلے بھی دو تین بار یہ عورت اپنے تبریز میاں کو ڈراپ کر کے گئی ہے یہاں۔ شکل سے خبیث لگتی ہے جی' جادوگرنی سی لگتی ہے۔ ہم نے تو جی صاحب کا نمک کھایا ہے۔ دل کڑھتا ہے جی۔ سچی بات ہے اپنے تبریز میاں پر جادو کر دیا ہے کسی نے۔ مجھے تو اسی عورت کا ہاتھ لگتا ہے۔ پہلے کتنے ہنس مکھ ہوتے تھے گھنٹہ گھنٹہ میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتے تھے اور اب تو دیکھتے ہی نہیں۔ حال بھی نہیں پوچھتے۔''

''یہ عورت ہے کون' کیا خبر آفس میں کوئی کام کرنے والی ہو۔''

''اوہ نہیں جی' یہ تو کوئی جادوگرنی ہی لگتی ہے۔'' خلیل نے پورے یقین سے کہا۔

''یہ عورت کون تھی۔ آنٹی کہہ رہی تھی تبریز کسی کام سے پشاور گئے ہیں۔ تو کیا یہ انہیں ائیر پورٹ سے لائی ہے۔ کیا خبر انکل نے آفس سے کسی کو بھیجا ہو' کسی ورکر کو۔ اُنہیں پتا تو تھا کہ نصیر کو ہمارے ساتھ مسز وہاب کے ہاں' وہ تبریز کو ایئر پورٹ لینے نہیں جا سکتا۔ یقیناً ایسا ہی ہو گا' اور یہ خلیل تو پاگل ہے بالکل۔''

مدحت نے سوچا اور مسکرا کر خلیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جادو وادو کچھ نہیں ہوتا اور نہ ہی جادوگرنیاں یوں گاڑیوں میں گھومتی پھرتی ہیں۔''

ہوتا ہے بی بی جادو' آپ کو کیا پتا' آج کل تو بڑی بڑی خواتین جادو ٹونے کرتی پھرتی ہیں۔ وہ نہیں اپنی بیگم سعد اللہ۔۔۔ وہ بی بی صاحب کی سہیلی نہیں ہیں' آن کی خالہ اپنی بیگم صاحب سے بہت دوستی ہے اُن کی۔ میں نے اُنہیں خود دیکھا تھا۔ اُدھر بیری والے بابا کے پاس' وہ جادو ٹونا ہی کرتے ہیں۔''

''اور تم وہاں کیا کرنے گئے تھے'' مدحت دلچسپی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''وہ میں جی۔۔۔ میں۔۔۔!'' وہ گھبرا گیا۔

تب ہی سونیا باہر آئی۔

''تم یہاں ہو مدحو' میں تمہیں اندر دیکھ رہی تھی۔ وہ تو تمیمی نے بتایا کہ مدحت باہر لان میں بیٹھی ہے

''تبریز نے؟''

مدحت کو حیرت ہوئی۔ اُس کا خیال تھا کہ تبریز نے اُسے دیکھا ہی نہیں ہے۔ وہ تو یوں ہی سر جھکائے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اندر چلا گیا تھا۔

''ہاں تبریز نے۔'' سونیا نے اُس کی طرف دیکھا۔

''وہ ابھی آیا ہے' لیکن ہمارے ساتھ نہیں جا رہا تھکا ہوا ہے۔''

''خلیل۔'' وہ خلیل سے مخاطب ہوئی۔

''نصیر سے کہو گاڑی نکالے۔''

''جی بی بی صاحب۔؟''

''اور تم یہاں کیا کر رہی تھیں۔''

''یوں ہی اندر دل گھبرا رہا تھا۔ پتا نہیں شام کے وقت بند کمروں میں مجھے گھٹن ہونے لگتی ہے۔ باہر آئی تو خلیل سے باتیں کرنے لگی۔''

''ارے یہ خلیل۔۔۔ مدحو اسے زیادہ لفٹ نہ کروانا۔ بہت باتونی ہے' کان کھا جاتا ہے۔ پتا نہیں کہاں کہاں کے جنوں بھوتوں کے قصے رٹ رکھے ہیں اُس نے۔''

رینت مراد نے اندرونی دروازے کو کھولتے ہوئے انہیں آواز دی اور پورچ کی طرف بڑھ گئیں۔

''کم آن سونی! پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔''

نصیر نے دروازہ کھولا۔

''سونی ڈارلنگ! یہ تمہارے پاپا کیا کہہ رہے تھے۔ ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں گے ناں۔''

''جی ماما''

سونیا نے دروازہ لاک کیا۔

''توبہ! یہ تمہارے پاپا ہمیشہ ہی ایسا کرتے ہیں۔ کبھی جو کسی دن صحیح پروگرام کے مطابق کسی فنکشن میں شریک ہو جائیں۔''

''کوئی کام ہو گا ماما!'' سونیا نے اُن کا دِفاع کرتے ہوئے کہا۔

''کام تو ہمیشہ ہی ہوتا ہے' لیکن لوگوں سے ملنا جلنا تو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ ہزاروں کام نکل سکتے ہیں اور پھر وہاب صاحب تو تیل اور گیس کے وفاقی وزیر ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ یہ دعوت مس ہی نہ کر دیں۔ کیا سوچیں گے وہاں سب۔''

''آ جائیں گے ماما! آپ پریشان نہ ہوں۔''

سونیا نے آہستگی سے کہا۔

''اور یہ تبریز کیا کہہ رہا تھا۔؟''

''وہ تھکے ہوئے ہیں۔''

''کون سا پیدل چل کر آیا ہے' ہوائی جہاز پر تو آیا ہے۔''

سونیا چپ ہی رہی۔

''پتا نہیں کیوں میں کبھی کبھی تبریز کی طرف سے پریشان ہو جاتی ہوں سونی؟''

پھر اچانک جیسے اُنہیں مدحت کا خیال آ گیا اور اُنہوں نے بات بدل دی۔

''وہ خاموش ہوگیا ہے۔' تم اسے کمپنی دیا کرو۔ باصر بھی ہاسپٹل میں ہی رہنے لگا ہے۔ رمیغر میں ہے گھر میں وہ بور ہوتا ہوگا۔''

''جی ماما۔'' سونیا سمجھ گئی تھی کہ کچھ کہتے کہتے اُنہوں نے بات بدل دی ہے۔

مدحت چُپ بیٹھی تھی۔

''ارے ہاں سونی! مجھے یاد آیا' وہاں پارلر میں مجھے بیگم لاثانی ملی تھیں' اپنی بہو کے ساتھ آ بڑی کیوٹ ہے اُن کی بہو۔ تمہیں پتا ہے نا۔ اُن کے بیٹے نے امریکہ میں شادی کر لی تھی۔ امریکن مُسلمان ہوگئی تھی۔ اس وقت بھی دوپٹا لئے ہوئے تھی۔ اور شلوار قمیض میں تھی۔ بیگم لاثانی بہت اصرار کر ر کہ کسی دن اُن کے گھر آئیں کسی دن چلیں گے۔''

وہ مسلسل بول رہی تھیں۔

''پتا نہیں آنٹی تھکتی بھی نہیں' یوں مسلسل بولنے سے۔'' مدحت نے حیرت سے سوچا۔

''اگر میں اس طرح بولوں تو میرے تو جبڑوں میں درد ہونے لگے۔''

زینت مراد سارا راستہ بولتی رہیں۔ بیگم لاثانی کے بعد انہیں مسز تنویر کی کوئی بات یاد آ گئ تنویر کے بعد بیگم سعد اللہ کا خیال آ گیا۔

مدحت تو اُن کی باتیں سُن سُن کر تھک گئی تھی۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کیا جب گاڑی مسز و کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوئی۔

انکل مراد پہلے سے ہی وہاں موجود تھے۔ زینت انہیں دیکھ کر خوش ہوگئی تھیں۔

''تھینک گاڈ آپ موجود ہیں' ورنہ مجھے تو خدشہ تھا کہ کہیں آپ یہ دعوت مس ہی نہ کر دیں۔''

''وہاب صاحب بُلائیں اور ہم نہ آئیں' یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' مراد علی نے قہقہہ لگایا۔

وہاب صاحب بھی ہنسنے لگے۔

سویرا اور نویرا نے بڑے خلوص و محبت سے سونیا اور مدحت کو ریسیو کیا اور اپنے کمرے میں لے آئیں

''باصر بھائی اور تبریز بھائی کیوں نہیں آئے۔''؟ سویرا نے سونیا سے پوچھا۔

''باصر کے اسپتال میں کوئی ایمرجنسی تھی' وہ ڈنر تک آ ہی جائیں گے' البتہ تبریز بھائی ابھی پہ آئے ہیں۔ اور کچھ تھکے ہوئے ہیں۔''

''یہ تبریز بھائی کچھ زیادہ سنجیدہ سنجیدہ سے نہیں ہیں۔'' سویرا نے مدحت کی طرف دیکھتے ہو سے دریافت کیا۔

''مدحت بھی تو سنجیدہ سی ہیں۔'' نویرا نے رائے دی۔

''خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔''

سویرا زور سے ہنسی۔

''دیوانے تمہارے جیسے ہوتے ہیں' فراز نے کہو۔'' نویرا نے اُسے چھڑا۔

''واہ! میں کون سی دیوانوں والی حرکت کرتی ہوں۔' کیوں سونی آپا' کیا میں دیوانی ہوں۔''

''ارے نہیں' تم تو بڑی کیوٹ ہو۔''

''تو اور کیا' وہاں کالج میں مدحت کے بعد میں ہی سب سے زیادہ پیاری ہوں۔''

''مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔''

نویرا نے پھر اُسے چھیڑا۔

''کیا مطلب؟'' سونیا نے پوچھا۔

''یہ ڈاکٹر صاحبہ کبھی کبھی فارسی پڑھ کر تیل بیچنے چلی جاتی ہیں۔''

''تمہیں فارسی آتی ہے نویرا۔'' سونیا نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ تھوڑی بہت سمجھ لیتی ہوں۔ دراصل عبید بھائی کی وجہ سے۔ اُنہیں لٹریچر سے بہت دلچسپی ہے۔ اُردو' انگلش' پرشین۔ ہر قسم کے لٹریچر کی بہترین بکس ہیں۔ اُن کے پاس۔''

''میاں جی کے پاس بھی فارسی کی بہت نایاب کتابیں ہیں۔''

''ارے کس کے پاس نایاب کتابیں ہیں؟'' عبید نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''عبید بھائی آیئے۔ آ جایئے۔ سویرا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''آیئے اِدھر اور ان سے ملیئے یہ سونیا ہیں انکل مراد کی بیٹی اور یہ مدحت ہیں ان کی کزن۔''

عُبید نے سر کو ہلکا سا خم کرتے ہوئے انہیں وِش کیا۔

''میں غالباً مخل ہوا۔''

''نہیں۔ نہیں بھائی! آپ بیٹھیں' آپ مخل بالکل نہیں ہوئے۔'' سویرا نے اُنہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''دراصل۔!''

اُنہوں نے ایک نظر سونیا اور مدحت کے چہرے پر ڈالی۔

''میں اُدھر گیا تھا ڈرائنگ روم میں' لیکن ڈیڈی اور انکل مراد انتہائی بور باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ باصر اور تبریز وغیرہ شاید اِدھر بیٹھے ہیں۔ اُس روز باصر سے کافی گفتگو رہی تھی' وہ لوگ کیوں نہیں آئے۔''

''باصر بھائی کو اسپتال سے آنا تھا' بس آتے ہی ہوں گے۔'' سونیا نے بتایا۔

''ہاں یہ کن کتابوں کا ذکر تھا بھئی؟''

عبید نے محسوس کیا تھا کہ سونیا اور مدحت اُن کے آنے سے کچھ جھجک سی گئی تھیں۔ اس لئے وہ۔۔ بے تکلفی سے بات کر رہے تھے۔

''یہ جو مدحت ہیں ناں اس کے میاں جی ہیں۔'' اُن کے پاس بہت نایاب کتابیں ہیں۔'' سویرا نے اُن کی بات کا جواب دیا۔

''کیا یہ نایاب کتابیں ہم بھی دیکھ سکتے ہیں۔''؟ اُنہوں نے مدحت کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' مدحت نے ذرا سی پلکیں اُٹھائیں۔

''لیکن وہ میاں جی تو شاہ پور میں ہوتے ہیں۔''

''اچھا تو شاہ پور چلے جائیں گے' لیکن آپ کے میاں جی کیا وہ ہمیں اپنی کتابیں دیکھنے اور پھر پڑھنے دیں گے۔؟''

''ہاں' ہاں کیوں نہیں' میاں جی تو کبھی کسی بات سے انکار نہیں کرتے اور وہ ڈاکٹر شاہ محمد تو اکثر اُن سے کتابیں لے جاتے ہیں اور میاں جی تو بہت خوش ہوتے ہیں' اگر کوئی علم کا قدر دان اُن کو مل جائے۔''

''اور ہمارے عبید بھائی تو علم کے سچے قدر دان ہیں۔''

سویرا نے ہنس کر کہا۔

''اور مدحو! اپنا ہے۔ بھائی کے پاس بھی ڈھیروں کتابیں ہیں۔''

''مدحو!'' عبید کے ذہن میں چھنا کا سا ہوا۔

تو یہ ہے وہ لڑکی مدحت۔ مدحو جس کا ذکر کر کر کے سویرا اُن کے کان کھا گئی تھی۔

''مدحت ایسی ہے عبید بھائی' ویسی ہے' بس آپ کے لئے میں نے اُسے پسند کر لیا ہے۔ آپ کے لئے تو بس ایسی ہی لڑکی ہونی چاہئے تھی۔ ایسی ہی دھیمے مزاج والی' ہولے ہولے بولتی ہوئی اور عبید' اُس کی باتیں سُن کر ہنس دیتے۔ فی الحال اُنہوں نے اپنی شادی کے متعلق نہیں سو اُن کا خیال تھا کہ شادی کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے کیونکہ یہ پوری زندگی کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اُن سامنے اپنی خالہ اور پھپھو کی مثال تھی۔ پھپھو کی شادی اُن کی پسند سے ہوئی تھی۔ زبیر حسن اُن کے کلاس فی اور پھپھو کی خواہش جاننے کے بعد زبیر حسن کے خاندان کے متعلق زیادہ چھان بین نہیں کی گئی تھی' لیکن بع پتا چلا کہ وہ کوئی بہت اچھا فیملی بیک گراؤنڈ نہیں رکھتے تھے۔ زبیر کے علاوہ اُن کے تمام خاندان والے اور اُجڈ سے لوگ تھے۔ ہر وقت کا لڑائی جھگڑا' گالم گلوچ۔ پھپھو کچھ ہی عرصہ بعد اپنی زندگی سے تنگ آ گئ لیکن زبیر اپنے خاندان کو چھوڑ نہیں سکتے تھے اور پھپھو کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ اب وہ زبیر سے علیحدگی لے کیونکہ دادا جان نے اُنہیں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اُن کے خاندان میں طلاق لینا انتہائی معیوب سمجھ ہے۔ زبیر اُن کی اپنی پسند تھا' لہٰذا اب نباہ کریں سو پھپھو نباہ کر رہی تھیں۔

عبید کبھی کبھار پھپھو سے ملنے اُن کے گھر جاتے تو اُنہیں دیکھ کر بہت افسردہ ہوتے تھے۔ یہ اُن کی پھپھو تھیں۔ تھکی ہاری' چڑچڑی' ہر وقت بچوں کو ڈانٹتی ڈپٹی رہتیں۔ حالانکہ اُنہیں اچھی یاد تھا کہ یہی پھپھو کتنی ہنس مکھ ہوا کرتی تھی۔ دھیمے دھیمے مسکراتی رہتی تھیں۔ نرم لہجے میں بات کرتی تھیں اور سے بہت پیار کیا کرتی تھیں۔' لیکن اب اپنے بچے اُنہیں زہر لگتے تھے۔

سو وہ سویرا کی باتیں سُن کر ہنس دیتے تھے۔ اُنہوں نے ایک بار بھی اُس کی باتوں کو دھیان سے سُنا تھا۔

''پچی بھائی! اُس کے بال اتنے لمبے ہیں' اتنے چمکیلے اور ملائم' اُس کی آنکھیں اتنی خوبصو ہیں۔ اور پلکیں اور اُس کی رنگت بھی بہت اچھی ہے۔'' لیکن پھر یک دم ہی اُس نے اُس کا ذکر کرنا چھوڑ دیا۔

تب ایک روز وہ پوچھ ہی بیٹھے۔

''کیا بات ہے گڈی' سویرا کو دادی اماں گڈی کہہ کر بُلاتی تھیں۔ تو کبھی کبھی لاڈ میں وہ بھی کہہ لیا کرتے تھے' بہت دنوں سے تم نے اپنی ہونے والی بھابی کا ذکر نہیں کیا؟''

''اوہ۔۔وہ''

وہ یک دم اُداس سی ہو گئی تھی۔

''کیوں' کیا موصوفہ کی ساری خوبیاں خامیوں میں بدل گئی ہیں۔''؟

اُسے چھیڑنے میں اُنہیں لطف آتا تھا۔

''نہیں' وہ بہت اچھی ہے' بہت پیاری ہے' لیکن اُس کی منگنی ہو چکی ہے۔''

اور عبید بے اختیار ہنس دیئے تھے۔

''بہت خوب گڈی جان اب اگر میرے لئے کوئی لڑکی پسند کی تو پہلے پوچھ لینا کہ وہ منگنی شدہ تو ہے۔''

''آپ میرا مذاق نہ اُڑائیں عبید بھائی۔'' وہ واقعی روہانسی ہو گئی تھی۔

''وہ واقعی ایسی تھی کہ دل چاہتا تھا اُسے ہمیشہ کے لئے اپنے گھر لے آئیں' آپ نے اُسے دیکھا نہیں ہے ناں''۔

اور اب وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ واقعی ایسی ہی تھی جیسا سویرا نے بتایا تھا۔ اتنی ہی دلکش' اتنی ہی جاذبِ نظر۔ اور سب سے زیادہ اٹریکٹو۔ اُس کے چہرے کی معصومیت تھی۔ وہ نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے رخسار گلابی ہو رہے تھے وہ دیکھنے میں اُنہیں اچھی ہی لگی تھی۔ لیکن ممی نے تو اُنہیں تاکید کی تھی کہ وہ سونیا کو دھیان سے دیکھیں۔ سویرا کی طرح ممی کو بھی اُن کی شادی کا شوق ہو رہا تھا۔ اُنہوں نے مدحت کے چہرے سے نظریں ہٹا کر سونیا کو دیکھا۔ سونیا بھی دلکش لڑکی تھی' لیکن کیا پتا یہ لڑکی جو دیکھنے میں دلکش اور اچھی لگ رہی ہے درحقیقت کیسی ہے۔ کالج میں' یونیورسٹی میں کئی لڑکیاں اُن کے ساتھ پڑھتی تھیں۔ اور اب کئی لڑکیاں اُن کی اسٹوڈنٹ بھی ہیں۔ ہر طرح کی لڑکیاں اُن کی نظر سے گذر رہی تھیں۔ انتہائی ماڈرن' تھوڑی سی کم ماڈرن بالکل دبو' سادا لڑکیاں لیکن کسی کے بارے میں بھی کیا کہا جا سکتا ہے کہ اندر سے وہ کیسی ہے' کس مزاج کی ہے۔ کس کو بھی پہچاننا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

خالہ مینا تھیں۔ کتنی بے تحاشا خوبصورت' لیکن مزاج کی اتنی ہی سخت' اُن کی ممی سے بالکل مختلف' بے چارے انکل افضل کی زندگی تو عذاب بنا رکھی تھی اُنہوں نے۔ اور پھر اُن کی بیٹی تھی۔ افشاں' ممی کا رجحان بھی تھا ادھر' مگر اُنہوں نے ایک بار اُسے گھر میں مینا خالہ سے لڑتے دیکھا تھا۔

اوہ گاڈ! ہرگز نہیں' وہ اس طرح محض کسی لڑکی کو دیکھ کر عمر بھر کا فیصلہ نہیں کر سکتے' جب تک اچھی طرح پرکھ نہ لیں۔ اُنہوں نے اطمینان سے سوچا اور براہ راست مدحت سے پوچھا۔

''یہ شاہ پور کہاں ہے۔؟''

شاہ پور ادھر ہی ہے' بس زیادہ دور نہیں ہے' لاہور سے راولپنڈی کی طرف جائیں ناں تو۔۔''

''اور آپ کے میاں جی کیا کرتے ہیں۔؟ پڑھاتے ہیں۔؟''

''نہیں تو۔''

مدحت نے کس قدر حیرانی سے اُنہیں دیکھا۔

کیا اُنہیں میاں جی کے متعلق کچھ پتا نہیں ہے۔ کیا آنٹی زینت نے ان لوگوں کو کبھی کچھ نہیں بتایا' کہ میاں جی کون ہیں کیا کرتے ہیں۔؟ میاں جی تو بس میاں جی ہیں' وہ گھر میں رہتے ہیں اور بہت سارے لوگ اُن کے پاس آتے رہتے ہیں۔ اُن سے کچھ سیکھنے کے لئے' جاننے کے لئے۔

''اور میاں جی' اُفوہ!''

اُس نے سوچا' اب بھلا وہ اُن کو کیا بتائے کہ میاں جی کیا ہیں۔ نہ وہ کوئی پیر ہیں۔ نہ کوئی عالم ہیں' بس وہ میاں جی ہیں ناں۔

''دراصل میاں جی کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔''

لمحہ بھر کے توقف کے بعد اُس نے کہا۔

عبید بہت دلچسپی سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اُس لڑکی میں سچ مچ کوئی خاص بات تھی۔ سویرا نے صحیح کہا تھا۔

میاں جی کے متعلق بات کرتے ہوئے اُس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں اور چہرا روشن ہو گیا تھا۔

''لیکن اُن کے پاس بہت مشکل مشکل کتابیں ہیں۔ حدیث اور فقہ کی اور ایسی ہی کتابیں تفسیر وغیرہ کی اور فارسی کی کتابیں بھی ہیں۔ پتا نہیں۔

پتا نہیں آپکو وہ سب نہ پسند آئیں۔ آپ پتا نہیں کس طرح کی کتابیں پڑھتے ہیں' لیکن آپ
دن باصر کے ساتھ شاہ پور چلے جائیں' اور خود ہی دیکھ لیں۔''
اُس نے بات ختم کرتے ہوئے یوں گہری سانس لی' جیسے کوئی مشکل مرحلہ آ گیا ہو۔''
''اور اگر آپ کے میاں جی نے کہا کہ یہ بن ٹلا یا
''نہیں۔نہیں۔'' اُس نے بے حد تیزی سے کہا۔
''میرے میاں جی ایسے نہیں ہیں۔ وہ تو مہمانوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں مہمان
کی رحمت ہوتے ہیں۔ اور اُن کے پاس تو بہت دور دور سے لوگ آتے ہیں مسائل پوچھنے۔ ہفتوں قیام کر
ہیں۔ اُن کے قیام و طعام کا بندوبست ہے وہاں' جو نزدیک سے آتے ہیں۔ وہ بھی کھانا کھا کر ہی جاتے ہیں
کیوں سونی' تم بتاؤ ناں انہیں' میاں جی ایسے نہیں ہیں۔''
مدحت نے بات کرتے کرتے سونیا کی طرف دیکھا۔ اُس کا رنگ یکدم سرخ ہو رہا تھا۔
''ہاں!''
سونیا نے چونک کر اُسے اور پھر عُبید کو دیکھا۔
''مدحو صحیح کہہ رہی ہے' میاں جی ایسے نہیں ہیں۔''
''اچھا!''
عُبید اب سونیا کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ سونیا اُن کی شرارت
بے اختیار مسکرا دی۔
''پلیز عابی بھائی! آپ مدحو کو تنگ نہ کریں۔'' نورا نے عُبید کو مخاطب کیا۔
''نہیں'' میں تو تنگ نہیں کر رہا''۔
اُنہوں نے مُسکرا کر مدحت کو دیکھا۔ یہ لڑکی جس کے متعلق سویرا کے بار بار کہنے پر بھی اُنہوں
ایک بار بھی نہیں سوچا تھا اور اب جب کہ سویرا انہیں بتا چکی تھی کہ وہ لڑکی منگنی شدہ ہے' تو پتا نہیں کیوں وہ
بوجھ کر مسلسل اُس سے باتیں کیے جا رہے تھے۔
''یہ لڑکی سچ مچ بہت معصوم ہے'' اُنہوں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔
لیکن پتا نہیں بعض اوقات ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کہ ہم ہمیشہ کہیں اور ہوتے ہیں اور وہ جسے ہمارا
ہوتا ہے' وہ کہیں اور۔۔۔!
تب ہی ملازم نے اندر جھانک کر دیکھا۔
''کیا بات ہے موجو؟ نورا نے پوچھا۔
''جی وہ باصر صاحب آئے ہیں۔''
''یار! انہیں ادھر ہی لے آؤ۔''
عبید نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔
''یہاں ہی بیٹھ کر گپ شپ لگاتے ہیں۔ کیوں سسٹرز! اجازت ہے یہیں تمہارے کمرے میں
ڈیرا جمائے رکھیں؟''
''ضرور۔'' سویرا نے خوشی کا اظہار کیا۔
''پتا ہے' مجھے اتنا اچھا لگ رہا ہے آپ کا اس طرح اتنے خوشگوار موڈ میں باتیں کرنا' کبھی کبھار

ہوتا ہے۔''
تب ہی باصر' ملازم کی رہنمائی میں اندر داخل ہوا۔
''السلام علیکم۔''
''وعلیکم السلام۔''
عبید نے بڑی گرمجوشی سے اُٹھ کر ہاتھ ملایا۔
مدحت نے ذرا کی ذرا نگاہیں اُٹھا کر اسے دیکھا اور پھر نگاہیں جُھکا لیں۔ لمحہ بھر کے لے جیسے
ہوائیں۔ تھم سی گئیں۔
''اُفوہ! کس قدر مشکل ہے اس شخص کا خیال دل سے نکالنا۔'' اُس نے نگاہیں جھکائے جُھکائے سوچا۔
''لیکن میں شاہ پور جاؤں گی تو میاں جی سے کہوں گی مجھے دم کر دیں' میرے ذہن میں فضول فضول
خیال آتے ہیں۔ بس پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
وہ آپ ہی آپ مطمئن سی ہو گئی' جیسے میاں جی کے دم کرنے سے باصر کا خیال اُس کے ذہن سے
نکل جائے گا۔
باصر نے سرسری نظر سے اُسے دیکھا تھا اور پھر عُبید کے پاس اس طرح صوفے پر بیٹھا کہ مدحت پر
اس کی نگاہ نہ پڑے۔ سونیا نے بڑی گہری نظروں سے باصر کو دیکھا۔
یہ باصر کو کیا ہوگا ہے؟ یہ کیسی تھکن اور اضمحلال سا اس کے چہرے پر ہے۔
تبریز کی کامیابی کے فنکشن کے بعد سے وہ ایسا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ تھکا تھکا اور بیمار سا۔ وہ جتنی
بار بھی گھر آیا تھا' سونیا کو یوں ہی محسوس ہوا تھا اور پھر وہ اپنی ذات کی طرف سے کس قدر غافل ہو رہا تھا۔ اس
وقت بھی وہ اہتمام سے تیار نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ ماما نے اُسے خاص تاکید کی تھی۔ وہ اچھی طرح ڈریس آپ ہو کر
آئے۔ پتا نہیں ماما کے ذہن میں کیا تھا۔ سویرا یا نورا۔ اُس نے باری باری دونوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔
دونوں ہی پیاری اور پُرکشش تھیں' خوش مزاج اور محبت کرنے والی تھیں۔
لیکن نہیں۔ اُس نے خود ہی اپنے خیال کو رَد کر دیا۔
پچھلے کئی دنوں سے ماما جنرل ہادی اور اُن کی ڈاکٹر بیٹی اور ڈاکٹر بیٹے کا بہت ذکر کر رہی تھیں۔ بلکہ کل
شام جب وہ باصر سے ملنے اسپتال گئی تھیں۔ تب بھی دو تین بار جنرل ہادی کا ذکر کیا تھا اور باصر کو تاکید کی تھی کہ
کسی دن وہ جا کر جنرل ہادی سے مل لے اور کل شام بھی باصر یہی ڈریس پہنے ہوئے تھا۔
وہ اور ماما شاپنگ سے واپسی پر باصر کے اسپتال کے پاس سے گذریں تو ماما نے نصیر کو کہا کہ وہ ذرا
دیر کے لئے انہیں باصر سے ملوا لائے۔
''کیوں سونی میرا خیال ہے باصر کو خود ہی بتا دوں کہ کل کا ڈنر مسز وہاب کے گھر ہے۔''
باصر انہیں اپنے کمرے میں ہی مل گیا تھا اور اس کیساتھ ڈاکٹر احمد تھے۔ وہ دونوں شاید ابھی ابھی اپنی
ڈیوٹی ختم کر کے آئے تھے
ڈاکٹر احمد نے بڑے ادب سے اُٹھ کر انہیں سلام کیا۔
''یہ ڈاکٹر احمد ہیں۔'' باصر نے تعارف کروایا۔
''تو یہ ہے ڈاکٹر احمد۔''
سونیا نے سوچا تھا' جس کی تعریفیں کر کر کے باصر کان کھا جاتا تھا۔ جب سے وہ اُن کے گھر سے آیا

تھا۔ تب سے ہی اُسے ماما سے شکایت رہنے لگی تھی۔

”ڈاکٹر احمد کی امی ایسی ہیں۔“

”بہنیں ایسی ہیں۔“

”گھر ایسا ہے۔“

اور احمد اُسے کوئی خاص نہیں لگا تھا۔ عام سا لڑکا تھا‘ جیسے اکثر لڑکے ہوتے ہیں۔ سانولا۔ دُبلا سا‘ کشادہ پیشانی‘ بڑی بڑی آنکھیں۔

”بہت خوب باصر میاں بہت دلچسپ۔“

عبید نے زور سے قہقہہ لگایا تو وہ چونک پڑی۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ باصر نے کیا کہا تھا۔ سب ہنس رہے تھے۔ باصر کے ہونٹوں پر بھی مُسکراہٹ تھی‘ لیکن مُسکراہٹ کے باوجود اُس کی آنکھوں میں تھکن اُداسی سی‘ سونیا کچھ سمجھ نہ سکی۔

”تم ٹھیک تو ہو نا باصر۔“ اُس نے باصر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تو اتنی دیر سے آپ بھی سوچ رہی تھیں۔“ عبید نے پہلی بار اُسے دلچسپی سے دیکھا۔

سونیا مُسکرا دی۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔“ باصر چونکا۔

”مجھے کیا ہونا ہے۔“

”تھکے تھکے لگ رہے ہو۔“

”ہاں تھکن تو ہو جاتی ہے۔“

”تو چھٹیاں کیوں نہیں لے لیتے۔ ماما نے بھی کہا تھا۔“

”دیکھا بہنیں ایسی ہوتی ہیں۔ اتنی محبت کرنے والی۔“ عبید نے پاس بیٹھی سویرا کے کان کھینچے۔

”تو کیا ہم آپ سے محبت نہیں کرتے۔“ سویرا نے منہ بنایا۔

”بس روٹھ گئیں۔ یار باصر! یہ جو ہے نا میری بہن ہر وقت روٹھی ہی رہتی ہے۔ کوئی ایسا ہے کہ یہ مجھ سے روٹھا نہ کرے۔“ باصر نے سویرا کی طرف دیکھا جو مُنہ پھلائے بیٹھی تھی۔

”میں تو کبھی بھی آپ سے نہیں روٹھی‘ وہ تو بس یوں ہی کرتی ہوں۔“

”بہانا۔“ عبید نے اس کا جملہ کاٹا۔

”تو ٹھیک ہے میں اب تمہارے روٹھنے کی بالکل بھی پروا نہیں کروں گا۔“

”نہیں۔ نہیں تھوڑا تھوڑا سا تو روٹھتی ہوں۔“

سویرا نے اتنی تیزی سے کہا کہ سب ہی ہنس دیے۔

”ہاں یار باصر۔“

عبید پھر باصر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”وہ قصہ تو بیچ میں ہی رہ گیا۔ تمہارے اُس دلچسپ مریض کا۔“

”ہاں۔“ باصر نے چونکتے ہوئے بات شروع کی۔

اور پھر ڈنر تک وہ سب وہاں ہی بیٹھے گپ لگاتے رہے۔ باصر نے اپنے مریضوں کے دلچسپ سُنائے۔

عبید اپنے اسٹوڈنٹس کی باتیں کرتے رہے۔

نویرا نے بھی کچھ مریضوں کا ذکر کیا۔ یوں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ جب موجو انہیں لے آیا تو وہ سب چونکے۔

”ارے اتنا وقت گزر گیا۔“ نویرا نے حیرت سے کہا۔

”اُٹھو گڈی! ذرا ٹیبل لگوانے میں موجو وغیرہ کی مدد کرو۔“

”کھانا تو لگ گیا صاحب آپ لوگ آ جائیں۔“ موجو نے دانت نکالے۔

”آج وقت بہت اچھا گزرا۔“

عبید نے اُٹھتے ہوئے کہا اور سب نے ہی اس کی تائید کی۔

مدحت بھی خوش دکھائی دے رہی تھی۔

کھانا کھا کر جب وہ باہر نکلے تو کافی رات ہو گئی تھی۔ باصر کی گاڑی میں سونیا اور مدحت تھیں۔ مراد ل اور مسز زینت مراد دوسری گاڑی میں تھے جسے نصیر ڈرائیو کر رہا تھا۔

”آئس کریم کھاؤ گی سونی۔“

پولکا پارلر کے پاس سے گزرتے ہوئے باصر نے پوچھا۔

”اوہ نہیں اس وقت تو بالکل فل ہوں۔“

”تو پھر میٹھے پان۔“

”ہاں وہ کھا لیں گے۔“

سونیا کو میٹھا پان بہت پسند تھا۔ جب کبھی وہ کھانا وغیرہ باہر کھاتے تو واپسی پر وہ پان ضرور کھاتی تھی۔

”مجھے پتا تھا تم انکار نہیں کرو گی۔“

باصر نے مُسکراتے ہوئے گاڑی ٹرن کی تو بالکل اچانک ہی اُس کی نگاہ پولکا پارلر سے باہر آتی سفید کرولا پر پڑی۔ اُسے کوئی خاتون ڈرائیو کر رہی تھی۔ اور اُس کے ساتھ یقیناً وہ تبریز ہی تھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔

”یہ۔۔۔ یہ تبریز بھائی تھے نا سونی اس سفید کرولا میں۔“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ارے نہیں تبریز بھائی تو ابھی پشاور سے آئے تھے۔ اور وہ بہت تھکے ہوئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ آرام کروں گا۔“

سونیا نے پورے یقین سے کہا شاید اُس نے سفید کرولا کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ تب ہی باصر کی ہیں مدحت کے چہرے پر پڑیں۔

”تم نے دیکھا تھا مدحت!“

مدحت نے اثبات میں سر ہلا دیا‘ لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔

باصر یک دم ہی پریشان ہو گیا تھا۔ یہ اتنی رات گئے تبریز کہاں جا رہا تھا اور وہ خاتون کون تھی اس سے قبل تو اس نے کسی خاتون کو تبریز کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔

اور وہ خاتون‘ گہرے سُرخ شیڈ کی لپ اسٹک۔

شوخ میک اَپ۔

چہرے پر عجیب سی سختی۔

اُس کی نگاہیں خاتون سے ملی تھیں بس وہ اتنا ہی دیکھ سکا تھا کہ اُس کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص تبریز ہے
''پتا نہیں۔۔پتا نہیں وہ کون ہے۔؟''
بے حد پریشان ہو کر اُس نے اسپیڈ بڑھا دی۔

☆☆☆☆

لیزا کے اندر آگ سی لگی تھی۔ یوں لگتا تھا' جیسے تشنگی بڑھ گئی ہو۔ جب سے وہ مسز شیر دل کے گھر آئی تھی' بہت بے کل تھی۔
بہت بے چین تھی۔
اندر باہر کہیں سکون نہیں تھا۔
وہی بے کلی اور بے چینی۔
جس نے اُسے اپنے گھر سے۔
اپنے لوگوں سے دور کر دیا تھا۔
وہی کیفیت جس نے اُس سے اتنا بڑا فیصلہ کروایا تھا۔
اور یہ میں تھی رتن کور۔۔
ایک بزدل سی کمزور لڑکی۔
اور کتنا بڑا قدم اُٹھایا تھا میں نے۔
ایک اجنبی ملک میں' اجنبی لوگوں کے ساتھ رہ رہی ہوں' شاید یہ بے چینی اس لئے ہے۔
یہ بے کلی سب سے بچھڑنے کی ہے۔
کبھی کبھی وہ سوچتی۔
''لیکن نہیں۔''
پھر وہ خود ہی اُس کی تردید کر دیتی۔
شاید ایسا نہیں ہے۔
یہ تو کچھ اور ہی کیفیت ہے۔
یوں جیسے تپتے صحرا پر پانی کا ایک قطرہ پڑا ہو اور خشک ہو گیا ہو۔ تشنگی بدستور ہو۔
یہ تشنگی کب ختم ہو گی؟
ہو گی بھی یا نہیں؟
شاید سب کچھ لاحاصل ہو۔
یہ سفر۔۔
یہ اذیت سب لاحاصل ہو۔
اور کہیں آخر میں جا کر پتا چلے۔۔
کہ وہ جو ہم نے اذیت کا سفر کاٹا' سب بے کار گیا۔ بے فائدہ
اور آنسو اُس کی پلکوں کے کناروں پر آ کر ٹھہر جاتے۔
اُس کا دل چاہتا کہ وہ روئے اور روتی چلی جائے' کیسا بے بسی کا موڑ تھا۔
کہ اُسے کوئی راستہ دکھائی نہ دے رہا تھا۔

یوں لگتا تھا' جیسے چاروں طرف دھند اور اندھیرا ہو۔
کہیں کوئی واضح راہ نہیں تھی۔ کبھی کبھی اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن سی چمکتی اور پھر غائب ہو جاتی۔
روشنی کی یہ کرن کیا تھی؟
اور اس کے ہاتھ کیوں نہیں آ رہی تھی۔
اُس کے کانوں میں آوازیں سی گونجتی رہتی تھیں۔
''خدا کی عظمت کا ادراک شعور تو نہیں ہو سکتا بی بی!''
کوئی اُس کے کان میں سرگوشی کرتا۔
''یہ اموشنل اپروچ میں آتا ہے۔
یقین۔۔یقین پیدا کرو۔
تسلیم کی کیفیت کو اپنانے سے ایمانی کیفیات پیدا ہوں گی۔''
وہ چونک کر ادھر اُدھر دیکھتی۔
یقین۔۔کس پر یقین؟
وہ تو بالکل ہی بے یقین ہو کر رہ گئی تھی۔
کسی بات پر اُسے یقین نہ تھا۔
اُس کا اعتبار اُٹھ گیا تھا۔
داؤجی کی باتوں سے۔
انکل رابرٹ سے۔
جان سے اور پھر اب یہ پروفیسر احسان فتح پوری تھے جو اور ہی طرح کی باتیں کر رہے تھے۔
جنہیں اُس کا ذہن صحیح طرح سے کیچ نہیں کر پایا تھا۔ سب کچھ ادھورا ادھورا سا لگ رہا تھا۔
نامکمل۔۔
جیسے وہ خود بھی ادھوری ہو گئی ہو۔ نامکمل' نامکمل سی' کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ اپنا یقین نہ توڑتی۔ قائم رکھتی۔
اُس پر جو کچھ اُس کے ماں باپ کہتے تھے۔
اور جس پر اُن کا یقین پختہ تھا۔
اور یہ یقین ہی کی تو بات تھی کہ وہ دیوی' دیوتاؤں کو خدا سمجھے ہوئے تھے' ورنہ عقل بھلا کب تسلیم کرتی تھی' یہ سب باتیں۔
پر عقل سے سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔
اُس نے جو سوچا تھا۔
شک کیا تھا تو کیا پایا تھا؟
اذیت' جُدائی اور پھر بھی رائیگاں' لاحاصل۔ یقین تو اب بھی اُسے حاصل نہیں ہوا تھا۔
وہ یوں ہی بے یقین سی تھی۔
ساری کشتیاں جلا بیٹھی تھی۔
نہ پیچھے پلٹ سکتی تھی اور نہ آگے بڑھنے کے لئے روشنی کی کوئی کرن ہاتھ آ رہی تھی۔
بھابھو' وکرم بھاجی اور دیپو سب ہی اُسے یاد آتے تھے۔ بے طرح' بے حساب' یہ کیا کیا تھا اُس نے

'کیوں کیا تھا۔؟

کبھی کبھی اُس پر پچھتاوا طاری ہو جاتا اور وہ سوچتی کہ واپس چلی جائے۔ بھاجی کے قدموں میں سر رکھ دے۔ بھابھو اور ماتا جی کے پاؤں پکڑ لے۔ وہ یقیناً اُسے معاف کر دیں گے۔ گلے سے لگا لیں گے' اور وہ پیو وہ۔۔ وہ تو بس ذرا بھی خفا نہیں ہوگا مجھ سے' اور ایک بار پھر زندگی اُسی طرح شروع ہو جائے۔ ویسے ہی پُرانے انداز میں۔ بھابھو صبح صبح اس کے لئے ناشتا بنائیں۔ وہ جلدی جلدی رسوئی میں بیٹھے بیٹھے ناشتا کر لے۔ اور بھابھو کے چیخنے چلانے کے باوجود جلدی جلدی دو تین نوالے لے کر اُٹھ کھڑی ہو' بھاگم بھاگ کالج جائے۔ واپس آ کر دو کرم سے کھیلے اور کبھی کبھار انکل رابرٹ کی طرف چلی جائے اور انکل رابرٹ سے باتیں کرنا اُسے کتنا اچھا لگتا تھا۔ مگر انکل رابرٹ۔ اُنہوں نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ کیا تھا' وہ اسے سمجھا کر روک دیتے منع کر دیتے اسے۔

اور وہ مہندر کی ماں' کتنا ہنسے گی مجھ پر۔ اشارے کر کر کے سب کو بتائے گی کہ دیکھو ریتو واپس آ گئی ہے۔ لگتا ہے۔

اور اس کی زبان کتنی گندی ہے۔

اور جب مسز ملہوترہ کی بیٹی اُن سے ناراض ہو کر اپنی موسی کے پاس چلی گئی تھی تو کتنی باتیں کی تھیں اُس نے' کتنی گندی اور فضول باتیں اور کتنا کرید کرید کر اُس سے پوچھا کرتی تھی۔

سچ بتا کدھر گئی تھی۔

کیوں واپس آئی ہے۔؟

وہ چھوڑ کر چلا گیا ہے ناں؟

پر میں۔۔ مجھے مہندر کی ماں کی باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ ماتا جی اور بھابھو پوری ہو جائیں گی اُنہیں۔

لیکن میں۔ کیا میں خوش رہ سکوں گی۔ وہ سب مجھے قبول کر لیں پھر بھی کیا وہ یقین دوبارہ مجھے حاصل ہو جائے گا۔

کیا مجھے' وہ سب اچھا لگے گا' مندر جانا' پوجا کرنا' اُسے کچھ سمجھ نہ آتا تو بے بسی سے رونے لگتی۔

آج بھی صبح سے کتنی بار وہ رو چکی تھی۔ ممی' ریٹا اور آن کے جانے کے بعد دو تین بار اُس کے کمرے میں آئی تھیں۔ اُسے تسلی دی تھی۔ محبت سے اُس کی پیشانی چومی تھی اور باہر اپنے پاس آ کر بیٹھنے پر اصرار کیا تھا' لیکن وہ یونہی بیٹھی رہی تھی۔

''نہیں ممی' میں ادھر ہی کمرے میں ٹھیک ہوں۔''

''ادھر اکیلے میں تم ہر وقت روتا رہتا ہے۔''

''نہیں ممی! اب نہیں روتی۔''

وہ آنسو پونچھ کر وعدہ کر لیتی مگر ممی کے جاتے ہی پھر رونے لگتی ریٹا بھی بہت مصروف ہو گئی تھی۔ بہت دیر سے آتی اور اتنی تھکی ہوئی ہوتی کہ زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔

آن تو پہلے بھی کم ہی بولتی تھی۔ ہاں ریٹا کی باتوں سے اُس کا دل بہلا رہتا تھا' لیکن ریٹا نے پارٹ ٹائم جاب کر لی تھی۔ ممی نے اور آن نے منع کیا تھا' لیکن اُس نے کسی کی نہیں سنی تھی۔ سو جب وہ واپس آتی تو آتے ہی بستر پر گر جاتی تھی۔

ممی ابھی کچھ دیر پہلے ہی اُس کے کمرے سے گئی تھیں اور وہ آنکھیں موندے بیڈ سے ٹیک لگائے تھی۔ اور آنسو بڑی آہستگی سے اُس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔

''لیزا۔'' ریٹا نے اندر جھانک کر کہا۔

اُس نے آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''تم آج جلدی آ گئیں۔؟''

''ہاں آج مجھے کہیں نہیں جانا تھا بس ذرا دیر کے لئے کیفی کی طرف گئی تھی۔ آج میرا کیفی کے ساتھ ...ر جانے کا پروگرام ہے۔۔ تم رو رہی تھیں۔''؟ وہ اُس کے قریب آ گئی۔

''نہیں۔۔ نہیں تو۔'' اُس نے جلدی سے ہاتھ کی پشت سے چہرا صاف کیا۔

''جان یاد آ رہا ہے۔'' ریٹا نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''نہیں۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

جان کو تو اُس نے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں سوچا تھا۔ جان کے ساتھ اُس کی کوئی کمٹمنٹ (وعدہ) تھی۔ وہ تو بس اچانک ہی اُس کے راستے میں آ گیا تھا۔ محض ایک ذریعہ' ایک واسطہ اور اب جب کہ وہ ...کی بیوی تھی' اب بھی اُس کے دل میں اُس کے لئے کوئی جذبہ نہیں تھا۔ کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ یہاں تھا اُس کی قربت کو وہ ناگوار فریضہ سمجھ کر برداشت کرتی تھی۔ اور اب وہ چلا گیا تھا' تو ایک لمحہ کے لئے بھی اُس ...ے نہیں سوچا تھا۔

''دراصل جان کا کچھ پتا نہیں ہوتا' وہ یوں ہی اچانک چلا جاتا ہے اور پھر اچانک آ جاتا ہے۔ کبھی تو ...دو دن بعد ہی پلٹ آتا ہے اور کبھی مہینے لگا دیتا ہے۔'' ریٹا نے اُس کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم اُس کے لئے پریشان نہ ہونا۔ وہ ایسا ہی ہے۔ اس لئے تو اُس کے پاپا نے اُس گھر سے نکال ... اور ممی اُسے ساتھ لے آئی تھیں۔''

''میں اُس کے لئے پریشان نہیں ہوں ریٹا۔'' لیزا نے وضاحت کی۔

''پتا نہیں کیا بات ہے۔' میں مطمئن نہیں ہو پا رہی کوئی چیز ہے' جو مجھے پریشان کر رہی ہے۔ عجیب ...بی اور بے کلی ہے۔''

دیکھو لیزا' جو پیچھے رہ گیا ہے' اُسے بھول جاؤ۔ اب تمہاری ایک نئی زندگی ہے تمہارا شوہر ہے' تم اپنی نئی ...آغاز کرو۔ جان کے لئے سوچو' وہ اتنا بھی بُرا نہیں ہے۔ پتا ہے جن دنوں ممی اُسے گھر لے کر آئی تھیں نا' ...ں ہم بہت اکیلے تھے۔ چارلس مر گیا تھا اور دوسرا بھائی یونان چلا گیا تھا۔ جان نے ہمیں بہت سہارا دیا۔ وہ ...ی بہت کھلا ہے ایک بار ہمیں اپنے خرچ پر انگلینڈ لے گیا۔ وہاں خوب گھمایا' پھرایا۔ جان کی سگی خالہ وہاں ...میں رہتی ہیں۔ جان کے پاپا' ممی کے کزن ہیں۔ وہ پاکستان آئے تو پھر اِدھر ہی رہ گئے۔ جان کی ممی اِدھر کی ...ستانی' جان بہت چھوٹا سا تھا جب اُس کی ممی مر گئی تھیں۔ انکل نے اسے بہت محبت سے پالا' مگر پتا ...ں اُن کے جان سے اختلافات ہو گئے۔ شاید جان کی عادات کی وجہ سے۔'' ریٹا نے تفصیل بتائی۔

رتن سر جھکائے سُنتی رہی۔ اُسے جان یا اُس کیا اس کے بابا کے حالاتِ زندگی سے کوئی دلچسپی نہ ...جان جیسا بھی تھا۔ اُسے کیا۔ اُس کی منزل جان نہیں تھا۔ اُسے تو شاید آگے جانا تھا۔ بہت آگے' پتا ...ل کہاں تھی اور راستے کتنے پُر خار تھے۔

''لیزا چلو' آج تمہیں جان کے پاپا سے ملواؤں''۔ ریٹا نے چٹکی بجائی اور بیڈ سے چھلانگ لگا کر

نیچے اُتر آئی۔

''کم آن لیزا' فٹافٹ تیار ہوجاؤ HE IS A GREAT MAN (وہ ایک عظیم آدمی ہیں) I HOPE (مجھے اُمید ہے) تمہیں اُن سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔ تمہیں پتا ہے' لیزا کچھ عرصہ پہلے چرچ میں پادری تھے۔ آجکل وہ گھر پر ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے اُنکے پاس' اُدھر ریوالی سینما کے پاس روڈ پر۔۔ کیا پتا تمہاری یہ بے نام سی اُداسی' یہ بے چینی یہ بے کلی ختم ہوجائے۔'' رتن کماری نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

''مگر تمہیں تو آج کیفی کے ساتھ سمندر پر جانا ہے۔''؟ ''ہاں' لیکن ابھی بہت وقت ہے۔ شام ہے ہمارا' سچ لیزا' فادر کے پاس جادو ہے۔ کوئی میں پہلے جب بھی آپ سیٹ ہوا کرتی تھی۔ تو میں اُن کے پاس جاتی تھی۔ اُنکی باتوں میں اتنا اثر ہے۔ لیزا' کہ تھوڑی دیر اُن کے پاس بیٹھو تو سارا ڈپریشن ختم ہوجاتا ہے۔ اوہ گاڈ! اس کا خیال کیوں نہیں آیا۔ وہ جان سے بالکل مختلف ہیں لیزا' تم جلدی سے تیار ہوجاؤ' میں ممی کو بتا دوں۔''

وہ جاتے جاتے پلٹی۔

''اور یہ ممی ہیں کدھر؟''

''کچن میں ہیں شاید۔''

''اور آن تو ابھی اسکول سے نہیں آئی ہوگی۔''

''نہیں۔'' لیزا نے نفی میں سر ہلایا۔

''اور دیکھو' تم یہ ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی ہو۔ ممی ہوتی ہیں ناں' اُن سے گپ لگایا کرو' مدد کیا کرو۔ ممی کے پاس سُنانے کے لئے ہزاروں باتیں ہیں۔ وہ ہزاروں لوگوں سے ملی ہیں۔ بہت دلچسپ عجیب باتیں۔''

''اچھا!'' وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوگئی۔

اور یہ کتنی غلط بات تھی وہ اتنے عرصہ سے یوں ہی مہمان بنی ہوئی تھی۔ اُسے ممی کی مدد کرنی چاہئے تھی۔ کیا سوچتی ہوں گی۔ دل میں یہ سب کہ ___ اور مجھے اُن پر بوجھ بھی نہیں بننا چاہئے۔ مجھے کوئی جاب کر لینا چاہیے۔ آخر زندگی یوں تو نہیں گذرے گی۔ اس طرح اور جان کا کچھ پتا نہیں' واپس بھی آئے یا نہیں' اور پھر مجھے جان سے کیا۔ اُس نے کہا تو تھا کہ کچھ دنوں تک وہ علیحدہ ہوجائیں گے۔ وہ شادی کا قائل نہیں ہے اور وہ بس اُسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

لوگ کتنے مکار ہوتے ہیں' کتنے دوغلے' وہاں انکل رابرٹ کے گھر میں وہ کس طرح پوز کرتا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔

اور میں اُس کے دھوکے میں آ گئی۔

لیکن نہیں دھوکا کیسا؟

میں اُس کی محبت میں تو گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ میں تو بس اُس کے سہارے حق کی تلاش کا سفر کرنا چاہتی تھی اور انکل رابرٹ نے کہا تھا' یہ محض پیپر میرج ہے اور تم پاکستان جا کر چاہے تو الگ ہوجانا' لیکن جان... اسے کراہت سی محسوس ہوئی۔

جان کس قدر جھوٹا نکلا۔ بہر حال یہ تو طے تھا کہ اُسے جان کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہنا۔ وہ آج ممی اور آن سے کہے گی کہ وہ اُس کیلئے کوئی جاب تلاش کرلیں۔

''اوہ گاڈ! یہاں پھر رونے کا پروگرام شروع ہونے لگا ہے۔''

ریٹا' ممی کو بتا کر آئی تو اسے اسی طرح بیٹھے دیکھ بولی۔

''یار جلدی سے تیار ہوجاؤ۔''

''ریٹا!''

لیزا نے بیڈ سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مجھے کہیں جاب مل سکتی ہے۔ میں۔۔ میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔ ریٹا۔''

''لیکن کیوں' تمہیں یہ خیال کیوں آیا جاب کرنے کا؟'' وارڈ روب سے کپڑے نکالتے ہوئے ریٹا نے مڑ کر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا اور پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولی۔

''اگر تمہارے ذہن میں یہ خیال ہے کہ تم ہمارے لئے بوجھ ہو تو یہ خیال ذہن سے نکال دو۔ تم جان کی بیوی ہو اور جان نے اس گھر کے لئے اور ہمارے لئے اتنا کچھ کیا ہے کہ تم ہم پر کبھی بھی بوجھ نہیں ہو سکتیں۔''

''نہیں ریٹا' میں گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہوجاتی ہوں۔'' رتن نے جلدی سے کہا۔

''میں کچھ کرنا چاہتی ہوں' مصروف رہنا چاہتی ہو۔''

''کہا تو ہے کہ تم ممی کے ساتھ مصروف رہا کرو' کچن کا کام کیا کرو۔''

''مگر مجھے کھانا پکانا کچھ نہیں آتا۔'' رتن نے بے بسی سے کہا۔

وہاں تو بھابھو اور ماتا جی اُسے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھیں۔ ماتا جی کبھی چھٹی والے روز کچھ کہتیں بھی تو بھابھو فوراً منع کردیتی۔

''نہ ماتا جی! آج چھٹی کا دن ہے۔ آرام کرنے دیں اسے' پڑھ لے' بہت عمر پڑی ہے چولہا جوکی کرنے کی۔''

اور اُس نے تو کبھی چائے بھی نہیں بنائی تھی' کتنی لاڈلی تھی' وہ سب کی۔

''آ جائے گا' ممی سکھا دیں گی۔ ممی بہت اچھی کک ہیں۔ چائنیز' انگلش' پاکستانی' ہندوستانی ہر طرح کے کھانے پکانا جانتی ہیں۔ پتا ہے ممی نے کچھ عرصہ ایک رائل فیملی میں کک کے فرائض بھی سرانجام دیئے ہیں۔ ہماری ممی نے بھی ڈیڈی کی وفات کے بعد بڑے دُکھ جھیلے ہیں' بڑی جدوجہد کی ہے ہمارے لئے' ممی دی گریٹ۔''

O☆O

کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
پلیز ریٹا! میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔''
''آل رائٹ۔''
ریٹا نے آہستگی سے اُس کا رخسار تھپتھپایا اور کندھے پر رکھا ہوا اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے
''لیکن سویٹ گرل! کیا تم جاب کرلو گی؟''
''ہاں کرلوں گی۔''
''دراصل تم اتنی چھوٹی سی، اتنی سادا اور معصوم سی لگتی ہو کہ یقین نہیں آتا کہ تم جاب کرسکو گی۔''
''کرلوں گی ریٹا' آخر اتنا بڑا کام میں نے کرلیا۔ گھر چھوڑ دیا' بھابھو' دکرم' دیپو' بھاجی' س
اُس کی آواز بھر آ گئی۔

''بی ایزی لیزا! ریلیکس۔ جو ہوگیا اُس پر پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرا مشورہ تو یہ تھا لیزا کہ
بیوی بن' جان کو اسیر کرلو' جکڑ لو۔ اور تم میں یہ صلاحیت ہے لیزا تم ایسا کرسکتی ہو۔ وہ دل کا بُرا نہیں ہے۔ ایک دفعہ
تمہیں دل سے اپنی بیوی تسلیم کرلیا تو وہ صرف تمہارا ہو کر رہ جائے گا۔ پھر تم اُسے جو کہو گی وہی کرے گا۔''
''پر ریٹا! میرا دل گھبراتا ہے۔ میں سوچتی ہوں۔ شاید جاب میں اُلجھ کر میری بے چینی ختم ہو
مجھے کچھ سوچنے کا وقت ہی نہ ملے۔''
''ٹھیک ہے میں کیفی سے کہوں گی۔ اُس کے بڑے تعلقات ہیں۔ میری یہ جاب بھی اُس
دلوائی ہے۔''
''مگر ریٹا! تم نے یہ جاب کیوں کی ہے۔ ممی کو بھی اچھا نہیں لگا۔ وہ کڑھتی رہتی ہیں۔ تمہیں
تو نہیں تھی۔ سب ٹھیک تو ہے ناں زیادہ پیسہ اکٹھا کرکے کیا کرو گی۔''

''یہ جاب؟ ریٹا نے اُس کا ہاتھ چھوڑ کر اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔
''مجھے پیسہ اکٹھا کرنے کا شوق نہیں ہے لیزا۔ یہ جاب میں نے کیفی کے لئے کی ہے۔''
''کیفی کے لئے؟'' رتن نے حیرت سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔
''ہاں کیفی کے لئے۔''
ریٹا کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی۔
''کیفی کی تین بہنیں ہیں اور اُسے اُن کی شادی کرنا ہے۔ کیفی کوئی بہت دولت مند نہیں ہے۔ اُس کی جاب اچھی ہے' لیکن یہاں پاکستان اور ہندوستان میں تم جانتی ہو ناں کہ لڑکیوں کی شادی کتنا بڑا مسئلہ ہے۔ امیروں جہیز' فضول کی رسومات ان سب کے لئے بہت پیسہ چاہئے ہوتا ہے ناں اور میں کیفی کے پرابلمز شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ آن نے مجھے کہا تھا کہ میں کیفی سے کہوں' اگر وہ سیریس ہے تو مجھ سے شادی کرلے اور پتا ہے کیفی نے کہا کہ اُسے شادی تو بہرحال مجھ سے ہی کرنی ہے۔' لیکن' اس کے لئے مجھے طویل انتظار کرنا پڑے گا۔ جب تک وہ اپنی تینوں بہنوں کی شادیاں نہ کرلے۔ تم جانتی ہو لیزا یہاں پاکستان میں اکثر بھائی بہنوں کے معاملے میں ایسے ہی جذباتی ہوتے ہیں اور پھر کیفی کا باپ نہیں ہے اور کوئی دوسرا بھائی بھی نہیں ہے۔ سو تینوں بہنوں کی ذمہ داری اُسی پر ہے۔ کیفی نے مجھے بتایا تھا کہ اُس کی بڑی بہن کی منگنی ہوچکی ہے۔ لیکن شادی وہ دو سال بعد کرے گا تاکہ کچھ پیسہ اکٹھا ہوجائے اور وہ بہتر طریقے سے اُسے رخصت کرسکے۔ اور میں نے سوچا لیزا کہ مجھے کیفی کی مدد کرنا چاہئے۔ اس لئے میں نے یہ پارٹ ٹائم جاب کرلی ہے۔ یہ تنخواہ میں بینک میں اسی طرح جمع کرواؤں گی اور اس طرح ممکن ہے' ہم دونوں مل کر سال بھر بعد ہی اتنی رقم اکٹھی کرلیں۔''
رتن حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھی۔
یہ لڑکی اُسے اکثر حیران کردیتی تھی۔ بظاہر لاپروا اور لاأبالی سی اس لڑکی کے اندر کیسا دل تھا۔ کتنا محبت بھرا اور دردمند۔
''اس طرح حیرت سے کیا دیکھ رہی ہو؟'' ریٹا ہنس پڑی۔
''جب آدمی محبت کرتا ہے' رفاقتیں مضبوط ہوجاتی ہیں تو من وتو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ دُکھ سُکھ سانجھے ہوجاتے ہیں۔ سو کیفی کے مسائل تنہا اُس کے مسائل تو نہیں ہیں۔ میرے بھی ہیں اور پھر اگر جلدی یہ مسائل حل ہوں گے تو انتظار بھی جلد ختم ہوگا۔''
رتن اب ابھی حیرت و تجسس کے جذبے کے ساتھ اُسے دیکھ رہی تھی۔
''یار! تو نہیں سمجھ سکے گی اِسے۔''
ریٹا نے اُس کا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ہلایا۔
''اِس لئے تو نے محبت نہیں کی اور تجھے نہیں پتا کہ محبت کیا ہے''
''محبت ذات ہوتی ہے''
''اُس نے جگمگاتی آنکھوں سے لیزا کو دیکھا اور گنگنانے لگی۔
محبت ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔
کوئی جنگل میں جا ٹھہرے۔
کسی بستی میں بس جائے۔
محبت ساتھ ہوتی ہے۔

محبت خوشبو کی لے۔
محبت موسموں کا دھن۔
محبت آبشاروں کے نکھرتے پانیوں کا من۔"

وہ بڑے جذب سے بول رہی تھی اور رتن ساکت کھڑی سُن رہی تھی۔

یہ محبت کیوں ہو جاتی ہے اور کیسے! پھر کیفی جیسے شخص سے جس میں کوئی بھی خاص بات نہیں ہے او[ر]

اُس روز مسز شیر دل کی پارٹی میں کس طرح اُسے دیکھ رہا تھا۔

اُس نے ایک جھرجھری سی لی۔

"ریٹا۔"

"ہوں۔"

ریٹا نے جو اپنی دھن میں گائے چلی جا رہی تھی' چونک کر اُسے دیکھا اُس کی معصوم آنکھ[وں]
میں حیرت جیسے منجمد سی ہو گئی تھی۔

"یہ محبت کیا ہوتی ہے ریٹا؟"

"محبت۔۔محبت ہوتی ہے میری جان' تم نے بھی تو محبت کی ہے؟"

"میں نے۔۔نہیں تو۔" رتن نے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ محبت ہی تو ہے' جس نے تمہیں گھر سے بے گھر کیا۔ حق کی تلاش کی محبت' سچ کو پا لینے کی چاہ'
تم کانٹوں پر چل رہی ہو ناں' یہی محبت ہے' یہی عشق ہے۔ بس ہمارے راستے مختلف ہیں۔ سفر کی نوعیت تو [ا]
ہی جیسی ہے ناں' آبلہ پا تو میں بھی ہوں۔

ایک لمبا طویل اذیت ناک سفر مجھے بھی تو کاٹنا ہے۔ اور میں نے اس راستے پر قدم رکھ دیا
محبت کے لئے محبت کی خاطر میں نے یہ تھکن خود مول لی ہے لیزا' اور مجھے پتا ہے کہ ابھی آگے کا سفر اور بھی اذ[یت]
ناک ہے۔ ہمارے مذاہب کا اختلاف' بہت مشکل سفر ہے۔

میں مسلمان ہو بھی جاؤں لیزا! تب بھی کیفی کو اپنے خاندان سے اپنے لوگوں سے ایک جنگ
ہے اور میں نے سب کچھ جانتے بُوجھتے یہ آزار مول لیا ہے اور پتہ ہے' یہ حوصلہ میں نے تم سے لیا ہے۔"

"مجھ سے!" لیزا نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

"میں تو بڑی بے حوصلہ ہوں' بہت کمزور ہوں اور بُزدل۔۔ پتا ہے ریٹا میں تو چھپکلی تک سے ڈر[تی]
ہوں" ریٹا مُسکرائی۔

"تم بہت با حوصلہ ہو۔ اتنی محبتوں کی زنجیر توڑ دینا محض ایک انجانی منزل کی طلب میں ایک نا[م]
منزل کے اُمید پر چل کھڑے ہونا' لیزا تم بہت بہادر ہو۔" ریٹا نے جُھک کر اُس کی پیشانی پر پیار کیا۔

"اور میری منزل تو پتا معلوم بھی نہیں ہے۔ مجھے پتا ہے کہ کہاں جانا ہے' بس راستے پُر خار ہیں۔"

ہاں ریٹا صحیح کہہ رہی تھی۔

رتن نے سوچا۔

اُسے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اُس کی منزل کہاں ہے اور وہ تو راستوں سے بھی بے خبر ہے' پھر بھ[ی]
پڑی ہے محض سایوں کے تعاقب میں' پرچھائیوں کے پیچھے۔۔ ریٹا صحیح کہتی ہے کہ میں بہادر ہوں' با حوصل[ہ]
اور پتا نہیں وہ کیا جذبہ تھا جس نے میرے اندر اتنا حوصلہ پیدا کر دیا تھا' ورنہ میں تو اتنی بزدل ہوں' اتنی کمزو[ر]

[ج]ب پہلے پہل پڑھنے کے لئے گیا تھا تو چُھپ چُھپ کر روتی تھی۔ بھابھو میکے جاتی تھی تو اُنہیں اور و کرم
[یاد ک]ر کر کے روتی اور کھانا پینا چھوڑ دیتی تھی اور اب۔۔ شاید یہی محبت ہے' یہی عشق ہے۔

یکا یک اُس کے اندر بڑا حوصلہ پیدا ہو گیا۔

وہ پہلی بار بڑے اعتماد سے مُسکرائی اور ریٹا کے وارڈ روب سے اپنی ساڑھی نکالنے لگی۔

ریٹا نے بھی مُسکرا کر اُسے دیکھا اور کپڑے اِستری کرتے ہوئے پھر بڑے جذب سے نظم کے بول
[گن گن]انے لگی۔

محبت جنگلوں میں رقص کرتی مورنی کا تن۔
محبت برف پڑتی سردیوں میں دھوپ بنتی ہے۔
محبت چلچلاتے گرم صحراؤں میں ٹھنڈی چھاؤں کی مانند
محبت اجنبی دُنیا میں اپنے گاؤں کی مانند
محبت دل
محبت جاں
محبت روح کا درماں
محبت روح کا درماں
محبت روح کا درماں

وہ ایک ہی مصرعہ دُہرا رہی تھی۔ رتن نے ایک نظر اُسے دیکھا اور ساڑھی لے کر آن کے کمرے میں
[چلی] گئی۔

جب وہ آن کے کمرے میں سے تیار ہو کر آئی تو ریٹا بھی تقریباً تیار رہی تھی۔ لپ اِسٹک لگاتے
[ہوئ]ے اُس نے مُڑ کر رتن کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔

"تم بہت پیاری ہو۔ پاپا تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ حالانکہ وہ جان سے خفا ہیں۔ لیکن پھر
[بھ]ی تم دیکھنا۔"

اور واقعی جان کے پاپا بڑی محبت اور خلوص سے ملے۔ لیزا کو ان کے وجود سے ایسی شفقت کی خوشبو
[محس]وس ہوئی جیسے بھاجی کے وجود سے آتی تھی۔

YOU ARE A BRAVE GIRL (تم ایک بہادر لڑکی ہو) اُنہوں نے اُس کے سر پر
[شف]قت سے ہاتھ رکھا۔

"اور جان بڑا لکی ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ خداوند یسوع مسیح نے کس نیکی کے صلے میں اُسے تم
[ج]یسی لڑکی بخش دی ہے۔ تم اُس کے لئے خدا کا انعام ہو۔"

اور پھر پاپا کی باتیں سُنتے ہوئے اُنہیں وقت گذرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ پاپا نے خود اُنہیں اپنے
[ہاتھ] سے چائے بنا کر دی اور اپنے نرم اور دھیمے لہجے میں حضرت عیسیٰؑ کی آمد کے متعلق حضرت مریمؑ کے متعلق
[بت]ا[تے] رہے اور اُس کے دل میں جیسے سب کچھ نقش ہوتا رہا۔

"اوہ گاڈ! کیفی انتظار کر رہا ہوگا۔" ریٹا یک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"ریٹا! یہ کیفی وہی لڑکا تو نہیں ہے' وہ شاعر؟"

"جی پاپا" ریٹا نے آہستگی سے کہا۔

''سوچ سمجھ کر بیٹا۔'' اُنہوں نے ریٹا کی آنکھوں میں جھانکا۔
''سب لوگ ایسے نہیں ہوتے' جیسے نظر آتے ہیں۔''
''جی''۔ ریٹا نے نگاہیں جُھکا لیں۔
پھر وہ رتن کی طرف مُڑے۔
''بیٹا! جب دل گھبرائے آجایا کرو' یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔''
''جی''۔

پاپا سے آنے کا وعدہ کر کے وہ تیزی سے سڑھیاں اُترنے لگیں۔
ریٹا بہت بے چین ہو رہی تھی۔
''کیفی خفا ہو جائے گا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں چار بجے اُس کے دفتر میں پہنچ جاؤں
''مگر ابھی چار تو نہیں بجے۔'' رتن نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔
''لیکن تمہیں گھر چھوڑتے چھوڑتے تو بج جائیں گے۔ اور پھر وہاں سے کیفی کے آفس تک جاتے ساڑھے چار تو ضرور ہو جائیں گے۔''
''سوری ریٹا! میری وجہ سے۔۔''
''اور گاڈ! لیز! ایسا نہ سوچا کرو۔ میں خود تمہیں لے کر آئی ہوں۔ بس یوں ہی خیال آ گیا تھا کیفی مجھ سے ناراض ہو ہی نہیں سکتا۔''
اور پھر جب وہ گھر پہنچیں تو کیفی برآمدے میں می کے پاس بیٹھا گپ لگا رہا تھا
''ارے کیفی تم؟'' ریٹا اُسے دیکھ کر یک دم ہی بہت خوش ہو گئی۔
''ہاں میں ذرا دفتر سے جلدی اُٹھ آیا تھا۔ سوچا تمہیں پک کر لوں۔''
''تھینک یو۔''
ریٹا کے سانولے چہرے پر سُرخی آ گئی تھی اور آنکھیں دمکنے لگی تھیں۔
''فادر کیسے تھے؟'' ممی نے پوچھا۔
''فائن اور آپ کو دُعائیں بھیجی ہیں۔'' ریٹا نے بتایا اور کیفی کی طرف دیکھنے لگی۔
''کیفی چلیں یا چائے پیو گے؟''
''اگر ایک کپ چائے ہو جائے تو بہتر ہے' بہت تھکا ہوا ہوں۔''
اچھا تم بیٹھو۔ میں دو منٹ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔
''اور ہاں۔'' وہ جاتے جاتے پلٹی۔
''یہ آن آ گئی ہے اسکول سے کیا؟''
''ہاں' سو رہی ہے۔'' ممی نے بتایا۔
وہ سر ہلا کر کچن کی طرف چل دی تو ممی نے پاس کھڑی رتن کی طرف دیکھا۔
''لیز! فادر تم سے اچھی طرح ملے تھے؟''
''ہاں ممی! وہ بہت اچھے ہیں' بڑے خلوص اور محبت سے ملے اور یہ اُنہوں نے مجھے پانچ سو روپے دیئے ہیں۔''
رتن نے خوش ہو کر بتایا۔ کیفی کی نگاہیں رتن کے چہرے پر تھیں۔ مسلسل اپنی طرف دیکھتے پا کر رتن

نگاہیں جُھکا لیں۔ کیفی اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سُرخ بارڈر والی سبز ساڑھی میں وہ سادگی میں بھی قیامت ڈھا رہی تھی۔
کیسی ہیں آپ؟''
''جی اچھی ہوں۔'' رتن نے گھبرا کر کہا۔
پتا نہیں کیا تھا اُس کی آنکھوں میں کہ رتن کو اُس کی نگاہیں سر سے پاؤں تک ٹٹولتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ عجیب نظریں تھیں اُس کی' وہ بالکل ایسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے۔۔ جیسے اُس رات جان کی نظریں تھیں۔ جس رات وہ زبردستی اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔
''بیٹھیں' بیٹھ جائیں نا آپ۔''
کیفی نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے نگاہیں اُس کے چہرے سے ہٹا لیں۔ رتن نے سکون کا سانس لیا اور کُرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔
''آپ پھر کبھی ملیں نہیں۔'' کیفی نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔
''آپ نے کہا تھا کہ آپ کے ذہن میں کچھ شکوک ہیں۔ جنہیں آپ دور کرنا چاہتی ہیں۔''
''جی'' رتن نے ذرا سی نگاہیں اُٹھا کر کہا۔
''میں شاید آپ کی کچھ مدد کر سکتا۔''
''جی وہ ریٹا نے کہا تھا کہ آپ مجھے کچھ ایسا لٹریچر دے سکتے ہیں' جس سے مجھے مدد ملے گی۔''
''ہاں' ہاں کیوں نہیں؟'' کیفی نے خوش دلی سے کہا۔
''اور وہ پروفیسر احسان صاحب! کیا اُن سے ملا جا سکتا ہے۔ وہ۔۔ اُنہوں نے بہت اچھی باتیں کی تھیں۔ اُن کی باتیں دل میں اُترتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھیں۔ میں صحیح طرح سے سمجھ تو نہیں سکی تھی' لیکن اُن کی باتیں مجھے اٹریکٹ کر رہی تھیں۔ میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں' کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ زیادہ وضاحت کے ساتھ زیادہ آسان لفظوں میں۔''
رتن نے جھجکتے جھجکتے دل کی بات کہہ دی۔
''کیوں نہیں' جب آپ کا دل چاہے۔ آپ بتا دیجئے گا۔ میں آپ کو لئے چلوں گا اُن کی طرف۔''
''جی شکریہ۔''
'یہ کس بات کا شکریہ ادا کیا جا رہا ہے۔''
ریٹا نے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے۔ دریافت کیا۔
''اُنہوں نے کہا ہے کہ یہ مجھے پروفیسر صاحب سے ملوا دیں گے۔ تم نے دیکھا تھا ناں اُس روز پروفیسر صاحب کتنی دلنشین باتیں کر رہے تھے۔''
رتن نے سر اُٹھا کر ریٹا کو دیکھا۔
''اُس کو تو جنون ہو گیا ہے کیفی۔ تم اسے ضرور لے کر جانا۔ شاید اس کی بے کلی ختم ہو جائے۔''
کیفی نے سر ہلا دیا۔
ریٹا نے رتن کی طرف دیکھا۔
''لیز ڈیر! تم ذرا چائے بنا کر سرو کر دو' میں جوتے تبدیل کر کے ابھی آتی ہوں۔ یہ جوتا کاٹ رہا ہے مجھے۔''
''اچھا!''

رتن نے چائے بنا کر کیفی کی طرف بڑھائی تو اُس کے ہاتھ سے پیالی لیتے ہوئے کیفی کا ہاتھ اُس ہاتھوں سے چُھو گیا۔ کیفی کی ایک انگلی کا ہلکا سا دباؤ اُس نے اپنے ہاتھوں پر محسوس کیا۔ اُس نے گھبرا کر ہاتھ کر لیا۔

''سوری۔'' کیفی نے معذرت کر لی۔

تب ہی ریٹا جو گرز پہن کر ہاتھوں سے بالوں میں کنگھی کرتی آ گئی۔

''چلو بھئی۔''

''چائے تو پینے دو۔'' کیفی نے مُسکراتے ہوئے اُسے دیکھا۔

''ارے کیفی! یہ جولیزا ہے ناں' یہ جاب کرنا چاہتی ہے' اگر تم دلوا سکو تو پلیز۔۔۔۔)''

ریٹا کو اچانک یاد آ گیا۔ ممی نے جواب تک بالکل خاموش بیٹھی' کچھ اُلجھے دھاگوں کو سُلجھا رہی تھیں۔ چونک کر سر اُٹھا کر اُسے دیکھا اور پھر سر جھکا کر کام کرنے لگیں۔

''کیسی جاب؟'' کیفی نے براہ راست رتن کی طرف دیکھا۔

''جیسی بھی ہو۔''

''ایک جاب ہے تو سہی' میرے ایک دوست کو ایک پی۔ آر۔ او کی ضرورت ہے۔'' کیفی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ کی انگلش اچھی ہو' میرا مطلب ہے' اسپیکنگ پاور ا ہے۔۔۔ کیونکہ اُس کی ڈیلنگ زیادہ تر فارنرز کے ساتھ ہے۔''

''میری انگلش بہت اچھی ہے۔'' رتن نے بتایا۔ ''اور دیپو تو کہتا تھا کہ میں لہجے سے بات کر ہوئے برٹش لگتی ہوں۔''

''رائٹ۔'' کیفی نے کپ نیچے رکھ کر چٹکی بجائی۔

''پھر ٹھیک ہے سمجھ لو تمہاری جاب پکی ہے۔ میں اپنے دوست سے بات کر کے ایک دو روز تمہیں بتا دوں گا۔''

''تھینک یو۔'' رتن نے شکریہ ادا کیا' تو وہ کھڑا ہو گیا۔

''شکریہ تب ادا کیجئے گا جب جاب مل گئی۔ اور ہاں آپ بھی چلیں ناں ہمارے ساتھ۔''

''نہیں' آپ لوگ جائیں۔''

''نہیں' آپ لوگ جائیں''

''AS YOU WISH'' کیفی نے ہلکا سا سر کو خم کیا اور ممی کو خدا حافظ کہا۔

''آن کو میرا سلام کہیے گا۔''

ممی نے اثبات میں سر ہلایا اور ارد گرد بکھرے ہوئے دھاگے سمیٹ کر باسکٹ میں رکھے اور پھر پڑی عینک اُٹھا کر آنکھوں پر لگائی۔

''تم نوکری کرے گا سوئٹ لڑکی۔''

''جی ممی! بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتی ہوں۔ مصروفیت مل جائے گی تو دھیان بٹ جائے گا۔'' رتن نے کہا

''تجھے نہیں پتا لیزا ڈارلنگ! باہر کی دُنیا کتنی گندی اور غلیظ ہے اور تم جیسی۔۔۔ تم جیسی معصوم لڑ ارے مجھ کو دیکھو' میں نے اس دُنیا کو دیکھا ہے یہ مرد لوگ بڑا چالاک ہوتا ہے' بڑا مکار' ہم تم کو نوکری نہیں کر

دے گا۔ اس کمینے جان کے پاس بڑا پیسہ ہے۔ تم کو کیا ضرورت ہے نوکری کرنے کا''

ممی نے اپنی عینک اُتار کر پھر نیچے رکھ دی۔

''یہ کیفی۔۔۔ یہ بوائے۔۔۔ یہ بھی مجھے پسند نہیں ہے۔ لیکن پتا نہیں اس ریٹا کو اس میں کیا نظر آتا ہے۔ تم اس سے زیادہ فری نہ ہونا ڈارلنگ! ہم ہمارا دل کہتا ہے۔ کہ یہ ریٹا سے کبھی شادی نہیں بنائے گا۔ پر ریٹا کا دل ایسا نہیں کہتا۔ اُس کا دل اُس کو دھوکا دے گا۔ تم یاد رکھنا لیزا ہمارا بات۔۔۔ آج کا دن ہم نے جو بولا۔ ایک بار ہمارا دل نے بھی ہم کو ایسا ہی دھوکا دیا تھا۔ پر ریٹا کو کون سمجھائے۔ خداوند یسوع مسیح اُس کا مدد کرے۔''

اور ممی کو کیا پتا کہ ریٹا کے دل میں کیفی کی محبت کتنی گہری ہے اور کتنی شدید اور یہ کہ اُس کا دل اُسے کبھی دھوکا نہیں دے گا۔

اور ممی کیا جانیں محبت کیا ہے؟

محبت دل۔

محبت جان۔

محبت روح کا درماں۔

دل ہی دل میں دُہراتے ہوئے رتن چائے کے برتن سمیٹنے لگی اور ممی پھر سے دھاگوں کو اُٹھا اُٹھا کر باسکٹ میں رکھنے لگیں۔

☆☆☆☆

مدحت پورے صحن میں اِدھر سے اُدھر چکراتی پھر رہی تھی۔ خوشی اُس کے پورے وجود سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ سونیا نے کھلے دروازے سے اُس صحن میں اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے دیکھا اور بغیر کسی کو مخاطب کیے بولی۔

''مدحت! آج بہت خوش ہے' بے حد''۔

اُس نے مُڑ کر باصر کی طرف دیکھا جو آنکھیں موندے پلنگ پر لیٹا تھا۔ قریب ہی عبید بیٹھے تھے۔

''باصر! تم نے دیکھا' آج مدحت کتنی خوش ہے۔ وہاں ہمارے گھر میں مدحت کبھی اتنی زیادہ خوش دکھائی نہیں دیتی۔''

''ہوں۔'' باصر نے یونہی آنکھیں موندے موندے جواب دیا۔

''بہت تھک گئے ہو کیا؟''

سونیا نے تشویش سے پوچھا۔

''اتنی لمبی ڈرائیو تو نہیں تھی۔''

''کچھ زیادہ نہیں تھکا' بس یہ نہیں لیٹ گیا ہوں۔ دراصل وہ کل رات میڈم نے پورے اسپتال کو نچائے رکھا' سو نہیں سکا تھا۔''

''کون میڈم بھئی؟''

عبید جو اُس کے قریب ہی بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے' انہوں نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''وہی میڈم' ستارا بیگم مشہور سنگر۔''

''انہوں نے کیوں نچائے رکھا؟''

عبید نے دلچسپی سے پوچھا۔

''آپ کو پتا ہی ہے کہ عبید بھائی' کہ میں نے چند دن قبل ہاؤس جاب ختم ہوتے ہی بدر ہسپتال میں جاب کرلی ہے۔''

ناصر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ہاں بتایا تو تھا آنٹی نے' لیکن یار! ایک دو ماہ ریسٹ کرتے' سیر و تفریح کرتے پھر جاب کر... رہتے آرام سے۔''

''دراصل ڈاکٹر بدر بہت دنوں سے کہہ رہے تھے مجھ سے کہ ہاؤس جاب مکمل کرتے ہی اُن کے ہسپتال آ جاؤں' بلکہ وہ تو ہاؤس جاب کے دوران ہی بُلا رہے تھے مجھے' لیکن میں ٹال رہا تھا' مگر اُس روز انہوں نے فون کیا کہ فوراً آ جاؤ____۔

دراصل اُن کے دو ڈاکٹر چُھٹی پر چلے گئے تھے۔ ایک ڈاکٹر منیب تو پارٹ ٹو کا' امتحان دینے کے لئے انگلینڈ چلے گئے ہیں۔ اور دوسرے ڈاکٹر بھی کسی وجہ سے دو ماہ کی چھٹی پر ہیں۔ آپریشنز کے دوران انہیں اسسٹ کرنے کے لئے فوری طور پر کسی ڈاکٹر کی ضرورت تھی سو میں چلا گیا۔''

ناصر نے تفصیل سے بتایا۔

''اور وہ میڈم ستارا کا کیا قصہ ہے۔''

''بھئی میڈم ستارا ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں' ساتھ میں اُن کی سہیلی وحید خانم ہیں۔ بھئی کیا چیز ہیں دونوں سارے ڈاکٹرز کو نچا رکھا ہے' بے چارے ڈاکٹر بدر تو مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ سارا دن اُن کے پاس لوگ آتے رہتے ہیں۔ رات گئے تک اُن کی بیٹیاں۔۔ داماد اور بیٹے' بیٹھے رہتے ہیں اور خوب ہنگامہ رہتا ہے۔ شور و غل اس قدر ہوتا ہے' جیسے وہ ہسپتال کا کمرا نہ ہو' بلکہ کوئی فنکشن ہو رہا ہو وہاں اور پھر آتے جاتے ڈاکٹرز بھی کمرے میں رُک جاتے ہیں۔ میڈم کی مزاج پُرسی کے بہانے۔ ذرا اُن کی بیٹیوں سے گپ شپ ہو جاتی ہے۔ بیٹیاں خوبصورت بھی تو بہت ہیں۔ کل رات ڈاکٹر بدر اچانک راؤنڈ پر آ گئے۔ میڈم کے کمرے میں اس قدر شور ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر بدر کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے بڑے غصے سے میڈم کا دروازہ کھولا۔ دو ڈاکٹرز بھی وہاں موجود تھے اور کچھ میڈم کے ملنے والے تھے۔ ٹی وی پر کوئی مووی لگی ہوئی تھی فل آواز سے۔ بس ڈاکٹر بدر نے پہلے تو ڈاکٹرز کو جھاڑا اور پھر یہ کہا کہ یہ ہسپتال ہے اور یہاں شور نہ ہو وغیرہ وغیرہ بس پھر کیا تھا' میڈم نے تو ڈاکٹر بدر کو وہ گالیاں دیں کہ ڈاکٹر بدر تو ڈر کر باہر نکل آئے۔ خوب شور مچا میڈم نے اور ڈاکٹر بدر سے کہا کہ وہ کیا سمجھتا ہے۔ وہ ابھی اسی وقت اُس کا پورا ہسپتال خرید سکتی ہے۔ اور یہ کہ میں ابھی ایس پی کو فون کرتی ہوں۔ ڈی۔ سی کو بلاتی ہوں۔ میری رات کی ڈیوٹی تھی۔ ڈاکٹر بدر تو چلے گئے۔ مگر میڈم نے ساری رات سونے نہیں دیا۔ بار بار بلاتی تھیں۔ کبھی کہیں درد کی شکایت کبھی کہیں اور ساتھ میں دو چار گالیاں ڈاکٹر بدر کو۔ ساری رات قلم لگائے رکھی اور فون کر کے نہ جانے کس کس کو بلا کر کمرے میں بٹھا کر شور و غل کیے رکھا۔''

ناصر نے تفصیل سے بتایا۔

''یار! یہ اُن لوگوں کی بھی پرائیوٹ زندگی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ اوپر سے کتنے پولشڈ۔ ہوتے ہیں اور اندر سے۔۔۔ اب بھلا ایک خاتون کے مُنہ سے گالیاں کیسی لگتی ہوں گی۔''

''سونی!''

عبید نے بات ختم کی ہی تھی کہ مدحت نے اندر جھانکا۔

''سونی! تم ادھر ہی بیٹھ گئی ہو۔ ادھر آ جاؤ نا' مُنہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ یا ہاتھ لے لو۔ نوریا آپی بُلا رہی ہیں۔ تم کو۔''

''میں یونہی بس ذرا دیر کو بیٹھ گئی تھی۔''

سونیا کھڑی ہو گئی۔

''آور آپ عبید بھائی' آپ بھی تھوڑی دیر کو آرام کر لیں۔''

اُس نے دوسرے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ سادا سا کمرہ تھا۔ سُرخ پایوں والے دو پلنگ بچھے ... درمیان میں' دری بچھی تھی۔

''سفر سے تھکان ہو گئی ہو گی۔''

''نہیں' کوئی خاص نہیں۔''

عبید مُسکرائے۔

''میاں جی سے کب ملاقات ہو گی؟''

''میاں جی کے پاس کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ سندھ سے' بھاگاں نے انہیں ہمارے آنے کی ... کر دی ہے۔ بس وہ مہمانوں کو رخصت کر کے آتے ہی ہوں گے۔ آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔ اتنے میں ... لگواتی ہوں۔ میاں جی کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائیں گے۔''

''مہراں آپا۔''

اُس نے وہیں کھڑے کھڑے آواز دی۔

''ذرا یہاں آ کر چائے کے برتن تو اُٹھا لیں۔''

''اور تم تھکی نہیں ہو مدحو' آتے ہی مصروف ہو گئی ہو۔''

سونیا نے اُس کے شگفتہ چہرے کی طرف دیکھا۔

''نہیں تو۔۔''

''میرا تو جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے' راستہ بہت خراب ہے۔''

''ہاں پہاڑی علاقہ ہے نا ورنہ فاصلہ تو زیادہ نہیں ہے۔''

''سڑک بھی تو بالکل بیکار ہے۔''

سونیا نے تبصرہ کیا۔

''اور میں بہت عرصہ بعد آئی ہوں اِدھر' اُس لئے تھکن ہو گئی ہے۔''

''تم چلو ماں جی والے کمرے میں وہاں نوریا اور سویرا لیٹی ہوئی ہیں میں ذرا کچن کو دیکھوں گی۔''

''رہنے دو مدحو' ماسی بھاگاں نے جو کچھ پکا رکھا ہے' وہی ٹھیک ہے' لنگر میں بھی تو کچھ پکا ہو گا ناں' تم

سونیا نے اُس کا ہاتھ پکڑا۔

''تم چلو ناں' میں آ رہی ہوں۔''

تب ہی مہراں آ گئی۔ مہراں کا قد تقریباً تین فٹ تھا۔ عمر کوئی تیس پینتیس کے قریب ہو گی۔ موٹی ... اُس نے اچھی طرح سے اپنے اِردگرد لپیٹ رکھا تھا۔ وہ خاموشی سے آ کر برتن اُٹھانے لگی تو سونیا اور ... نکل آئیں۔

''یہ بونی ابھی تک یہیں ہے۔'' سونیا نے پوچھا۔

''ہاں' کہاں جاتی۔ میاں جی نے کہا' چاہو تو یہاں رہ لو' کہو تو تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتے ہیں۔ یہ یہاں

ہی رہ گئی۔ اور میاں جی نے کہا تھا۔ اُسے بونی نہ کہا کرو۔ مہران نام ہے اس کا۔ میں اسے مہران آپا کہتی ہوں
سونیا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مدحت نے بتایا۔

سونیا کو اچھی طرح یاد تھا' جب پہلی بار ماں جی بیمار ہوئی تھیں اور وہ ماما کے ساتھ شاہ پور آ
جی کی مزاج پُرسی کرنے تو ایک شام جب ماں جی کی طبیعت کافی بہتر تھی اور بھاگاں نے باہر صحن میں
کے چارپائیاں بچھادی تھیں۔ اور ماں جی صحن میں بچھی چارپائی پر تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز ماما
ہوئے کچھ کہہ رہی تھیں۔ اور وہ بڑی بور سی ہو کر صحن میں ٹہل رہی تھی اور ٹہلتے ٹہلتے اچانک ہی اُسے
کہ چلو فاطمہ کے ساتھ چل کر گپ شپ لگاتی ہوں۔

فاطمہ کا گھر قریب ہی تھا اور وہ بڑے مزے مزے کی باتیں کرتی تھی۔ فاطمہ کے گھر
خیال سے جوں ہی اُس نے لکڑی کا بڑا سا دروازہ کھولا تھا تو اچانک اُس کی نظر ایک چھوٹی سی تین فٹ
پڑی تھی' جو بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں اور چھوٹے چھوٹے بچے ذرا فاصلے پر کھڑے ہنس رہے
بونی کہہ کر اُسے چھیڑ رہے تھے۔ جوں ہی اُس نے گیٹ کھولا وہ بھاگ کر اندر آ گئی۔

بچے اُسے اندر جاتا دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے تھے اور سونیا یک دم ایک طرف ہٹ گئی تھی۔ وہ
صحن میں آ گئی تھی اور ماں جی کی چارپائی کے پاس نیچے زمین پر بیٹھتے ہی اُس نے دھواں دھار رو
دیا اور ماں جی یک دم اُٹھ بیٹھی تھیں اور اُسے بازوؤں سے پکڑ کر اُوپر اپنے پاس بٹھا لیا تھا اور اُس
پوچھ رہی تھیں۔

"بیٹا! تم کون ہو' کس گاؤں سے آئی ہو' کس سے ملنا ہے۔"

لیکن وہ روئے چلی جا رہی تھی اور پھر سونیا' فاطمہ کی طرف چلی گئی تھی اور اگلی صبح وہ
لاہور واپس آ گئے تھے اور پھر ماں جی کی وفات پر اُس نے بونی کو دیکھا تھا۔ بے تحاشا روتے ہو
بھاگ بھاگ کر کام کرتے ہوئے اور بھاگاں نے بتایا تھا۔ اُسے کہ ماں جی نے اُس کے عزیزوں کا
اور بہت جلدی وہ اُسے چھوڑ آئیں گے۔ لیکن وہ ابھی تک یہیں تھی۔ ماں جی کی وفات کے بعد
نہیں سکی تھی اور اُسے خبر تک نہ تھی کہ جس مہراں آپا کا ذکر مدحت اتنے چاؤ سے کرتی ہے۔ وہ بونی ہی
"مگر مدحو!"

ماں جی والے کمرے کے دروازے پر رُک کر سونیا نے پوچھا۔

"جب ماں جی فوت ہوئی تھیں تو بھاگاں کہتی تھی۔ میاں جی نے بونی کے گھر والوں کا
اور وہ اُسے گھر چھوڑ آئیں گے۔" "ہاں مگر مہراں آپا نے میاں جی کے پاؤں پکڑ لئے تھے اور کہا تھا
ہی رہنا چاہتی ہیں۔ میاں جی کے سائے میں ساری زندگی۔"

"مدحت نے بتایا اور کچن کی طرف مُڑ گئی۔

کچن میں بھاگاں مصروف تھی۔

"بیٹی! تم جاؤ مہمانوں کے پاس' میں سب کر لوں گی۔"

"نہیں ماسی بھاگاں! میں کچھ مدد کرتی ہوں۔ یہ پیاز اور کھیرا وغیرہ مجھے دے دو۔ میں
ہوں۔ تم مُرغی بھون لو اور۔۔۔۔"

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"اپنے لیے کیا پکا رکھا تھا۔"

"میاں جی تو دوپہر کا کھانا کھاتے نہیں' ہم سب نے اپنے لئے بینگن کا بھرتہ بنایا تھا۔"

"اور لنگر میں؟"

مدحت نے پوچھا۔

"شاید آلو گوشت ہوگا۔"

بھاگاں نے بتایا۔

"لیکن باہر تو کھانا تقسیم بھی ہو چکا ہوگا۔ اور آج تو پار والے گاؤں سے بہت لوگ آئے تھے' جھگڑا
[illegible] دو گروہوں میں صلح صفائی کے لئے میاں جی نے بُلوایا تھا۔"

"اچھا۔"

مدحت کچھ مایوس سی نظر آنے لگی۔

"کچھ اور تیار نہیں ہو سکتا جلدی سے؟"

"کچھ اور۔۔۔!" بھاگاں نے ایک لمحے کے لئے سوچا تھا۔

چاول بنا لوں۔ ساتھ مٹر اور آلو ڈال دوں گی۔"

"بنا لو۔"

"مٹر ہیں تو مجھے دے دو' میں چھیل دیتی ہوں۔"

"نہیں بیٹی! تم مہمانوں کے پاس بیٹھو' ابھی مہراں آ جاتی ہے تو کر لیتی ہے سب کچھ۔"

"مہراں آپا کہاں گئی ہیں۔؟"

"اوپر چھت پر گئی ہے تندور گرم کرنے کے لئے۔"

"پتا ہے وہاں شہر میں جب کوئی مہمان آتا ہے ناں تو بارہ تیرہ قسم کی ڈشز ہوتی ہیں۔ میز بھر جاتی
[illegible]ن روسٹ' بٹیر' کڑاہی گوشت' تکّے' چاول' شامی کباب' سوپ اور نہ جانے کیا کیا۔۔؟"

مدحت نے کھیرا چھیلتے ہوئے بھاگاں کو بتایا۔

"توبہ ہے جی' یہ تو اسراف ہے بڑا۔ پیٹ بھرنے کے لئے تو ایک قسم کا سالن بھی کافی ہوتا ہے۔
[illegible]لی کہتے ہیں ہمارے پیارے نبیؐ اکثر چند کھجوریں اور ستو کھا کر دن گذار دیتے تھے۔"

اُس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا۔

"میں قربان جاؤں اپنے نبیؐ کے۔

بیٹی! تم رہو گی کچھ دن؟"

"نہیں ماسی! کل ہم لوگ چلے جائیں گے وہاں کالج بھی تو جانا ہوتا ہے ناں۔"

"اور سب ٹھیک ہیں جی وہاں؟

بیگم صاحبہ اور بابو جی اور پھر تبریز میاں اور رمیض میاں۔"

"ہاں سب ٹھیک ہیں۔" مدحت نے آہستہ سے کہا۔

"تبریز میاں کیوں نہیں آئے ساتھ جب سے ولایت سے آئے ہیں۔ ایک ہی بار آئے
پہلے تو بہت آیا کرتے تھے۔"

"وہ مصروف تھے۔"

مدحت نے مختصراً کہا اور پیاز کاٹتے ہوئے غیر ارادی طور پر اُسی کے متعلق سوچنے لگی۔

''پتا نہیں۔ تبریز کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں۔

باصر نے کتنا کہا تھا۔ اُسے بھی ساتھ چلنے کو لیکن اُس نے انکار کر دیا تھا۔''

''مجھے ایک ضروری کام سے کراچی جانا ہے۔''

''کیا آفس کا کوئی کام ہے۔؟ پاپا سے کہہ دیں کسی اور کو بھیج دیتے ہیں۔''

''نہیں میرا اپنا کام ہے پرسنل کام۔''

''کیوں کیا آپ نے اپنا کوئی ذاتی بزنس شروع کر دیا ہے۔؟''

سونیا نے مذاق کیا تھا' لیکن مدحت نے محسوس کیا تھا کہ تبریز کے چہرے کا رنگ بدل گیا
دوسرے ہی لمحے وہ نارمل ہو گیا۔

''ایک دوست ہے میرا کراچی میں۔ اُس سے ملنے جا رہا ہوں۔''

مدحت کی نظریں اچانک ہی باصر کی طرف اُٹھ گئی تھیں۔ وہ بہت گہری نظروں سے تبریز کو دیکھ
اُس رات مسز وہاب کے گھر سے واپسی پر انہوں نے تبریز کو دیکھا تھا۔ اُس کے ساتھ کوئی
تھیں' بہت شوخ اور گہرے میک اَپ میں اور گھر بھی اُسے ایک خاتون نے ڈراپ کیا تھا اور وہ خلیل کہہ
وہ جادوگرنی ہے۔

باصر نے اظہار نہیں کیا تھا لیکن اُسے اتنی رات گئے تبریز کا کسی خاتون کے ساتھ جانا ناگوا
اور مدحت نے اُس کی ناگواری کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ بہت دیر تک ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا غالباً تبریز کا
انتظار کرتا رہا تھا۔

مدحت تو اپنے کمرے میں آتے ہی بستر پر گرتے ہی سو گئی تھی۔ پھر نہ جانے رات کا کون
جب باتوں کی آواز سے اچانک اُس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

''باصر! مجھے تمہارا اس طرح اپنی ذات میں دخل دینا قطعی پسند نہیں ہے۔ میں کیا کرتا ہو
جاتا ہوں' کس کے ساتھ جاتا ہوں' تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔''

یہ غالباً تبریز تھا۔

اُس کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔

یقیناً باصر نے اُس سے پوچھا ہو گا کہ وہ اس وقت اُس لڑکی کے ساتھ کہاں جا رہا تھا۔

مدحت نے سوچا اور کان آوازوں پر لگا دیئے لیکن جواب میں باصر نے جو کچھ کہا تھا۔ وہ
تھی۔ پھر سیڑھیوں پر قدموں کی آواز آئی تھی۔ شاید تبریز اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

صبح ہمیشہ کی طرح وہ سب سے پہلے جاگی تھی اور نماز پڑھ کر جب وہ اپنے لئے چائے بنا
تو ٹی وی لاؤنج میں باصر صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔

''ارے باصر! رات یہیں رہا' اپنے کمرے میں نہیں گیا۔''

وہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

رات کو اچھی خاصی خنکی ہو جاتی تھی اور وہ بغیر کمبل کے ساری رات یونہی' مگر کیوں۔

اُس کے قدموں کی آہٹ سن کر باصر نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس کی آنکھیں
رہی تھیں۔ شاید رات بھر سویا نہیں تھا۔

''آپ اپنے کمرے میں کیوں نہیں گئے تھے۔''

''بس یونہی ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو گیا تھا۔

مدحو! میرے لئے بھی ایک کپ چائے بنا دینا۔''

''جی۔۔!''

وہ کچن کی طرف چلی گئی اور جب چائے بنا کر واپس آئی تو وہ اُٹھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اُس کے ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ تھا۔

''آپ سگریٹ بھی پیتے ہیں۔''؟

مدحت نے حیرت سے اُسے دیکھتے ہوئے چائے میز پر رکھی۔

''ہاں بس کبھی کبھی یوں ہی ایک آدھ۔۔!''

باصر نے سگریٹ بجھا کر ایش ٹرے میں پھینک دیا۔

مدحت نے چائے بنا کر کپ اُس کی طرف بڑھایا اور خود اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''مدحت! بیٹھ جاؤ' اپنے لئے بھی چائے بنا لو۔''

''وہ میں ایک ہی پیالی لائی ہوں۔''

''تم مجھ سے اتنا ڈرنے کیوں لگی ہو مدحت! ہمارے درمیان ایک اور رشتہ بھی تو ہے۔ تم میرے ماموں اور پھپھو کی بیٹی ہو۔''

''نہیں تو۔'' مدحت نے آہستگی سے کہا۔

''کیا مطلب' کیا تم میری کزن نہیں ہو۔''

''نہیں' میرا مطلب ہے' میں آپ سے ڈرتی نہیں ہوں۔''

''تو پھر۔۔؟'' باصر کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ کر معدوم ہو گئی۔ ''اپنے لئے کپ لے آؤ۔''

کچن سے کپ لا کر مدحت نے اپنے لئے چائے بنائی اور باصر کے بالکل سامنے بیٹھ کر پینے لگی۔

''مدحو!'' باصر نے آہستگی سے کہا۔

''جی۔'' اُس نے چونک کر باصر کی طرف دیکھا۔

وہ بہت گہری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''سنو' تبریز بھائی کا خیال رکھا کرو۔''

''میں۔۔!''

اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

''میں خیال رکھا کروں؟''

''ہاں تم۔''

''مگر کیسے' میں بھلا اُن کا کیسے خیال رکھ سکتی ہوں؟ وہ کوئی بچے تو نہیں ہیں۔''

اُس نے باصر سے پوچھا۔

''کبھی کبھی بڑوں کا خیال رکھنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے مدحو' اور بچوں سے زیادہ کہیں' اور تبریز بھائی۔۔۔!''

تب ہی سیڑھیوں پر آہٹ سنائی دی۔ شاید تبریز نیچے آ رہا تھا۔ باصر نے اپنی بات نامکمل ہی چھوڑ دی اور سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

تبریز نیچے آ رہا تھا۔ مدحت نے مڑ کر اُسے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بھی سُرخ ہو رہی تھیں اور وہ ابھی تک رات والے ڈریس میں ہی تھا۔

"تبریز بھائی غالباً چائے کے لئے ہی آ رہے ہیں۔"

باصر نے کہا۔

"تم ایک کپ اور لے آؤ۔"

مدحت خاموشی سے اُٹھ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ چائے کے لئے ہی آیا ہے۔ جب سے وہ آیا تھا اس کی عادت تھی کہ وہ بہت سویرے اُٹھ کر کچن میں آ کر خود ہی چائے بنا لیتا تھا۔ کئی بار مدحت نے اُسے کچن کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ دو تین بار تو وہ اس سے پہلے ہی کچن میں موجود تھی لہٰذا اُس نے اُس کے لئے چائے بنا دی تھی۔

"آیئے تبریز بھائی! اِدھر ہی آ جائیے، چائے ہے۔ مدحت کپ لینے گئی ہے۔"

باصر کی آواز اُسے کچن میں آئی تھی اور جب وہ کپ لے کر آئی تو تبریز، باصر کے قریب ہی بیٹھا تھا۔

"آپ رات سوئے نہیں کیا؟"

باصر اُس سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"تبریز بھائی! آپ آج میرے ساتھ ہسپتال چلیں۔ وہاں ڈاکٹر بدر سے کہہ کر آپ کا مکمل چیک اپ کراتا ہوں، مجھے آپ کی صحت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔"

"نہیں یار! بالکل ٹھیک ہوں، ایسے ہی ذرا تھکن سی ہے۔"

تبریز نے کہا اور مدحت کی طرف دیکھا، جس نے چائے بنا کر کپ اُس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"تھینک یو۔" تبریز نے کپ اُٹھا لیا۔

"آپ کے لئے اور بناؤں" اُس نے باصر سے پوچھا۔

"نہیں شکریہ۔"

اور اپنا خالی کپ اُٹھا کر کچن میں رکھ کر وہ اپنے کمرے میں واپس آ گئی تھی۔

مدحو گہری نیند سو رہی تھی مگر اُس کا ذہن اُلجھ گیا تھا اور پھر کئی دن تک اُلجھا رہا۔

باصر کی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے کیوں کہا تھا کہ وہ تبریز کا خیال رکھا کرے بھلا وہ تبریز کا کیسے خیال رکھ سکتی ہے۔

گھر میں اتنے نوکر ہیں۔

آنٹی ہیں۔

سونیا ہے۔

اور پھر اُسے تو خبر بھی نہیں ہوتی تھی کہ تبریز کب گھر آتا ہے، کب جاتا ہے۔ جب وہ گھر میں ہوتا زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتا تھا۔ پتا نہیں باصر کا اس سے کیا مطلب تھا۔ اس کے بعد باصر کئی دن تک گھر پر ہی رہا تھا، لیکن اس موضوع پر باصر سے بات نہیں ہوئی تھی۔ باصر اکثر تبریز کے آنے پر اُس کے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ شاید وہ اُسے کمپنی دینے کی کوشش کرتا تھا۔ مدحت نے محسوس کیا تھا کہ وہ تبریز کے ساتھ زیادہ وقت گذارتا تھا۔

اُن دنوں تبریز بھی آفس سے آنے کے بعد کہیں نہیں جا رہا تھا اور کبھی کبھی رات کے کھانے پر وہ سب اکٹھے ہوتے تو ایک خوشگوار سا احساس ہوتا تھا۔ آنٹی زینت اور انکل مراد بھی بہت خوش دکھائی دیتے تھے۔ ہلکی پھلکی باتوں کے دوران کھانا کھایا جاتا تھا۔ تبریز اگرچہ گفتگو میں کم حصہ لیتا تھا، لیکن اس کی موجودگی سے سب خوش ہوتے تھے۔

رمیض کے فون آتے رہتے تھے۔ عبید، نورین، سویرا اس دوران دو تین بار آئے تھے اور سب سے ہی ان کی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ عبید تو ایک دو بار اکیلے بھی باصر کے ساتھ آئے تھے۔ اُن کی باصر سے کافی دوستی ہو گئی تھی۔ اگرچہ وہ عمر میں اُس سے کچھ بڑے تھے، لیکن باصر اُن کی بے حد تعریف کرتا تھا۔

مسز زینت مراد اُن کی بہت خاطر مدارت کرتی تھیں۔ بہت محبت اور خلوص سے ملتیں اور ان کے آنے پر کافی دیر آ کر اُن کے پاس بیٹھتی تھیں۔

اُس روز عبید اور مسز وہاب آئی ہوئی تھیں اور باصر نے بتایا تھا کہ وہ ایک دو روز کے لئے شاہ پور جا رہا ہے۔

"خیریت؟" مسز وہاب نے پوچھا تھا۔

"جی خیریت ہی ہے۔ بہت دن ہو گئے ہیں۔ میاں جی سے ملے ہوئے۔ پھر مدحت بھی اُداس ہو رہی ہے۔ اسے ملوا لاؤں گا۔ کالج تو یوں بھی اب دو تین دن بند رہیں گے۔"

"کالج تو بند ہے۔" عبید نے کہا۔

"میں بھی چلوں گا تمہارے ساتھ۔ تمہارے میاں جی سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے مجھے۔"

اور پھر سب کا ہی پروگرام بن گیا تھا۔ نورین، سویرا، سونیا، مسز زینت مراد، مسز وہاب سب کا، مگر پھر مسز وہاب کسی وجہ سے نہ آ سکی تھیں۔ چونکہ مسز وہاب نہیں آ رہی تھی۔ اس لئے زینت مراد بھی نہیں آئی تھیں اور سب آج صبح لاہور سے روانہ ہوئے تھے اور کچھ دیر پہلے ہی یہاں پہنچے تھے۔

"بس کریں بی بی! اتنے زیادہ پیاز کاٹ دیئے آپ نے۔" بھاگاں نے کہا تو وہ چونکی۔

"لائیں مجھے دیں یہ کھیرا اور آپ جائیں مہمانوں کے پاس۔"

"مگر میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔"

"لیجئے، یہ مہراں بھی آ گئی ہے۔"

بھاگاں نے اندر آتی ہوئی مہراں کو دیکھا۔

"تندور تپ گیا؟"

"ہاں آگ جلا آئی ہوں۔ کچھ دیر بعد جا کر روٹیاں لگاؤں گی اور بی بی! آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میں سب کر لیتی ہوں۔ ابھی پچھلے دنوں کراچی سے بہت بڑے لوگ آئے تھے میاں جی کے پاس۔ منٹوں میں میں نے سب کچھ تیار کر لیا تھا۔ پوچھ لیں ماسی بھاگاں سے۔" مہراں نے تفاخر سے کہا۔

"میں... مجھے کئی طرح کے سلاد بنانے اور ڈیکوریٹ کرنے آتے ہیں۔ ہمارے گھر میں۔ میرا مطلب ہے یہاں آنے سے پہلے میں جس گھر میں رہتی تھی، وہاں بڑی بڑی پارٹیاں ہوتی تھیں۔ آج فلاں کا ڈنر، آج فلاں صاحب آ رہے ہیں اور...!"

مدحت حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اتنا عرصہ ہو گیا تھا اسے یہاں رہتے ہوئے، لیکن اس سے قبل اس نے کبھی اپنی ذات کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔ بس خاموشی سے اپنے کام میں لگی رہتی تھی اور جب میاں جی نے کہا تھا کہ انہوں نے اُس کے گھر والوں کا پتا لگا لیا ہے، وہ چاہے تو اُسے پہنچا دیں۔ مگر وہ رونے لگی تھی اور

اُس نے میاں جی کے پاؤں تھام لیے تھے کہ وہ اُسے اپنے قدموں سے جُدا نہ کریں پھر اُس کے اور میاں
کے درمیان نہ جانے کیا بات ہوئی تھی کہ دوبارہ میاں جی نے اُسے اُس کے گھر لے جانے کی بات نہیں کی
اور اُس کے جانے کے بعد سارے گھر کا انتظام اُسی کے ہاتھ میں تھا۔

''اچھا! مدحت کھڑی ہوگئی۔

''پھر میں چلتی ہوں' کھانا لگ گیا تو پھر بُلا لینا''۔

''بےفکر ہوکر جاؤ جی۔'' مہراں نے کہا۔

مدحت باہر نکلی تو میاں جی بڑے گیٹ سے اندر آرہے تھے۔

''میاں جی۔'' وہ دوڑ کر اُن سے لپٹ گئی۔

''کیسی ہے بیٹی؟'' میاں جی نے اُس کے سر پر بوسہ دیا۔

''میں تو بالکل ٹھیک ہوں' آپ کیسے ہیں۔؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔''

''نہیں' آپ اتنے ٹھیک نہیں ہیں۔''

اُس نے الگ ہوکر انہیں غور سے دیکھا۔

''اتنے کمزور ہورہے ہیں۔''

''کمزوری تو اب عمر کا تقاضا ہے بیٹی! بیمار وغیرہ بالکل نہیں ہوں۔ اپنے باصر میاں بہت اچھے
ہیں۔ اور یہ اچانک کیسے آگئے تم لوگ؟''

''بس ایسے ہی دل بہت اُداس ہورہا تھا۔ میں باصر بھائی اور سوتی آرہے تھے کہ آنٹی کے کوئی ملنے
ہیں' اُن کے بچے عبید بھائی' نوریا آپی اور سویرا بھی ساتھ آگئے۔ عبید بھائی کو آپ سے ملنے کا تو بہت شوق تھا۔''
اُن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اُن کا ہاتھ تھام کر___ اُس نے بتایا۔

''اچھا!'' میاں جی نے ایک گہری نظر اُس پر ڈالی۔

''اُن لوگوں کا اِدھر مراد ہاؤس میں بہت آنا جانا ہے' اچھے لوگ ہیں میاں جی۔'' مدحت
وضاحت سے کہا۔

میاں جی نے سر ہلایا۔

''آیئے عبید بھائی اور باصر بھائی اِدھر ہیں' اُس کمرے ہیں۔''

''میاں جی آپ___!''

باصر انہیں دیکھ کر ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ عبید بھی کھڑے ہوگئے تھے۔ مدحت انہیں وہاں
واپس پلٹ آئی۔

☆☆☆☆

بڑے کمرے میں وہ سب دری پر بیٹھے تھے اور عبید چاروں طرف رکھی ہوئی بڑی بڑی الم
میں موجود کتابوں کو حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

''اتنی قیمتی اور نایاب کتابیں۔''

انہوں نے زیرِ لب کہا اور مُڑ کر باصر کی طرف دیکھا جو نوریا سے ہولے ہولے کچھ کہہ رہا تھا۔

''باصر یار! مجھے تو تم لوگ یہیں چھوڑ جاؤ۔ میرا ان کتابوں کو چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔

پڑھا۔ کبھی دیکھا نہیں۔ یہ دیکھ رہے ہو تم یہ کتاب___!

وہ ایک کتاب اُٹھائے اُٹھائے اُن کے پاس چلے آئے۔

''دیکھا تو بہت بار ہے ان کتابوں کو بچپن سے دیکھ رہا ہوں۔ لیکن پڑھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔''

باصر نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

''اور آپ جب تک چاہیں یہاں رہ سکتے ہیں۔
میاں جی کو آپ کی میزبانی سے بہت خوشی ہوگی۔''

''یار! میں میاں جی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ اور مجھے افسوس ہورہا ہے کہ میں اب تک ان سے
نہیں ملا تھا۔''

عبید اُس کے قریب ہی دری پر بیٹھ گئے اور کتاب کی ورق گردانی کرنے لگے۔ جب وہ یہاں آرہے
تب بھی اُن کے وہم و گمان میں یہ بات نہ تھی کہ میاں جی اتنے عالم فاضل شخص ہوں گے۔ اُن کا خیال تھا کہ
ایک مولوی قسم کے آدمی ہوں گے نیک اور تہجد گذار قسم کے اور گاؤں کے لوگ اُن کے عقیدت مند ہوں گے۔
سے تعویذ وغیرہ لیتے ہوں گے۔ پانی وانی دم کرا کے لے جاتے ہوں گے اور بس۔

مدحت کے بتانے کے باوجود اُن کا خیال تھا کہ اُن کے پاس کچھ کتابیں ہوں گی یہی بس حدیث
وغیرہ کی۔ مگر یہاں تو رنگ ہی اور تھا۔

ادب شاعری' حدیث' شریعت فقہ کون سا موضوع تھا۔ جس پر یہاں کتاب نہ تھی' اور پھر میاں جی
اُن کے تصور کے بالکل برعکس تھے۔ یہاں تو بڑے بڑے عالم اور فاضل لوگ اُن سے علمی اور ادبی بحث
نے آتے تھے۔ بڑے بڑے فقہی مسائل کا حل پوچھنے آتے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ایک چھوٹے سے گاؤں
ایک اتنی عظیم شخصیت موجود ہوگی۔ وہ لوگ صرف ایک روز کے لئے آئے تھے اور پھر میاں جی کے شدید
ار پر رُک گئے تھے۔ باصر نے قصبے سے جا کر گھر فون کر دیا تھا۔ عبید کو میاں جی' یہ چھوٹا سا گاؤں اور یہاں کی
کی سب کچھ بہت اچھا لگا تھا۔

''میں چھٹیوں میں یہاں ضرور آؤں گا بہت دنوں کے لئے رہنے۔ باصر! میاں جی سے بات کر
بہت لطف آتا ہے۔''

عبید نے بات ختم کی ہی تھی کہ دروازہ کُھلا اور ڈاکٹر شاہ محمد بغل میں مُرغی دبائے اندر داخل ہوئے۔

''آہا! باصر میاں آئے ہوئے ہیں۔''

انہوں نے بغل سے مُرغی نکال کر باہر اُچھال دی۔

''آیئے ڈاکٹر صاحب!''

باصر اُٹھ کر اُن سے گلے ملا۔

''اور یہ مُرغی کس کی پکڑ لائے ہیں۔؟''

''یہ مُرغی۔''

انہوں نے مُڑ کر پیچھے دیکھا۔ مُرغی کے پاؤں بندھے ہوئے تھے' اس لئے وہ دروازے کے پاس
پڑی تھی۔

''حق حلال کی کمائی ہے میاں''

''فیس میں ملی ہوگی۔''

''بالکل''۔ وہ زور سے ہنسے۔

''پتا چلا تھا شہر سے میاں جی کے مہمان آئے ہیں۔ سوچا آج اُنہیں دیسی مُرغی کھلائیں۔ ق
کھا کے مُنہ کا ذائقہ خراب ہو گیا ہوگا۔''

''شکریہ۔'' باصر نے مُڑ کر عبید کی طرف دیکھا۔

''عبید! ان سے ملیں' یہ ہیں ڈاکٹر شاہ محمد' اس گاؤں بلکہ آس پاس کے بھی چند دیہات کے
ڈاکٹر اور یہ پروفیسر عبید ہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب پڑھاتے ہیں۔

''ہوں''

ڈاکٹر شاہ محمد نے گہری نظروں سے عبید کو دیکھتے ہوئے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ عبید
دلچسپی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ انہیں اُن کی شخصیت میں عجیب سی کشش محسوس ہوئی۔ چمکتی ہوئی آنکھیں
سی داڑھی جن میں کہیں کہیں سفید بال بھی تھے اور مُسکراتا ہوا چہرا' سُرخ و سفید رنگت۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

عبید نے اُن کا ہاتھ گرم جوشی سے دباتے ہوئے کہا۔

''حیرت ہے' اس چھوٹے سے گاؤں میں بڑی بڑی عظیم شخصیتیں چُھپی ہوئی ہیں۔''

''کسی کے بارے میں اتنی جلدی اندازہ نہیں لگایا کرتے' میاں ہم تو بڑے معمولی سے آدمی ہیں
ڈاکٹر شاہ محمد مُسکرائے اور باقی لوگوں کی طرف نظر دوڑائی۔

''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو یہ اپنی سونی بیٹی ہیں۔''

اُنہوں نے سونیا کی طرف اشارہ کیا۔

سونیا نے کھڑے ہو کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے بڑی شفقت سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

''اور یہ نویرا ہیں مستقبل کی ڈاکٹر اور پروفیسر عبید کی چھوٹی بہن۔''

باصر نے تعارف کرایا۔

''اور یہ سویرا ان سے چھوٹی۔''

ڈاکٹر شاہ محمد نے باری باری دونوں کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

''اور وہ ہماری مدحو بیٹی کدھر ہیں۔؟''

''انکل! کیسے ہیں آپ؟''

مدحت نے پیچھے سے آ کر انہیں پکارا تو انہوں نے مُڑ کر اُسے دیکھا

''ارے ہماری بیٹی کیسی ہے۔ بھئی میں تمہیں بہت یاد کرتا ہوں اور یہ تم نے کیسی شکل بنالی ہے
باصر میاں؟''

وہ یک دم باصر کی طرف مُڑے۔

''کھانے کو کچھ نہیں دیتے ہو اسے؟''

باصر کی نظریں مدحت کی طرف اُٹھ گئیں۔ سونیا کا رنگ لمحہ بھر کو بدل گیا۔ مدحت جلدی سے

''نہیں ڈاکٹر انکل! میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔''

''وہاں سب لوگ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ابھی تک ایڈجسٹ نہیں ہوئی۔ میاں
مِس کرتی ہے۔''

سونیا نے وضاحت کی۔

''میاں جی بھی اسے مِس کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر شاہ محمد نے دری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اور سُنو مدحو بیٹی! آج ہم لنچ ڈنر سب یہاں ہی کریں گے۔ تم لوگ ہونا یہاں''؟

''جی' آج کا دن اور کل ہم چلے جائیں گے۔ آج تیسرا دن ہے ہمیں آئے ہوئے۔''

مدحت نے بتایا۔

''دراصل میں دو دن سے اگلے دیہات میں گیا ہوا تھا' وہاں ہیضہ پھوٹ پڑا تھا۔''

ڈاکٹر شاہ محمد نے مدحت کی بات کا جواب دے کر باصر کی طرف دیکھا۔

''سُنا تھا' تمہارا ہاؤس جاب مکمل ہو گیا ہے' تو کب آ رہے ہو یہاں؟ ہم تو آنکھیں فرش راہ کئے
بیٹھے ہیں۔۔''

''ابھی پاپا سے بات نہیں ہوئی' کچھ وقت تو لگے گا ناں''؟

''یعنی ارادے پختہ ہیں۔''

''بالکل۔''

''مگر یہ بہت مشکل ہے انکل۔'' سونیا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے باصر کو سمجھایا تھا۔ پاپا یہاں روپیہ انویسٹ نہیں کریں گے اور پھر یہاں کروڑوں روپیہ
لگا کرنے کا فائدہ بھی کیا ہے۔''؟

''سونی بی بی! بعض فوائد دکھائی نہیں دیتے۔ محسوس ہوتے ہیں۔ تمہیں کیا خبر کہ باصر کا یہ ہسپتال اِرد
گرد کے کتنے دیہات کے لئے مسیحا ہوگا۔''

''لیکن انکل!'' سونیا نے بحث کی۔

''آپ خود سوچیں یہاں اس اتنے پسماندہ دیہات میں کون ڈاکٹر آئے گا۔ یہاں تو بجلی بھی ابھی
چند ماہ پہلے پہنچی ہے۔ غنیمت ہے اسپتال کی عمارت بن گئی سامان بھی آ گیا۔ لیکن ڈاکٹر کہاں سے آئیں گے'
ایک آپ ایک باصر۔''

اُس نے ایک نظر باصر کی طرف دیکھا۔

''جدید ترین سہولتوں سے آراستہ آپریشن تھیٹر لیکن آپریٹ کون کرے گا؟''

''بس سونیا بی بی بس!''

ڈاکٹر شاہ محمد نے ہاتھ اُوپر اُٹھایا۔

''تم نے تو ایک لمحے میں میرے سارے خوابوں کا محل چکنا چُور کر دیا۔ جب سے باصر میاں نے
یہاں ہسپتال بنانے کا پروگرام بنایا تھا' تب سے میں بڑے خوبصورت' خوبصورت خواب دیکھنے لگا تھا۔''

''آپ خواب ضرور دیکھیں ڈاکٹر تعبیر انشاء اللہ میں دوں گا۔''

باصر کے لہجے میں یقین اور اعتماد تھا۔

''لیکن۔'' سونیا کچھ کہنا چاہتی تھی' مگر عبید نے اُسے ٹوک دیا۔

''سونیا جی! مجھے آپ سے اتفاق نہیں ہے۔ دُنیا میں ایسے سرپھروں کی کمی نہیں ہوتی۔ جن کا مقصد
حیات ہی لوگوں کی خدمت کرنا ہوتا ہے۔ میں اگر ڈاکٹر ہوتا تو سب سے پہلے باصر کے ہسپتال میں ہوتا۔''

سونیا نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ اُس کے بالکل قریب کھڑا تھا اور کتاب اُس کے ہاتھ میں تھی
اُسے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ ہولے سے مُسکرایا اور مُڑ کر کتاب الماری میں واپس رکھنے لگا۔

''اور یہ شخص پروفیسر عبید۔''!

اُس کی پُشت پر نظریں جمائے جمائے سونیا نے سوچا۔ ''شاید میں اُس سے کچھ کچھ متاثر ہو رہی ہوں۔''

''اور یہ نویرا ابھی تو ہیں آپ کی بہن۔''

سونیا نے عبید کو مخاطب کیا تو وہ وہیں الماری کے پاس کھڑے مُڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔

''ان سے پوچھیں' کیا یہ یہاں اس دیہاتی ہسپتال میں کام کرنا پسند کریں گی''

'میں' میں پتا نہیں' میں نے ابھی ایسا سوچا نہیں ہے۔'' نویرا نے جلدی سے کہا۔

''میں اور نویرا دو الگ شخصیتیں ہیں۔ اور ہماری سوچ و فکر بھی الگ ہے' اگر نویرا میری طرح سوچتی تو یہ ایک فطری بات ہے آپ کی اور باصر کی سوچ میں بھی تو بہت تضاد ہے۔''

''میں ... مجھے باصر سے اختلاف نہیں ہے۔' میں اسے APPRECIATE (قدر کرتی ہوں) کرتی ہوں اُس کا جذبہ قابلِ قدر ہے۔' بس میں تو اُسے ایک فیکٹ (حقیقت) بتا رہی ہوں۔ پاپا کبھی بھی اس کے ساتھ اتفاق نہیں کریں گے اور ماما تو پاپا سے زیادہ مخالفت کریں گی' وہ تو ...!''

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ ایک نظر اُس نے باصر کی طرف دیکھا۔

''میں نہیں چاہتی کہ ایک ایسا خواب اس کی آرزو بن جائے' جس کی تعبیر اس کے اختیار میں نہ ہو۔''

''خواب ضرور دیکھنا چاہیے سونیا بی بی! اور تعبیر مقدر پر چھوڑ دینی چاہیے۔''

عبید مُسکرائے۔

''اور اب تم اُس چھوٹے سے دماغ پر زیادہ زور نہ ڈالو۔'' باصر نے اُس کا سر پکڑ کر ہلایا۔

''یہ میرا پرابلم ہے اور اسے میں ہی حل کر لوں گا۔ ناؤ پلیز چینج دی ٹاپک۔ (اب مہربانی کر کے موضوع بدل دو)''

سویرا نے ہاتھ اُونچا کرتے ہوئے کہا۔

''میں بہت بور ہو گئی ہوں۔''

''تو آپ کی بوریت دور کرنے کے لئے کیا کیا جائے خاتون؟''

باصر نے شوخی سے پوچھا تو مدحت نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہی پُرانا شوخ لہجہ۔

تو کیا باصر نے اس حقیقت کو قبول کر لیا ہے کہ میں اور تبریز۔ اور وہ مطمئن بھی ہو گیا ہے' مگر میرے لئے اب بھی کتنا مشکل ہے یہ سب پتا نہیں کیوں باصر کا تصور ذہن سے نکلتا ہی نہیں تھا۔

''میاں تم نے اپنے مہمانوں کو گاؤں دکھایا؟'' ڈاکٹر شاہ محمد نے پوچھا۔

''نہیں تو۔''

''تو پھر انہیں گاؤں دکھالاؤ' بوریت دور ہو جائے گی۔''

''چلیں گے آپ لوگ؟'' باصر نے سب سے پوچھا۔

''کیوں نہیں' ضرور''؟ سویرا نے اشتیاق سے پوچھا۔

''مجھے گاؤں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے آج تک کوئی گاؤں نہیں دیکھا۔''

''مگر اس میں دیکھنے والی کیا چیز ہے' اُونچی نیچی گلیاں ہیں' چھوٹے چھوٹے مکانات ہیں۔'' سونیا نے

''نہر دکھالاؤ' کھیت دیکھ لینا۔'' ڈاکٹر شاہ محمد نے کہا۔

''آپ بھی چلیں ڈاکٹر۔''

''نہیں بھئی' میں ذرا میاں جی کے پاس بیٹھوں گا' دو تین دن ہو گئے اُن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کچھ تشنگی سی محسوس ہو رہی ہے۔ کچھ دن میاں جی سے نہ ملوں تو یوں لگتا ہے' جیسے کچھ کھو سا گیا ہے۔ زندگی میں کچھ کمی سی ہو گئی ہے۔''

ڈاکٹر شاہ محمد اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''انشاء اللہ کھانے پر ملاقات ہو گی۔''

''ڈاکٹر صاحب! آپ اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔؟''

''نہیں'' وہ مُسکرائے۔

''میرا تعلق فیصل آباد سے ہے' بس ایک دن یونہی گھومتے گھماتے اِدھر آیا اور بس اِدھر ہی ڈیرا ڈال لیا۔ میاں جی نے باندھ لیا۔ اس گاؤں کی ہواؤں نے اسیر کر لیا۔ مٹی نے زنجیریں ڈال دیں۔''

''اور آپ کا خاندان آپ کے ماں باپ' بہن بھائی' بیوی بچے۔''

سویرا نے حیرت سے پوچھا۔

''ہم بھول گئے ہر بات۔''

ڈاکٹر شاہ محمد گنگنائے۔

''آپ جب سے یہاں آئے پھر مُڑ کر نہیں گئے۔''؟

''نہیں''

''کتنا عرصہ ہو گیا آپ کو اِدھر آئے ہوئے؟''

''یہی کوئی اٹھارہ برس۔ ارے میاں کس چکر میں پڑ گئے ہو' جاؤ گھوم پھر آؤ' پھر دھوپ تیز ہو جائے گی تو مشکل ہو جائے گی۔''

عبید حیرت سے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ جوتے پہن کر ہاتھ ہلاتے ہوئے باہر چلے گئے۔

''یہ ڈاکٹر شاہ محمد۔'' عبید نے اُن کے جانے کے بعد سوالیہ نظروں سے باصر کی طرف دیکھا۔

''مجھے کچھ زیادہ معلوم نہیں ان کے متعلق' ایک بار میاں جی نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر شاہ محمد ایک دن اُن کے پاس آئے تھے۔ میاں جی کے کسی جاننے والے کے ساتھ اور پھر مُڑ کر واپس نہیں گئے۔ یہاں ہی رہ گئے۔''

''حیرت ہے۔'' عبید نے تبصرہ کیا۔

''اس طرح گھر بار چھوڑنا آسان تو نہیں ہوتا۔ یقیناً کوئی پس منظر ضرور ہو گا۔''

''شاید''۔ باصر نے جواب دیا۔

''شادی وادی بھی نہیں کی۔'' نویرا نے پوچھا۔

''ہاں وہاں فیصل آباد میں شاید بیوی بچے ہوں لیکن کبھی ذکر نہیں کیا۔''

باصر نے بتایا۔

''بہت خوش مزاج آدمی ہیں۔ میں نے انہیں کبھی پریشان یا اُداس نہیں دیکھا۔''

''مگر انہیں اپنا گھر' ماں باپ' بہن بھائی یاد تو آتے ہوں گے۔'' سویرا نے پوچھا۔

''ظاہر ہے لیکن اظہار کبھی نہیں کیا۔''

باصر نے سویرا کی طرف دیکھا۔

''اور اب تم لوگ چلو پھر واقعی دھوپ تیز ہو جائے گی۔''

باصر کے ساتھ ہی سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

سویرا' نویرا بہت دلچسپی سے گاؤں کے گھروں اور گلیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اُونچی نیچی کبھی یک دم ڈھلان آ جاتی اور کبھی اُونچائی۔ تین چار گھروں کے بعد پھر فاصلہ آ جاتا۔ باصر اور مدحت اِردگرد کے گھروں کے متعلق بتاتے جا رہے تھے۔

''یہ رجو کا گھر ہے۔''

''یہ فاطمہ کا۔''

وہ گاؤں سے نکل کر نہر کی طرف آ گئے۔

باصر نے اُنہیں وہ زمین دکھائی جو میاں جی نے ہسپتال بنوانے کے لئے باصر کے نام کر دی تھی۔

''اردگرد کا ماحول تو بہت خوبصورت ہے۔ سبزہ' کھیت اور کھلی فضا جس میں کسی بھی طرح کی کوئی آلودگی نہیں ہے۔''

عبید نے تبصرہ کیا۔

''یار باصر! تم یہاں ہسپتال ضرور بنوانا۔ میں اگر کبھی بیمار پڑا' تو میں اس خوبصورت ماحول میں تمہارے ہسپتال میں ایڈمٹ ہونا پسند کروں گا۔''

''خدا نہ کرے' آپ بیمار ہوں۔''

سونیا کے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

عبید نے چونکتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا

سونیا نے نگاہیں جُھکا لیں۔ اُس کے رخساروں پر سُرخی دوڑ گئی تھی اور وہ نگاہیں جھکائے جھینپی سی نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کچل رہی تھی۔

عبید کے ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ آ گئی۔

اور یہ لڑکیاں کتنی جلدی جذباتی رشتے قائم کر لیتی ہیں۔ ممی نے مجھے اس کے متعلق سوچنے ... اور شاید مسز مراد نے بھی اسی طرح کی کوئی بات اس سے کہی ہوگی' تب تو۔ مگر میں۔۔۔ پتا نہیں کیوں میں ابھی اس کے متعلق اس طرح نہیں سوچ سکا ہوں۔ نہ جانے کیوں یہ سادا سی دلکش لڑکی مدحت۔ میرے تصور میں آتی ہے' جس کے متعلق مجھے سوچنے کا کوئی حق نہیں ہے اور وہ شاندار شخصیت کا مالک' کم گو تبریز مراد علی ... ڈیزرو کرتا ہے اور یہ لڑکی سونیا ممکن ہے۔ زندگی کے سفر میں یہی میری رفیق ہو' یا پھر جو بھی لڑکی میری رفیق ...

چاہے وہ کتنی ہی خوبصورت۔

کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں۔

یہ مدحت شیراز ضرور مجھے کبھی نہ کبھی ڈسٹرب کرتی رہے گی' شاید اس لئے کہ میں نے ایک ... لڑکی کا تصور کیا تھا۔

سادا دل۔

دلکش۔

مخلص اور محبت کرنے والی۔

''ڈاکٹر نویرا! ہاؤس جاب کرنے کے بعد اگر ممکن ہو سکے تو میرے اس ہسپتال میں کچھ وقت ضرور ...ے گا۔''

باصر نویرا سے کہہ رہا تھا۔

عبید اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ہاں بھئی' میں باصر کی سفارش کر رہا ہوں پیشگی۔''

''ارے وہ کاکا جی''!

مدحت نے سامنے سے آتے ہوئے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کون بزرگوار ہیں؟''

عبید' جو نویرا سے مخاطب تھے مدحت سے پوچھنے لگے۔

''یہ کاکا سائیں ہیں۔'' سے مدحت نے بتایا۔

''گاؤں کے لوگ کہتے ہیں مجذوب ہیں' جو مُنہ سے نکل جائے' سچ ہوتا ہے۔ رات رات بھر گاؤں کی گلیوں میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور پھر جہاں جگہ مل جائے' وہیں پڑ کر سو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی میاں جی کے مہمان خانے میں بھی ٹھہر جاتے ہیں۔''

''کیا واقعی مجذوب ہیں۔۔؟''

''پتا نہیں' میاں جی نے بتایا تھا تیرہ چودہ سال کی عمر میں چھت سے گرے تھے' سر پر شدید چوٹ آئی ... سے دماغی توازن خراب ہو گیا۔ گاؤں کے لوگوں کے عقیدے بھی تو بس ایسے ہی ہوتے ہیں' سب انہیں ... اب سمجھنے لگے ہیں۔ دُعائیں کروانے کے لئے اُن کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ جواب میں یہ گالیاں دیتے ... اسے بھی یہ لوگ اعزاز سمجھ لیتے ہیں۔'' باصر نے تفصیل سے بتایا۔

''میرا خیال ہے' اب واپس چلیں۔''

سونیا شاید تھک گئی تھی۔

''ہاں چلتے ہیں۔''

باصر نے اُس کی تائید کی۔

کاکا سائیں وہیں رُک کر آنکھوں پر ہاتھوں کا چھجا بنا کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ جب وہ اُس کے پاس سے گزرے تب بھی وہ اسی طرح ہاتھوں کا چھجا بنائے انہیں دیکھتا رہا۔

''سلام سائیں جی۔''

باصر نے اُسے سلام کیا' لیکن اُس نے جواب نہیں دیا۔ یونہی آنکھوں پر ہاتھ رکھے انہیں دیکھتا رہا۔

... سہم کر مدحت کے قریب ہو گئی۔

''ڈرو نہیں' یہ کچھ کہتا نہیں ہے۔'' مدحت نے اُسے تسلی دی۔

لیکن اس کی آنکھیں کتنی سرخ ہیں۔''

''ہاں سوتا بہت کم ہے' مسلسل جاگنے سے اس کی آنکھیں سرخ رہنے لگی ہیں۔''

مدحت نے بات کرتے کرتے مُڑ کر پیچھے دیکھا۔ کاکا سائیں ہولے ہولے کچھ بڑبڑاتا ہوا اُن کے ... رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اُس کی آواز اُونچی ہوتی گئی۔ وہ میاں محمد بخش کی سیف الملوک کے اشعار پڑھ رہا

جھوٹے یار دی یاری انج جیوں رکھ کھجور دا اے
دُھپ لگے تے چھاں نہ لبھے بھک لگے تے پھل دور اے

(جھوٹے دوست کی دوستی اس طرح ہے' جیسے کھجور کا درخت' دھوپ ہو تو چھاؤں نہیں دیتا
لگے تو پھل دور ہوتا ہے)

راستے میں باصر کو جاننے والا جو بھی ملتا' گھر چل کر چائے لسی پینے کی دعوت ضرور دیتا۔
عبید گاؤں کے لوگوں کے اس خلوص سے بے حد متاثر ہو رہے تھے۔
کا کا سائیں بدستور اُن کے پیچھے تھا۔ وہ رُکتے تو وہ بھی رُک جاتے' چلتے تو ساتھ ہی چل پڑتا
اُس کی لے بدل گئی تھی اور آواز مزید اُونچی ہو گئی تھی۔
''مان نہ کیجئے' روپ گھنے دا وارث کون حسن دا۔

سدا نہ رہن شاخاں ہریاں سدا نہ پھُل چمن دا
روپ کا مان نہ کرو ' حُسن کا کوئی وارث نہیں
ہوتا ہمیشہ شاخیں سبز نہیں رہتی اور نہ
ہی پھول ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔)

کا کا سائیں زیادہ تر خاموش رہتے ہیں۔
مدحت نے بتایا
''بس کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے تو یوں ہی گلیوں میں اُونچی آواز میں گاتے پھرتے ہیں' اور چپ
ہوتے ہیں تو ہفتوں کسی سے بات نہیں کرتے۔''
''اُن کے والدین نے کسی دماغی امراض کے ماہر کو نہیں دکھایا تھا۔'' نویرا نے پوچھا۔
''پتا نہیں؟ مدحت نے کہا۔ گاؤں کے لوگ بھلا کہاں اتنا تردد کرتے ہیں۔''
میاں جی کے گھر کے بڑے سے گیٹ تک پہنچ کر کا کا سائیں واپس پلٹ پڑا۔ اُس کی زبان
بھی وہی بول تھے۔

ع سدا نہ موج جوانی والی۔

''ویسے آواز میں بڑا سوز ہے۔''
سویرا نے گیٹ کو کھولتے ہوئے کہا۔
''ہاں' مگر یہ ایک ہی چیز نہیں گاتے۔ ذہنی رو بھٹکتی رہتی ہے۔''
مدحت نے اُس کے پیچھے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔
صحن کے بیچوں بیچ تبریز کھڑا تھا۔
''ارے تبریز بھائی آپ اخیریت۔'' سونیا نے بے قراری سے پوچھا۔
''پاپا اور ماما تو ٹھیک ہیں؟''
''ہاں۔''
''اور آپ کو تو کراچی جانا تھا۔''
باصر نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔
ہاں' پھر پروگرام رہ گیا ہے۔ دراصل میرے ایک دوست آ گئے تھے۔ پشاور سے خان

انہیں اِدھر آنا تھا۔ آگے سید پور میں چوہدری برکت علی سے ملنے جانا تھا۔ انہیں اِدھر کے راستوں کی خبر نہیں تھی۔
سو میں ساتھ چلا آیا۔ یہاں سے گذرنا تو تھا ہی' سوچا میاں جی سے ملتا چلوں۔'' تبریز نے تفصیل بتائی۔
مدحت' سونیا' سویرا' نویرا اندر والے کمرے میں چلی گئیں' عبید اور باصر' تبریز کے ساتھ بڑے
کمرے میں چلے آئے۔ جہاں داؤد خان بیٹھا ہوا تھا۔
''یہ داؤد خان ہیں۔''
تبریز نے تعارف کروایا۔
باصر کو وہ شخص کچھ اچھا نہیں لگا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں' جن سے مکاری اور خباثت جھلکتی تھی۔
قدرے تنگ پیشانی سُرخ و سپید رنگت چھوٹا سا دہانہ عمر میں وہ تبریز سے کافی بڑا تھا۔
''پتا نہیں بھائی کی دوستی کیسے کیسے لوگوں سے ہو گئی ہے۔''۔ باصر نے سوچا۔
''یہ پروفیسر عبید وہاب ہیں۔''
تبریز عبید کا تعارف کروا رہا تھا کہ مہراں ٹرے میں جگ اور گلاس لئے آئی۔
''کھانا ابھی لگ جاتا ہے' اتنے میں آپ یہ ٹھنڈا پئیں۔''
وہ ٹرے میز پر رکھ کر سیدھی ہوئی تو داؤد خان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''مہرافروز تم یہاں۔؟''
مہراں کا رنگ یکدم زرد ہوا' پھر سفید پڑ گیا۔
اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ وہ ایک لخت تیزی سے مُڑی اور میاں جی کو پکارا۔
''میاں جی۔ !'' اور اس کے ساتھ ہی وہ چکرا کر زمین پر گر پڑی۔ عبید اور باصر بے اختیار اُس کی
طرف بڑھے' لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆☆

دروازے پر مسلسل بیل ہو رہی تھی' رتن گھبرا کر بیڈ سے اُتر آئی۔ کمرے سے باہر آ کر اُس نے
چاروں طرف دیکھا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا' ریتا اپنی موسیقی کی کلاس لینے گئی ہوئی تھی۔ آن اسکول اور ممی ابھی ابھی
باسکٹ لے کر سبزی وغیرہ لینے گئی تھیں' ابھی تو وہ مارکیٹ تک بھی نہیں پہنچی ہوں گی' بھلا اتنی جلدی کیسے واپس آ
سکتی ہیں۔ پھر۔ پھر کون ہو سکتا ہے۔ اس وقت۔
بیل پھر ہوئی تو وہ اُچھل پڑی۔
ڈرتے ڈرتے دروازے تک آئی۔
''کون۔۔؟''
ذرا سا دروازہ کھول کر اُس نے باہر جھانکا۔ باہر ایک برقع پوش خاتون کھڑی تھیں۔ اُسے دیکھتے ہی
بولنے لگیں۔
''بی بی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ خاوند بیمار ہے۔''
اُس نے ایک فریم آگے کیا۔ جس پر غالباً یہی کہانی لکھی تھی۔
''معاف کریں بی بی۔''
ریتو نے فوراً دروازہ بند کر لیا۔
''توبہ ہے۔''

پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے وہ وہیں باہر بیٹھ گئی۔"
میں تو ڈر سی گئی تھی۔ حالانکہ گھر میں کیسا ڈر۔ اور میں اتنی ڈرپوک اور بزدل ہوں' یقین نہیں آتا میں نے اتنا بڑا اقدم کیسے اُٹھالیا۔
اور اُس روز کیفی بھی تو پوچھ رہا تھا۔
"آپ اتنی نازک اور کمزور دل لڑکی ہیں' آپ سے بھلا کہاں جاب ہو سکے گی۔"
"لیکن جاب تو مجھے کرنی ہی ہے۔ مجھے ان لوگوں پر بوجھ نہیں بننا' اور یہ کیفی پتا نہیں کچھ عجیب کیوں لگتا ہے۔
اور ریٹا اس سے محبت کرتی ہے۔
شدید محبت۔
کیفی کی تین بہنیں ہیں۔ دو بڑی ایک چھوٹی کیفی کو ان کی شادیاں کرنا ہیں۔ اس لئے ریٹا موسیقی کی کلاس کے بعد جاب کرتی ہے۔ تاکہ پیسہ اکٹھا ہو سکے' اور ممی کہتی ہیں۔
"ریٹا کتنا بھی SACRI FICE (ایثار) کرلے یہ کیفی اُس سے شادی نہیں بنائے گا کبھی نہیں۔"
اور ریٹا کیسے بھاگم بھاگ گھر آتی ہے' جلدی جلدی دو لقمے لیتی ہے اور پھر جاب کے لئے نکل جاتی ہے۔
ویسے کیفی اچھا ہے' لیکن پتا نہیں کیوں کچھ پُراسرار سا لگتا ہے۔"
اُس نے چارپائی پر پڑی ہوئی ممی کی چیزیں اکٹھی کر کے باسکٹ میں ڈال دیں۔
"پتا نہیں مجھے جاب کب ملے گی۔ کیفی کوشش تو کر رہا ہے۔ پتا نہیں جان واپس آئے گا تو کیا کرے شاید علیحدگی ہو جائے۔ اور اگر ایسا ہوا تو پھر میرا یہاں رہنا مناسب بھی ہوگا۔ یا نہیں۔ مجھے جان کے آنے سے پہلے ہی جاب کر لینی چاہئے۔ میں آج ریٹا سے کہوں گی' کہ اگر کیفی سے بات ہو تو میری جاب کی بات کرے۔"
بیل پھر بج اُٹھی۔
"لگتا ہے' وہ عورت پھر آ گئی ہے۔"
وہ پاؤں میں چپل ڈالتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔
"بھئی۔ کہا تو ہے' معاف کرو' گھر کے مالک گھر میں نہیں ہیں۔" اُس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ مگر باہر کیفی کھڑا تھا۔
"اوہ آپ!" وہ شرمندہ سی ہو گئی۔
"میں سمجھی' مانگنے والی ہے۔"
"بھکاری تو ہم بھی ہیں۔
کیفی نے آہستگی سے کہا۔
"جی۔!" اُس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔
"اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیا۔"
"نہیں نہیں۔ آپ آئیں۔ پلیز لیکن وہ ممی گھر نہیں ہیں۔"
"کیوں ممی کدھر ہیں؟"
کیفی نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔
"وہ ذرا مارکیٹ تک گئی ہیں' سبزی وغیرہ لینے۔" "یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ فرینکلی بات چیت کر لیں گے۔"

کیفی وہیں باہر ہی کُرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تو رتن کماری نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔
"بیٹھیں نا آپ بھی۔"
"جی۔!" وہ اُس کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔
"لیزا! میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کسی دن تم سے تمہارے متعلق تفصیل سے پوچھوں گا۔"
وہ یکدم آپ سے تم پر اُتر آیا تھا۔
"ریٹا نے آپ کو نہیں بتایا؟" رتن نے پوچھا۔
"ہاں' لیکن میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے ریٹا کی بات پر یقین نہیں آیا۔ جان ایسا تو نہیں ہے کہ اُس کے لئے کوئی گھر بار چھوڑ دے۔"
"نہیں۔ میں نے جان کے لئے گھر تو نہیں چھوڑا۔"
رتن کی آواز بھرا گئی۔
"بس پتا نہیں کہاں سے میرے من میں یہ خیال سما گیا تھا کہ ہمارا دھرم سچا نہیں ہے۔ بس سچے دھرم کی تلاش مجھے یہاں تک لے آئی ہے۔"
"لیزا! تم عجیب سی لڑکی ہو۔"
لیزا نے کوئی جواب نہیں دیا' لیکن اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اس نے پلکیں جھپک کر ان کو باہر نکلنے سے روکا۔ "میں یہاں تک آ تو گئی ہوں لیکن میرے من کی بے چینی ختم نہیں ہوتی۔ ریٹا کہتی تھی آپ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے۔
آپ کی باتیں سُن کر ریٹا کے من میں بھی شک کے کانٹے اُگ آئے۔ پر ریٹا کو اس سے دلچسپی نہیں آپ۔۔ آپ مجھے اپنے مذہب کے متعلق کچھ بتائیں۔"
"میں۔۔!" کیفی نے اپنی طرف اشارہ کیا۔
وہ اس لئے تو یہاں نہیں آیا تھا کہ اُسے مذہب کا درس دے' اُسے پتا تھا کہ ریٹا اور آن اس وقت گھر نہیں ہوں گی' وہ اور ممی ہوں گی۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر گپ شپ لگائے گا۔ اُسے بتائے گا کہ وہ اُس کی جاب کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ اور
"ہاں آپ!" رتن نے اُسے خاموش دیکھ کر کہا۔
"مجھے کچھ بتائیں پلیز۔"
"ہمارا مذہب تو محبت ہے لیزا بی بی!
وہ ذرا سا مُسکرایا۔
"اور ہم عالمگیر انسانیت کی بات کرتے ہیں۔
ہمارا کوئی مذہب نہیں ہے' ہم تو اپنے دل میں سب کے لئے درد رکھتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں۔ سب سے چاہے وہ کسی بھی مذہب سے متعلق ہو' اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور تھوڑا سا جھکا۔
"اور تمہارے لئے۔"
تب ہی دروازہ کھلا اور ممی باسکٹ اُٹھائے اندر داخل ہوئیں۔
"دروازہ بند نہیں کیا تم نے لیزا۔ ارے یہ تو کراچی ہے کراچی۔" انہوں نے باسکٹ وہیں دروازے کے پاس ہی رکھ دی۔

''وہ ممی! رتن ایک دم کھڑی ہوگئی۔'' میں نے تو دروازہ بند کرلیا تھا۔ یہ ابھی کیفی صاحب آ گئے
''اچھا۔ اچھا' پر احتیاط کیا کرو۔''
وہ جھک کر باسکٹ اُٹھانے لگیں تو لیزا نے آگے بڑھ کر باسکٹ اُٹھالی۔
گوشت' سبزی' پھل وغیرہ فرج میں رکھ دو۔''
''جی!''
''اور ہاں یہ تم نے کیفی کو چائے وائے پلایا۔''
''نو ممی۔!''
''نہیں ممی! بس میں اب چلوں گا۔ میں صرف لیزا کو یہ بتانے آیا تھا کہ شام کو ذرا تیار ر
اسے منظر صاحب سے ملانے لے چلوں گا۔ انہوں نے جاب کا وعدہ کیا ہے۔''
رتن نے مڑ کر اُسے حیرت سے دیکھا۔ ''ہاں لیزا! میں چار بجے تک آؤں گا۔''
''کیا یہ آپ کے وہی دوست ہیں جن کا آپ نے ذکر کیا تھا۔''
''نہیں بھئی۔ وہ تو آج کل باہر گیا ہوا ہے' اور تمہیں جاب کی جلدی ہے' اس لئے ان صا
بات کی تھی۔''
کیفی کھڑا ہوگیا۔
''ارے چھوکرا لوگ بیٹھو۔ مجھ کو تم سے بات کرنا ہے۔''
''جی کہیے۔''
''بیٹھو! بیٹھو اور لیزا! تم سامان رکھ کر چائے بنالینا۔''
''جی ممی۔!'' وہ کچن میں چلی گئی' تو کیفی نے کھڑے کھڑے ممی کی طرف سوالیہ نظروں سے د
''ارے بیٹھو۔ کھڑے کھڑے کیا بات ہوگی۔''
کیفی بے دلی سے بیٹھ گیا۔
''تم ریٹا سے محبت کرتا ہے۔؟''
''جی۔۔!'' کیفی نے بوکھلا کر کچن کی طرف دیکھا۔ لیکن رتن سامنے کہیں نہیں تھی۔
''تو پھر تم اُس سے شادی کیوں نہیں بناتا۔''
''وہ ممی۔!'' کیفی نے سنبھلتے ہوئے کہا۔
''کچھ مجبوریاں ہیں۔ ذمہ داریاں ہیں' مجھ پر کچھ اس لئے ابھی جلدی شادی نہیں کر سکتا
آپ کو بتایا نہیں۔
''نہیں۔ وہ ہم کو کچھ نہیں بتاتی۔ پر ہم جانتا ہے' کہ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔ وہ محبت
والی لڑکی ہے۔' ایسا لڑکی تم کو پھر کبھی نہیں ملے گا۔ ایسا ٹوٹ کر محبت کرنے والا۔''
جی ممی! میں جانتا ہوں اور اُس کی محبت کی قدر کرتا ہوں۔''
''تو پھر تم اُس کے ساتھ شادی بنالو۔ وہ تمہاری ذمہ داریاں بانٹ لے گی۔ وہ ایسا ہی لڑ
محبوب کے لئے مر جانے والی۔ مٹ جانے والی۔ ہم اُس کا نیچر کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ دیکھو
تم اُس کو دھوکا نہ دینا۔ وہ مر جائے گا۔''

''BELIEVE ME MUMY I LOVE HER''

(یقین کریں ممی! میں اُس سے محبت کرتا ہوں)
کیفی نے ممی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔
''اور ہم بہت جلد شادی کرلیں گے۔''
لیزا چائے بنا کر لے آئی۔
''تم نے یوں ہی تکلف کیا لیزا۔ مجھے جلدی تھی۔''
''کوئی بات نہیں۔ ایک کپ چائے سے کیا فرق پڑتا ہے۔
''لیزا نے چائے بنا کر ممی اور کیفی کو دی۔
''یہ کس طرح کی جاب ہوگی۔'' اُس نے پوچھا۔
''معلوم نہیں۔ یہ تو منظر صاحب سے مل کر ہی پتا چلے گا۔ دراصل اُن کے پاس فی الحال تو کوئی
نی ہے نہیں' میرے اصرار پر انہوں نے کہا تھا کہ اُن سے ملاقات کروادوں' وہ دیکھیں گے' تم سے بات
ت کر کے تمہارے لئے کون سا کام مناسب ہوگا۔ ان کی ایک ریڈی میڈ گارمنٹس کی فیکٹری ہے۔ اس کے
وہ بھی مختلف بزنس کرتے ہیں۔''
کیفی جلدی جلدی چائے پی کر کھڑا ہوگیا۔
''اچھا اب چلتا ہوں۔''
رتن اُسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔
کیفی نے ایک نظر اُسے دیکھا۔
آپ کو دیکھ کر اُس وقت ایک شعر ذہن میں آرہا ہے۔ مگر خیر پھر کبھی سہی۔''
وہ سر کو ہلکا سا خم کرتا ہوا چلا گیا۔ تو وہ دروازہ بند کر کے واپس چلی آئی۔
''یہ تم کو کیسا لگتا ہے لیزا۔؟''
ممی نے اُس سے پوچھا۔
''مجھے۔؟''
''ہاں!'' ممی نے سوچتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا۔
''پتا نہیں۔ میں تو زیادہ نہیں جانتی' پر ریٹا بہت تعریف کرتی ہے۔'' رتن نے ممی کی طرف دیکھتے
ئے جواب دیا۔
''ہاں ریٹا تو اس سے محبت کرتی ہے' اور محبت میں تو سب اچھا ہی اچھا لگتا ہے' پر پتا نہیں کیوں ہمارا
ل اس کو قبول نہیں کرتا' ہمارا دل بولتا ہے کہ یہ ریٹا کو دھوکا دے گا۔''

O☆O

نہیں ممی! ریٹا کوئی بے وقوف تو نہیں ہے۔ اور وہ ہم سے زیادہ کیفی کو جانتی ہے' آپ پریشان نہ کریں۔ GOD (خدا) اُس کی ہیلپ کرے گا۔"

"تم بہت معصوم ہے لیزا! تمہارا دل بہت شفاف ہے۔ اُس پر کوئی مٹی دھول نہیں پڑا ہے' ہم تم کو کہتا ہے۔ لیزا تم جاب واب نہ کرو۔ جان کے پاس بڑا پیسہ ہے' بڑا دولت ہے اُس کے پاس' تم کو جاب کی ضرورت ہے۔ تم جان کو بولو۔ تم اُس کا وائف ہے' اُس کو جکڑ لو۔ اپنا بنالو۔ ایسے اسیر کرلو کہ پھر وہ کہیں نہ جا سکے۔

رتن سر جھکائے سنتی رہی۔ وہ ممی کو کیسے سمجھاتی کہ جان کا اور اُس کا بندھن محض عارضی ہے' وہ اُسے حاصل کرنا چاہتا تھا' اور وہ' اُس نے جان کو محض ایک سنگِ میل سمجھا تھا۔ اُن کے درمیان محبت کا کوئی رشتہ ہی نہیں' پھر وہ کیسے اُسے اسیر کرتی' کیسے روکتی۔

"ایک دو بے بی ہو جائے تو پھر مرد پھنس جاتا ہے۔ اٹک جاتا ہے۔"

ممی نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ لیزا چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔

"ریٹا کو بولنا۔ آج جاب پر نہ جائے تمہارے ساتھ کیفی کے پاس چلی جائے۔ اُس میں بڑا اعتمادی ہے' وہ اُس آدمی سے تمہاری جاب کے بارے میں خود بھی بات کرلے گی۔ وہ آدمی کو پہچانتی ہے کیفی کو نہیں سمجھتی ہے' محبت نے اُس کا آنکھیں بند کر دی ہیں۔"

"ہاں یہ صحیح ہے۔"

رتن نے سوچا۔

اس طرح اکیلے کیفی کے ساتھ جانا کتنا مشکل تھا۔ پتا نہیں کیوں عجیب سا ڈر' عجیب سا خوف اُس کے اندر بیٹھ گیا تھا۔ اور وہاں جب وہ اپنے گھر میں رہتی تھی تو ذرا بھی نہیں ڈرتی تھی۔ کبھی کبھی جب اُسے کنوینس نہیں ملتی تھی' تو وہ بڑے اطمینان سے ونو' اجیت یا سلیمان سے لفٹ لے لیتی تھی' انکل رابرٹ کے گھر چلی جاتی تھی۔

مسز مہتہ کے اُس بلڈاگ مہندر کپور کے ساتھ تو وہ ایک بار پکنک پر بھی چلی گئی تھی۔ یوں ہی شرارت شرارت میں اور اُس نے وہاں اُسے کتنا بیوقوف بنایا تھا۔ اور بعد میں بھابھو اور دیپو کو ہنس ہنس کر اس شرارت کے متعلق بتایا تھا۔ مگر اب پتا نہیں کیوں اُس کے اندر کا سارا اعتماد' سارا حوصلہ جیسے ڈھے سا گیا تھا۔ وہ دروازے سے باہر تک جاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ حالانکہ ریٹا نے اُسے کتنی بار کہا تھا کہ وہ ممی کے ساتھ اُن کے ساتھ باہر آیا جایا کرے' راستوں کی پہچان کرے۔ مگر اُسے ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔

"تم تو بہت ہی ڈل ہو۔"

ریٹا کو حیرت ہوئی۔

"یقین نہیں آتا کہ تم گریجویشن کر رہی تھی سہمی ہوئی ہرنی۔"

ریٹا زور سے ہنستی۔

"ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج۔"

اور وہ واقعی ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج تھی۔ اور بھٹک رہی تھی۔ پتا نہیں کب تک۔ پتا نہیں کب تک یوں ہی بھٹکتی رہوں گی۔

وہ ریٹا کے آنے تک ممی کے ساتھ کچن میں مصروف رہی۔ سبزی کاٹ دی۔ برتن دھو دیئے' ممی مسلسل بولتی رہی تھیں لیکن اُس کا دھیان نہیں تھا۔ وہ صرف ہوں ہاں کرتی رہی تھی۔ ریٹا صحیح کہتی تھی کہ ممی کے پاس کرنے کو بہت باتیں ہیں۔ وہ سارا دن کوئی نہ کوئی قصہ سناتی رہتی تھیں۔

اس وقت بھی سلاد بناتے ہوئے وہ کسی مسٹر ابراہیم کا قصہ سنا رہی تھیں۔ جب ریٹا حسبِ معمول شور مچاتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔

ہیلو ممی! ہیلو لیزا' دن کیسے گذرا؟"

"فائن۔!" ممی! نے سلاد کی پلیٹ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بڑی خوشبو ہے۔ کیا پکا ہے۔؟"

"قیمہ اور شملہ مرچ۔" ممی نے بتایا۔

"تم منہ ہاتھ دھو کر آجاؤ۔"

"آن آگئی۔؟"

"نہیں۔" لیزا نے کہا۔

"تم اِدھر ہو کچن میں۔ تم نے سالن بنایا۔" ریٹا نے کچن میں جھانکا۔

"نہیں۔۔" وہ شرمندہ سی ہوگئی۔

کھانا تو ممی نے ہی بنایا ہے۔ میں تو بس یوں ہی ممی کی ہیلپ کر رہی تھی۔"

" یہ بھی بہت ہے۔ ڈیرا فٹافٹ ایک پلیٹ میں تھوڑا سا قیمہ ڈال دو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

"ریٹا۔ بے بی کبھی دو منٹ آرام سے بیٹھ کر کھانا کھا لیا کرو۔ شکل دیکھا ہے اپنی۔"

"ممی! آپ کو پتا ہے مجھے دو بجے اپنے آفس پہنچنا ہے' اور میرے پاس صرف پچیس منٹ ہوتے ہیں۔"

"تم نے یہ مصیبت کیوں سر پر لے لیا ہے بے بی! جاب کرنا ہے تو اِدھر "گھنشیام ہاؤس" جانا چھوڑ دو۔"

"ممی! وہ میرا شوق ہے اور یہ۔۔"

اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر لیزا کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

''اور یہ بھی میرا شوق ہے۔ ممی!''

''اور تمہاری طرح لیزا کو بھی شوق ہوا ہے سروس کرنے کا' آج وہ آیا تھا کیفی۔''

''کیفی''

ریٹا جاتے جاتے پلٹ پڑی۔ اُس کی آنکھیں یکدم چمکنے لگی تھی۔ اور سانولی رنگت دمک اُٹھی تھی

''کیوں آیا تھا وہ؟ کیا کہا تھا اُس نے آپ سے''

''وہ لیزا سے کہنے آیا تھا کہ شام کو جاب کے سلسلے میں کسی سے ملنا ہے۔ تیار رہے۔''

''اوہ!'' اس نے ہونٹ سکیڑے' میرے متعلق کچھ کہا تھا اُس نے؟ پوچھا تھا؟''

''نہیں کوئی خاص نہیں۔''

''کیسی جاب ہے؟''

''پتا نہیں'' ممی نے غور سے اُسے دیکھا۔

''بے بی! تم آج اپنے آفس سے چھٹی کرلو اور لیزا کے ساتھ چلی جانا۔ یہ اکیلے کیفی کے کیسے جائے گا۔''

''اوہ ممی! آپ یونہی ڈرتی ہیں۔ اسے جانے دیں اکیلا پھر کیفی ہوگا نا اس کے ساتھ' اکیلی تھوڑی گی۔ جب جاب کرے گی تو ظاہر ہے اکیلے ہی جانا ہوگا۔''

''بے بی ریٹا! تم میری بات نہیں سمجھتا۔''

''میں سب سمجھتی ہوں ممی!''

ریٹا نے ہنس کر ممی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔'' ہی از اے ویری نائس مین (وہ بہت اچھا ہے) اور ممی۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔؟

''یہ مرد لوگ کا محبت ایسا ہی ہوتا ہے۔ ناقابل اعتبار۔''

ممی نے اُس کی بانہیں گلے سے نکالتے ہوئے کچن میں دیکھا۔ رتن کچن سے باہر چلی گئی تھی اپنے کمرے میں۔

''لیزا بڑا خوبصورت لڑکی ہے اور کیفی۔''

''اوہ ممی! تم یونہی ڈرتی ہو' مجھے کیفی پر مکمل اعتماد ہے۔'' ریٹا نے اُن کے رخسار کو چوم لیا۔

''پر بے بی! ہم جانتا ہے۔ مرد لوگ کا محبت۔'' یہ پھسل جاتا ہے۔ برف کی ڈلی کی طرح' اور لیزا تو بڑا معصوم ہے۔''

''لگتا ہے ممی! آپ کو کسی مرد نے دھوکا دیا ہے۔ اتنی بے اعتباری کیوں ہے آپ کو؟'' ریٹا نے شرارت سے پوچھا۔

''اوہ ناٹی گرل (شرارتی لڑکی)''

''نہیں ممی! آج آپ بتائیں کہ کیا آپ نے بھی کسی سے محبت کی؟''

ریٹا ایک طرف کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ کچن کے ایک کونے میں ایک چھوٹی میز اور چار کرسیاں تھیں۔ سردیوں میں تینوں یہاں ہی کھانا کھا لیتی تھیں۔

''تمہیں دیر ہو رہا ہے۔ بے بی! یہ لیزا کدھر کو چلی گئی ہے۔ بُلاؤ اُسے۔ کھانا کھالو۔''

ممی مُڑ کر ڈونگے میں سالن نکالنے لگیں

''ممی!'' ریٹا کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔ ''بتاؤ نا ممی آپ نے محبت کی؟''

''تمہاری ممی کا دل بہت بڑا ہے۔ ریٹا اُس نے سب سے ہی محبت کیا ہے۔''

ممی نے ہاٹ پاٹ اُٹھا کر ٹیبل پر رکھا۔

''تم کھانا شروع کرو' میں لیزا کو بلاؤں۔''

ممی نگاہیں چُرا کر باہر نکل گئیں۔ تو وہ زور سے ہنس پڑی۔

''اوہ سویٹ ممی! میں جانتی ہوں کہ تم نے ضرور محبت میں دھوکا کھایا ہے۔ لیکن میرا کیفی ایسا نہیں۔ وہ تو حساس دل رکھنے والا شاعر ہے۔ خوبصورت شاعر' جو محبت کرنا' جانتا ہے' جسے پتا ہے کہ دل توڑنا گناہ محبت عبادت ہے۔ محبت حُسن ہے' اور جو مجھ سے محبت کرتا ہے' سچی اور کھری محبت جس میں کوئی کھوٹ والی ریا کوئی دھوکا نہیں ہے۔ اور پتا نہیں وہ کون تھا' جس نے ممی کا دل توڑا۔ ممی کو دھوکا دیا۔ اور ممی اپنی ینگ ایج (نوجوانی) میں بہت خوبصورت رہی ہوں گی۔ اور پتا نہیں وہ شخص انہیں چھوڑ کر کیوں چلا گیا ہوگا۔''

اُس نے پلیٹ میں قیمہ نکالا۔

آج وہ ضرور لیٹ ہو جائے گی۔ اور اُس کا باس بڑا سخت تھا۔ کوئی ریزن تو سنتا ہی نہیں تھا۔ اَب تو ہاتھ دھونے کا وقت بھی نہیں تھا۔ اُس نے جلدی جلدی دو تین لقمے لیے اور کچن سے باہر نکل آئی۔ ممی لیزا کے ساتھ آ رہی تھیں۔

''میں جا رہی ہوں ممی بائے۔''

''کھانا تو کھا لیتیں' پھر میں نے تم سے کہا تھا بے بی کہ تم آج چھٹی کرلو۔ لیزا بہت گھبرا رہی ہے۔''؟

ریٹا نے سر اُٹھا کر لیزا کی طرف دیکھا۔ اُس کے گیلے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ چہرا بھی گیلا گیلا تھا۔ ہونٹ بے حد سُرخ ہو رہے تھے۔ لمبی پلکیں۔

''ممی صحیح کہتی ہیں۔ لیزا میں بہت کشش ہے۔''

اُس نے سوچا۔

''کیفی نے کب آنا ہے۔''؟

اُس نے پوچھا۔

''چار بجے تک آنے کو کہا تھا اُنہوں نے۔'' رتن نے بتایا۔

''تو ٹھیک ہے' میں چار بجے سے پہلے آ جاؤں گی۔ باس سے چھٹی لے لوں گی۔ دو گھنٹے پہلے۔''

''تھینک یو ریٹا! تم بہت اچھی ہو!'' رتن نے احسان مندی کے جذبے سے مغلوب ہو کر کہا۔ ریٹا جواباً مسکرا دی۔

''تمہیں کیا خبر لیزا ڈیر! کہ یہ اچھائی میری اپنی ذات کے لئے ہے۔ ابھی ابھی کچھ دیر پہلے میں کیفی کے لئے بہت پُر اعتماد تھی۔ لیکن ابھی تمہاری ان لانبی پلکوں والی گیلی آنکھوں کو دیکھتے دیکھتے میرے اندر خوف کے کانٹے سے اُگ آئے ہیں۔ مجھے تمہاری معصومیت اور دلکشی سے ڈر لگنے لگا ہے کہ کہیں۔ اوہ نانسنس' کیفی ایسا نہیں ہے۔ اور محبت اتنی کمزور بھی نہیں ہوتی کہ۔''

اُس نے سر کو ہولے سے جھٹکا اور ممی کی طرف دیکھا۔'' بائے!''

''بائے پھر ضرور آ جانا۔'' ممی نے تاکید کی۔ اور وہ سر ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

باس کا موڈ بہت خراب تھا۔ ایک بار تو ریٹا نے سوچا بھی کہ وہ چھٹی نہ لے۔ مگر پھر وہ جو
کانٹا سا اُس کے دل میں چھپا تھا۔ وہ تکلیف دینے لگا۔
''کیا خبر' کیا پتا کیفی۔
نہیں لیزا کو اُس کے ساتھ اکیلا نہیں جانا چاہئے۔'' اُس نے فیصلہ کُن انداز میں سوچا
بجے باس کے آفس میں پہنچ گئی۔
''سر! آج مجھے جلدی گھر جانا ہے۔''
''کیوں؟'' باس تقریباً دھاڑا تھا۔
''وہ سر! بہت ضروری کام ہے۔'' ریٹا نے سہم کر کہا۔
''اچھا ٹھیک ہے جائیں۔''
''جی تھینک یو سر سو نائس۔''
''سنیں۔'' وہ جانے کے لئے پلٹی تو باس نے قدرے نرم آواز میں کہا۔
''جی!''
''کیفی کے ساتھ گھومنے جانا ہوگا۔''
''نو۔ نو سر!'' ریٹا نے بوکھلا کر اُسے دیکھا۔ یہ جاب اُسے کیفی نے ہی دلائی تھی۔
''کبھی ہمارے ساتھ بھی گھومنے چلیں۔ کیفی کیا ہے۔ پھٹیچر سا شاعر۔''
''شٹ اَپ۔''
باس کا سارا رعب ودبدبہ لمحہ بھر میں ختم ہوگیا تھا۔
''میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔''
اُس نے غصے سے باس کی طرف دیکھا۔ اور زور سے دروازہ بند کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔
''ممی صحیح کہتی ہیں یہ مرد۔''
سارا رستہ وہ کھولتی رہی مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اور کیفی کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں
کتنے دنوں بعد اُس نے کیفی کو دیکھا تھا۔ جاب کرنے سے پہلے تو وہ تقریباً ہر روز ہی ملتے تھے۔ مگر اب
گذر جاتے تھے۔
''کیسے ہو کیفی؟'' وہ بے تابی سے اُس کی طرف بڑھی۔
''اچھا ہوں۔'' کیفی نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔
''ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ممی نے بتایا تھا کہ تم بھی ساتھ چلوگی۔''
''ہاں! تم لیزا کو کہاں جاب دلوا رہے ہو۔''
''ابھی تو کچھ پتا نہیں ہے۔ وہ منظر صاحب ہیں۔ نا' فلاور گارمنٹس والے۔ اُس سے
تھی۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ لیزا کو اُن سے ملوادوں' پھر وہ دیکھیں گے۔''
''کیسے آدمی ہیں؟'' ریٹا نے پوچھا۔
''اچھے ہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔''
''میری جاب کے لئے بھی اُن سے بات کرنا۔''
''کیوں اس جاب میں کوئی برائی ہے۔''

''مجھے اپنا باس اچھا نہیں لگا۔
''کیوں؟''
کیفی نے پوچھا تو اُس نے آج کی بات بتادی۔
''میں بات کروں گا اُس سے اور بتا دوں گا کہ تمہارا مقام میری نظر میں کیا ہے۔ آئندہ وہ تم سے
ایسی بات نہیں کرے گا۔''
''تھینک یو کیفی''
ریٹا نے محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔
''لیزا تیار نہیں ہوئی کیا؟''
''وہ تو تیار ہی ہے۔ اندر ہے شاید آنٹی کے پاس۔''
''اور تم اکیلے بیٹھے ہو؟''
''نہیں ممی تھیں۔ ابھی وہ پڑوس میں فون سُننے گئی ہیں۔''
''لیزا۔ لیزا! کم آن!''
ریٹا نے وہیں سے ہی اُسے پکارا۔
کالے بارڈر والی سوتی ساڑھی میں وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ ریٹا نے ستائشی نظروں سے اُسے دیکھا۔
''بہت پیاری لگ رہی ہو۔''
لیزا شرما گئی۔
''چلو بھئی۔!'' کیفی کھڑا ہوگیا۔
''منظر صاحب نے چار بجے کا وقت دیا تھا۔''
''گاڑی ہے۔'' ریٹا نے پوچھا۔
''ہاں اُدھر پیچھے پارک کی ہے۔ ایک دوست سے مانگ کر لایا ہوں۔''
''یہ اچھا کیا تم نے اَب ایسا ہے کہ تم دو منٹ رکو میں ذرا منہ ہاتھ دھو کر اور بال بنا کر آتی ہوں۔''
''ہر روپ میں اچھی لگتی ہو ریٹا!''
کیفی نے سرگوشی کی تو ریٹا مغرور سی ہوگئی۔ ''یوں ہی ڈر گئی تھی میں۔ بھلا کیفی میرے ہوتے ہوئے
کسی اور کو اس نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ لیزا خوبصورت سہی۔ لیکن وہ اُس سے محبت تو نہیں کرتا نا' اور اصل چیز تو
محبت ہوتی ہے۔ اور پھر وہ جانتا ہے۔ اچھی طرح سے کہ وہ جان کی بیوی ہے۔''
''پلیز دو منٹ۔!'' اور پھر اُس نے واقعی دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگائے تھے۔
اُس کے آتے ہی کیفی اُٹھ کھڑا ہوا۔ رتن گھبرائی گھبرائی سی تھی۔
''تم ڈر رہی ہو؟''
ریٹا نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔
''ابھی تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نہ آتی تو۔''
''نہیں۔ بس یونہی ذرا گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔
پتا نہیں منظر صاحب کیسے آدمی ہوں گے۔ پتا نہیں وہ مجھے جاب دیں گے بھی یا نہیں۔''
''جاب کی تم فکر نہ کرو۔ ویکنسی نہ بھی ہوئی تو تمہارے لئے وہ پیدا کرلیں گے۔ تمہیں تو وہ انکار

کر ہی نہیں سکتے۔"

"کیوں؟" اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ریتو نے پوچھا۔

"تم اتنی پیاری سی تو ہو۔"

"کیا وہ ایسے آدمی ہیں۔ میرا مطلب ہے۔ اچھے آدمی نہیں ہیں۔"

"بابا۔!" ریٹا ہنسی۔

"باہر کی دنیا میں تو ہر طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ بس آدمی کو خود مضبوط ہونا چاہئے۔ دیکھو لیزا۔ تم نے جاب کرنی ہے تو پھر خود کو مضبوط بنالو۔ اپنے اندر اعتماد پیدا کرو۔ ڈری سہمی لڑکیوں کے لئے تو باہر کی ایک جال ہے۔ جس میں پھنس جاتی ہیں وہ۔" لیزا نے سر ہلا دیا۔

وہ دل ہی دل میں خوفزدہ سی تھی۔ ریٹا کیفی کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھی نہ جانے ہولے ہولے باتیں کر رہی تھی۔ لیکن اُس کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔ ریٹا نے دو ایک بار مڑ کر اُسے دیکھا بھی لیکن پھر اُسے سوچ میں کھویا دیکھ کر کیفی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

پتا نہیں منظر صاحب کیسے آدمی ہوں گے۔ اور ممی بھی تو کہتی ہیں کہ میں بہت معصوم ہوں اور باہر دنیا بہت غلیظ ہے۔

خدا کرے منظر صاحب نہ ملیں۔

اُس نے دل ہی دل میں دُعا کی۔ "کم از کم آج نہ ملیں۔" پتا نہیں کیوں ایک دم ہی اُس کا حو ڈھے گیا تھا۔ ایک دو روز بعد سہی۔ تب تک' تک تک شاید میرے اندر ہمت پیدا ہو جائے۔"

منظر صاحب گھر پر نہیں تھے۔

"صاحب تو اسلام آباد گئے ہیں۔"

نوکر نے بتایا تو اُس نے سکون کا سانس لیا۔

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ تم نے ٹائم لیا ہے اُس سے" ریٹا نے پوچھا۔

"یار! عجیب بھلکڑ آدمی ہیں' مجھے ٹائم دے کر خود اسلام آباد چلے گئے۔"

کیفی بڑبڑایا۔ اور لیزا کی طرف دیکھا۔

"اَب کیا پروگرام ہے واپس چلیں۔"

گاڑی تو ہے نا تمہارے پاس۔ کہیں گھمانے لے چلیں' جب سے لیزا آئی ہے۔ ہم اُس کہیں کر ہی نہیں گئے۔ وہ جان کا بچہ خود نیو یارک جا کر بیٹھ گیا ہے۔"

ریٹا نے تجویز پیش کی۔

"کہاں چلیں۔ کلفٹن؟" کیفی نے پوچھا۔

"کیوں لیزا؟"

ریٹا نے لیزا کی طرف دیکھا۔

"کہیں نہیں۔"

"کہیں نہ کہیں تو جانا ہی ہے"۔

"تو۔ تو پھر؟"

لیزا نے جھجکتے ہوئے کیفی کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں کہو"

"وہ۔ وہ جو پروفیسر صاحب تھے۔ مسز شیر دل کے ہاں میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں۔ میرا ذہن اُلجھ گیا ہے اُن کی باتیں اکثر میرے ذہن میں گونجتی رہتی ہیں۔ مگر میں اُن کا مفہوم نہیں سمجھ پاتی۔ تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔"

"پروفیسر احسان فتح پوری"۔

کیفی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"جی لیکن کیا وہ ہم سے ملنا پسند کریں گے۔ کیا وہ میرے ذہن کی اُلجھی گتھیاں سُلجھا دیں گے۔؟"

"وہ اُن کا دروازہ ہر وقت ہر ایک کے لئے کھلا رہتا ہے۔ علم کے پیاسے ہمیشہ اُنہیں گھیرے رکھتے ہیں۔"

"کس قدر بور لڑکی ہو تم لیزا! سمندر پر جاتے اور کہیں کسی اچھی جگہ کھانا کھاتے بہت دنوں سے میں نے کیفی کے ساتھ باہر کھانا نہیں کھایا۔"

"ریٹا!" کیفی کے لہجے میں شفقت اور خلوص تھا۔

"پھر کسی دن باہر کھانا کھالیں گے۔ آج لیزا کو پروفیسر صاحب سے ملوالاتے ہیں۔ یہ اُلجھی ہوئی ہے۔ اَپ سیٹ ہے۔ ممکن ہے پروفیسر صاحب اس کی ہیلپ کر سکیں۔ ممکن ہے وہ تشنگی جو اسے محسوس ہوتی ہے۔ ختم ہو جائے۔ ریٹا ہمیں اُس کی مدد کرنا چاہئے۔"

لیزا نے تشکر نظروں سے کیفی کی طرف دیکھا۔ یہ کیفی تو بہت اچھا آدمی ہے۔ ممی یونہی اس کے متعلق بدگمان رہتی ہیں۔

"لیزا! مجھ سے جو ممکن ہو سکا۔ میں تمہارے لئے کروں گا یہاں کراچی میں بہت بڑے بڑے عالم اور فاضل لوگ ہیں۔ میں تمہیں اور لوگوں سے بھی ملواؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ جلد ہی تم اس الجھاؤ سے باہر نکل آؤ گی۔"

"تھینک یو۔!" لیزا کی آواز بھرا گئی۔ "میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ میں نے یہ اتنا لمبا سفر اس لئے نہیں کیا کہ سب رائیگاں چلا جائے' میں کچھ حاصل کرنا چاہتی ہوں' کچھ جاننا چاہتی ہوں۔"

"پریشان نہ ہو لیزا۔" ریٹا نے اُسے تسلی دی۔ "ڈھونڈنے سے تو سب کچھ مل جاتا ہے۔"

"پتا نہیں۔" لیزا نے آہستگی سے کہا۔

"یار! کیفی ہے نا تمہاری مدد کرنے کو۔ بس اَب پریشان ہونا چھوڑ دو۔"

لیزا نے سر ہلا دیا۔ اُس دوران کیفی کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ کبھی کبھار وہ عقب نما آئینے میں اُسے دیکھ لیتا۔

ریٹا بہت مطمئن تھی اور خوش سی ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔

"تھوڑی اونچا گاؤ ہم بھی تو تمہاری سُریلی آواز سے مستفیض ہوں۔"

کیفی نے ریٹا سے کہا تو اُس نے آواز قدرے بلند کرلی۔ اُس کی آواز میں قدرے سوز تھا۔ ؏

دل تمہارے لئے جاناں

لیزا ابھی دھیان سے سُننے لگی۔ اتنے دن ہو گئے تھے اُسے یہاں آئے ہوئے۔ وہ اکثر صبح ہی صبح اُٹھ کر ریاض کرتی تھی۔ لیکن لیزا نے کبھی اتنا دھیان سے اُسے نہیں سُنا تھا۔

"تمہارے آواز تو بہت خوبصورت ہے۔ ریٹا۔"

اُس نے بے اختیار تعریف کی۔ ریٹا یونہی گنگناتی رہی۔ ؏

ہجر کی مسافت میں دل تمہارے بن جاناں

لیزا آنکھیں بند کیئے سُن رہی تھی۔ کبھی اُسے بہت شوق ہوتا تھا۔ موسیقی کا' کتنی ڈھیروں
تھیں اُس کے پاس' اُس کے کمرے میں دن بھر ٹیپ چلتی رہتی تھی۔ بھابھو اکثر چڑتی تھیں۔
''کبھی تمہارے کمرے میں تو آنے کا فائدہ ہی نہیں ہوتا۔ تم سے بات کرنے کا مزا ہی نہیں
اور وہ ہنس کر ٹیپ بند کر دیتی تھی۔ اور وکی کتنا مست ہوتا تھا گانے سُن کر جھومنے لگتا تھا۔
''اوہ وکی! پتا نہیں وہ مجھے یاد کرتا ہوگا۔۔ ڈھونڈتا ہوگا۔ شاید وہ میرے لیئے اُداس ہوتا ہو
بھابھو سے پوچھتا ہو کہ۔ ریتو کہاں ہے۔ وہ آ کیوں نہیں جاتی۔''
وکی I Love You (میں تم سے محبت کرتی ہوں) اَب بھی۔ آئی لو یو مائی سن۔''
''لیکن میں نے تم سب کو چھوڑ دیا ہے تم سب کو جن سے میں محبت کرتی تھی۔ ایک نامعلو
منزل کی خواہش میں۔''
''لیجئے جناب!'' کیفی نے بریک لگاتے ہوئے کہا۔ تو وہ چونک پڑی آپ کی منزل آ گئی۔
''میری منزل۔ کاش یہاں سے ہی مجھے منزل کے نشان مل جائیں۔''
''کچھ تو پتا چلے' کچھ تو خبر ملے۔''
وہ کیفی کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھیں۔
''گھر تو بہت خوبصورت ہے۔''
ریٹا چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔
''تو تم کیا سمجھ رہی تھیں۔ پروفیسر صاحب کسی جھونپڑی میں رہتے ہوں گے۔ خاندانی رئیس
کیفی نے بتایا۔
گیٹ پر کوئی چوکیدار وغیرہ نہیں تھا۔ کیفی سیدھا اندر چلا گیا۔ ایک کمرے میں پروفیسر صاحب
تھے۔ اور اُن کے پاس تین چار اور افراد بھی موجود تھے۔ فرشی نشست تھی۔ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔
شور سے گفتگو جاری تھی۔
''آیئے آیئے جناب جاذب کیفی صاحب آج آپ کیسے راستہ بھول پڑے؟''
''بس جناب آپ کی کشش کھینچ لائی۔
کیفی نے آگے بڑھ کر ادب سے ہاتھ ملایا۔
''خواتین بھی ہیں تمہارے ساتھ۔ میاں تو کیا کھڑے کھڑے آئے ہو یا بیٹھو گے بھی۔''
''سر! یہ لیزا اور ریٹا ہیں۔ اُس روز شیر دل صاحب کے ہاں آپ سے متعارف کروایا تھا
''اوہ ہاں۔'' انہوں نے سر ہلایا۔
''یہ لیزا آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہیں۔ کچھ جاننا چاہتی ہیں۔'' اُس روز آپ کی گفتگو
ہوئی تھیں۔ اُلجھی ہوئی ہیں کچھ۔''
''میاں میں کیا اور میری گفتگو کیا۔ بولنے کا مرض ہے مجھے۔ بولتا رہتا ہوں۔ بیٹھو بی بی۔''
بات کرتے کرتے وہ لیزا کی طرف متوجہ ہو گئے۔
''سر! لیزا نے ملتجی نظروں سے اُنہیں دیکھا۔
''ایک منٹ خاتون! میں ابھی آرام سے آپ کی بات سنتا ہوں۔ آپ تشریف رکھیں۔''
ریٹا اور لیزا ایک طرف بیٹھ گئیں۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ زندگی جس مادّی دلدل میں دھنس چکی ہے اُس سے نجات کیسے حاصل ہو۔
حقیقت کو جوڑا گیا منجمد مخفی اور مدفون کیا گیا متعلق و مرتکز کیا گیا اُسے آزادی کیسے نصیب ہو۔ اگر موجودات
سب نمونے فانی غیر حقیقی اور ناقابل اعتماد ہیں۔''
لیزا نے کوشش کی کہ وہ پروفیسر صاحب کی باتوں کو سمجھ سکے۔ شاید کہیں سے اُسے بھی کوئی منزل کا سرا
مل جائے۔ لیکن اُن کی باتوں کا مفہوم اُس پر واضح نہ ہو سکا۔ اُن کا لیکچر سُنتے سُنتے اُس کا دھیان پھر پیچھے کی طرف
گیا تھا۔
چند ماہ صرف چند ماہ پہلے اچانک ہی اُس کے ذہن میں یہ خیال سما گیا تھا۔ کہ اُس کا مذہب صحیح نہیں ہے۔
کاش یہ خیال اُس کے ذہن میں نہ آتا اور اگر آیا ہی تھا تو وہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیتی۔
کیا پتا ماں جی اور بھابھو سچ کہتی ہوں۔
میرے دماغ میں شیطان سما گیا ہو۔
جس نے مجھے گھر سے بے گھر کر دیا۔
سب کو جُدا کر دیا مجھ سے۔
وہ سوچتی رہی' ارد گرد سے بے خبر ہو کر اُسے پتا ہی نہ چلا کہ کب پروفیسر صاحب کا لیکچر ختم ہوا اور
لوگ اُٹھ کر چلے گئے۔ وہ تو اُس وقت چونکی جب پروفیسر صاحب اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔
''ہاں تو بی بی! کیا مسئلہ ہے۔ کہاں اُلجھ گئی ہو؟''
''سر!'' وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُن کے سامنے دوزانو بیٹھ گئی۔
''سر!''
اُس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔ ''میں نے ایک طویل سفر کیا ہے۔ طویل ذہنی سفر۔ سچ کی تلاش میں اپنا
چھوڑ کر عیسائیت میں پناہ لی۔
لیکن وہ بے چینی وہ اضطراب جو ایک دن اچانک دل میں پیدا ہوا تھا۔ اب بھی یونہی ہے۔ وہ یقین
چھن گیا ہے سر۔ جب بے یقین ہی رہنا تھا تو پھر یہاں تک کیوں آئی ہوں۔ کبھی دل چاہتا ہے واپس
اور کبھی دل چاہتا ہے چلتی جاؤں۔ چلتی جاؤں۔ یہاں تک کہ یقین کو پالوں۔ اُس روز آپ یقین' ایمان'
کی باتیں کر رہے تھے مجھے بتائیں۔ مجھے بتائیں پلیز یہ یقین کہاں سے ملے گا۔ کیسے حاصل ہوگا۔''
اُس کی آواز بھرا گئی اور آنسو پلکوں کا بند توڑ کر رخساروں پر پھسل آئے۔
''بی بی! یقین کسی کے دلانے سے نہیں آتا۔ ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔ یہ تو خود بخود دل میں پیدا ہوتا
اس میں کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ دل خود بخود گواہی دیتا ہے کہ یہ ہے۔ ہمارا ایمان اور یقین یہ ہے
کائنات کا خالق و مالک اللہ ہے' باقی سب نظر کا دھوکا ہے۔ اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ دیکھے بغیر ایمان لایا
آسمانی کتابوں پر پیغمبروں پر اور روز حساب پر کیسا بھی عقیدہ ہو یقین تو لازمی ہے بی بی!
شک تو عدم اعتماد ہے اور بے اعتمادی زندگی کے منافی ہے۔''
''اور میرے اندر شک کے کانٹے اُگے ہوئے ہیں۔ یہ لمبے لمبے کانٹے جو ہر آن مجھے چبھتے رہتے
تکلیف دیتے رہتے ہیں۔ میرا یقین کہیں نہیں ٹھہرتا۔ جب میں وہاں تھی تو مجھے انکل رابرٹ کی ہر بات سچ
لگی۔ مجھے لگتا تھا جیسے سکون یہاں ہی ہے۔ اسی مذہب کے دامن میں لیکن میں اب بھی بے سکون ہوں۔ خدا
۔ اس کائنات کا راز کیا ہے۔ یہ اتنے مذاہب کیوں ہیں۔ صرف ایک ہی مذہب کیوں نہیں جو سچا اور حقیقی

مذہب ہے۔ سب مذاہب میں خدا کا تصور موجود ہے۔ پھر سب کا خدا جُدا جُدا کیوں ہے۔ آپ کے پاس علم ہے آپ میرے دل سے شک کے یہ کانٹے نکال دیں۔ میرے ہاتھ میں یقین کی ڈور پکڑا دیں۔"

"میں تو بہت معمولی آدمی ہوں۔ بی بی اور میرا علم بھی بڑا محدود ہے۔ پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں تمہیں مطمئن کر سکوں۔"

"یقین کا ایک ننھا سا سرا میرے ہاتھ میں آ جائے تو پھر میں اُس سرے کو تھام کر آگے ہی آ بڑھتی جاؤں گی۔ میں پیچھے پلٹنے کے لئے نہیں آئی تھی۔ لیکن مجھے آگے کا راستہ نہیں مل رہا۔ آپ را نشاندہی کر دیں' منزل میں خود تلاش کر لوں گی۔"

اُس نے رخساروں پر پھسل آنے والے آنسوؤں کو ہاتھوں کی پُشت سے پونچھا۔ پروفیسر اح غور سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

"خدا کیا ہے۔؟

میں نے شاید اُس روز اُس پہلی ملاقات میں بھی کہا تھا کہ خدا کی عظمت کا ادراک شعور کو نہیں ہو ہزاروں برس تک لوگ بلی کو پوجتے رہے پھر کسی نے سورج کو دیوتا کہہ دیا۔ کسی نے درخت کی پوجا شروع کر کسی نے پتھر اور مٹی کے خدا بنا لیے۔ قدیم یہودیوں نے انتہائے احترام میں خدا کا نام لینے سے بھی اح اور لارڈ کا لفظ اللہ کے لئے وضع کر لیا۔ جتنے اللہ کے نام ہیں صفاتی ہیں۔ حالانکہ وہ بھی خاصے محدود ہیں۔ شعورِ انسانی کی رسائی محدود ہے۔"

پروفیسر احسان فتح پوری بول رہے تھے اور اُس کے اندر ادراک و آگہی کے در وا ہو رہے تھے ہے' کوئی ہے۔ اُس کا دل گواہی دے رہا تھا۔ سب سے بلند۔

سب سے ماروا۔

جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا۔ بنایا۔

دل کی گواہی سب سے زیادہ معتبر ہے۔

حواسِ خمسہ پر بھروسا بے کار ہے۔

پروفیسر احسان فتح پوری کہہ رہے تھے۔ اُس نے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرا اوپر اُٹھایا۔

"سر! کیا میں۔ میں بھی مسلمان ہو سکتی ہوں۔"

"جو بھی یہ تسلیم کرے کہ اس کائنات کا خالق و مالک اللہ ہے۔ وہ مسلم ہے۔ تسلیم کی کیفیت سے ہی ایمانی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ اور اس بات کو کہ اس کائنات کا خالق و مالک اللہ ہے' اُس نے اُس تسلیم کیا تھا جب اُسے کچھ خبر نہ تھی۔ جب اچانک ہی ایک دن اُس کے اندر حق کی طلب جاگ اُٹھی تھی۔ گوپی کے داؤجی نے اُسے بتا دیا تھا کہ کائنات کا مالک تو ایک ہی ہے۔ باقی سب اُس کے روپ ہیں۔"

"میں۔ میں اسے تسلیم کرتی ہوں کہ کائنات کا خالق و مالک اللہ ہے۔ بلکہ بہت پہلے میں تسلیم کر لیا تھا۔ مگر پھر جیسے اندھیرا ہو جاتا تھا۔ راستہ بند ہو جاتا تھا۔"

"بی بی!" پروفیسر احسان فتح پوری مُسکرائے۔

"کچھ دن پہلے آپ کسی اور مذہب کی پیرو تھیں۔ وہ مذہب جو آپ کے ماں باپ کا' بہن تھا۔ آپ کے آباؤاجداد کا تھا۔ پھر آپ کے دل نے اس کی نفی کی اور آپ نے بغیر سوچے سمجھے ایک ا دامن تھام لیا۔ اور اس کے لئے آپ کو بہت کچھ چھوڑنا پڑا۔ لیکن اطمینان پھر بھی آپ کو نہ ملا۔ اب آ

مذہب کی پناہ میں آ رہی ہیں۔ اور اس کے لئے پھر آپ کو کچھ چھوڑنا پڑے گا۔"

اُس نے لب کھولے۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔ بتانا چاہتی تھی کہ اُسے جان کو چھوڑتے ہوئے کوئی دُکھ نہیں ہوگا۔

کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

لہولہان تو وہ پہلے ہوئی تھی۔

اُن سب کو چھوڑتے ہوئے۔

جن سے اُس کے ناتے بڑے گہرے اور بڑے مضبوط تھے۔ اور وہ رشتے ٹوٹنے کے باوجود نہیں ٹوٹے تھے۔ مگر اُس نے اپنے ہونٹ بند کر لئے اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتی رہی

"فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرو بی بی! دیکھو سمجھو پرکھو۔ پہلے کچھ جان لو۔ پھر فیصلہ کرنا۔ وہ فیصلہ زیادہ مضبوط ہوگا۔ پہلے یقین حاصل کر لو۔ ابھی تمہارا یقین مکمل نہیں ہے۔ ابھی تو محض تمہیں حقیقت کا ایک رنگ دکھائی دیا ہے۔ جلدی نہ کرو بی بی۔"

"ہاں یہ صحیح ہے۔" لیزا نے سوچا۔ پہلے بھی تو میں نے جلدی کی تھی۔ مگر کیا کرتی۔ میرے اندر تو جیسے آگ لگی تھی۔ اور بجھتی ہی نہیں تھی۔ انکل رابرٹ کی باتوں سے یوں لگتا تھا جیسے وہ آگ ٹھنڈی پڑ گئی ہو۔ مگر یہاں آ کر پھر وہ آگ بھڑک اُٹھی تھی۔

"اور میاں کیفی!" پروفیسر احسان کھڑے ہو گئے۔ "مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی لیزا بی بی کو یہاں لے آیا کرو۔ یہاں بڑے بڑے عالم آتے ہیں۔

بی بی! تم اُن کو سُننا۔ سمجھنا۔"

وہ پھر لیزا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"جی!" لیزا نے سر ہلا دیا۔ ریٹا بہت بور ہوئی تھی لیکن لیزا پُرسکون تھی۔ خوش تھی۔ اُس نے کیفی سے درخواست کی تھی کہ جب بھی اُسے فرصت ہو تو وہ اُسے پروفیسر احسان سے ملوانے ضرور لایا کرے۔

مجھے تو معاف ہی رکھنا۔" ریٹا نے کہا۔ "میں تو سارا وقت دل ہی دل میں اپنے موسیقی کے اسباق دہراتی رہی تھی۔"

"ہاں' میں دیکھ رہا تھا۔ تم بہت بور ہو رہی تھیں۔ لیکن لیزا میرے ساتھ اکیلی تو نہیں آئے گی۔ اسے شاید میرا اعتبار نہیں ہے۔"

"نہیں نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" لیزا نے جلدی سے کہا۔

"کیفی میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اور مجھے اس پر بہت اعتماد ہے۔"

ریٹا نے بڑے یقین سے کہا۔

"اور لیزا ڈیئر فارگاڈ سیک۔ اب تم آئندہ مجھے نہ آزمانا۔ وہ بور باتیں سُنتا ہیلیو می۔ میرے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اگر تمہیں کیفی سے ڈر لگتا ہے تو ممی کو ساتھ لے آنا۔"

"نہیں۔ نہیں' تو بھلا ڈر کیا؟"

لیزا نے کہا تو کیفی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ڈاؤد خان کہتا تھا۔

غزنوی دے سر لاردے۔"

(پہاڑ یقیناً بلند ہے لیکن راستہ اس کے اوپر سے بھی گذرتا ہے)

شرط صرف یہ ہے کہ آدمی صبر اور ہمت سے کام لے اور جلد بازی نہ کرے۔

اور واقعی چند دن بعد جب وہ لیزا سے ملنے گیا تو لیزا بغیر کسی جھجک کے اُس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ وہ اُسے لے کر پروفیسر احسان کے پاس آیا تھا۔ پروفیسر احسان نے بڑے خلوص اور گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ اُسوقت وہ کہیں باہر جا رہے تھے لیکن انہوں نے اُسے کچھ وقت دیا۔ اُس کے کچھ سوالوں کے جواب بہت شفقت و محبت سے دیے۔ کیفی نے اُس سے کوئی خاص بات نہیں کی تھی۔ پروفیسر احسان سے ملوا کر وہ اُسے گھر چھوڑ گیا تھا۔ ممی نے کھوجتی نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

''جلدی آ گئی ہو؟''

''پروفیسر صاحب کو کہیں جانا تھا۔''

''ناحق اپنے آپ کو اُلجھاتی ہو۔ لیزا ہم تم کو بولتا ہے تم فادر کے پاس چلو۔ وہ تمہارے ذہن کا سارا جالا اُتار دے گا۔''

''نو ممی! پروفیسر احسان بہت بڑے عالم ہیں اور اُن کے پاس بہت علم ہے۔''

''اچھا جیسا تمہارا مرضی اور یہ کیفی نے کیا کہا تھا۔''

''کچھ نہیں ممی کوئی بات ہی نہیں کی۔''

''اچھا۔!'' ممی مطمئن ہو گئیں۔

اور پھر اُس کے بعد بھی وہ دو تین بار کیفی کے ساتھ گئی اور ہر بار اسے یوں لگتا تھا جیسے اُس نے سب کچھ جان لیا ہے۔ بس اَب اُسے صرف فیصلہ کرنا ہے اور آگے راستے آسان ہی آسان ہوں گے۔ لیکن ہر بار کچھ دنوں بعد اُسے یوں لگتا جیسے اُس نے کچھ نہیں جانا ابھی تو ایک الف کا نقطہ ہی نہیں سمجھ پائی۔ پھر وہی اضطراب' پھر وہی بے چینی اُسے گھیر لیتی۔ پاگلوں کی طرح وہ اندر باہر چکراتی پھرتی۔ ممی سے باتیں کرتی۔ ریٹا نے گیت سُنتی۔

آن کے پاس جا کر بیٹھتی اور ننھے ننھے بچوں کی دلچسپ باتوں میں خود کو گم کر دیتی لیکن اضطراب یونہی باقی رہتا۔ کیفی بہت دنوں سے نہیں آیا تھا۔ اور وہ بہت بے چین تھی۔ بہت سے سوالوں کے بھنور اس اندر اُٹھ رہے تھے۔ اور ان سوالوں کے جواب صرف پروفیسر احسان ہی اُسے دے سکتے تھے۔

اُس نے ممی سے' ریٹا سے' آن سے سب سے ہی پوچھا تھا لیکن کسی کے پاس تسلی بخش جواب تھے۔ اور کیفی پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ اُس روز وہ بہت بے چین تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ آج ریٹا آئے گی اُس سے کہے گی کہ وہ اُسے پروفیسر صاحب کے گھر لے چلے' یا پھر آن سے درخواست کرے گی۔

اس وقت تو دونوں ہی گھر پر نہیں تھیں۔ اور ممی سو رہی تھیں۔ دو دن سے اُن کی طبیعت کچھ ناساز تھی باہر ہی کوریڈور میں اکیلی بیٹھی یوں ہی اخبار دیکھ رہی تھی۔ کہ کیفی آ گیا۔ وہ اُسے دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئی۔

''مجھے آپ کا بہت انتظار تھا۔ آپ آئے کیوں نہیں۔'' ع

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

کیفی نے مسکراتے ہوئے شعر پڑھا۔

''آج شام آپ مجھے لے چلیں گے پروفیسر صاحب کے پاس''

''ضرور لیکن اس وقت تو میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ میرا وہ دوست واپس آ گیا ہے۔ جس

نے آپ کی جاب کی بات کی تھی۔ نوکری پکی ہے۔ لیکن ایک بار ملنا تو ضروری ہے۔''

''اچھا۔!'' لیزا نے کہا اور ممی کو بتا کر اُس کے ساتھ چلی آئی۔

کیفی نے ایک جگہ گاڑی پارک کی۔

''آ جاؤ لیزا۔''

''کیا آپ کے دوست اُدھر رہتے ہیں۔؟''

''نہیں۔'' کیفی نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔

''یہ اس بلڈنگ میں تیسری منزل پر میرا فلیٹ ہے۔ چلو آج تمہیں اپنے غریب خانے کی سیر ہی کروا دوں۔ مجھے کچھ ضروری کاغذات لینے ہیں اِدھر سے۔''

''اچھا۔!'' لیزا اُس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ایک فلیٹ کے دروازے کے پاس رُک کر کیفی نے لاک کھولا۔

''آپ کے والدین اور بہنیں۔'' لیزا نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا''

''وہ سب تو ملتان ہوتے ہیں۔ میں اِدھر اکیلا رہتا ہوں۔'' کیفی نے بتایا۔

''آج پہلی بار تم میرے گھر آئی ہو کہو کیا خاطر کروں''

''کچھ نہیں'' لیزا مسکرائی۔ اَب وہ کیفی سے بلا جھجک گفتگو کر لیتی تھی۔

''میں نے آپ کے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے چائے پی تھی۔ ممی کے لئے بنائی تھی۔''

''پھر بھی میرا تو فرض ہے'' کیفی مسکرایا۔

تم بیٹھو اِدھر میں ابھی آتا ہوں۔''

لیزا نے ٹیبل پر پڑا ہوا میگزین اُٹھا لیا۔ اور پڑھنے لگی۔

کچھ دیر بعد کیفی کوک لے آیا۔ کوک پیتے ہوئے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ کیفی اُسے اپنے متعلق بتاتا رہا۔ کہ کب وہ کراچی آیا تھا۔ اور کب اُس نے یہ فلیٹ لیا تھا۔

''ریٹا آپ کی شاعری کی بہت تعریف کرتی ہے۔''

''بس یونہی کچھ کہہ لیتا ہوں۔'' کیفی نے انکساری ظاہر کی۔

''کوئی کتاب نہیں چھپی۔'' لیزا نے پوچھا۔

''حالات ہی ایسے نہ تھے۔ اَب پہلا مجموعہ ترتیب دیا ہے زیرِ طبع ہے۔''

کیفی نے اُسے اپنے کچھ اشعار سُنائے۔

شعر سُناتے سُناتے اچانک وہ اُٹھ کر اُس کے قریب آ بیٹھا۔

''لیزا۔! اُس کی آواز جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی تم بہت پیاری ہو۔ بہت دلکش۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کاش تم مجھے بہت پہلے ملی ہوتیں۔ جان کتنا خوش قسمت ہے کہ تم جیسی لڑکی اُسے ملی ہے۔''

''جی۔!'' لیزا نے حیرت سے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ اور تھوڑا سا پیچھے کھسک گئی۔

جان کو نیویارک گئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔''

تقریباً دو ماہ ہونے والے ہیں۔''

''تم اُسے مِس تو بہت کرتی ہو گی۔''

''نہیں۔ نہیں تو کوئی خاص نہیں۔''

''تم سے شادی کرنے کے ایک ہفتے بعد وہ چلا گیا۔ حالانکہ پہلے چھ مہینے تو۔''

کیفی اُس کے اور قریب ہو گیا۔

''خیر جان کے لئے تو شادی شدہ زندگی کا تجربہ نیا نہیں ہے لیکن تم'' اُس کی آنکھوں میں نہ جا
تھا کہ لیزا ایک دم خوبزدہ ہو گئی۔

''میرا خیال ہے کہ اَب چلیں۔ آپ اپنے دوست سے ملوا کر گھر پہنچا دیں مجھے، ممی کی طبیع
ٹھیک نہیں تھی۔''

''لیزا۔! کیفی نے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''تم نے کبھی غور کیا لیزا۔ یہ کائنات
تخلیق کا مقصد مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ آدمی نیچر سے نہیں لڑ سکتا
راستوں پر چل نکلی ہو۔ جان نہ سہی کوئی اور سہی۔''

وہ یکدم ہی ہاتھ چھڑا کر کھڑی ہو گئی۔

''لیزا۔ ڈرو نہیں۔ میں تو تمہیں۔''

''نہیں۔'' اُس نے قدرے پیچھے ہٹتے ہوئے کیفی کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ
تھیں۔ اور چہرا ابھی سرخ سُرخ لگ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے جان کا چہرا آ گیا۔ اُس روز جب
گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لے گیا تھا تو اُس کی آنکھیں بھی یوں ہی سُرخ ہو رہی تھیں۔ اور چہرا تپ رہا تھا

وہ خوف زدہ سی ہو کر دروازے کی طرف بڑھی۔ کیفی کھڑا ہو گیا۔

''رُکو لیزا کہاں جا رہی ہو۔ ڈرو مت۔''

اُس نے ایک نظر مُڑ کر کیفی کو دیکھا اور فلیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بھاگ کھڑی ہوئی۔

''لیزا، لیزا۔ا'' کیفی اُسے پکارتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ لیکن وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی
تھی۔ اور خوف سے اُس کا دل سینے کے اندر تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ نیچے سیڑھیوں سے کوئی اوپر آ رہا تھا
کا سانس پھول رہا تھا۔ آنے والے شخص کی طرف اُس نے امداد طلب نظروں سے دیکھا۔ اور چیخی۔

"PLEASE PLEASE HELP ME" پلیز۔ پلیز ہیلپ می۔ (مہربانی کرکے
کریں۔)

اوپر آنے والا ٹھٹک کر رُک گیا تھا۔

اُس نے مُڑ کر پیچھے دیکھا۔ کیفی اُس سے کچھ پیچھے کھڑا اُسے پکار رہا تھا۔ وہ سیدھی ہوئی، اور
اُترتے ہوئے اُس کا پاؤں رپٹ گیا۔

''لیزا۔ لیزا بیٹی۔!'' اوپر آنے والے نے بے اختیار بازو آگے بڑھایا اور وہ ''پاپا'' کہتے
بازوؤں میں جھول گئی۔

☆☆☆☆

''ڈاکٹر باصر!''

وحیدہ خانم نے ڈیوٹی روم کے دروازے میں کھڑے ہو کر آواز دی۔ باصر ابھی کچھ دیر پہلے
روم میں آیا تھا اور اب آنکھیں موندے کرسی پر جھول رہا تھا۔

''ڈاکٹر باصر!''

انہوں نے پھر آواز دی تو اُس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

''جی میڈم۔''

''پلیز دو منٹ کے لئے ذرا کمرے میں آؤ۔''

''مگر ابھی چند منٹ پہلے میں نے میڈم کا بلڈ پریشر چیک کیا ہے۔ نارمل ہے سب۔''

''تم آؤ تو بھئی۔'' وحیدہ خانم مُڑ گئیں۔

''جی۔'' وہ اُٹھ کر اُن کے پیچھے آ گیا۔

''ذرا یہ مووی لگا دو بھئی نہ جانے کیا گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ریورس ہی نہیں ہو رہی ہے۔''

باصر نے بُرا سا منہ بنایا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ اس کے فرائض میں شامل نہیں ہے۔ لیکن اُس نے
خوشی سے وحیدہ خانم کے ہاتھ سے کیسٹ لے لی۔

''یہ اچھی ہے نا؟''

''پتا نہیں جی۔''

وہ وی۔ سی۔ آر کی ٹریکنگ صحیح کرنے لگا۔

''بیٹھو نا تم بھی دیکھو۔''

میڈم ستارا نے کہا۔ ''نو میڈم تھینک یو۔ مجھے ابھی وارڈ میں جانا ہے۔'' باصر نے بہانہ بنایا۔

''بیٹھو بابا فلم دیکھو۔ وحیدہ! وہ سیب دو کاٹ کر ڈاکٹر کو کھانے کے لئے۔''

میڈم نے اسے روکا۔

''تھینک یو میڈم! میرا اس وقت جی نہیں چاہ رہا کچھ کھانے کو اور پھر وارڈ میں ایک دو سیریس مریض
انہیں ضروری دیکھنا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے پھر فارغ ہو کر آ جانا بچی بڑی اچھی فلم ہے۔ ہے نا وحیدہ۔''

''ہاں سچ۔''

وحیدہ خانم میڈم ستارا کے بیڈ پر ہی اچک کر بیٹھ گئیں۔ آج خلاف توقع اُن کے کمرے میں کوئی
تھا۔ کچھ دیر پہلے اُن کے سابقہ خاوند اپنی بچیوں سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ اسی بہانے میڈم کا بھی
ہو گیا تھا۔ باصر اُس وقت میڈم کے کمرے میں ہی تھا۔ کیسی ہیں آپ''

''تم کیسے ہو۔''

جیسے جملوں کا تبادلہ ہوا تھا پھر وہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر چلا گیا تھا۔ اور کچھ دیر کوریڈور میں کھڑے ہو
دونوں باپ بیٹی بات کرتے رہے تھے۔ پھر وہ چلا گیا تھا اور میڈم کی بیٹی بھی اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی تھی
سے اب تک میڈم کے کمرے میں خاموشی تھی۔ دونوں سہیلیاں خود ہی وقفے وقفے سے اُونچے اونچے
اور بچوں جیسی حرکتیں کرتی رہی تھیں۔

ڈاکٹرز روم کی طرح جاتے ہوئے اُسے ڈاکٹر بدر ملے۔

''میڈم ستارا چلی گئیں؟''

''نو سر۔''

باصر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی کیونکہ اب یہ ڈاکٹر بدر کا معمول بن گیا تھا کہ ہاسپٹل آتے ہی وہ
سے پہلا سوال یہی کرتے تھے اور پھر نفی میں جواب پا کر وہ مایوس ہو جاتے۔ ڈاکٹر باصر کے گاؤں جانے
سے ہی دن ڈاکٹر بدر نے میڈم ستارا سے کہہ دیا تھا کہ وہ اب بالکل ٹھیک ہیں لہٰذا گھر جا سکتی ہیں۔ لیکن

میڈم ستارا نے گھر جانے سے انکار کر دیا تھا۔

''جب میں خود اپنے آپ کو بہتر محسوس کروں گی چلی جاؤں گی۔''

وہ ڈاکٹر بدر کو جان بوجھ کر تنگ کر رہی تھیں۔

''آئندہ ہاسپٹل میں اس طرح کی خواتین کا داخلہ بند۔'' انہوں نے حکم دے دیا تھا۔

ایک بار میڈم ستارا چلی جائیں تو پھر دوبارہ انہیں ہرگز ایڈمٹ نہیں کرنا چاہیے۔ کتنی بھی کیوں نہ ہو۔

''کوئی ارادہ بھی نہیں جانے کا؟'' انہوں نے باصر سے پوچھا۔

''لگتا تو نہیں؟''

کیا کر رہی ہیں۔''

''فلم دیکھ رہی ہیں۔''

''اچھا! مایوس سا ہو کر ایک طرف چلے گئے تو باصر ڈاکٹرز روم کی طرف بڑھا ہی تھا کہ پیچھے حارث نے اُسے آواز دی۔

''باصر!'' اُس نے مڑ کر دیکھا۔

''تمہارا فون ہے گھر سے''

''اچھا!'' وہ پلٹ کر پڑا۔

دوسری طرف ماما تھیں۔

''باصر! آج شام ذرا جلدی گھر آ جانا۔''

''مگر ماما میری ڈیوٹی آٹھ بجے آف ہو گی۔''

''کوشش تو کرنا بیٹا!''

''کوئی خاص بات ہے کیا۔؟''

''ہوں!'' زینت مراد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''خاص ہی سمجھ لو۔''

''مثلاً!''

''گھر آ ؤ گے تو بتا دوں گی۔''

''اگر کوئی ایمرجنسی نہ ہوئی تو کوشش کروں گا جلدی آ جاؤں۔ لیکن وعدہ نہیں کرتا۔''

ریسیور کریڈل پر ڈال کر وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُسے گاؤں سے آئے آج کتنے دن ہو پھر عبید وغیرہ سے ملاقات ہی نہ ہو سکی تھی۔ آج اگر ماما نے گھر جلدی آنے کو نہ کہا ہوتا تو اس کا ارادہ عبید جانے کا تھا۔ اُسے عبید بہت پسند آیا تھا۔ اُس کی صحبت میں وہ ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ عبید حقائق کی باتیں

وہ خوابوں اور خیالوں میں رہنے والا شخص نہ تھا لیکن حقائق بیان کرتے ہوئے اس کی زبان نہیں آتی تھی۔ وہ بہت لطیف انداز میں بات کرتا تھا۔ اور بندے کو قائل کر لیا کرتا تھا اُس کی زبان حقیقتیں بھی اتنی تلخ نہیں لگتی تھیں۔ اس روز جب مہراں۔۔ داؤد خان کو دیکھ کر بیہوش ہو گئی تھی اور داؤد بتایا تھا کہ وہ اس کی بہن ہے اور کچھ عرصہ پہلے اچانک گھر سے غائب ہو گئی تھی۔ اور یہ کہ انہوں نے تلاش کیا تھا اور اب تو وہ مایوس ہی ہو چکے تھے تو میاں جی نے مہراں کو داؤد خان کے حوالے کرنے سے

عبید نے ہی انہیں قائل کیا تھا۔

''وہ اس کا بھائی ہے میاں جی! اور اُس کا حق ہے کہ وہ اُسے ساتھ لے جائے''۔

''لیکن وہ جانا نہیں چاہتی عبید میاں اور برسوں پہلے بھی ڈاکٹر شاہ نے مجھے بتایا تھا کہ مہراں پشاور سے اور وہاں اس کا گھر ہے تو میں نے اس سے بات کی تھی لیکن اس نے وہاں جانے سے انکار کر دیا تھا۔''

اور پھر طویل بحث کے بعد انہوں نے میاں جی کو منا ہی لیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ جب میاں جی گئے تو مہراں نے صاف انکار کر دیا۔

''داؤد خان میرا بھائی نہیں ہے۔''

اُس نے انکشاف کیا۔

''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔''

وہ دیوار کے سہارے کھڑی تھی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لیکن وہ بڑی جرأت کے ساتھ خان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''میرے والدین کون ہیں کہاں رہتے ہیں۔ یہ میں نہیں بتاؤں گی لیکن انہوں نے بہت بچپن میں مجھے داؤد کے حوالے کر دیا تھا کیونکہ انہیں میرے وجود سے شرمندگی ہوتی تھی۔ داؤد خان میرے پاپا کے جاننے والے ہیں۔ ان سے کہا تھا کہ وہ مجھے ساتھ لے جائیں وہ ہر ماہ میرا خرچ بھیجتے رہیں گے اور یہ صحیح ہے کہ داؤد خان کی ماں اور نے ہمیشہ میرے ساتھ ایسا سلوک کیا جیسے مالکوں کے ساتھ کیا جاتا ہے میرا بہت خیال رکھا۔''

''ماں تجھے بہت یاد کرتی ہے مہر افروز۔''

داؤد خان نے اُس کی منت کی۔

''تم میرے ساتھ چلو۔ ہم نے تمہیں کبھی غیر نہیں سمجھا۔''

لیکن مہراں اُس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اور میاں جی نے اُس کی مرضی کے خلاف اُسے بھیجنے ار دیا تو داؤد خان تبریز کے ساتھ آ گے سیدپور چلا گیا اور وہ واپس لاہور آ گئے اور گھر آ کر بھی وہ کتنی یرت سے سوچتا رہا تھا کہ یہ کیسی دنیا ہے جہاں سگے ماں باپ نے اپنی اولاد کو محض اس لئے خود سے جدا کہ وہ نارمل نہیں تھی۔ لیکن سب تو نارمل نہیں ہوتے۔

اُس نے یہاں ہاسپٹل میں اور پھر ہاؤس جاب کے دوران ایسی کئی ماؤں کو دیکھا تھا جو اپنے ابنارمل معذور بچوں کے لئے اپنی زندگی وقف کیے ہوئے تھیں۔ اور مہراں کا تو صرف قد ہی چھوٹا تھا۔ ذہنی طور نارمل تھی۔ پھر اُس کے والدین نے اُسے داؤد خان کے حوالے کیوں کر دیا تھا اور وہ وہاں سے کیوں تھی۔ کیا وہاں اُس کے گھر میں اُس پر ظلم کیا جاتا تھا۔ لیکن نہیں وہ تو بڑی محبت جتا رہا تھا۔'' سگی بہنوں محبت کرتا ہوں اس سے' ایک بار بھی اسے غیر نہیں جانا۔''

وہ بار بار میاں جی سے کہتا تھا۔

لیکن پتا نہیں کیوں چھوٹی چھوٹی مکار آنکھوں والا یہ شخص اُسے بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اور پتا یز کے حلقہ احباب میں ایسے لوگ کیوں شامل ہو گئے تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے تو اُس کے حلقہ احباب یس لوگ ہوا کرتے تھے بالکل اُسی جیسے مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ۔ لیکن اب نہ جانے کس کس طرح آنے لگے تھے۔ اُس کے پاس اور ماما کہتی تھیں۔ گذرتے وقت کے ساتھ ان لوگوں کی آمد و رفت ہو جائے گی۔ اور وہ عورت نہ جانے کون تھی جو اس روز تبریز کے ساتھ گاڑی میں تھی۔ پتا نہیں تبریز اور

وہ۔ وہ اور تبریز اگر میاں جی کو پتا چلا تو اُنہیں کس قدر دُکھ ہوگا۔ اور مدحت وہ معصوم لڑکی۔

اُس کا دل تو اتنا نازک ہے۔ کہ ابھی تک وہ سنبھل ہی نہیں پائی۔ اور اب اگر تبریز نے۔

میں کسی دن پھر تبریز سے بات کروں گا اُسے سمجھاؤں گا کہ وہ مدحت کا خیال رکھا کرے۔

مدحت اُس کی منگیتر ہے۔

اور میاں جی کی بہت لاڈلی۔

خیریت تھی ڈاکٹر باصر۔؟

''ڈاکٹر حارث راؤنڈ کر کے واپس آئے تو انہوں نے پوچھا۔

''خیریت تھی بس وہ ماما چاہ رہی تھیں کہ میں آج ذرا جلدی گھر آ جاؤں۔''

''تو چلے جاؤ بھئی۔''

ڈاکٹر حارث اس کے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

''یوں بھی ڈاکٹر بدر چلے گئے ہیں۔ آؤٹنگ کے لئے والدہ کو ساتھ لے کر گئے ہیں' دیر سے آئیں گے۔ اور پھر میں ہوں نا یہاں۔''

ڈاکٹر بدر کی والدہ ہاسپٹل کے ایک کمرے میں ہی رہتی تھیں۔ کیونکہ اُن کی وائف اُنہیں اپنے رکھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ اور ڈاکٹر بدر نے انہیں اپنے کلینک میں رکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر بدر کا اصول تھا کہ صبح ہی سب سے پہلے وہ والدہ کے کمرے میں جاتے' اپنے سامنے انہیں ناشتہ کرواتے کچھ دیر اُن سے باتیں کر اور پھر رات کو جانے سے پہلے اُن کے منع کرنے کے باوجود اُن کے پاس بیٹھ کر اُن کے پاؤں دباتے تھے کبھی جب اُن کا دل ہاسپٹل کے ماحول سے گھبراتا وہ انہیں آؤٹنگ کے لئے باہر لے جاتے کسی عزیز رشتہ سے ملوانے یا پھر یونہی لمبی ڈرائیو کر کے واپس آتے۔ وہ اپنی والدہ کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ ذرا اُن کی طبیعت خراب ہوتی تو پریشان ہو جاتے گھنٹوں اُن کے پاس کھڑے رہتے کبھی نبض دیکھ رہے ہیں' کبھی سر دبا رہے ہیں۔ لیکن وہ اپنی وائف سے ڈرتے تھے۔

اور اُسے مجبور نہیں کر سکتے تھے کہ وہ اُن کی والدہ کا احترام کرے' اُن کی عزت کرے۔

اور یہ مرد بھی کہاں کہاں کس کس مقام پر مجبور ہوتا ہے۔

اُن کے ماتحت ڈاکٹر اور بدر ہاسپٹل کا پورا عملہ اُن سے ڈرتا تھا۔

اُن کے غصے سے خوف کھاتا تھا۔

لیکن۔

''کیا سوچنے لگے ڈاکٹر باصر! چلے جاؤ کیا خبر تمہاری ماما کو کوئی ضروری کام ہو۔''

ڈاکٹر حارث نے اُسے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر کہا۔

''بھلا ماما کو ایسا کیا ضروری کام ہو سکتا ہے۔'' باصر نے سوچا۔

بس کسی سے ملوانا ہوگا۔ کسی نئی خاتون سے دوستی ہوئی ہوگی۔ کسی کو کھانے پر بلوایا ہوگا اور بس۔

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ زینت مراد کو نئے نئے لوگوں سے تعلقات بنانے کا شوق تھا۔ ضرور کسی کلب کی کوئی ممبر ہوں گی۔ جنہیں کھانے پر بلا رکھا ہوگا اور اب چاہتی ہوں گی کہ میں بھی اُن سے مل لوں غالباً انہیں یقیناً اُن محترمہ کی ایک دو صاحبزادیاں ہوں گی۔

اور ماما کو کیا پتا کہ اب باصر مراد علی کے دل میں شاید جنت عرصہ تک کسی کے لئے بھی کوئی خیال

سکے۔

چاہے کوئی کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن مدحت۔

مدحت جیسی تو شاید کوئی لڑکی بھی نہیں ہے۔

وہ نوریا اور سویرا دونوں کتنی اچھی ہیں لیکن میرے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی ان کا خیال نہیں آیا۔

حالانکہ وہ نوریا شاید مجھ میں دلچسپی بھی لے رہی ہے۔ لیکن میں نے تو بس فیصلہ کر لیا ہے۔ ڈاکٹر شاہ کی طرح اپنی زندگی کو اپنے مریضوں کے لئے وقف کر دوں گا۔ اور آج کل میں مجھے پاپا سے بات کر لینی ہے۔

وہ کھڑا ہو گیا۔

''تو تم جا رہے ہو؟''

ڈاکٹر حارث نے پوچھا۔

''ہاں میرا خیال ہے چلا ہی جاؤں۔ اگر ڈاکٹر بدر آ گئے تو تم بتا دینا کہ گھر سے فون آیا تھا۔

"DO NOT WORRY (پریشان نہ ہو)''

ڈاکٹر حارث نے کہا اور وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر ہاسپٹل سے باہر نکل آیا۔

زینت مراد اُسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔

''تھینک گاڈ باصر' تم آ گئے۔ میں دعا مانگ رہی تھی کہ کوئی ایمرجنسی نہ ہو۔''

''کیا کسی کی دعوت ہے؟''

باصر اُن کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''ارے نہیں دعوت کیا بس وہ جنرل ہادی ہیں نا انہیں آج ڈنر پر بلایا تھا بس آنے ہی والے ہوں گے۔''

''جنرل ہادی۔''

باصر نے ذہن پر زور ڈالا۔

''اچھا وہ ڈاکٹر جنرل ہادی۔''

''ہاں تمہیں پتا تو ہے تمہارے پاپا کی اُن سے بہت دوستی ہے۔''

''ہاں لیکن عجیب اتفاق ہے' آج تک میری اُن سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''بہت مصروف آدمی ہیں۔''

''اور یہ ڈنر کس خوشی میں ہے۔''

''وہ اُن کا بیٹا آیا ہے نا امریکہ سے سپیشلائز کر کے۔ تو بس اسی خوشی میں۔ پھر تمہارے پاپا بھی چاہتے تھے۔ آرام سے گھر بیٹھ کر ہاسپٹل کے پلان پر ڈسکس کر لی جائے گی۔''

''کیسا پلان؟

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''سونی نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔ تمہارے پاپا نے گلشن اقبال والے چاروں پلاٹ تمہارے ہاسپٹل کے لئے مخصوص کر دیے تھے۔ وہ چاہتے ہیں تمہارا یہ ہاسپٹل بہت شاندار ہو' اس میں تمام جدید مشینری اور آلات ہوں' اس سلسلے میں انہوں نے جنرل ہادی سے بھی بات کی تھی۔ وہ بھی تمہارے اس ہاسپٹل کی تعمیر میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ بلکہ وہ بھی اس میں روپیہ انوسٹ کر رہے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ وہ اور تم مشترکہ مالک ہو

اس ہاسپٹل کے۔"

"مگر ماما"! باصر نے بے زاری سے کہا۔

"میں نے کچھ اور سوچ رکھا ہے۔ میرا پلان کچھ اور ہے۔"

"کیا؟" زینت مراد نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"کیا تم ساری زندگی بدر ہاسپٹل میں نوکری کرنا چاہتے ہو۔ چند ہزار روپوں کے عوض"

"ماما! بات چند ہزار روپوں کی نہیں ہے۔ یہاں تو میں صرف تجربہ حاصل کر رہا ہوں۔ میرا پلان کچھ اور ہے۔"

"ہائیر ایجوکیشن کے لئے باہر جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ" ہاسپٹل کوئی ایک دم سے تو نہیں بن جائے گا۔ ابھی تو تمہارے پاپا نے ایک دو آرکیٹیکٹس سے بات کی ہے۔ نقشے دیکھیں گے، سوچیں گے۔ تم اس دوران دو تین سال باہر لگا آؤ۔ بلکہ جنرل صاحب کی تو یہ ہی خواہش ہے کہ تم باہر سے بھی ڈگری لو۔ اُن کی بیٹی بھی تو سپیشلائیز کرنے گئی ہے۔ ابھی تو اُس کے آنے میں بھی سال بھر ہے۔"

"ماما! باہر جانا مسئلہ نہیں ہے اور پھر میں پارٹ ون کا امتحان یہاں سے ہی دوں گا۔ پارٹ ٹو کے لئے جاؤں گا اور پھر فوراً آ جاؤں گا۔ مجھے خوف آتا ہے۔"

"کیوں؟" زینت مراد نے کسی قدر حیرت سے پوچھا "تیمی بھائی بھی تو باہر گئے تھے۔"

"ضروری تو نہیں باصر کہ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہو۔ شاید تیمی کو وہاں اچھے دوست نہیں ملے تھے، تم دھیان رکھنا۔ سینکڑوں لڑکے جاتے ہیں۔ پڑھنے کے لئے سب کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوتا۔" زینت مراد نے اسے سمجھایا۔

"ماما! میں چاہتا ہوں کہ پاپا گلشن اقبال میں ہاسپٹل بنوانے کے بجائے شاہ پور میں ہاسپٹل بنوا دیں۔ میں نے میاں جی سے بات کر لی تھی۔ نہر کے پیچھے والی ساری زمین خالی پڑی ہے۔ میاں جی نے کہا ہے کہ میں وہاں۔"

"اوہ میرے خدا باصر۔"

زینت مراد نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"یہ احمقانہ خیال تمہارے ذہن میں کیسے آیا۔"

"یہ احمقانہ خیال نہیں ہے ماما۔ وہاں بہت ضرورت ہے ایک اچھے ہاسپٹل کی۔ آپ کو تو پتا ہے۔ شاہ پور۔ شاہ پور اور دور دور تک کے دیہات میں اس طرح کی کوئی سہولت نہیں ہے۔

"باصر۔ باصر تمہارا دماغ صحیح ہے۔"

زینت مراد نے کس قدر غصے سے کہا

"تمہارے پاپا کا دماغ خراب نہیں ہے کہ وہ کروڑوں روپیہ وہاں اس چھوٹے سے گاؤں میں خرچ کر دیں۔"

"مگر ماما! میں خود پاپا سے بات کروں گا۔ وہ پاپا کا اپنا گاؤں ہے کیا وہ اپنے گاؤں کے لئے۔"

"دیکھو باصر! تمہارے پاپا نے صرف پلاٹ تمہارے نام کیے ہیں۔ باقی تمام انوسٹمنٹ جنرل ہادی کی ہوگی اور اس سلسلے میں اُن سے بات بھی ہو چکی ہے۔"

"اگر وہ اپنے بیٹے کے لئے ہاسپٹل بنانا چاہتے ہیں تو پلاٹ بھی خود ہی خرید لیں۔ آخر ہمارے ساتھ کیوں شئیر کرنا چاہتے ہیں۔

زینت مراد نے ایک نظر اُسے دیکھا۔

"دراصل یہ سب کچھ تو وہ اپنی بیٹی کے لئے کریں گے۔ تمہارے پاپا نے تمہاری بات کی ہے اُن کی بیٹی کے لئے۔"

"کیا؟"

باصر کو زینت مراد کی بات سمجھنے میں کچھ دیر لگی لیکن بات کی تہہ تک پہنچتے ہی وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔

کیا مطلب؟

مجھ سے پوچھے بغیر، مجھے بتائے بغیر پاپا نے بات کر لی۔

مجھے کسی جنرل ہادی، وادی کی بیٹی سے شادی نہیں کرنا۔"

"وہ تمہارے باپ ہیں باصر۔ ظاہر ہے جو کچھ بھی کریں گے تمہاری بہتری کے لئے کریں گے۔"

زینت مراد نے سمجھایا۔

"آپ پاپا سے کہہ دیجئے گا کہ مجھے یہ سودے بازی ہرگز پسند نہیں ہے۔"

"یہ سودے بازی نہیں ہے۔ بیٹا۔"

"یہ سودے بازی نہیں تو اور کیا ہے آپ ایک اَن دیکھی لڑکی کو محض اس لئے میرے ساتھ منسلک کر رہے ہیں کہ اس کا باپ پاپا کے بنائے ہوئے خاکے میں رنگ بھرنے کا اہل ہے۔"

"دیکھو بیٹا! میں نے تصویریں دیکھی ہیں اُس کی، پیاری لڑکی ہے۔ یقین کرو وہ تمہاری بہترین پارٹنر ثابت ہوگی۔ اور پھر تم اسے دیکھنا چاہتے ہو تو دیکھ آؤ۔ میں تمہارے پاپا سے بات کرتی ہوں۔ وہ انتظامات کر دیتے ہیں۔ تمہارے جانے کا۔ دو تین ماہ لگا آؤ۔ انڈرسٹینڈنگ بھی ہو جائے گی۔"

"امپاسبل (ناممکن) مجھے کہیں نہیں جانا اور نہ ہی آپ کے اور پاپا کے کسی سودے کا حصہ بننا ہے۔"

"باصر! بیٹھو اور ٹھنڈے دل سے بیٹا میری بات پر غور کرو۔ ہم تمہارے ماں باپ ہیں تمہارے لئے ہی سوچیں گے۔ تمہارے مستقبل کی فکر ہے ہمیں۔ جنرل ہادی کے ساتھ کام کر کے تمہارا ایک نام اور مقام ہو گا یوں تو ایم۔ بی۔ بی ایس ڈاکٹرز سینکڑوں پھرتے رہتے ہیں۔ لیکن کوئی انہیں پوچھتا تک نہیں۔"

"فار گاڈ سیک ماما! مت کریں مجھ سے اس موضوع پر بات۔ مجھے کسی روشن مستقبل کی ضرورت نہیں۔ آپ منع کر دیں پاپا کو، جنرل ہادی سے بات نہ کریں۔"

"جنرل ہادی سے تو بات ہو چکی بیٹا، اور اب تمہیں ہماری لاج رکھنا ہے۔"

"نہیں ماما! میں نے کہا نا مجھے نہ تو جنرل ہادی کی بیٹی سے شادی کرنا ہے اور نہ ہی میں نے گلشن اقبال کے پلاٹ لینے ہیں۔ اگر پاپا کو میرا خیال ہے تو شاہ پور۔"

"شاہ پور۔ شاہ پور۔"

زینت مراد کو غصہ آ گیا۔

"تنگ آ گئی ہوں میں یہ نام سُن سُن کر اس لئے مجھے تمہارا بار بار وہاں جانا پسند نہیں تھا۔ پتا نہیں وہاں کیا کیا تمہارے کان میں انڈیلتے رہتے ہیں۔ اور وہ ڈاکٹر شاہ محمد کیا کچھ سکھاتے رہتے ہیں۔ میں بات کروں گی میاں جی سے۔"

"آپ کو میاں جی سے بات کرنے کی کوئی ضروت نہیں ہے۔" باصر کا چہرا سرخ پڑ گیا تھا۔

"نہ تو انہوں نے مجھ سے کچھ کہا ہے اور نہ ڈاکٹر شاہ محمد نے، یہ قطعی میرا ذاتی فیصلہ ہے۔"

"دیکھو باصر!"

زینت مراد نے پھر لہجے کو نرم بنایا۔

"آخر تبریز بھی تو ہے۔ اس نے تو ہمارے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ وہ لڑکی کسی بھی اس کے قابل نہیں ہے۔ گاؤں میں پلنے والی سیدھی سادی دیہاتی لڑکی۔"

"کون لڑکی مدحت۔؟" باصر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ تبریز کو ایک سے ایک اچھی لڑکی مل سکتی تھی اور جب وہ امریکہ جارہا تھا تب میں نے اُ سے پوچھا بھی تھا کہ اگر اُسے اعتراض ہو تو میں میاں جی سے بات کروں گی۔ لیکن اُسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ ا تم اعتراض کر رہے ہو اُس لڑکی کے لئے جو ہر لحاظ سے مناسب ہے خوش شکل' ویل ایجوکیٹڈ۔"

"اور مدحت تو ایسی لڑکی ہے کہ اُس کے لئے تو کوئی بھی اعتراض نہ کرے۔ میں اور اگر مجھ سے آپ کہتیں تو۔" اُس نے سوچا۔

"اچھا! اب جاؤ اپنے کمرے میں نہا کر کپڑے تبدیل کرو۔ اور ذہن پر زیادہ بار نہ ڈالو۔ اور رات کھانے پر اچھی طرح سے بات کرنا۔ اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے تم بھی اچھی طرح سوچ لینا۔"

"میں اگر ایک صدی بھی سوچ لوں تو میرا فیصلہ نہیں بدل سکتا ماما۔ فی الحال تو میں نے شادی متعلق سوچا ہی نہیں ہے۔ بلکہ میرا ارادہ ہی نہیں ہے شادی کرنے کا اور اگر میں نے کبھی شادی کی بھی تو وہ کم از اس طرح کی کاروباری نہیں ہوگی۔"

"یہ کاروباری شادی ہے کیا؟"

"تو اور کیا ایک لڑکی جو عرصہ چھ سال سے امریکہ میں مقیم ہے جس کی سوچ' پسند ناپسند دوستیوں' دشمنی کسی چیز سے بھی آپ باخبر نہیں' اُسے آپ میری زندگی میں شامل کرنا چاہتی ہیں تو اسے میں اور کیا کہوں۔"

اُس نے ایک نظر زینت مراد کی طرف دیکھا اور اُن کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ٹی وی لاؤنج میں مدحت نماز پڑھ رہی تھی۔ وہ لمحہ بھر اُسے دیکھتا رہا سفید دوپٹے کے ہالے میں لپٹا ہوا اس کی پاکیزہ اور معصوم سا چہرا۔

اور تبریز بھائی بھلا کیوں اعتراض کرتے۔ اور ماما کیسے ذکر کر رہی تھیں مدحت کا' جیسے وہ کوئی ناپسندیدہ ہستی ہو۔

پھر وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے سونیا کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"سونی! یہ سب کیا ہے تم نے سُنا ماما یہ کیا کہہ رہی ہیں۔"

"ارے باصر! تم آج جلدی نہیں آگئے۔"

"ہاں ماما نے فون کیا تھا۔"

باصر بیٹھ گیا۔

"کیوں؟"

سونیا جو کچھ نوٹس بنا رہی تھی اس نے قلم بند کر کے رکھا۔ اور باصر کی طرف دیکھا۔

"اور ماما کیا کہہ رہی ہیں"

"انہوں نے جنرل ہادی کی صاحبزادی کے ساتھ میری بات طے کر دی ہے۔"

"رئیلی"! سونیا کو حیرت ہوئی۔

"مگر مجھے تو ماما نے نہیں بتایا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ وہ نوریا میں انٹرسٹڈ ہیں۔"

"مگر سونی آ" باصر سنجیدہ تھا۔

"مجھے جنرل ہادی کی بیٹی سے شادی نہیں کرنا اور میں نے ماما سے کہہ دیا ہے۔"

"پھر انہوں نے کیا کہا؟"

سونیا پریشان ہو گئی تھی۔

"فی الحال کچھ نہیں۔"

"باصر! کیا تم کسی اور میں انٹرسٹڈ ہو؟"

باصر خاموش ہی رہا۔

"اگر ایسی کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ' میں ماما سے بات کرتی ہوں۔ کیا نوریا۔"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

تب ہی مدحت اندر داخل ہوئی۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔"

باصر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھو نا باصر!" سونیا نے کہا۔

"میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ اور جب مہمان آئیں تو تم مجھے مت جگانا۔"

"اوہ گاڈ۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ دوپہر میں ماما نے بتایا تو تھا کہ رات ڈاکٹر ہادی کی فیملی۔ اوہ اب سمجھی۔"

"کیا۔؟" مدحت نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ یہ تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

"نماز پڑھنے۔"

"آج جلدی نماز نہیں پڑھ لی؟"

"ہاں آنٹی نے کہا تھا۔ ڈنر پر کچھ لوگ آ رہے ہیں پھر ظاہر ہے' دیر ہو جائے تو سستی ہو جاتی ہے۔ نماز پڑھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ آنٹی آئی تھیں۔ کچھ دیر پہلے تو تم سو رہی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا تم جاگو تو تمہیں یاد دلا دوں' ذرا کچن میں دیکھ لینا کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔"

"اچھا۔" سونیا اُٹھ کر باصر کے پیچھے ہی باہر نکل آئی۔

"دیکھو تم ڈنر پر آ جانا' یونہی ماما کا موڈ خراب ہوگا' بعد میں بات کر لیں گے۔"

"اچھا دیکھوں گا۔"

سونیا' زینت مراد کے کمرے کی طرف چلی گئی تو باصر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆☆

صبح کے دس بج رہے تھے لیکن باصر ابھی تک اپنے کمرے میں ہی تھا۔ وہ ناشتا کرنے کے لئے نیچے نہیں اُترا تھا' اُس کی آنکھیں بے حد سُرخ ہو رہی تھیں۔ وہ تقریباً ساری رات جاگتا رہا تھا۔ جنرل ہادی کی وائف اور اُن کا بیٹا اُسے ذرا بھی تو اچھے نہ لگے تھے۔ سارا وقت وہ بزنس پوائنٹ آف ویو سے ہی باتیں کرتے رہے تھے۔ اور اُن کا بیٹا کس قدر مغرور اور خود پسند لگ رہا تھا' اور بیٹی بھی یقیناً ایسی ہی ہوگی۔ اور پھر اُن کے جانے کے بعد اُس نے پاپا اور ماما کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی تھی' لیکن وہ کسی طور اُس کی بات ماننے

کے لئے تیار نہ تھے۔

"دیکھو باصر! اگر تمہارے ذہن میں یہ ہے کہ میں میاں جی کے کہنے پر وہاں شاہ پور میں تمہارے ہاسپٹل پر پیسہ خرچ کروں گا تو یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دو۔ میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ میں اُسے بزنس سے نکال سکوں اور جنرل ہادی سے جو بھی میری کمٹمنٹ ہوئی ہے۔ وہ محض میں نے تمہارے لئے تمہارے فائدے کے لئے کی ہے۔ ہاسپٹل کی تعمیر' مشینری وغیرہ پر جو بھی خرچ ہوگا۔ وہ سب وہ کریں گے اور۔"

"پلیز پاپا! میں یہ ساری اسٹوری سن چکا ہوں میں آپ کی کمٹمنٹ کا ذمہ دار نہیں ہوں' یہ کمٹمنٹ میری نہیں ہے۔ میرے اپنے بھی تو کچھ خواب ہیں۔ کچھ آئیڈیل ہیں۔ میری کمٹمنٹ بھی تو کسی سے ہو سکتی ہے۔؟

تبریز نے بھی اُنہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"پاپا زندگی صرف اس لئے تو نہیں ہوتی کہ اُسے آدمی صرف اپنی ذات کے لئے خرچ کرے دوسروں کا بھی اس پر کوئی نہ کوئی حق ہوتا ہے' اور شاہ پور میں ہاسپٹل بنوانے کا خیال بُرا تو نہیں ہے۔ پاپا۔ آپ کو تو پتا ہے وہاں طبی سہولتیں بالکل نہیں ہیں۔"

"میں نے بیٹوں کو اس لئے پڑھا لکھا کر بڑا نہیں کیا تھا کہ جب وہ بڑے ہو جائیں تو اُنہیں دوسروں کے لئے وقف کر دوں۔" مراد علی کو غصہ آ گیا تھا۔

"پہلے تم نے میرے خوابوں کو آگ لگائی ہے' اور اب یہ باصر۔ تم اگر میرے خوابوں پر پورے اُترے تو آج میں باصر کو اس کی اجازت دے سکتا تھا کہ وہ خود کو وقف کر دے۔"

تبریز کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہو گیا تھا۔ وہ یکدم ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

"پاپا! میں کوشش تو کر رہا ہوں کہ آپ کے خوابوں پر پورا اُتر سکوں اور پوری ایمانداری سے کام کر رہا ہوں۔"

"جانتا ہوں۔ لیکن تبریز میاں کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارے حلقہ احباب سے بے خبر ہوں۔ وہ لوگ جو تمہارے پاس آ کر بیٹھتے ہیں' جن سے تم ملتے جلتے ہو۔ کیا وہ تمہاری سوسائٹی کے لوگ ہیں۔ کیا وہ تمہیں دوبارہ واپس نہیں لے جا سکتے۔"

"پاپا پلیز۔ میرے دوست احباب قطعی میرا ذاتی مسئلہ ہیں۔ اور میں آفس کا کام۔۔"

"وہ تمہارا ذاتی مسئلہ نہیں ہے تبریز! وہ میرا مسئلہ بھی ہے۔"

"پلیز پاپا!" باصر نے اُنہیں ٹوکا۔

"اُس وقت تبریز بھائی کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ میری بات ہے۔"

مراد علی نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔

"میرا فیصلہ نہیں بدل سکتا باصر!"

"پاپا!۔"

وہ احتجاج کرنا چاہتا تھا' اُنہیں سمجھانا چاہتا تھا۔

لیکن وہ ڈائننگ ہال سے باہر نکل گئے۔ زینت مراد بھی اُن کے پیچھے ہی چلی گئی تھیں۔

"باصر!" پریشان کھڑے باصر کے کندھے پر تبریز نے ہاتھ رکھے۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ تو میری خواہش بھی تھی۔ کہ شاہ پور کو ایک مثالی گاؤں بناؤں گا۔ لڑکیوں کے لئے دستکاری اسکول' ایک چھوٹا سا کلینک اور نہ جانے کیا کا خواب دیکھا کرتا تھا میں لیکن

بعض اوقات جو ہم سوچتے ہیں۔ وہ نہیں ہوتا۔ ہمارے خواب ہمارے ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں' کبھی ہماری غلطیوں کی وجہ سے' اور کبھی یوں ہی نادانستگی میں۔" تبریز کی آواز بھرا گئی تھی۔

"اور دیکھو باصر! جنرل ہادی کی بیٹی کو میں نے ایک بار دیکھا تھا امریکہ میں' وہ کسی بھی طور تمہارے قابل نہیں ہے۔ میں نے تو سوچا تھا تمہارے لئے۔" وہ ذرا کی ذرا رُکا۔

"تمہارے لئے میرے ذہن میں ایک بہت اچھی بہت پیاری لڑکی ہے۔ باصر۔ بس تھوڑا انتظار کر رہا تھا میں۔"

"کیا مدحت سے بھی اچھی کوئی لڑکی ہو سکتی ہے میرے لئے۔" باصر نے سوچا تھا۔

مجھے بہت خوشی ہوئی ہے باصر! کہ تم اس طرح سوچتے ہو' اس انداز میں۔"

اور پھر وہ تبریز کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ لیکن ساری رات وہ سو نہیں سکا تھا۔ وہ پاپا کے ساتھ کسی صورت بھی کمپرومائز نہیں کر سکتا تھا۔ صبح ہونے تک اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے کہیں چلا جائے' اگر وہ یہاں رہا تو اُس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ احمد بھی تو کئی دنوں سے کہہ رہا تھا کہ گھر چلو اماں تمہیں یاد کر رہی ہیں' اور وہاں احمد کے گھر میں کتنا سکون ہوتا ہے۔ کتنی محبت ہے۔

اور ماں جی کتنی محبت کرتی ہیں۔ مجھ سے

پاپا بھلے شاہ پور میں ہاسپٹل نہ بنوائیں۔ لیکن یہ طے ہے کہ اُسے جنرل ہادی کی بیٹی سے شادی نہیں کرنا۔

وہ اُٹھا اور چند جوڑے کپڑے نکال کر بیگ میں رکھے۔ اور کچھ دوسرا ضرورت کا سامان۔

"ڈاکٹر بدر یقیناً چھٹی دے دیں گے۔ میں اُنہیں بتا دوں گا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اُس نے سوچا۔

"سونی سے کہتا ہوں۔ ایک کپ چائے بنوا دے' سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔" لیکن اُس نے ارادہ بدل دیا۔ سونی اور مدحت تو اپنے اپنے کالج' یونیورسٹی جا چکی ہوں گی۔ احمد کے پاس ہی جا کر چائے پیتا ہوں' احمد گنگا رام میں تھا۔

وہ بیگ اُٹھا کر نیچے اُترا تو کوریڈور میں پڑے فون کی بیل بج رہی تھی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ماما شاید کمرے میں ہوں گی۔ اور پاپا دفتر جا چکے ہوں گے' اور شاید تبریز بھی۔

"ہیلو۔! اُس نے ریسیور اٹھایا۔

دوسری طرف ڈاکٹر شاہ محمد تھے۔

"ہیلو ڈاکٹر! کیسے ہو۔ یہ تم ہی ہو نا۔ میں نے صحیح پہچانا۔"

"جی ڈاکٹر شاہ! باصر ہی ہوں۔"

"کیسے ہو بھائی! کب تک آ رہے ہو۔"

انہوں نے پوچھا۔ اُن کی عادت تھی کہ وہ اُسے وعدہ ضرور یاد دلاتے تھے۔

"آ جاؤں گا ڈاکٹر صاحب! لیکن آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں۔؟"

قصبے سے۔"

"میاں جی کیسے ہیں؟"

"اُن کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے میں نے تمہیں فون کیا ہے' اگر آ سکو تو ایک دو دن کے لئے آ جاؤ۔"

''کیوں کیا ہوا؟'' باصر گھبرا گیا۔

''کوئی خاص نہیں' کچھ اَپ سیٹ سے ہیں۔ کل رات بلڈ پریشر بہت ہائی ہو گیا تھا۔ دراصل
کے جانے کا کا سائیں کے قتل سے وہ بہت اَپ سیٹ ہو گئے ہیں۔''

''مہراں کہاں گئی' اور کا کا سائیں کو کیا ہوا؟''

''مہراں کل صبح سویرے باہر گئی تھی فاطمہ سے ملنے۔
کبھی کبھی وہ اس کی طرف چلی جاتی تھی۔ تمہیں پتا تو ہے فاطمہ۔ پار کے گاؤں میں بیاہ گئی ہے۔
نے بتایا تھا کہ مہراں صبح کی نماز پڑھ کر ہی نکل گئی تھی۔ کہتی تھی۔ کہ دوپہر تک لوٹ آؤں گی۔ اُسے میاں جی کی فکر
اس لئے زیادہ دیر رُکتی نہیں تھی۔ حالانکہ میاں جی نے اُسے کہا بھی تھا کہ تھوڑی دیر انتظار کرلو تو غلاماں آ جائے گا تو تا
چلی جانا۔ لیکن وہ اکثر پیدل ہی جایا کرتی تھی۔ لیکن دس بجے کے قریب گلباز نہر کی طرف سے گذرا تو اُس
سائیں کی لاش دیکھی۔ نہر کے کنارے پڑی تھی اور اُس کا جسم چھلنی تھا۔ کلاشنکوف سے فائر کیا گیا تھا۔''

''اور گاؤں میں فائر کی آواز نہیں سُنائی دی؟'' باصر نے پوچھا۔

''سُنائی دی بھی ہو تو کسی نے دھیان نہیں دیا۔ دراصل اِدھر پچھلے کچھ دنوں سے سید پور کی طرف
وقت بے وقت کلاشنکوف کے فائروں کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ شروع شروع میں لوگ چونک پڑتے
اب تو عادی ہو گئے ہیں۔''

''ہوں۔۔اور مہراں کیسے غائب ہو گئی؟''

'مہراں کا دوپٹہ اور اس کا ایک جوتا کا کا سائیں کی لاش کے پاس ہی پڑا تھا۔ گمان یہ ہے کہ
اغوا کرلیا ہے کسی نے۔ اور شاید کا کا سائیں نے مزاحت کی ہوگی۔ سو اُسے مار ڈالا گیا۔ فاطمہ کا گاؤں اُدھ
ہے۔ نہر سے آگے۔ اور مہراں فاطمہ کے گھر پہنچی ہی نہیں۔''

''لیکن مہراں کے اغوا سے کسی کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔''

باصر نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''معلوم نہیں' لیکن یار' ڈاکٹر وہ جو تیرے بھائی کے ساتھ آیا تھا نا خاں داؤد خان! وہ مجھے
آدمی نہیں لگا تھا۔ وہ مہراں کو ساتھ بھی لے جانا چاہ رہا تھا۔ بہرحال پولیس کو اطلاع کر دی تھی۔ لیکن میا
بہت پریشان ہیں۔ تم آ نہیں سکتے کیا۔''

''میں بس ابھی آ رہا ہوں۔''

باصر نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ زمین پر رکھا ہوا بیگ اُٹھایا۔ اور خلیل کو آواز دی۔

مدحت نے کمرے سے باہر نکل کر اسے دیکھا وہ بیگ اُٹھائے کوریڈور میں کھڑا تھا۔

''خلیل تو آنٹی کے ساتھ گیا ہے۔''

کون مدحت؟''

باصر نے مُڑ کر اسے دیکھا۔

''تم کالج نہیں گئیں؟''

''ہاں! آج کل گیمز وغیرہ ہو رہے ہیں۔ پڑھائی نہیں ہوتی۔ آپ کہیں جا رہے ہیں کیا؟

''شاہ پور جا رہا ہوں۔''

''کیوں؟''

''یوں ہی بس میاں جی سے ملنے۔'' اُس کا کا سائیں اور مہراں کا بتانا مناسب نہ سمجھا۔

''آپ کچھ پریشان ہیں؟''

''نہیں تو۔''

اُس نے مُسکرانے کی کوشش کی۔

''آپ پریشان ہیں' مجھے پتا ہے۔ آپ آنٹی کی بات مان کیوں نہیں لیتے۔ کہیں نہ کہیں تو آپ کی
شادی کرنا ہی ہے۔''

''ہوں'' اُس نے آہستگی سے کہا۔

''تو پھر آپ وہاں ہی شادی کیوں نہیں کر لیتے' جہاں آنٹی کی خواہش ہے۔''

''میں فی الحال اپنے آپ کو شادی کے لئے تیار نہیں پاتا' اور پھر یہ شادی نہیں ہے مدحو! سودے
بازی ہے۔''

''آپ آنٹی اور انکل کی بات مان لیں اور شاہ پور میں ہاسپٹل بنانا تو محض ایک خواب ہے۔ اور یہ
خواب انکل شاہ محمد نہ جانے کب سے دیکھ رہے ہیں۔ پتا نہیں کیوں انہوں نے اپنے اس خواب میں آپ کو بھی
شریک کرلیا۔ پلیز! آپ انکل کا دل نہ دُکھائیں۔ شاہ پور والے پہلے بھی تو زندہ ہیں' اب بھی زندہ رہیں گے۔''

''مدحو!'' باصر نے بیگ ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل کیا۔

''بعض خوابوں کی تعبیر آدمی کے اختیار میں نہیں ہوتی۔ اور آدمی انہیں اپنی آنکھوں سے نوچنے پر مجبور ہو
جاتا ہے۔ لیکن بعض خوابوں کی تعبیر پانا آدمی کے اختیار میں ہوتا ہے بس ذرا سی کوشش اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔
اور میں اپنے سارے خوابوں کو اپنے ہاتھوں قتل نہیں کر سکتا۔ شاہ پور میں ہاسپٹل ڈاکٹر شاہ محمد کا نہیں' میرا خواب ہے۔''

''لیکن یہ بہت مشکل ہے۔ انکل بہت غصے میں تھے۔ صبح ناشتے پر بھی اُن کی بہت بحث ہوئی ہے۔
تبریز سے' اور انہوں نے کہہ دیا ہے کہ آپ کو ادھر ہی رہنا ہے' تو آپ کو اُن کی بات ماننا پڑے گی۔''

''جانتا ہوں' اس لئے تو جا رہا ہوں۔''

''تو کیا اب آپ واپس نہیں آئیں گے؟'' مدحت کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

''شاید۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

باصر کی نگاہیں مدحت کی جھلملاتی آنکھوں سے ٹکرائیں۔

''میں جب اوپر سے آ رہا تھا تو میرا ارادہ احمد کے گھر جانے کا تھا۔ اور یہاں آ کر میرا ارادہ بدل گیا
ہے۔ اب میں شاہ پور جا رہا ہوں۔ کل کیا ہوگا۔ ابھی سے کیا کہا جا سکتا ہے۔

میاں جی کو کوئی پیغام۔

''نہیں۔ بس سلام دید یجئے گا۔''

مدحت نے پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کی' لیکن وہ رخساروں تک بہہ گئے۔

''مدحت!''

باصر بے چین ہو گیا۔

''تم رو رہی ہو پگلی! خوش رہا کرو۔ اور میں نے تم سے کہا تھا' تبریز بھائی کا خیال رکھا کرو۔'' وہ
بہت اچھے آدمی ہیں' بہت محبت کرنے والے بس پتا نہیں کیوں راستہ بھول گئے تھے' اب واپس آ تو گئے ہیں' لیکن
لگتا ہے' جیسے ابھی بھی کہیں بھول بھلیوں میں پھنسے ہیں۔ ان بھول بھلیوں سے نکلنا چاہتے ہیں۔ لیکن نکل نہیں

پاتے۔ مدحوتم! انہیں ان بھلول بھلیوں سے نکال سکتی ہو۔ وہ گھر آئیں تو اُن کے کھانے' ناشتے ہر چیز
کرو۔ ماما کو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہیں ہوتا' اور سونی کو بھی نہیں۔ تم کبھی بھی پچھتانا مت' تبریز
بہت اچھے انسان ہیں۔ بہت اچھے۔''

''آپ آنٹی سے مل کر نہیں جائیں گے؟'' مدحت نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے
پتا نہیں وہ کب آئیں گی۔ لیکن اتنی صبح وہ چلی کہاں گئی ہیں۔''

''معلوم نہیں' ناشتے کے بعد ہی خلیل کو ساتھ لے کر گئی تھیں۔

'' اچھا میں اب چلوں' زندگی ہوئی تو پھر ملیں گے۔ خدا حافظ۔''

''خدا حافظ؟''

مدحت نے آہستگی سے کہا اور اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر وہیں کوریڈور میں ہی پڑی
پر بیٹھ گئی۔ آنسو ایک بار پھر اُس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے۔

''پتا نہیں۔ یہ اب واپس لوٹ کر آئے گا بھی یا نہیں پتا نہیں انکل مراد اور آنٹی اس کی ہی بات مان
یا پھر نہ مانیں اور پھر۔ سونیا کہہ رہی تھی۔ جنرل ہادی کی بیٹی بہت خوبصورت ہے۔ بہت ایجوکیٹڈ
شاید وہ بھی ڈاکٹر ہے۔

پھر بھلا ہاصر کیوں انکار کر رہا ہے۔

کیا اُس کے دل میں اب بھی میرا خیال ہے۔

کیا وہ اب بھی مجھے سوچتا ہے۔

لیکن نہیں ایسا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ بار بار مجھے تبریز کا خیال رکھنے کو نہ کہتا اور اُس کی تعریف
کرتا' اور اُس کی تعریف تو میاں جی بھی بہت کرتے ہیں۔ اور میں۔ اور مجھے بھی اس پر غصہ نہیں آتا۔
محسوس ہوتی ہے۔

ہاصر صحیح کہتا ہے' اُسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ الجھا ہوا ہے' کہیں بھول بھلیوں میں گھیرا ہوا
مگر میں۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ مجھے تو تبریز سے بات کرتے ہوئے بھی جھجک ہوتی ہے۔

اور ہاصر۔

ضرور میاں جی اُسے واپس بھیج دیں گے۔ اور اُس سے کہیں گے کہ وہ انکل کی بات مان لے
ہاصر میاں جی کی بات نہیں ٹال سکتا' کبھی بھی نہیں۔

اور پھر اتنی خوبصورت اور ماڈرن بیوی کو پا کر شاید کبھی اُسے یاد بھی نہ رہے کہ ایک رات اُس
''اوہ!'' اُس نے بیدردی سے ہونٹ کو دانتوں تلے کچلا۔ مگر آنسو اُمڈتے چلے آرہے تھے۔
یہ محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔ سسکیاں لے لے کر۔

محبت جھلملاتی آنکھ میں برسات ہوتی ہے۔

محبت ذات ہوتی ہے۔

محبت نیند کی رُت میں'

حسین خوابوں کے رستے پر۔ سُلگتے جان کو آتے رتجگوں کی گھات ہوتی ہے۔

محبت ہار ہوتی ہے۔

محبت مات ہوتی ہے۔

بہت دن پہلے پڑھی ہوئی ایک نظم کے مصرعے اُس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ اور وہ دونوں
ہاتھوں میں چہرہ چھپائے روئے چلی جا رہی تھی۔

پھر نہ جانے کتنی دیر وہ یونہی روتی رہی۔ اُس نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹیک دیا تھا اور آنسو بند
آنکھوں سے بہہ بہہ کر رخساروں کو بھگو رہے تھے۔

''مدحت بی بی!''

خلیل نے اُسے یوں روتے دیکھ کر پریشانی سے پکارا' تو وہ چونک کر سیدھی ہو گئی' اُسے خلیل کے
آنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔

''تم کب آئے؟''

اُس نے ہاتھوں کی پشت سے جلدی جلدی آنسو پونچھے۔

''ابھی' لیکن آپ کو کیا ہوا ہے۔ طبیعت خراب ہے کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو فون کروں۔''

''نہیں' بس سر میں درد تھا۔'' اُس نے بہانہ بنایا۔

''بہت شدید درد۔ اب ٹھیک ہو جائے گا۔ گولی کھالی ہے۔ اور آنٹی کہاں ہیں۔''

''وہ تو جی اُدھر چلی گئیں مسز سبحان کے ہاں۔ مجھے یہاں گھر کے پاس اُتار دیا۔ کہ باہر کوئی نہیں ہوگا'
گھر خالی نہیں رہنا چاہیے۔ روز ہی ڈاکے پڑ رہے ہیں۔''

وہ اُس کی کرسی کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

''وہ بڑا گیٹ بند ہے نا۔''

''ہاں جی۔''

''اور یہ اندر والا''

''یہ بھی بند ہے جی۔''

''آنٹی صبح صبح کدھر گئی تھیں۔''

''وہ جی۔'' اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''کسی کو بتائیں گی تو نہیں۔''

''نہیں۔'' مدحت نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''وہ جی اُدھر۔ ایک منٹ۔'' وہ اُٹھا اور کچن میں جھانک کر واپس آ گیا۔

''کام کر رہے ہیں۔ دونوں پھر بھی۔''

اُس نے آواز آہستہ کر لی۔

''وہ جی ہم اُدھر گئے تھے بابا جی کی طرف۔''

اُس نے پھر سے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کون بابا جی؟'' مدحت نے پوچھا۔

''وہی جی۔ اُس روز آپ کو بتایا نہیں تھا جادو ٹونا کرتے ہیں۔ بڑا صحیح کام کرتے ہیں۔ کالا علم ہے
اُن کے پاس۔''

''مگر آنٹی کیوں گئی ہیں وہاں۔ وہ تو پڑھی لکھی سمجھدار خاتون ہیں وہ بھلا۔''

''اوہ جی' پڑھی لکھی عورتیں بھی جاتی ہیں جی۔ جب من میں کھوٹ آ جائے' دل میں میل ہو' اور
حسد ہو' تو جی ساری پڑھائیاں لکھائیاں بھول جاتی ہیں جی۔''

''پر آنٹی کو کسی سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے۔''

''وہ تو جی اپنے باصر میاں کے لئے گئی ہیں۔''

خلیل نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

''وہ جی انہوں نے بابا جی سے کہا ہے تا کہ وہ کچھ ایسا کریں کہ باصر میاں کا دل موم ہو جائے جی اُدھر جنرل صاحب کی بیٹی سے شادی کرلیں۔''

''نہیں۔'' مدحت کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ آنٹی اس قدر جہالت کا کام کریں گی۔ یہ جادو جاہل اور دیہاتی اَن پڑھ لوگ کرتے ہیں۔

''سچ کہہ رہا ہوں جی' وہ تو جی بیگم صاحبہ تو پہلے بھی جاتی رہی تھیں۔ اپنے تبریز صاحب کے پر وہ تو جی کچھ حساب اُلٹ ہی ہوگیا۔ اپنے تبریز میاں تو بالکل ہی فرنٹ ہوگئے تھے۔ ورنہ بیگم صاحبہ نے سے اتنا ہی کہا تھا کہ اپنی پھوپھو کی بیٹی سے اُن کی شادی نہ ہو۔''

''کیا۔۔؟'' مدحت نے حیرت سے کہا۔

''ہاں جی۔ وہ انہوں نے بتایا تھا بابا جی کو' کہ وہ بالکل جاہل دیہاتی لڑکی ہے' اپنے تبریز کے ساتھ ذرا بھی نہیں جچتی جی۔ اور تبریز میاں کو تو جی بڑے بڑے جنرلوں اور وزیروں کی بیٹیاں مل جاتیں جی۔''

اُسے شاید معلوم نہیں تھا کہ مدحت ہی اُس کی پھوپھو کی بیٹی ہے' کیونکہ زینت مراد ہمیشہ کہہ کر ہی متعارف کرواتی تھیں۔ مدحت حیرت دُکھ اور غم سے ساری بات سن رہی تھی۔ اُسے یقین نہیں کہ آنٹی ایسا' اس طرح بھی کرسکتی تھیں۔

اب تو وہ اُس کا بہت خیال رکھ رہی تھیں۔ تبریز کی اُس کے ساتھ منگنی کا ذکر انہوں نے اور روز فنکشن ارینج کرکے باقاعدہ اعلان کرنے کا اصرار کرتی تھیں۔ وہ تو تبریز ہی ٹال رہا تھا۔ ورنہ نہ جانے کیا کیا کہانیاں سُنا رہا تھا۔

''خلیل! تم بہت فضول بولتے ہو۔''

''آپکو یقین نہیں آ رہا بی بی۔''

خلیل کو افسوس ہوا کہ اُس کی بات کا یقین نہیں کیا جا رہا۔

''میں تو خود بیگم صاحبہ کے ساتھ جاتا رہا ہوں۔ بابا جی کے پاس۔ بیگم صاحبہ نے دوپٹہ بھی بابا جی کو اپنی نند کی بیٹی کا اور اُس پر تو اُنہوں نے جادو کیا تھا۔''

''دوپٹہ۔''

مدحت کو یاد آیا ایک بار آنٹی گئی تھی۔ شاہ پور تو اُس سے دوپٹہ لیا تھا۔ نیلے رنگ کا دوپٹہ جس نے مقیش لگائی تھی۔

''مدحو! یہ دوپٹہ دینا' ایسی ہی مقیش لگواؤں گی۔ سونیا کے دوپٹے پر۔''

''آنٹی آپ اِدھر ہی بھیج دیں دوپٹہ۔ فاطمہ لگا دے گی۔''

اُس نے کتنا اصرار کیا تھا۔ لیکن آنٹی نے نہیں مانا تھا۔ تب اُس نے ضد کر کے انہیں وہ دوپٹہ دے دیا

''یہی سونی کے لئے لے جائیں۔''

''خلیل تمہیں یاد ہے' اُس دوپٹے کا رنگ کیا تھا۔''

''جی بالکل' نیلا رنگ تھا۔ میری یادداشت تو بہت اچھی ہے۔ بچپن کی ساری باتیں بھی یاد

اُس نے ایک گہری سانس لے کر سر کرسی کی پشت سے ٹیک دیا عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔

''مدحت بی بی! آپ کسی سے کچھ نہ کہنا ورنہ بیگم صاحبہ تو مجھے گھر سے نکال دیں گی۔''

''نہیں کہوں گی' تم جاؤ باہر گیٹ پر۔ آنٹی آتی ہوں گی۔''

''شمیم دروازہ بند کرلو۔''

اُس نے کچن میں کام کرنے والی لڑکی کو آواز دی' اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک بار پھر اُسے کسی سے کچھ نہ کہنے کی تلقین کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

یہ سب کیا تھا؟

مدحت کا ذہن اُلجھ رہا تھا۔ گھٹن سی ہو رہی تھی۔

آنٹی زینت مراد کس قدر چاہتی ہیں اُسے' کتنا خیال رکھتی ہیں اُس کا' پھر پھر وہ کیوں نہیں چاہتی کہ میں اور تبریز۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اور انکل شاہ محمد کہتے ہیں۔

''شہروں میں لوگ دوغلے ہوتے ہیں' چہروں پر نقاب چڑھائے پھرتے ہیں۔ اُن کے ظاہر اور باطن کا پتا نہیں چلتا۔ آپ سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے والے آستینوں میں خنجر چھپائے پھرتے ہیں۔''

یکا یک اُس کا دم گھٹنے لگا۔ اُس کا جی چاہا' وہ بھاگتی ہوئی' باہر چلی جائے۔ بڑا گیٹ کھول کر سڑک پر جائے۔

باصر۔ باصر بھی چلا گیا تھا۔ وہ ہوتا تو وہ اس کے ساتھ ہی چلی جاتی شاہ پور۔ میاں جی کے پاس۔ ایک دم خوف سا آنے لگا۔ سب سے' آنٹی سے' سونیا سے' انکل مراد سے' سب سے' وہ یہاں نہیں رہے گی۔

اُس نے سوچا۔ مگر آنٹی اُسے کب جانے دیں گی۔ اور وہ میاں جی وہ بھی تو کہتے ہیں کہ مجھے یہاں رہ کر تعلیم حاصل کرنا ہے۔

''اُف خدایا! میں کیا کروں۔''

اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ تو وہ زور زور سے رونے لگی۔ اُس کے رونے کی آواز سُن کر کچن میں کام کرتی ہوئی پروین اور شمیم بھاگتی ہوئی باہر آ گئیں۔

''کیا ہوا' کیا ہوا؟''

لیکن وہ روئے چلی جا رہی تھی۔

O☆O

''لیزا۔ لیزا بیٹے! اب بتاؤ کیا ہوا تھا تمہیں۔ اور پھر تم اکیلی کیوں تھیں۔ ریٹا اور آن کدھر تھیں
فادر کے بیڈ پر گھٹنوں پر تھوڑی دھرے وہ چُپ بیٹھی فادر کو دیکھ رہی تھی۔ اور اس کی سمجھ میں
تھا کہ اب انہیں کیا بتائے۔

''بولو نا بیٹا ڈرو نہیں، تمہیں پتا ہے تم پورا ایک گھنٹہ بے ہوش ہو رہی ہو۔''

''وہ میں ڈر گئی تھی۔''

''کیسے؟''

''وہ۔''

ریتو نے لمحہ بھر کے لئے سوچا۔

''وہ کیفی ہے نا۔؟''

''وہ شاعر لڑکا ریٹا کا دوست۔''

''جی پاپا۔ میں اُس کے ساتھ آئی تھی۔ وہ دراصل مجھے کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ میں
چاہتی ہوں پاپا، اور ریٹا نے اُس سے میری جاب کے لئے کہا تھا۔''

''پھر کیا اُس نے تمہیں پریشان کیا۔ وہ لڑکا''۔

فادر یک دم پریشان ہو کر کھڑے ہو گئے۔

''نو پاپا۔ وہ۔ وہ کیفی تو مجھے وہاں کھڑا کر کے خود کسی کام سے چلے گئے تھے۔ انہوں نے کہا
اُن کا انتظار کروں۔''

وہ رُک رُک کر بول رہی تھی۔

''بس وہاں اکیلے کھڑے کھڑے مجھے ڈر لگنے لگا۔ بس میں وہاں سے بھاگ پڑی، مجھے

لگا جیسے کوئی میرے پیچھے آ رہا ہو۔ مجھے پکڑنے کے لئے۔ لیکن پاپا آپ وہاں کیسے آ گئے تھے۔''

''اسی بلڈنگ میں میرا فلیٹ ہے۔''

''تھینک گاڈ پاپا۔ اگر آپ نہ آتے تو میرا تو ہارٹ فیل ہو جاتا۔

''مرسی فل گاڈ۔ اپنے نیک بندوں کی خود حفاظت کرتا ہے۔
لو اب دودھ پی لو، اتنا گرم نہیں ہے اب۔''

فادر نے میز سے دودھ کا گلاس اُٹھا کر اُسے دیا۔ اور پوچھا۔

''تم جاب کیوں کرنا چاہتی ہو؟ کیا جان تمہیں پیسہ نہیں دیتا۔''

''نہیں پیسے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ مجھے پاپا، بس یونہیں دل گھبراتا ہے گھر میں۔ مصروفیت کے
لئے جاب کرنا چاہتی ہوں۔ ممی، ریٹا اور آن سب میرا بہت خیال رکھتی ہیں، اور مجھے میری ضرورت کی سب
چیزیں مل جاتی ہیں۔''

''اچھا پھر میں بات کروں گا۔ جان کا ایک دوست ہے۔ اکبر خان، بہت اچھا آدمی ہے، جان کو بھی
ملتا رہتا تھا، اُس کا اپنا دفتر ہے، امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا ہے۔ اُسے اکثر محنتی لڑکیوں کی ضرورت رہتی
ہے۔ یوں بھی دل کا اچھا آدمی ہے۔''

''تھینک یو پاپا! آپ میرے لئے ضرور بات کیجئے گا۔''

اُس نے پاؤں بیڈ سے نیچے لٹکا دیے اور اجازت طلب نظروں سے اُنہیں دیکھا۔

''پاپا! اب مجھے گھر پہنچا دیں۔ ممی اور آن وغیرہ پریشان ہوں گی۔ اور پھر کیفی نے مجھے نہ پا کر گھر جا
کر نہ جانے کیا بتایا ہو گا۔''

''میں نے فون کر دیا تھا پڑوس میں اور بتا دیا تھا۔ کہ تم اِدھر ہو میرے پاس۔

''اچھا!'' وہ تھوڑی مطمئن ہو گئی۔ ''مگر مجھے گھر تو جانا ہے نا پاپا!''

''یہ گھر بھی تو تمہارا ہی ہے بیٹا!''

''جی لیکن۔''

تب ہی بیل بج اُٹھی۔

پاپا اُٹھ کر دروازے تک گئے، اور پھر ممی اور آن کے ساتھ واپس آ گئے۔

رتن ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''اوہ گاڈ تم اب بالکل ٹھیک ہے ناں لیزا۔''

ممی نے اُس کے رخساروں پر پیار کیا۔

''میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ فادر نے ڈرا ہی دیا تھا۔''

''ممی! آپ کو یوں ہی تکلیف ہوئی۔''

رتن شرمندہ ہو گئی۔

''اس بہانے فادر کی بھی زیارت ہو گئی، بہت دنوں سے دل چاہ رہا تھا'' ممی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

آن ابھی تک کھڑی تھی اور گہری نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''تم تو کیفی کے ساتھ آئی تھی، کیا ہوا تھا۔''؟

''کیفی مجھے انتظار کرنے کا کہہ کر خود کہیں چلا گیا تھا۔''

"کہاں انتظار کرنے کا؟"
آن نے کھوجتی نظروں سے اُسے دیکھا۔
"یہیں اس بلڈنگ میں۔ فورتھ فلور پر۔
وہ جس سے کیفی کو ملنا تھا اُس کا فلیٹ لاک تھا۔"
اب وہ کچھ سنبھل گئی' اور بڑے اعتماد سے بات کر رہی تھی۔
"کیفی مجھے وہاں کھڑا کر کے نیچے چلا گیا تھا۔ شاید فون کرنے اور دوست کا پتا کرنے کیفی کو کچھ گئی تھی' اور مجھے وہاں اکیلے کھڑے ڈر لگنے لگا۔ میں نیچے اُترنے لگی اور مجھے لگا جیسے کوئی میرے پیچھے ہو۔ وہ تو نیچے سے پاپا آ رہے تھے۔ اور۔"
"اور اب وہ بے چارا لڑکا پریشان ہوتا پھر رہا ہوگا۔"
ممی نے تاسف سے اُسے دیکھا۔
"اتنا چھوٹا سا تو تیرا دل ہے لڑکی' اور تو نوکری کرنا مانگتی ہے۔ میں نے اُس کو بولا ہے فادر۔"
ممی فادر کی طرف متوجہ ہو گئیں۔
"اپنے جان کے پاس بہت پیسہ ہے' تم کو نوکری کا ضرورت نہیں ہے۔ اب کے جان آتا ہے اُس کو بول دے گا۔ کہ قسمت اُس کو اتنا اچھا بیوی دے دیا ہے۔ تو اب وہ ٹِک کر بیٹھے گھر بنائے۔"
"ہاں' ہاں ضرور سمجھانا۔"
فادر نے اُن کی تائید کی۔
"اسی نیک پری کے طفیل خداوند یسوع مسیح شاید اُس کے بھی گناہ بخش دے۔" فادر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تم لوگ گپ لگاؤ۔ میں چائے بناتا ہوں۔"
"آپ بیٹھیں پاپا' میں بنا لیتی ہوں۔" آن نے کہا۔
"نہیں۔ نہیں۔ تم میری مہمان ہو' اور چائے تو تم اپنے پاپا کے ہاتھ کی ہی پیو گی۔"
فادر کچن میں چلے گئے' تو آن رتن کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"حیرت ہے کیفی نے تمہاری گمشدگی کی اطلاع ابھی تک گھر پر نہیں دی تھی۔"
"بے چارا لڑکا لوگ ڈھونڈتا پھر رہا ہوگا اسے۔" ممی نے کہا۔
"لیزا۔! ادھر دیکھو میری طرف۔" آن نے سرگوشی کی۔ "کوئی اور بات تو نہیں تھی۔"
"نو۔!" لیزا نے نگاہیں چرا لیں۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ریٹا کو' آن کو' کسی کو بھی اصل نہیں بتائے گی۔
ریٹا کتنی محبت کرتی ہے اُس سے' کتنا چاہتی ہے اُس کو۔ جاب کر رہی ہے' تاکہ کیفی کی بہنوں کی شادی ہو سکے۔ اور اگر اُسے پتا چلے کہ کیفی تو کسی قدر ہرٹ (دکھی) ہو گی وہ۔ ٹوٹ جائے گی بالکل۔ شاید عشق اسے ہی کہتے ہیں۔ میں اُسے بے اعتبار نہیں ہونے دوں گی' اور کیا خبر کیفی بھی اُس سے محبت کرتا ہو۔ اور یہ تو بس مرد کی نیچر ہے نا۔
اور وہ انکل رابرٹ بھی تو مسز مہتا سے کہا کرتے تھے۔ بھئی' یہ باہر تھوڑا بہت سلسلہ تھوڑی تاک جھانکی تو چلتی ہی رہتی ہے نا۔ اس کی پروا نہ کیا کرو۔ اندر سے تو وہ سارے کا سارا تمہارا ہی ہے نا۔"
آن نے پھر کچھ نہیں پوچھا' لیکن شاید اُسے رتن کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ کیفی کی ذات سے ممی کی طرح مطمئن نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو سرے سے سارے مردوں کو ہی بے اعتبار سمجھتی تھی۔

"پرلے درجے کے جھوٹے اور مکار ہوتے ہیں یہ مرد۔" وہ اکثر ریٹا کو سمجھاتی تھی۔ "محبت کا کھیل کھیلتے ہیں۔ محبت کچھ نہیں ہوتی' محبت مشغلہ ہے اور محبت کھیل ہوتی ہے۔
محبت ڈھول ہوتی ہے۔
محبت ریت ہوتی ہے۔
جو مٹھی سے پھسل جائے تو
"اور تم یہ اس لئے کہتی ہو۔ آن بیگم کہ تم نے کبھی محبت کی ہی نہیں' اور نہ ہی تم سے کبھی کسی نے محبت کی ہے۔" ریٹا اُس کی باتوں کو ذرا بھی اہمیت نہ دیتی تھی۔
کوئی مرد زندگی میں کسی سے صرف یہ تین لفظ کہہ دے کہ "آئی لو یو۔"
تو عورت ان تین لفظوں میں سب کچھ ہار جاتی ہے۔ بھلے یہ لفظ جھوٹ ہی کیوں نہ ہوں۔
اور کیفی کے پاس تو اتنے خوبصورت لفظ ہیں کہ میں تو پور پور ان لفظوں میں بھیگ جاتی ہوں۔
کسی قدر خوبصورت اظہار۔
ایک ایک لفظ رنگ و خوشبو میں ڈوبا ہوا۔
اُس کی چاہت کی شدتوں کا اظہار کرتا ہوا۔ میں تو جب جب اُس کے کہے لفظوں کو سوچتی ہوں۔ تب تب میرے اندر رنگ پھوٹنے لگتے ہیں' جیسے اندر آتش بازی ہو رہی ہو۔ انار چھوٹ رہے ہوں۔" اور آن اُس کی باتوں سے اوب جاتی تھی۔
"تم تو پاگل ہو ریٹا۔ دیوانی ہو گئی ہو۔"
"محبت پاگل ہی تو بناتی ہے۔ دیوانہ ہی تو کر دیتی ہے۔"
ریٹا ہار نہیں مانتی تھی۔ اور اب اگر۔ اب اگر۔ اور پتا نہیں یہ لیزا صحیح بھی کہہ رہی ہے یا نہیں۔ اگر یہ سچ بھی کہہ رہی ہو۔ تب بھی پتا نہیں مجھے کیوں اچھا نہیں لگتا۔
آن مسلسل اُسے دیکھ رہی تھی۔
"آن۔" رتن نے پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔
"کیا سوچ رہی ہو؟"
"کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی تھی اب چائے پی کر چلتے ہیں۔ کیا خبر ریٹا آئی ہو' اور کیفی بھی۔ تو کیفی سے تمہارے گم ہو جانے کا سُن کر وہ پریشان ہو جائے۔"
"شاید کیفی نہ آئے۔" رتن نے سوچا۔
"یا پھر کوئی جھوٹ کہانی گھڑ کر سُنا دے۔ اور وہ سب کی نظروں میں گر جائے' بے اعتبار ہو جائے۔"
"خدا کرے کیفی نہ آئے۔" اُس نے بے آواز دُعا کی۔
"لیجئے چائے تیار۔" فادر نے خوشدلی سے کہا اور ٹرے میز پر رکھی۔
"لو بھئی' اب تم چائے سرو کرو۔"
"جی۔" آن چائے بنانے لگی اور فادر نے بسکٹوں کی پلیٹ سب کی طرف بڑھائی۔
چائے پی کر آن اور ممی کھڑی ہو گئیں۔
"بھئی لیزا کو تو اِدھر ہی چھوڑ جاؤ کچھ دن اپنے پاپا کے پاس رہ جائے۔"
"ضرور۔"

"نہیں پاپا!" وہ بھی کھڑی ہوگئی۔

"میں پھر آؤں گی کسی دن۔ آپ میری جاب کی بات ضرور کیجئے گا۔"

"میں کل ہی جاؤں گا اکبر خان کی طرف۔"

"تم جاب ضرور کرے گا بیں۔" ممی نے اُس کے رُخساروں کو محبت سے چھوا۔

"ممی! اسے جاب کرنے دیں، میرا خیال ہے کہ یہ اپنی حفاظت کرسکتی ہے۔"

آن نے رتن کی طرف دیکھا۔

"فادر کہہ رہے تھے کہ مرسی فل گاڈ خود سب کی حفاظت کرتا ہے۔"

رتن نے اعتماد سے کہا اور فادر کو خدا حافظ کہہ کر وہ آن کے ساتھ باہر آگئی۔

☆☆☆☆

اکبر خان کے ہاں رتن کو ریسپشنسٹ کی جاب مل گئی تھی۔ وہ صبح صبح ریٹا اور آن کے ساتھ ہی نکلتی پھر واپسی پر خود آجاتی تھی۔ شروع میں دو چار دن ریٹا اُسے لینے آئی تھی۔ لیکن اب اُسے راستوں کی پہچان تھی۔ چار بجے اُس کا آفس بند ہو جاتا تھا۔ آفس کی یہ عمارت تین چار کمروں پر مشتمل تھی۔ زیادہ لوگ بھی تھے، دو لڑکیاں اور تھیں، ایک اکبر خان کی سیکریٹری تھی مس شہلا۔ اور ایک میڈم روبینہ تھیں۔ شاید کلریکل سٹاف میں تھیں، چند مرد تھے جن میں ایک شبیر صاحب تھے، جن سے اُس کی ایک دو بار ہوئی تھی۔ اُس کا کام ایسا تھا کہ اُسے اسٹاف سے زیادہ واسطہ نہیں تھا۔ وہ لوگ اندر سے ہی باس کے آفس میں آ جاتے تھے۔ اُس کا کام صرف باہر سے آنے والوں سے تھا۔ وہ انٹر کام پر اکبر خان کو اطلاع دیتی اگر وہ کسی سے ملنا تھا۔ اندر بھیج دیتی یا انتظار کرنے کو کہتی اور اگر اکبر خان منع کر دیتا تو معذرت کر لیتی۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ دن طرح طرح کے لوگ آتے رہتے تھے اور ان سب آنے والوں سے اکبر خان ملتا بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھی کھٹ کھٹ مس شہلا اُس کے پاس سے گذرتی، تو اُس کی طرف ایک نرم مسکراہٹ سے ضرور دیکھتی تھی۔

اُسے اپنی جاب اچھی لگی تھی۔ وہ رات کو بستر پر لیٹتی تو ریٹا کو تمام آنے والوں کی تفصیل ضرور تھی۔ لیکن ریٹا بہت پریشان تھی، اُس روز کے بعد سے نہ تو کیفی گھر آیا تھا۔ اور نہ ہی باہر کہیں اُس سے ملا تھا۔ نے کتنی ہی بار اُس کے آفس فون کیا تھا۔ لیکن وہاں سے پتا چلتا کہ وہ آفس نہیں آرہا۔

اُس روز رتن آفس سے آئی تو ریٹا اپنے کمرے میں ہی تھی۔

"تم آفس نہیں گئیں؟" رتن نے پرس ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں۔" ریٹا نے یونہی بیڈ پر لیٹے لیٹے جواب دیا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں، لیکن دل ہی نہیں چاہا۔"

"کیفی ملا تھا؟"

"نہیں۔" ریٹا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "شاید وہ گھر چلا گیا ہے۔ مگر اُس سے پہلے ایسا نہیں ہوا کہ وہ مجھے بتائے بغیر مجھ سے ملے بغیر چلا جائے۔"

"تم اس کے آفس گئی تھیں؟" رتن نے پوچھا۔

"نہیں بس فون کیا تھا۔"

رتن کو اُس پر ترس آرہا تھا۔ کیفی کو شاید ڈر ہے کہ میں نے اُس کے متعلق کہیں کوئی غلط بات آکر

گیا ہو، تبھی تو وہ چھپ رہا ہے، بچ رہا ہے، ریٹا کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ میں اگر اُس کے آفس جا کر اُسے بتادوں کہ میں نے ریٹا کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ اُسے دُکھ نہ دے، یہ لڑکی بہت اچھی ہے بہت گہری محبت کرتی ہے اُس سے۔ یہ صحیح ہے۔ میں کسی وقت یونہی باتوں باتوں میں ریٹا سے اُس کے آفس کا پتا پوچھوں گی۔ یا پھر کسی دن اُس کے گھر چلی جاؤں گی۔ اُس کا فلیٹ وہیں تو ہے نا، پاپا والی بلڈنگ میں۔ لیکن نہیں پاپا تو کہہ رہے تھے کہ انہوں نے کیفی کو کبھی اس بلڈنگ میں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ شاید وہ اُس کے کسی دوست کا فلیٹ ہو، مگر مجھے تو اُس نے یہی بتایا تھا کہ وہ اُس کا فلیٹ ہے۔

"ریٹا!" وہ باتھ روم کی طرف جاتے جاتے مُڑی۔

"تمہیں پتا ہے کیفی کہاں رہتا ہے۔"

"نہیں۔" ریٹا نے اُس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"آن!" ریٹا نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔

"تم سو رہی ہو؟"

"نہیں تو۔"

"کیا بوریت پھیلا رکھی ہے، چلو کہیں گھوم آتے ہیں۔"

ریٹا نے آنسو صاف کر کے کروٹ بدل کر اُسے دیکھا۔

"میرا موڈ نہیں ہے۔ لیزا کو لے جاؤ۔"

"لیزا آگئی ہے؟"

"ہاں منہ ہاتھ دھو رہی ہے۔"

ریٹا اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ریٹا" آن اُس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ کیفی کیوں غائب ہے۔ کہیں لیزا اُسی سے تو خوفزدہ ہو کر نہیں بھاگ گئی۔ کہیں اُس نے ریپ (RAPE) کرنے۔"

"آن!" ریٹا زور سے چیخی۔

"فار گاڈ سیک آن کچھ مت کہنا پلیز۔ کیفی ایسا نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔"

وہ زور زور سے رونے لگی۔ "ضرور اُس کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ شاید وہ اچانک اپنے گھر چلا گیا ہے، اُس کی ممی بھی اکثر بیمار رہتی ہیں نا۔" لیزا تولیہ ہاتھ میں پکڑے باہر آگئی تھی۔

"کیا ہوا۔ ریٹا کو کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔" ریٹا نے سنبھلنے کی کوشش کی۔

"اور اگر کیفی پلٹ کر نہ آیا اور اُس نے سچ مچ بے وفائی کی تو۔ تو کیا ہوگا۔؟"

آن نے افسردگی سے سوچا۔

"ریٹا کیسے جی پائے گی۔ جو اُس کے لئے مذہب تک چھوڑنے کو تیار ہے۔"

"ریٹا!" لیزا نے جھک کر پیار سے اُس کے آنسو پونچھے۔

"اتنا چھوٹا سا دل ہے تمہارا۔ کیفی آجائے گا۔ فکر نہ کرو۔"

"اُسے آنا چاہیے تھا لیزا! وہ تمہیں ساتھ لے کر گیا تھا۔ اور واپسی پر جب تم اُسے نہیں ملیں
ایک نیچرل بات ہے کہ اُسے گھر میں سے پتا کرنا تھا تمہارا۔"

آن نے بہت غور سے لیزا کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"آخر وہ کیوں نہیں آیا۔"

"شاید۔ ممکن ہے اُسے پاپا مل گئے ہوں۔ ہمارے آنے کے بعد' اور انہوں نے بتا دیا ہو۔
وہاں ہی تو ڈھونڈ رہا ہوگا مجھے۔"

"ہاں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ آن! اُسے پاپا مل گئے ہوں۔" ریتا نے خوش دلی سے کہا۔

"تم یونہی شک کرتی ہو۔ کیفی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ بلیومی آن (میرا یقین کرو) اُس کی محبت میں
کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ وہ بہت سچا' بہت کھرا آدمی ہے۔ اور لیزا کی تو وہ بہت عزت کرتا ہے۔ بہت پیار
کرتا ہے اس کی۔"

"آل رائیٹ ریتا! آن مُسکرا دی۔" چلو اُٹھو کہیں گھومنے چلتے ہیں۔ تم بھی تیار ہو جاؤ لیزا! بہت دن
ہو گئے ہیں۔ ہم باہر نہیں گئے۔ ممی کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" رتن نے تائید کی' کہیں چلتے ہیں۔"

حالانکہ وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔

چھ سات گھنٹے مسلسل کُرسی پر بیٹھے بیٹھے بندہ اکڑ جاتا ہے۔ وہ اس وقت لیٹنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ
خیال سے تیار ہو گئی۔ اُس نے ریتا کی افسردگی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ کیسے ہر وقت ہنستی کھلکھلاتی رہتی
خوش اور مطمئن لیکن اب۔

"جاب نے تم پر اچھا اثر ڈالا ہے۔"

راستے میں ریتا نے کہا۔

"تم اب اتنی بے چین اور مضطرب نظر نہیں آتیں۔"

"انسان کو حالات سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔"

ریتا! جواب میں آن نے کہا۔

"جان اتنا بُرا اثر کا نہیں ہے۔ لیزا بھی ہولے ہولے ایڈجسٹ کرے گی۔ کیوں لیزا۔"

"ہاں۔" لیزا نے چونکتے ہوئے کہا۔ "ہاں شاید۔"

"کیا تمہیں اب ذرا بھی بے چینی نہیں ہوتی؟" ریتا نے پھر پوچھا۔

"بے چینی۔ بے چینی تو ہوتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے دل چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں نکل
پتا نہیں کہاں' اور کبھی کبھی وہ سب۔ بھابھو' پھوپو' ماما' تاجی' وکرم سب بہت یاد آتے ہیں۔ کبھی کبھی تو آفس
بیٹھے حلق خشک ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے برسوں سے پیاسی ہوں۔"

"اور لڑکی لوٹو۔" ممی نے اُنہیں ٹوکا۔ "یہ کیا باتیں شروع کر دیں ہیں تم نے۔ اچھی اچھی
گھومنے نکلی ہو۔"

"جی ممی! آن نے جواب دیا۔ اور قریب سے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روکا۔ اور چاروں کلفٹن جانے کے
لئے اُس میں سوار ہو گئیں۔

☆☆☆☆

رتن آج گھر میں داخل ہوئی تو بہت تھکی تھکی اور نڈھال سی تھی۔ لیکن چج میں ہی اُسے ریتا اور کیفی
کے ہنسنے کی آواز آئی۔ ممی اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی اپنا مخصوص کام کر رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا۔

"ہیلو ممی!

"ہیلو لیزا! تم آ گئیں۔"

"ریتا آج پھر آفس نہیں گئی۔؟

"گئی تو تھی' لیکن پھر کیفی اُسے اُس کے آفس سے لے آیا۔"

"اچھا کیفی آ گیا ہے۔" اُس کے ہونٹوں پر آسودہ سی مُسکراہٹ آ گئی۔

کل شام کو اُس کا کیفی کے آفس جانا بیکار نہیں گیا تھا۔

"ہاں" ممی نے خوش ہو کر بتایا۔

"اُسے اچانک گھر جانا پڑ گیا تھا' اُس کا ممی بیمار ہو گیا تھا۔ اور تمہارے متعلق فادر نے اُسے بتا دیا تھا۔"

ممی بھی ریتا کی افسردگی سے اُداس تھیں۔ شاید۔ انہیں کیفی کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن آج وہ بہت
خوش لگ رہی تھیں۔

"چائے پیو گی۔؟" ممی نے پوچھا۔

"ابھی کیفی کے لئے بنایا تھا۔ کچن میں جا کر ایک کپ بنا لو۔"

"نو ممی! آج بہت تھک گئی ہوں۔ تھوڑی دیر لیٹوں گی۔"

تب ہی ریتا ہنستی ہوئی کیفی کے ساتھ باہر نکلی۔ وہ بہت فریش اور خوش لگ رہی تھی۔ اُس کی سانولی
رنگت دمک رہی تھی' اور آنکھیں ستاروں کی طرح روشن لگ رہی تھیں۔

"ہیلو لیزا! تم آ گئیں۔"

اُس نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔

"کیسی ہو؟" کیفی نے پوچھا۔

"فائن!

"سنا ہے' تمہیں جاب مل گئی ہے۔ سوری میں نہیں دِلوا سکا۔"

"اچھا ممی! میں ذرا کیفی کے ساتھ جا رہی ہوں طارق روڈ تک' اسے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ کسی
دوست کی شادی ہے گفٹ لینا ہے۔ آپ کو کچھ چاہئے اور تمہیں لیزا۔"

"نو تھینک یو۔"

رتن شکریہ ادا کر کے کمرے میں آ گئی۔ اُس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اُس روز کلفٹن سے واپسی پر
ریتا نے اُسے کیفی کا دفتر دکھایا تھا۔

"یہ اس آفس میں کیفی کام کرتا ہے۔"

"یہ بھلا کون سا روڈ ہے؟"

اُس نے پوچھ لیا تھا۔ اور پھر ذہن میں رکھ لیا' اور پھر کل شام اپنے آفس سے نکل کر کیفی کا آفس
ڈھونڈنے میں اسے زیادہ وقت نہیں ہوئی تھی۔ کیفی آفس سے باہر نکل رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے
حیران رہ گیا۔

"ہیلو۔!" لیزا نے اُسے مخاطب کیا۔ "آپ یہاں کام کرتے ہیں اس آفس میں۔"

''جی۔'' وہ کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔

''ریٹا! آپ کو بہت مس کر رہی ہے۔'' لیزا نے کھڑے کھڑے کہا۔ ''آپ پھر گھر نہیں آ

''وہ بس یوں ہی کچھ۔''

کیفی کی شاید کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے' اور کیا سمجھے۔

''لیزا! اُدھر سامنے ریسٹورنٹ ہے۔ وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

لیزا خاموشی سے اُس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ وہاں تک جاتے جاتے کیفی بہت حد تک سنبھل گیا

''اس روز تم یونہی ڈر کر بھاگ گئی تھیں۔ میں کوئی تمہیں نقصان تو نہیں پہنچانے لگا تھا۔ لیزا! تمہاری بہت عزت کرتا ہوں۔ بہت احساس ہے مجھے کہ تم اپنا گھر اپنے عزیزوں کو چھوڑ کر آئی ہو۔ یہ تو ہما ہے۔ کہ ہم تمہارا خیال رکھیں۔''

اب وہ اتنے اعتماد اور یقین سے بات کر رہا تھا کہ اُسے شک ہونے لگا جیسے اُس روز وہ یونہی خوفزدہ ہو گئی تھی۔ شاید اُسے ہی غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔

اُس نے سوچا اور کیفی کو بتایا کہ اُس نے ریٹا پاپا اور سب لوگوں سے کیا جھوٹ بولا تھا۔

''ارے تم تو بہت عقلمند لڑکی ہو۔ میں تو تمہیں بیوقوف سمجھ رہا تھا۔''

کیفی ایک دم خوش ہو گیا تھا۔

''ریٹا آپ سے بہت محبت کرتی ہے' اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ آپ سے بدگمان ہو۔''

اور آج کیفی موجود تھا' اور ریٹا خوش تھی۔

''چلو یہ بھی اچھا ہو گیا کہ کیفی مجھے مل گیا تھا کل شام۔ ورنہ ریٹا کی افسردگی دیکھتے ہوئے میں مجرم سمجھنے لگتی تھی۔''

اُس نے پرس ایک طرف پھینکا اور خود بھی بیڈ پر گر سی گئی۔ آج پھر اُس کے دل میں یہ سوالوں کے کانٹے اُگ آئے تھے۔ آج پھر وہی روز اوّل والا اضطراب جاگ اُٹھا تھا۔ اس ساری جدو حصل کیا ہے؟

ایک معمولی جاب۔

جان جیسا شوہر

اور اس کے عوض کیا کچھ کھویا تھا۔

کیسے کیسے رشتے چھوڑ آئی تھی۔

اور پایا کیا تھا۔ ملا کیا تھا اُسے' کچھ بھی نہیں۔ خالی دامن لئے کھڑی تھی۔ اور وہ اصغر بابا کہہ من کا میل دور ہو جائے تو منزل خود بخود پکار لیتی ہے۔ پھر اُسے منزل کیوں نہیں پکارتی' کیا اُس کا من میلا

کیا اُس کے دل میں کہیں کوئی کھوٹ ہے۔

اصغر بابا اُس کے آفس میں چوکیدار تھے۔ سفید داڑھی روشن کشادہ پیشانی۔ وہ جب سے اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ ظہر کی نماز آفس ہی مین پڑھا کرتے تھے۔

بالکل اُس کے کیبن کے سامنے' وہ جاء نماز بچھا کر نماز پڑھتے تھے' اور وہ غور سے اُنھیں رہتی تھی۔ آج اس نے اُن سے پوچھ لیا تھا۔

''بابا! کیا سب مسلمان اسی طرح عبادت کرتے ہیں۔ جیسے تم کرتے ہو۔؟''

''ہاں۔'' اصغر بابا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کیا آپ نے بی بی پہلے کبھی مسلمانوں کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔''

اور کتنی عجیب بات تھی کہ اُس سے قبل اُس نے کسی مسلمان کو عبادت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اُن کی کتابیں دیکھی تھیں۔ اور سمجھتی تھی کہ سب مسلمان مسجد میں جا کر عبادت کرتے ہوں گے۔ اُس کے ساتھ کئی مسلمان مسلمان لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ لیکن اُس کی کسی سے دوستی نہ تھی۔ اُس کی دوستی تو کسی ہندو لڑکی سے بھی نہ تھی۔

بس اُس کے دوست تو صرف دیپو بھابھو اور انکل رابرٹ تھے۔

''بابا! کیا آپ کا دھرم سچا ہے۔ اور کیا آپ کو یقین ہے اس کا۔''

''من میلا نہ ہو تو یقین خود بخود مل جاتا ہے بی بی! لیکن ہمارے تو من میلے ہو گئے ہیں۔ دل کالے ہیں۔ اس لئے تو ہمارا یقین ہم سے چھن گیا ہے۔''

بابا! تم مجھے اپنے مذہب کے متعلق بتاؤ نا کچھ۔

تب ہی آفس کی بیل بج اُٹھی۔

''صاحب بلا رہے ہیں' پھر آؤں گا۔''

''بابا' کچھ تھوڑا سا تو بتاؤ نا۔''

''بی بی! جو زمینی آقا کی غلامی میں سچا نہیں ہوتا۔ وہ آسمانی آقا کی بندگی میں بھی ڈنڈی مار جاتا ہے۔ میں دونوں آقاؤں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس لئے فارغ ہو کر جو جانتا ہوں بتا دوں گا۔''

اصغر حسین چلا گیا تھا اور اُس کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ آج بڑے دنوں بعد اُسے پروفیسر احسان فتح بھی یاد آئے تھے۔ اُن کی باتیں یاد آئی تھیں' اُن کی باتیں تو سیدھی دل میں اُتر جاتی تھیں۔ تھوڑی دیر کے لئے تو یوں لگتا تھا جیسے برسوں کی پیاس بجھ گئی ہو۔ لیکن پھر وہی تشنگی' وہی اضطراب چھا جاتا۔ اصغر حسین کو پھر فرصت نہیں ملی تھی۔ اس کی ڈیوٹی تھی کہ وہ اکبر خان کے آفس کے باہر بیٹھتا تھا۔ سارا دن میں بس وہ ظہر کی نماز کے لئے اٹھتا تھا۔

کئی بار اُس نے اپنے کیبن میں سے اُس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔ وقفے وقفے سے بیل ہوتی رہتی تھی' اور وہ فائلوں کے ڈھیر اُٹھائے اِدھر سے اُدھر آ جا رہا ہوتا تھا۔

آج جب وہ آفس سے اُٹھی' تو اس کا ارادہ تھا کہ وہ ریٹا سے کہہ کر پروفیسر صاحب کی طرف جائے گی۔ لیکن ریٹا کیفی کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اور آن کے ساتھ وہ اتنی بے تکلف نہ تھی۔

کچھ دیر وہ یونہی بستر پر لیٹی رہی پھر اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ کچن میں آ کر چائے بنائی اور آن کے کمرے میں جھانکا۔ آن کاپیاں چیک کر رہی تھی۔ اُس کی عادت تھی کہ وہ اکثر بچوں کی ہوم ورک کی کاپیاں گھر لے آتی تھی' جس پر ریٹا بہت چڑتی تھی۔

''یار! کیا مصیبت ہے۔ گھر میں بھی دماغ کھپاؤ۔''

لیکن آن کا خیال تھا کہ اس طرح گھر میں بھی اچھا وقت گذر جاتا ہے۔ دراصل اُسے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ نہ ٹی وی دیکھنے سے نہ اخبار و رسائل سے۔

''آ جاؤ لیزا!'' آن نے اُسے جھانکتے دیکھ لیا تھا۔

لیزا کپ اٹھائے اندر آ گئی۔

''چائے پیو گی؟''

''نہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی پی ہے۔ کیفی آیا تھا تو ممی نے بنائی تھی۔''

''بیٹھو۔ کیسی جا رہی ہے تمہاری جاب''؟

''ٹھیک۔'' لیزا اُس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''ہوں۔'' آن نے مارکر بند کر کے ٹیبل پر رکھا۔ اور کُرسی کا رُخ تھوڑا اُس کی طرف موڑ لیا۔ ریٹا اور کیفی چلے گئے؟''

''ہاں کیفی کو کچھ شاپنگ کرنا تھی۔''

''ریٹا کیفی کو بہت چاہتی ہے۔''

''جی۔''

''کیفی کو چاہئے کہ اب وہ اُس سے شادی کر لے' میں نے کتنی بار ریٹا سے کہا ہے کہ وہ اُس شادی کے لئے کہے۔''

''کہا تو تھا۔ اور ممی نے بھی کہا تھا۔'' لیزا نے بتایا۔

''اچھا۔'' آن کو حیرت ہوئی۔ ''مجھے تو معلوم نہیں۔''

''وہ کیفی ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اُس کی بہنیں ہیں نا۔ وہ پہلے اُن کی شادیاں کرے گا۔ پھر اپنی

''اچھا' تم آج اِدھر میرے کمرے میں کیسے آ گئیں۔'' آن نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

''بس وہ ریٹا نہیں تھی نا' اس لئے۔''

''مجھے بہت خوشی ہوتی ہے' لیزا کہ تم اب بہت خود اعتماد نظر آتی ہو۔ اس طرح زندگی سہل ہو ہے۔ جان کوئی قابلِ اعتبار آدمی نہیں ہے۔ تم ہمیشہ اپنے آپ کو اس بات کے لئے ذہنی طور پر تیار رکھنا وقت کسی بھی لمحہ تمہیں چھوڑ سکتا ہے۔ ریٹا کی باتوں کا اعتبار نہ کرنا اُسے آدمیوں کی پہچان نہیں ہے۔ لیکن جانتی ہوں' جان من کا میلا آدمی ہے۔ چلو چھوڑو میں بھی کیا موضوع لے بیٹھی۔ تم بتاؤ شاید کچھ کہنا چاہتی ہو

''کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ آج میرا دل چاہ رہا تھا۔ کہ میں پروفیسر صاحب کی طرف جاؤں

''کون پروفیسر صاحب؟'' آن نے پوچھا۔

''وہ پروفیسر احسان فتح پوری۔ وہی جو مسز شیر دل کے ہاں پارٹی میں ملے تھے۔''

''اوہ اچھا۔!'' آن نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''بہت قابل آدمی ہیں۔''

''ہاں کیفی کے ساتھ میں اور ریٹا ان کے گھر گئے تھے۔ مجھے اُن کی باتیں' اچھی لگتی ہیں آن۔ میرا چاہتا ہے۔ وہ بولتے رہیں۔ اور میں سنتی رہوں۔ تشنگی کم ہوتی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے۔ اضطراب اور بھی کم ہو جاتی ہے۔ مجھے حوصلہ اور یقین ملتا ہے۔ اُن کی باتوں سے' وہ جو ہولے ہولے میرے اندر پنجے مایوسی سی پنجے گاڑنے لگتی ہے وہ کم ہو جاتی ہے۔ ختم ہو جاتی ہے۔ میرے اندر ایک امید سی پیدا ہو جاتی ہے کہ طلب رائیگاں نہیں جائے گا۔ میں کبھی نہ کبھی حق کا راستہ پا لوں گی۔ جیسے میں صحیح راہ پر چل رہی ہوں۔''

''تم بہت عجیب لڑکی ہو لیزا۔'' آن ہولے سے ہنسی۔

''جب مجھے یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ تم ایڈجسٹ ہو گئی ہو۔ اور تم نے اس سب کو اور جان کو قبول ہے۔ تو پھر تم وہی پرانی باتیں کرنے لگتی ہو۔''

لیزا خاموش ہی رہی' اُس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا خالی کپ میز پر رکھا۔

''تم کام کر رہی تھیں۔ آن میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔''

''کوئی بات نہیں لیزا۔ بیٹھو۔ سنو تم شاید پروفیسر احسان کی طرف جانا چاہتی ہو۔''

''ہاں۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن مجھے ٹھیک طرح سے اُن کا ایڈریس یاد نہیں ہے۔ کیفی کے ساتھ ہی گئی ہوں۔ اور ایڈریس پوچھا ہی نہیں۔''

''ٹھہرو۔'' آن نے لمحہ بھر کچھ سوچا۔

''چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ راستے میں سے مسز شیر دل کو کسی پی۔ سی۔ او۔ سے فون کر کے اُن کا پتا پوچھ لیتے ہیں۔''

''تھینک یو آن۔'' لیزا کی آواز بھر آ گئی۔

''تم سب لوگ بہت اچھے ہو اور میرا بہت خیال رکھتے ہو' میں مر کر بھی تمہارا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔''

''بیوقوف ہو تم۔ چلو اُٹھو۔ چلتے ہیں۔ میری بھی آؤٹنگ ہو جائے گی۔''

☆☆☆☆

پروفیسر احسان فتح پوری کے گھر آج بھی محفل جمی تھی۔ تین چار طلباء بیٹھے تھے' اور ایک طرف دو ادھیڑ عمر کے مرد بھی تھے۔ آن چونکہ پہلی مرتبہ آئی تھی' اس لئے اندر جاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ لیکن لیزا نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''تم آن' یہاں کسی کے اندر آنے پر پابندی نہیں ہے۔''

پروفیسر صاحب نے بات کرتے کرتے نظر اُٹھا کر اُنہیں دیکھا۔ سر کے اشارے سے اُن کے آداب کا جواب دیا۔ اور اشارے سے ہی اُنہیں بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ دونوں ایک طرف مؤدب سی بیٹھ گئیں۔ تو پروفیسر احسان اُن آدمیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''یہ حیرت کی بات نہیں ہے میاں! حقیقت ہے کہ سائنس جس مقام پر آج پہنچ رہی ہے' ہمارے صوفیا' اور اولیاء اس پر آج سے صدیوں پہلے پہنچ گئے تھے۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ نظر آنے والی کائنات ایک فریب نظر کے سوا اور کچھ نہیں ہے' جس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ناموجود ہے بلکہ یہ کہ وہ ایسی نہیں جیسے کہ نظر آتی ہے' اور پھر وہ کیسی ہے' اس کے جواب میں صوفیاء نے قطرے میں دجلے کا ذکر کیا اور کہا کہ دجلہ تو ہمہ وقت قطرے کے اندر موجود تھا بلکہ یہ قطرہ تو خود دجلہ تھا۔ قصور دیکھنے والی آنکھ کا ہے کہ اُسے بصورت قطرہ نظر آیا بصورت دجلہ نہیں۔ کثرت کا عالم فریب نظر ہے۔ اصل حقیقت ایک عظیم وحدت کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

''سبحان اللہ۔''

قریب بیٹھے ہوئے شخص نے بے اختیار کہا۔

''کس قدر خوبصورتی کے ساتھ آپ نے کائنات کی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ ساری بات علم کی ہے۔''

''میاں! میں کیا اور میرا علم کیا' یہ تو مدت ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک مضمون پڑھا تھا۔'' دمادم صدائے کن فیکون'' اسی موضوع پر پڑھا تھا۔ تم نے کائنات کے متعلق پوچھا تو اُن کا لکھا مضمون ذہن میں آ گیا۔''

''ہاں تو بی بی۔'' وہ رتن کی طرف متوجہ ہوئے' کیا حال ہے آپ کا' ذہن کے شکوک کچھ کم ہوئے یا نہیں۔؟''

''نہیں!'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابھی تو لگتا ہے جیسے وہیں کھڑی ہوں' جہاں سے چلی تھی۔ کولہو کے بیل کی طرح جو جتنا بھی چلے وہیں رہتا ہے۔''

پروفیسر احسان مُسکرائے۔

''آپ پھر آئیں ہی نہیں' میں نے آپ سے کہا تھا۔
آپ کو اپنے مُرشد سے مِلواؤں گا۔''

''تو اب مِلوا دیں۔'' اُس نے بے قراری سے کہا۔

''اب تو ممکن نہیں اس وقت' پھر کبھی سہی' یہ کچھ طلباء بیٹھے ہیں۔ کچھ پوچھنے آئے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو پہلے ان کو مطمئن کر دوں' پھر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔''

''جی ضرور۔'' آن نے بے قراری سے پہلو بدلا تو انہوں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''یہ ریٹا کی سِسٹر ہیں۔ آن۔ اسکول میں پڑھاتی ہیں۔''

''بہت اچھا کام کر رہی ہو بی بی! پھر مضطرب سی کیوں لگ رہی ہو۔''

''نہیں تو۔ بالکل بھی نہیں' میں اپنی زندگی سے بالکل مطمئن ہوں' یہ تو لیزا ہے۔ جو ــــ؟

پروفیسر احسان مُسکرائے اور طلباء کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ہاں تو کل بات کہاں چھوڑی تھی۔''

''سر! وہ بابا فرید گنج کی شاعری پر بات ہو رہی تھی۔'' ایک لڑکے نے کہا۔

''ہاں' ہاں میں تمھیں بتا رہا تھا کہ بابا فرید گنج کی شاعری میں راہِ نجات بھی ہے' اور خالق حقیقی کے ہاں حاضر ہونے کی سامان بھی موجود ہے۔ وہ اپنی شاعری میں یہ احساس دلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محبوب حق ہے اور وہی ایک خالق اور مالک' وہی خالق ہے وہی رازق ہے۔ وہ سدا سے ہے اور سدا۔۔ رہے گا۔
وہ مالک بھی ہے اور جبار بھی اور قہار بھی۔''

پروفیسر احسان فتح پوری بول رہے تھے' اور وہ پورے دھیان سے سُن رہی تھی۔ ایک فصاحت و بلاغت کا دریا تھا۔ جو چلا جا رہا تھا' آن بھی حیرت سے سُن رہی تھی۔ پروفیسر احسان بول رہے تھے۔ وہ بابا فرید گنج کا کوئی شعر پڑھتے' اور پھر اُس کی تشریح کرتے چلے جاتے۔

''محبت وہ جذبہ ہے جس کے سامنے کسی بھی چیز کی کوئی وقعت نہیں رہتی' اور یہ عجز و انکساری کے بغیر ممکن نہیں۔ جب عشقِ حقیقی ہو' رب کریم کی محبت ہو۔ مرشد کے ساتھ عقیدت ہو پھر غیر اللہ کی پروا نہیں ہوتی اور نہ دنیا کی' جو لوبھ اور لالچ کے کیچڑ سے بھری ہوئی ہے۔''

لیزا کی آنکھوں میں بار بار آنسو آ جاتے تھے۔ یہ بابا فرید نے کتنی سچی اور کھری باتیں کی تھیں۔

فرید اگلیئیں چکڑ دور گھر نال پیار ہے نینہ
چلاں تاں بھجے کملی رہاں تاں ٹٹے مینہ

گلیوں میں کیچڑ ہے محبوب کا گھر دور ہے مرشد کے ساتھ اقرار بھی ہے۔ جانا بھی ضروری ہے' کیونکہ محبت اور انکساری میں صرف حکم ماننا ہوتا ہے' اس میں ''نہ'' کی گنجائش نہیں ہوتی۔''

وہ شعر پڑھتے رہے' اُن کی تشریح کرتے رہے اور وقت گذرنے کا احساس ہی نہیں ہوا' اور ہمیشہ کی طرح مغرب کی اذان ہو گئی۔ پروفیسر صاحب کھڑے ہو گئے' اور اُن کے ساتھ دوسرے افراد بھی۔ لیزا حیران بیٹھی تھی' اور پروفیسر صاحب کے لیکچر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

''بی بی! آج بھی آپ سے بات نہ ہو سکی۔''
پروفیسر صاحب نے معذرت کی۔

''ایسا کریں۔ کسی دن جمعہ کو تشریف لائیں۔ اُس دن میں اکیلا ہوتا ہوں۔ یہ طلباء وغیرہ اس روز نہیں ہوتے۔''

''جی۔ شکریہ۔'' لیزا کھڑی ہو گئی۔

''کوشش کروں گا کہ آپ کے ذہن کے کچھ شکوک کم کر سکوں۔''

''شکریہ سر!'' اُس نے ایک بار پھر شکریہ ادا کیا۔ اور آن کے ساتھ باہر آ گئی۔

رات وہ ٹھیک سے ہو نہیں سکی تھی۔ اس لئے صبح اُس کا ذہن بوجھل بوجھل سا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے سوچا چھٹی کر لے۔ مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ ابھی نئی نئی جاب ہے' اور پھر اکبر خان بھی کچھ سخت مزاج کا آدمی تھا' اس لئے وہ آ گئی تھی۔ مگر اب اُس سے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اصغر حسین' اکبر خان کے آفس کے باہر اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ اور انگلیوں پر وہ کچھ شمار کرتا جا رہا تھا۔ وہ جب بھی فارغ ہوتا۔ وہ دیکھتی تھی کہ اُس کے ہونٹ ہلتے رہتے تھے۔ شاید وہ کچھ پڑھتا رہتا تھا۔

کوئی دُعا۔

کوئی وظیفہ۔

شاید یہ بھی اُس کی عبادت کا ایک طریقہ تھا۔

وہ اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہ کسی نے میز پر انگلی بجائی۔

''ہیلو مِس! اگر آپ اصغر بابا کا مطالعہ کر چکی ہوں۔ تو ادھر بھی متوجہ ہوں۔''

''سوری۔'' وہ شرمندہ ہو گئی۔

''فرمایئے۔؟''

اکبر خان ہیں۔؟''

''جی سر۔!''

''انہیں بتاؤ کہ داؤد خان آیا ہے پشاور سے۔''

''جی سر! آپ تشریف رکھیں۔ میں انفارم کرتی ہوں۔''

وہ انٹر کام پر اکبر خان کو اُس کے متعلق بتانے لگی۔

''جی سر! جایئے! وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

داؤد خان نے ایک گہری نگاہ اُس پر ڈالی اور پھر پیچھے مُڑ کر اپنے ساتھ آنے والے سے کہا۔

''اکبر خان ہمیشہ اچھی چیز پسند کرتا ہے۔ لڑکی زبردست ہے۔''

اُس نے لیزا کو آنکھ ماری۔ لیزا کا رنگ یکدم سُرخ ہو گیا۔ اور اُس نے نگاہیں جھکا لیں۔ کچھ کہنے کے لئے اُس نے لب کھولے اور پھر بند کر لئے۔ مِس شہلا نے پہلے دن اُسے بتا دیا تھا کہ بعض اوقات کچھ منچلے آ جاتے ہیں۔ اور سب کے ساتھ اخلاق سے پیش آنا' اُس کی جاب کا حصہ ہے۔

داؤد خان چلا گیا تو اُس نے سر اُٹھا کر آنے والے کی طرف دیکھا' اُس کی پیشانی پر ناگواری سے بل پڑی ہوئی تھیں۔

جیسے اُسے داؤد خان کی بات اچھی نہ لگی ہو' اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں معذرت طلب نظروں سے دیکھا۔ اور سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''چائے یا ٹھنڈا'' لیزا نے پوچھا۔

"NOTHING (کچھ نہیں)"

داؤد خان کے ساتھی نے سنٹر ٹیبل پر پڑا ہوا اخبار اُٹھا لیا اور دیکھنے لگا۔ لیزا نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔

کشادہ پیشانی۔

خوبصورت ملوک آنکھیں' جن میں ہلکا ہلکا ملال کا رنگ تھا۔

دلکش نقوش۔

چہرے پر بلا کی سنجیدگی۔ اُس کی طرف دیکھتے دیکھتے یکا یک لیزا کا دل زور سے دھڑک اُٹھا۔ زور سے کہ دھڑکن اُسے سُنائی دینے لگی۔

"اُف اوہ۔"

اُس نے گھبرا کر دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

اپنے چہرے پر اُس کی نگاہوں کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے اجنبی نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ کی نگاہیں لیزا کی نظروں سے ٹکرائیں۔

کیا تھا اُن کی آنکھوں میں؟

کیسی تھیں وہ آنکھیں۔

بلا کی خطیب ملوک آنکھیں۔

تھکی تھکی مضمحل آنکھیں۔

جن میں عجیب سے رنگ تھے۔

مایوسی کے' اُداسی کے۔

جیسے کوئی زندگی کی ساری بازیاں ہارے موت کے انتظار میں بیٹھا ہو۔ کون ہے یہ شخص انتظا[illegible] تھکا ہوا۔

کیا اسے بھی حق کی تلاش ہے اور اب اس تلاش میں ناکام ہو گیا ہے۔ تو یہ حزن و ملال کے [illegible] کے اندر اُتر آئے ہیں۔ لیزا اب بھی اُسے ہی دیکھے جا رہی تھی۔ اجنبی نے الجھ کر پھر نگاہیں جھکا لیں اخبار دیکھنے لگا۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ لیزا کو کچھ خبر نہیں تھی' وہ تو بس اُسے ہی دیکھے جا رہی تھی۔ جانے [illegible] نظروں میں کہ وہ اندر باہر سے راکھ ہوئی جا رہی تھی۔

اکبر خان' داؤد خان کے ساتھ اپنے آفس سے باہر نکلا تو وہ چونک کر اُس کی تعظیم کے لئے کھڑ[illegible]

اکبر خان نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بیٹھنے کے لئے کہا تو داؤد خان اُس کی طرف دیکھ کر خباثت سے مسکر[illegible]

"تمہاری چوائس کو ہمیشہ داد دینے کو جی چاہتا ہے اکبر خان!"

اکبر خان نے ایک غصیلی نظر اُس پر ڈالی۔

"گھر کی عورت قابلِ عزت ہوتی ہے داؤد خان اور یہ بات میں نے کتنی بار تمہیں سمجھائی۔"

"تمہارے استقبالیہ آفس میں بیٹھنے والی گھر کی عزت کیسے بن گئی۔ کیا تم اسے گھر میں ڈال [illegible]"

"بکومت۔ یہ جان کی بیوی ہے۔"

"جان کی بیوی؟" داؤد خان نے حیرت سے پوچھا۔

"اُس نے شادی کب کر لی؟"

"معلوم نہیں' لیکن اُس کے فادر نے مجھ سے اس کی جاب کے لئے کہا تھا۔ اور تمہیں پتا ہے داؤد [illegible] میں فادر کی بہت عزت کرتا ہوں۔"

"لیکن جان کی بیوی کو نوکری کی کیا ضرورت ہے۔ بھائی؟"

"بس مصروفیت کے لئے"

"اوئے خدایا۔" داؤد خان اپنی ران پر ہاتھ مار کر ہنسا۔

"جان کی بیوی۔ جان نے بتایا تھا۔ بتایا تھا مجھے' میرے دماغ سے نکل گیا تھا۔ انڈیا سے بیاہ کر لایا ہے۔"

داؤد خان کی آواز سرگوشیوں میں ڈھل گئی۔ خدا جانے اُس نے کیا کہا تھا کہ اکبر خان نے دو تین بار لیزا کی طرف دیکھا۔ گہری تنقیدی نظروں سے' اور پھر اثبات میں سر ہلا کر اجنبی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اکبر خان!" اُس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اجنبی کھڑا ہو گیا۔

"تبریز مراد علی خان۔"

اجنبی کے لہجے میں بھی ٹھہراؤ سا تھا۔ کیسی مقناطیسیت تھی اُس کی ذات میں۔ لیزا اب بھی اسے دیکھ [illegible]

"کون تھا یہ اجنبی؟"

اور وہ کیوں اُس کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی۔

اُس نے اُلجھ کر سوچا اور اپنی نگاہیں جُھکا لیں۔ اکبر خان اُس سے اور داؤد خان سے باتیں کرتا ہوا باہر چلا [illegible] یک اُسے یوں لگا' جیسے اُس کے چاروں طرف اندھیرا سا ہو گیا ہو۔ اور اس کے دل میں ویرانی اُتر آئی ہو۔

عجیب سی ویرانی اور تنہائی کا احساس ہوا اُسے۔

"بابا۔ بابا پلیز۔ ادھر آئیں۔!"

اُس نے اصغر حسین کو آواز دی اور نڈھال سی ہو کر سر ٹیبل پر رکھ دیا۔

☆☆☆☆

مدحت کو گاؤں آئے کئی دن ہو گئے تھے مگر ابھی تک وہ سنبھل نہیں پائی تھی' اُس کے چہرے پر یونہی [illegible] پھیلی تھیں۔ اور پلکیں آپوں آپ بھیگ جاتیں۔ میاں جی نے کئی بار پوچھا تھا۔

"کیا بات ہے مدحت بیٹا! جو کچھ دل میں ہے کہہ دو۔"

"کچھ نہیں میاں جی!"

وہ پلکیں جھکا لیتی اور بے اختیار اُمڈ آنے والے آنسو پینے کی کوشش کرتی۔

"پتا نہیں کیوں آج کل ماں جی بہت یاد آتی ہیں۔"

اور ڈاکٹر شاہ محمد گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھ کر اُس کا دل بہلانے کی کوشش کرتے۔

"کوئی بات ہے ضرور جو تمہیں پریشان کر رہی ہے بیٹا!" وہ یقین سے کہتے۔

"کوئی بات نہیں ڈاکٹر انکل! بس مجھے مہران آپا کے جانے کا اور کاکا سائیں کی موت کا بہت دُکھ ہے۔"

ڈاکٹر شاہ محمد اُس کی بات سُن تو لیتے لیکن یقین نہیں کرتے تھے۔

"قطعی نہیں بیٹا! کوئی اور بات ہے۔ وہاں لاہور میں تو تمہیں کاکا سائیں کی موت کا علم نہیں تھا۔"

پھر اتنی بیمار کیوں ہوگئی تھیں۔"

"بیمار تو آدمی یوں بھی ہو جاتا ہے' کسی وجہ کا ہونا ضروری تو نہیں ہوتا۔"

وہ اُنہیں قائل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

ڈاکٹر شاہ محمد قائل تو نہ ہوتے۔ البتہ اُس کا دل بہلانے کے لئے موضوع بدل دیتے تھے۔

اُسے خلیل کی بات کا یقین نہیں آتا تھا۔ وہ آنٹی زینت مراد کو بالکل سمجھ نہیں پائی تھیں۔ یہ ظاہر و باطن میں اتنا تضاد کیوں تھا۔ اگر وہ اُس کی اور تبریز کی شادی کے اتنے خلاف تھیں۔ پھر اَب خو اُنہوں نے اُس کا اعلان کیا تھا۔

اور پھر خلیل تھا۔

اُسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

اُس کا ذہن اُلجھ کر رہ گیا۔

بیٹھے بیٹھے اُس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔

سانس رُکنے لگتی تھی۔

جب اُس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تو وہ رونے لگتی۔ روتے روتے بے حال ہو جاتی تھی۔

باصر کسی کو بتائے بغیر گھر سے چلا گیا تھا۔ سوائے اُس کے کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ شاہ پور گیا ہے۔ مراد بولائی بولائی پھرتیں صبح صبح خلیل کو لے کر نکل جاتیں۔ مراد علی سے جھگڑتیں۔

"بچوں سے نرمی سے بات کی جاتی ہے' طریقے سے اُنہیں سمجھایا جاتا ہے۔ خدا جانے کہاں چلا گیا۔ بدر ہاسپٹل سے پتا کیا گیا تو پتا چلا کہ اُس نے ایک ماہ کی چھٹی لے لی ہے۔ شاہ پور فون کی چلا کہ وہ آیا تو تھا لیکن دو روز ٹھہر کر چلا گیا ہے۔

تبریز تھا ہمیشہ کی طرح خاموش اور اپنے آپ میں گم جب سے باصر گیا تھا۔ وہ اور بھی ہو گیا تھا۔ مدحت کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کب آتا ہے اور کب جاتا ہے۔

سونیا بھی ان دنوں بہت چُپ چُپ رہنے لگی تھی۔

کھوئی کھوئی سی اور اُداس سی۔

اُسے صرف باصر کے جانے کا دُکھ نہیں تھا۔ کوئی اور بات بھی تھی جو اُسے پریشان کر رہی تھی ... نے بھی مدحت کی طرف دھیان نہیں دیا کہ ہر وقت اُس کی آنکھیں سرخ سرخ کیوں رہنے لگی ہیں۔

وہ اتنی چُپ سی کیوں ہے۔

اور روز بروز اُس کا رنگ زرد کیوں ہو رہا ہے۔ کسی کے پاس کسی کے لئے وقت نہیں تھا۔ اپنی اُلجھنوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ مراد علی الگ جھنجھلائے جھنجھلائے سے رہنے لگے تھے۔ جنرل ہادی تیسرے روز فون کر کے منگنی کی تاریخ مانگتے۔

"میں بہت اچھے طریقے سے یہ فنکشن کرنا چاہتا ہوں۔"

اور مراد علی ہوں ہاں کر کے رہ جاتے۔

ان حالات میں اچانک ہی رمیض آ گیا تھا اور آتے ہی اُس نے سب سے پہلے مدحت کو نو...

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ ہر وقت کمرے میں کیوں گھسی رہتی ہو۔ اور جب بھی کمرے سے ... ہو روئی روئی سی لگتی ہو۔"

"کچھ نہیں۔"

مدحت نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی' چند دن کے لئے تو رمیض آیا تھا' خواہ مخواہ اُسے پریشان کیا جائے اور زینت مراد نے بھی منع کر دیا تھا کہ اُسے باصر کے بغیر بتائے کہیں جانے کے متعلق نہ ... ئے۔ اُنہوں نے رمیض سے کہہ دیا تھا کہ وہ چند دنوں کے لئے اپنے دوستوں کے ساتھ کراچی گیا ہوا ہے ... کو بہت افسوس ہوا تھا۔

"اتنے عرصے بعد تو میں آیا تھا۔ خیر پھر سہی۔"

تبریز تو صبح آفس چلا جاتا اور شام کو لوٹتا سو اس کا زیادہ وقت مدحت کے ساتھ ہی گذرتا تھا۔ کیونکہ ... دنوں کالج نہیں جا رہی تھی۔ سونیا بھی باقاعدگی سے یونیورسٹی نہیں جاتی تھی۔ تاہم جب سے رمیض آیا وہ یونیورسٹی جا رہی تھی۔ رمیض محسوس کر رہا تھا کہ مدحت ٹھیک نہیں ہے۔

کوئی بات ہے جس نے اُسے اندر سے ڈسٹرب کر رکھا ہے' ایک دو بار اُس سے پوچھا بھی تھا مدحت نے ٹال دیا۔ اُس روز بھی وہ سونیا کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ مدحت اپنے بیڈ پر بیٹھی کوئی کتاب ... رہی تھی کہ وہ اُس کے کمرے میں چلا آیا۔ اور نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔

"آؤ مدحو! کارڈز کھیلیں۔"

"مگر مجھے تو کارڈز کھیلنا نہیں آتا"۔

"آؤ تو سکھا دوں گا۔"

مدحت جھجکتی ہوئی نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

سچ وہاں سے اتنا خوش خوش آیا تھا۔ لیکن یہاں آ کر بہت بور ہو رہا ہوں۔

اُس نے میز کی دراز سے کارڈز نکالے اور پھر مدحت کو سمجھانے لگا۔

"یہ پان ہے۔"

"یہ چڑیا ہے۔"

پتے بانٹتے ہوئے اُس نے سر اُٹھا کر مدحت کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے تم اتنی ڈری ڈری' اتنی سہمی سہمی سی کیوں لگ رہی ہو۔ جب میں پہلی بار تم سے ملا تھا تب تم ... فزدہ نہیں لگ رہی تھیں۔ حالانکہ اب تو تمہارے اندر زیادہ اعتماد پیدا ہو جانا چاہئے میں تمہارا بھائی ہوں مجھے بتاؤ کیا بات ہے جس نے تمہیں اتنا پریشان کر رکھا ہے۔ شاید میں تمہاری کچھ ہیلپ (مدد) کر سکوں۔"

مدحت نے نگاہیں اُٹھائیں' وہ بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"اَب تک تو تمہیں اس ماحول کا عادی ہو جانا چاہئے مدحو! کیا سونی نے کچھ کہا ہے؟ ماما کی کوئی ... لگی ہے؟"

"نہیں' کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ ایسے ہی تمہارا وہم ہے۔"

اُس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اُس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"کوئی بات ہے ضرور' لیکن تم بتانا نہیں چاہتیں تو چھوڑو۔ لیکن دیکھو' ماما کی باتوں کا خیال نہ کیا کرو۔ ... اوقات وہ یونہی بے دھیانی میں دل دکھانے والی بات کر جاتی ہیں۔ حالانکہ میں نے پچھلی بار دیکھا تھا کہ ... ے ساتھ تو اُن کا رویہ خصوصی ہے۔"

"آنٹی تو بہت خیال کرتی ہیں۔ میرا۔"

مدحت نے رمیض کی طرف دیکھا۔

''وہ بھلا میرے ساتھ ایسی کوئی بات کیوں کریں گی جس سے میرا دل دُکھے گا۔''

اور دل تو اُس کا دکھا تھا۔

حالانکہ تبریز کے ساتھ اُس کا کوئی جذباتی تعلق نہیں تھا۔ ابھی تک وہ ذہنی طور پر تبریز کو اِس میں ACCEPT (قبول) نہیں کر سکی تھی۔ پھر بھی خلیل کی باتوں سے اُس کا دل دکھا تھا۔ آنٹی نے ایسا اُسے ایک جاہل دیہاتی لڑکی کیوں کہا ہے۔

اور پھر جب وہ اُسے ایسا سمجھتی تھی پھر اُنہوں نے تبریز کے ساتھ اُس کی نسبت کا اعلان کیوں اُسے آنٹی سے خوف آنے لگا تھا۔

اُسے لگتا تھا جیسے ابھی وہ شکل بدل لیں گی۔ ابھی کوئی جادوگرنی بن جائیں گی اور اُس کے سر چھبو دیں گی۔ اور وہ چڑیا بن جائے گی۔

اُسے سوچ میں کھویا دیکھ کر رمیض پھر سے پتے بانٹنے لگا۔

''یہ رہے تمہارے کارڈز۔''

''پہلے رنگ کھیلتے ہیں یہ بہت آسان ہے۔''

وہ اُسے سمجھانے لگا۔ مدحت پورے دھیان سے اُس کی بات سُن رہی تھی کہ زینت مراد نے اندر جھ

''تم یہاں ہو رمیض! اور میں نے پورے گھر میں تمہیں دیکھ ڈالا ہے۔''

''میں اگر اپنے کمرے میں نہیں ہوتا تو اُس کا مطلب ہوتا ہے کہ سونیا کے کمرے میں ہوں خالی دیواروں سے تو باتیں نہیں کی جاسکتیں۔''

''مدحو۔!''

زینت مراد اُس کی بات کا جواب دیئے بغیر مدحت کی طرف مڑیں۔

''تم کالج کیوں نہیں گئیں۔ بلکہ میں دیکھ رہی ہوں تم کئی دنوں سے کالج نہیں جا رہی ہو۔''

''وہ پہلے تو کالج میں اسپورٹس ہو رہی تھیں۔ پھر فنکشنز شروع ہو گئے۔ پڑھائی بالکل نہیں ہو رہی''

''اُس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم گھر بیٹھ جاؤ۔''

مسز زینت مراد نے تیز لہجے میں کہا۔

''یہ فنکشنز بھی تم لوگوں کے لئے ہی ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ آدمی سیکھتا ہی ہے ان سے۔''

''جی۔!''

مدحت نے کس قدر حیرت سے اُنہیں دیکھا۔ اس سے پہلے تو اُنہوں نے کبھی اُس سے اس بات نہیں کی تھی۔

''ماما۔!'' رمیض نے اُن کی توجہ اپنی طرف کی۔ ''یہ باصر بھائی کب آئیں گے' بہت بو ہوں میں۔''

''بتا کر نہیں گیا کب آئے گا۔ اور تم آؤ اُدھر میرے کمرے میں' ہر وقت اِدھر ہی مت گھسے رہا کر رمیض کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اُسے زینت مراد کا اس انداز میں بات کرنا قطعی اچھا نہیں مدحت اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پوری طرح کھولے حیرت سے اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ اُنہوں نے ایک چبھتی نظر اُس پر ڈالی اور باہر نکل گئیں۔ رمیض نے معذرت طلب نظروں سے مدحت کی طرف دیکھا۔

''سوری مدحو میں ابھی آتا ہوں ماما کی بات سُن کر تم کارڈز سنبھالنا مت' آج تمہیں بہت سارے سکھاتا ہوں۔''

مدحت خاموش ہی رہی۔ رمیض زینت مراد کے پیچھے پیچھے اُن کے کمرے میں پہنچا۔

''ماما آپ کو مدحت سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہئے تھی۔ کیا سوچتی ہو گی وہ اُس کا دل تو یوں بہت کمزور سا ہے۔''

''مت نصیحتیں کرو مجھے۔''

اُنہوں نے غصّے سے کہا۔

''میں جانتی ہو کہ مجھے کس سے کس لہجے میں بات کرنا چاہئے۔''

''ماما۔!'' رمیض نے بے حد حیرت سے اُنہیں دیکھا۔

''کیا مدحت سے کوئی خطا ہو گئی ہے۔''

''کوئی خطا نہیں ہوئی۔''

اُنہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''لیکن مجھے تمہارا ہر وقت اس طرح اُس کے کمرے میں گھسے رہنا پسند نہیں ہے۔ جب دیکھو اُس کے پاس بیٹھے ہو اور وہ میٹھی میٹھی باتیں مٹھار رہی ہے۔''

''مگر کیوں؟'' رمیض نے احتجاج کیا۔ ''وہ میری کزن ہے' میرے ہونے والی بھابھی ہے۔''

''ہوں بھابی!'' انہوں نے طنز سے کہا۔

''وہ تمہارا بھائی تو اُس سے شادی سے انکار کر گیا ہے۔''

''کیوں؟''

رمیض نے بے حد حیرت سے اُسے دیکھا۔ ''کیا بُرائی ہے مدحت میں۔ اتنی پیاری اتنی اچھی نیچر کی ہے۔ وہ' ایسی لڑکی بھائی کو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ ماما''

بات کرتے کرتے رُک کر رمیض نے پوچھا۔

''اُنہوں نے انکار کی وجہ نہیں بتائی؟''

''وہ کہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اُس کے قابل نہیں سمجھتا۔ حالانکہ وہ اس کے قابل نہیں تھی۔ اور جب تمہارے پاپا نے مجھے بتایا تھا کہ میاں جی کی خواہش ہے کہ تبریز اور مدحت تو رمیض میں تمہیں کیا بتاؤں کہ مجھے کس قدر شاک لگا تھا۔ کتنا دُکھ ہوا تھا۔ اُن دنوں تبریز کے لئے مسز یعقوب نے خود کئی بار مجھ سے کہا تھا۔ سات بہن ہیں۔ مسز یعقوب کی اور فارحہ اُن کی اکلوتی بیٹی تھی۔ تب میں نے تبریز سے بات کی تھی لیکن وہ کہنے لگا کہ نہیں اُسے میاں جی کی خواہش کا احترام ہے اور اَب کہتا ہے کہ وہ خود کو مدحت کے قابل نہیں سمجھتا۔ اور یہ کہ میں اُس کے ساتھ مدحت کی شادی کر دوں۔''

''تو کیا حرج ہے ماما۔!'' رمیض نے اطمینان سے کہا ''تبریز بھائی نہ سہی باصر بھائی سہی۔ آپ باصر بھائی کی شادی مدحت سے کر دیں اور تبریز بھائی کی اُنہی مسز یعقوب کی بیٹی سے کر دیں۔''

''رمیض تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے وہ مسز یعقوب اپنی اکلوتی بیٹی کا رشتہ ایک ADDIC (نشے کا عادی) لڑکے کو دیں گی۔ ایسی باتیں کبھی چھپی ہیں بھلا۔ کتنی کوشش کی تھی میں نے کہ باہر یہ بات نہ پھیلے لیکن پتا نہیں کیسے سب کو ہی پتا چل گیا کہ تبھی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے' نشہ کرنے لگا ہے۔ سب نے پہلے تو انہی مسز

یعقوب نے۔ اظہارِ افسوس کیا تھا۔"

"لیکن تیمی بھائی اَب تو بالکل نارمل ہیں۔ آپ اُنہیں بتا دیجئے گا۔"

"ہوں نارمل!" مسز مراد نے سر کو ہولے سے جھٹکا۔ "اُس کا مستقبل تو بہر حال مخدوش ہے
نہیں کیا کرتا پھرتا ہے یہ لڑکا۔"

"اور آپ نے" رمیض نے افسردگی سے کہا

"ایک ایسے لڑکے کو جس کا مستقبل مخدوش ہے آپ نے اپنی سگی بھتیجی سے منسوب کر دیا۔"

"بہت خوب!" وہ طنز سے ہنسا۔ "اَب میں سمجھا کہ آپ کو تبریز بھائی کی بات پر اتنا غصہ کیوں
ہے۔ اگر تبریز بھائی نے آپ سے ایسا کہا ہے کہ وہ خود کو مدحت کے قابل نہیں سمجھتے تو آپ کیوں بضد ہیں
نہیں ماما اگر وہ ایسا نہیں چاہتے تو آپ کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہئے' مدحت بہت اچھی ہے ماما۔ آپ باصر
کے ساتھ ہی اس کی منگنی کر دیں۔ باصر بھائی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے۔"

"تم مجھے مشورے مت دو رمی! میں نے تمہیں یہاں مشورے لینے کے لئے نہیں بلایا۔ اور
بات طے ہو چکی ہے جنرل ہادی کی بیٹی سے اور وہ بیوقوف لڑکا گھر سے چلا گیا ہے کہ وہ جنرل ہادی کی
شادی نہیں کرے گا۔"

"کیا مطلب؟" رمیض حیرت سے کھڑا ہو گیا۔

"باصر بھائی گھر سے خفا ہو کر گئے ہیں وہ؟" اور مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔ کہاں گئے ہیں وہ؟"

"مجھے کیا معلوم کہاں گیا ہے۔ خود ہی آ جائے گا ٹھوکریں کھا کھا کر۔" زینت مراد بہت آپ
لگ رہی تھی۔

"تو باصر بھائی گھر سے خفا ہو کر گئے ہیں تب ہی ماما اتنی ڈیپریس ہو رہی ہیں۔"
رمیض نے سوچا۔

"ورنہ پہلے تو اُنہوں نے اس طرح کی باتیں کبھی نہیں کی تھیں۔ بلکہ بچوں سے فالتو بات کرنے
عادت ہی نہ تھی اُنہیں۔"

"ماما! وہ ضرور شاہ پور گئے ہوں گے آپ نے پتا کروایا۔"

"مت نام لو شاہ پور کا میرے سامنے' شاہ پور' شاہ پور جادو کر رکھا ہے میاں جی نے تم سب پر
تبریز کو پھانسا اور پھر اَب ضرور یہ نیا سبق بھی اُنہوں نے ہی تبریز کو پڑھایا ہوگا۔"

"ماما! مت کہیں کچھ میاں جی کو۔ آپ کو کیا پتا کہ میاں جی کیا ہیں۔"

رمیض نے غصے سے کہا اور تیزی سے باہر نکلا۔ تبھی اُس کی نظر مدحت پر پڑی جو واپس اپنے کمرے
کی طرف پلٹ رہی تھی۔ لمحہ بھر کو وہ ٹھٹھک کر رُک گیا۔

"کیا مدحت نے اُس کی اور ماما کی باتیں سُن لیں۔" "مدحت!" اُس نے آواز دی لیکن مد
اُس کی بات کا جواب دیے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رمیض اور زینت مراد کے جانے کے بعد وہ کتنی ہی دیر تک یونہی نیچے کارپٹ پر بیٹھی زینت مراد
لہجے اور رویے کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ اور ابھی چند لمحے پہلے ہی وہ اُٹھی تھی۔ اور پروین سے ایک کپ چا
بنانے کے لئے کہا اور باہر نکلتے ہوئے اُس نے رمیض کو غصے سے بولتے ہوئے سُنا تھا۔

"کیا ہوا ہے۔ آنٹی نے میاں جی کو کیا کہا ہے؟ نہیں آنٹی میاں جی کو کچھ نہیں کہہ سکتیں۔ پھر

وں اتنے غصہ سے بول رہا تھا۔ اور آنٹی نے جاتے ہوئے کس قدر غصے سے اُسے دیکھا تھا۔ کیا اُس سے کوئی
لی ہو گئی ہے۔ جو آنٹی نے میاں جی کو کچھ کہا ہے پھر میاں جی۔ بھلا میاں جی کو کوئی کیسے کچھ کہہ سکتا ہے' وہ
اتنے اچھے ہیں۔ اتنے محبت کرنے والے

اور ان سب سے وہ اتنی محبت کرتے ہیں۔ کتنا یاد کرتے ہیں انہیں۔

آنٹی کو۔

انکل کو۔

تبریز اور باصر کو

رمیض اور سونیا کو۔

اور ان سب کے لئے وہ کتنی دُعائیں کرتے ہیں ان کی زندگیوں کے لئے اُن کی خوشیوں کے لئے
ور آنٹی کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اور وہ کیسے اُن کی غلط فہمی دور کرے۔ اُسے تو پتا ہی نہیں کہ آنٹی کو کس بات پر
غصہ ہے۔ اُف وہ کیا کرے۔

اُس کا دم گھٹنے لگا۔

وہی پرانی کیفیت جو کتنے روز سے اُس کا گھیراؤ کئے ہوئے تھی۔

اُس نے منہ کھول کر گہرے گہرے سانس لئے۔ لیکن سانس یوں ہی رُک رہا تھا۔

وہ کچھ دیر یونہی ہونٹ بھینچے بیٹھی رہی۔ پھر گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔

رمیض ابھی تک اپنے دروازے پر کھڑا تھا۔

مدحت نے اُس کی پکار کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ یقیناً اُس نے
لی نہ کوئی بات سُن لی تھی۔ وہ ضرور ہرٹ ہوئی ہوگی۔ مجھے اُس کے پاس جانا چاہئے دیکھوں تو جا کر کہا پتا اُس نے
منہ سُنا ہو اور میں یونہی پریشان ہوتا رہوں۔ اُس نے سونیا کے کمرے کی طرف قدم بڑھایا پھر رُک گیا۔

نہیں ماما اس وقت بہت ڈیپریس ہو رہی ہیں۔ غصے میں ہیں۔ اگر اُنہوں نے مجھے مدحت کے پاس
تے دیکھا تو غصے میں کوئی ایسی بات نہ کہہ دیں' جس سے مدحت کو تکلیف ہو۔ اور ماما کو تو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ
میں کیا کہہ دیتی ہیں۔ شاید وہ باصر بھائی کے جانے سے پریشان ہیں۔ حالانکہ اس سے قبل تو اُنہوں نے
ں جی کے لئے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ بلکہ اُس نے ہمیشہ اُنہیں اُن کا احترام کرتے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ
آپ میں نہیں ہیں۔

وہ مدحت کی طرف جاتے جاتے پلٹ گیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ گھر آتے ہوئے وہ کس قدر
تھا کہ خوب انجوائے کرے گا۔ مگر یہاں آ کر انتہائی بوریت ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنے بیگ سے ایک
ب نکالی اور نیم دراز ہو کر پڑھنے لگا۔

یہ ایک سفرنامہ تھا۔ اور بہت دلچسپ لہٰذا اُسے وقت گذرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ نہ جانے' کتنی دیر
گئی تھی کہ اچانک اُسے سونیا کی چیخ سُنائی دی تھی۔

"ماما۔ رمیض رمی یہ مدحت کو کیا ہو گیا ہے۔"

وہ کتاب پھینک کر باہر بھاگا۔

سونیا اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی چیخ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟"

''وہ مدحو۔ مدحو بے ہوش پڑی ہے۔ میں ابھی یونیورسٹی سے آئی تو دیکھا۔''
اور اُس کی پوری بات سُنے بغیر وہ اندر لپکا۔
مدحت کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہو رہا تھا۔ سانس رُک رُک کر آ رہی تھی۔
''اوہ گاڈ!''
مدحت! مدحو!''
اُس نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا لیکن وہ آنکھیں بند کیے بے خبر پڑی تھی۔ تب وہ ڈاکٹر کو فون کرنے بھاگا۔
اُسے فوری طور پر ہاسپٹل میں ایڈمٹ کر لیا گیا تھا اور پھر کتنے ہی دن وہ ہاسپٹل میں رہی تھی۔ اور رمیض تو ہر وقت اُس کے پاس ہی رہتے تھے۔ آنٹی اور انکل بھی اُسے دیکھنے کے لئے ایک دو بار آئے تھے۔ نورا بھی اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ آئی تھی۔ اور پروفیسر عبید بھی تین چار بار پھول لے کر آئے تھے۔ کافی بہتر تھی لیکن ڈاکٹرز کا اصرار تھا کہ ایک دو روز اُسے ابھی ہاسپٹل میں ہی رکھا جائے تو بہتر تھا۔ وہ ڈپریشن کا شکار تھی۔ نروس بریک ڈاؤن کا خطرہ تھا۔
''یار! تجھے کیا ہو گیا تھا۔''
وہ کچھ دیر پہلے ہی ہاسپٹل سے آئی تھی۔ اور تکیے کے سہارے ٹیک لگائے بیٹھی تھی کہ سونیا نے اُس کے ہاتھ میں جوس کا گلاس دیتے ہوئے پوچھا۔
''پتا نہیں'' وہ شرمندہ سی ہو گئی۔
اُسے تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک اُسے کیا ہو گیا تھا۔
''سوری سونی! میں نے تم لوگوں کو پریشان کیا۔
وہاں شاہ پور میں تو میں کبھی بیمار نہیں پڑی تھی۔''
''تو کیا ہم نے تمہیں بیمار کر ڈالا ہے۔'' سونیا نے شرارت سے کہا۔
''نہیں' میرا یہ مطلب نہیں۔''
اُس نے گھبرا کر سونیا کو دیکھا۔
''بس پتا نہیں یہاں آ کر کیا ہو گیا ہے۔ دل گھبراتا رہتا ہے۔ بہت دنوں سے' بہت دنوں سے دم گھٹ رہا تھا۔ سونی بس ایسا لگتا تھا جیسے کوئی دل کو ہاتھوں میں لے کر مسل رہا ہو۔''
''تم نے مجھے بتایا ہوتا۔''
''کئی دفعہ میرا دل چاہا کہ تمہیں بتاؤں۔'' اُس نے خالی گلاس سونیا کو دیتے ہوئے کہا۔'' مگر تم اتنی پریشان دکھتی تھیں۔ کہ دل نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں مزید پریشان کروں۔''
''ہاں باصر کے جانے سے پریشان ہوں۔ بلکہ گھر میں سب ہی پریشان ہیں۔ ماما اور پاپا ظاہر نہیں کرتے مگر اندر سے وہ بہت ڈیپریس ہیں۔''
''کیا اُن کا کچھ پتا چلا' کوئی فون وغیرہ''
''نہیں'' سونیا نے افسردگی سے کہا۔
''پتا نہیں ماما اور پاپا کو کیا ہو گیا ہے۔ خواہ مخواہ ضد پر اَڑ گئے ہیں۔ اَب اگر باصر جنرل ہادی کی بیٹی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تو نہ سہی۔۔۔ وہ نورا بھی تو ہے۔' کتنی دلکش ہے اور پھر دونوں ہم پیشہ بھی ہیں۔''
''ہاں نورا مجھے بھی بہت اچھی لگی ہے۔ اور عبید بھائی بھی بہت اچھے ہیں۔ میرا تو دل چاہتا تھا کہ عبید بھائی تم سے شادی کر لیں۔ کیا وہ تمہیں بھی اچھے لگتے ہیں۔؟''

مدحت نے سادگی سے کہا سونیا کا رنگ پہلے سُرخ ہوا پھر ماند پڑ گیا۔
''شاید میں اُن کے معیار پر پوری نہیں اُترتی۔''
اُس کے لہجے میں افسردگی تھی۔
''کیوں اتنی اچھی تو ہو تم!'' مدحت کو حیرت ہوئی۔
سونیا سر جھکائے اپنے ناخنوں کو گھورتی رہی
''سونی'' مدحت سیدھی ہو کر بیٹھ گئی' اِدھر دیکھو میری طرف۔ کیا تمہیں وہ عبید بھائی اچھے لگتے ہیں؟۔
سونیا نے ذرا کی ذرا نگاہیں اُٹھا کر اُسے دیکھا اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔
''سونی۔!'' مدحت بے قرار سی ہو گئی۔
''کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟''
سونیا دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ مدحت نے بستر سے اُتر کر بے اختیار اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ روتے روتے اُس نے کہا۔
''مدحو۔ میں میں شاید عبید سے محبت کرنے لگی ہوں۔ اور یہ سب کچھ دانستہ نہیں ہوا بس۔ اچانک ہی خود بخود وہ مجھے اچھے لگنے لگے۔ اُن کی باتیں اُن کی گفتگو ہر بات مجھے امپریس (متاثر) کرتی ہے۔ مدحو پتا نہیں تم اس جذبے کو نہ سمجھ سکو۔ میں گھنٹوں اُنہیں سوچتی رہتی ہوں۔''
''اور تمہیں کیا خبر سونیا مراد علی کہ میں اس جذبے کو سمجھتی ہوں اور مجھے اس کرب کا بھی احساس ہے جو تم محسوس کر رہی ہو۔''
مدحت نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اُس کے آنسو پونچھے۔
''سونی! تم یونہی پریشان ہو رہی ہو تمہیں پتا ہے۔ آنٹی نے ایک دو بار انکل سے کہا تھا کہ وہ چاہتی ہیں کہ تم اور عبید۔''
''اُن کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔''
سونیا نیا اُس کی بات کاٹی۔
''اگر عبید ایسا نہ چاہیں تو؟''
''مگر سونی! وہ مسز وہاب کی بھی تو یہی خواہش ہے۔ ایک دن آنٹی بتا تو رہی تھیں۔''
''مجھے معلوم ہے۔'' سونیا نے افسردگی سے کہا۔
''مگر عبید ایسا نہیں چاہتے!''
''کیا اُنہوں نے تم سے کہا؟''
''نہیں۔'' سونیا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لیکن میں نے اُن کی آنکھوں میں اپنے لئے ایسا کوئی جذبہ نہیں دیکھا۔ وہ سرسری نظر سے مجھے دیکھتے ہیں۔ سرسری انداز میں بات کرتے ہیں۔ اگر مسز وہاب اور ماما کی خواہش پوری بھی ہو جائے تو بھی وہ شاید مجھ سے محبت نہ کر سکیں۔ اور میں چاہتی ہوں وہ شخص جو میری زندگی کا شریک بنے' وہ مجھ سے محبت کرے' مجھے چاہے۔''
وہ پھر رونے لگی' تب ہی باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔
''کوئی آ رہا ہے۔''

مدحت نے کہا تو سونیا اُٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔

''میں منہ دھو کر آتی ہوں۔''

''اندر آ سکتا ہوں خاتون!

رمیض نے دروازے سے سر نکال کر شوخی سے کہا۔

مدحت نے مڑ کر اُسے دیکھا۔ تو وہ اندر چلا آیا۔

''اور بی بی! یہ آپ کھڑی کیوں ہیں آپ کو خبر ہے۔ ڈاکٹر نے آپ کو ریسٹ کی ہدایت کی ہے۔''

''میں تو اَب بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''جی نہیں۔ آپ بالکل ٹھیک نہیں ہیں۔ اور آرام کریں آپ ورنہ ابھی واپس ہاسپٹل لے چلتا ہوں۔''

''بلیوی (یقین کرو) ریمی میں اَب بالکل ٹھیک ہوں۔''

''پریشان کر کے رکھ دیا تھا تم نے سب کو۔'' رمیض اُس کے سامنے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''پتا ہے پاپا اتنے پریشان ہو گئے تھے۔ وہ تو میاں جی کو بھی اطلاع کرنے لگے تھے' میں نے منع کیا کہ خواہ مخواہ وہاں پریشانی ہو گی۔''

''یہ تم نے اچھا کیا ریمی! خواہ مخواہ میاں جی پریشان ہو جاتے۔''

''ہاں' اَب تم بتاؤ' یہ تمہیں بیٹھے بیٹھے کیا ہو جاتا ہے۔ اچھا بھلا میں تمہیں کمرے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ دیکھو جھوٹ نہیں چلے گا ورنہ تمہارے کان کھینچنے اور ڈانٹنے کا حق ہے میرے پاس۔''

''پتا نہیں ریمی! مجھے خود کچھ نہیں پتا۔ کئی دنوں سے میری طبعیت خراب تھی نا۔ شاید اس لئے اچانک زیادہ خراب ہو گئی۔''

''دیکھو اگر طبعیت خراب ہو تو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ بہت ڈاکٹر ہیں یہاں۔ تم کسی کو بتاتیں کہ تمہاری طبیعت خراب ہے؟

''سوری رمیض! میں نے تم سب کو پریشان کیا۔''

''اچھا خیر' اَب سوری وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے' تمہیں پتا ہے' میری چھٹیاں ختم ہونے میں صرف تین دن رہ گئے ہیں۔ اس قدر بور کیا ہے تم نے۔''

''ریمی۔!'' مدحت نے جھجکتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔ ''ایک بات پوچھوں؟''

''ایک نہیں دس پوچھ لو۔ اَب بہن بنایا ہے تو بھگتنا بھی ہے تمہیں۔''

''ریمی! اُس روز جب میں بیمار ہوئی تھی تو تم اتنے غصّے سے کیوں بول رہے تھے۔ اور آنٹی۔ کہا تھا۔ میاں جی کو جو تم۔''

رمیض چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ تو اُس کا خیال صحیح تھا۔ مدحت نے اُس کی بات سُن لی تھی۔

اُس روز۔ کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔ کیا کہہ رہا تھا میں۔''

''تم۔'' اُس نے باتھ روم کے دروازے کی طرف دیکھا۔ سونیا ابھی تک اندر ہی تھی۔

''تم کہہ رہے تھے کہ ماما آپ میاں جی کچھ مت کہیں۔''

''اوہ ہاں یاد آیا۔''

اُس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''وہ ماما۔ ماما کہہ رہی تھیں۔ کہ میاں جی نے تمہیں ویو بنا دیا ہے۔ خود اعتمادی نہیں ہے۔ وہ تم

کے فنکشنز اٹینڈ نہیں کر رہی تھیں۔ اس لئے۔''

''اچھا۔!''

مدحت نے اطمینان بھری سانس لی۔

''تم فنکشنز وغیرہ اٹینڈ کیا کرو مدحو!''

اُس کو مطمئن ہوتے دیکھ کر رمیض نے طمانیت محسوس کی۔ بیوقوف لڑکی نے اتنی سی بات کو دل پر لے لیا تھا شکر ہے اُس نے پوری بات نہیں سنی تھی۔

''میں جب وہاں تھی تو سارے فنکشنز اٹینڈ کرتی تھی۔ گیمز میں بھی حصہ لیتی تھی۔ اور میاں جی خوش ہوتے تھے۔''

''اور یہاں آ کر کیا ہو گیا ہے۔؟''

''یہاں بس ویسے ہی دل نہیں چاہتا۔''

تب ہی سونیا نے باتھ روم کا دروازہ کھولا۔

''اچھا تو محترمہ اندر تھیں۔'' رمیض نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔

''ہاں' آپ کو کوئی اعتراض؟''

''جی نہیں' بندہ کیا اعتراض کر سکتا ہے۔ البتہ اس وقت کچھ کھانے پینے کو دل چاہ رہا تھا۔''

''مثلاً!

سونیا نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھا آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''مثلاً کچھ اسنیکس اور چائے ہو جائے تو کیا بات ہے۔''

''ایک تو تم وقت بے وقت چائے پیتے رہتے ہو کم پیا کرو۔''

''کیا کروں وہاں عادت پڑ گئی ہے۔''

''اچھا میں کہتی ہوں پروین سے۔''

سونیا باہر نکل گئی۔ وہ خود وہاں رُکنا نہیں چاہتی تھی۔ رمیض اگر غور سے دیکھتا تو ضرور اُس کے رونے کا راز پا جاتا۔

سونیا کے باہر نکلتے ہی تبریز آ گیا۔

''میں ہاسپٹل گیا تھا۔ پتا چلا آپ آ گئی ہیں۔'' اُس نے مدحت سے کہا۔

''جی!'' مدحت نے نگاہ اُٹھا کر اُسے دیکھا وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ اور خاموش تھا۔

''کیسے ہو ریمی؟''

وہ رمیض کی طرف مڑا۔

''فائن! مسکرایا۔

''آپ بیٹھیں پلیز۔''

''نہیں' میں بس مدحت کو دیکھنے آیا تھا۔''

''کیسی ہو اَب؟'' وہ پھر مدحت سے مخاطب ہوا۔

''اچھی ہوں'' پتا نہیں کیوں مدحت کی آواز بھرا گئی۔

''مدحت! میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ گھبرائیں ناں سب ٹھیک ہو

جائے گا۔ پھر بھی پتا نہیں آپ کیا سوچتی رہتی ہیں کہ بیمار ہو جاتی ہیں۔''
''نہیں تو۔'' مدحت نے گھبرا کر اُسے دیکھا۔ ''میں تو کچھ بھی نہیں سوچتی۔''
ایک ہلکی سی مسکراہٹ تبریز کے ہونٹوں پر آ کر معدوم ہو گئی۔
''ڈاکٹرز کہہ رہے تھے کہ آپ کو کوئی بیماری نہیں ہے' بس آپ بہت زیادہ سوچتی ہیں۔ آپ نہ سوچا کریں۔ میں صبح پشاور جا رہا ہوں ضروری کام سے' واپسی پر میاں جی کے پاس جاؤں گا۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔''
''آپ میاں جی کے پاس جا رہے ہیں۔ میاں جی کے پاس جائیں گے؟'' مدحت نے بے قراری سے پوچھا۔
''ہوں۔''
''تو پھر پلیز مجھے بھی ساتھ لے جایئے گا۔ میرا دل بہت اُداس ہے میاں جی کے لئے پلیز۔''
تبریز نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔
''اچھا! لیکن پتا نہیں مجھے وہاں کتنے دن لگ جائیں ایسا کریں آپ رمیض کے ساتھ چلی جائیں میں پاپا سے کہہ دوں گا۔''
''رمی!'' وہ رمیض کی طرف مڑا۔ ''یار رمی! تم صبح مدحت کو شاہ پور چھوڑ آنا۔''
''جی بہتر تبریز بھائی۔ اسی بہانے میاں جی سے بھی مل لوں گا۔ بہت دن ہو گئے ہیں۔ ان سے ملے ہوئے۔''
اور یوں رمیض مدحت کو شاہ پور چھوڑ گیا تھا۔ اگرچہ زینت مراد نے کہا تھا کہ خلیل چھوڑ آئے لیکن رمیض کو غصہ آ گیا تھا۔
''آپ کمال کرتی ہیں ماما میاں جی کیا سوچیں گے کہ مدحت کو خلیل کے ساتھ بھیج دیا ہے۔''
یوں آتے سے زینت مراد کا موڈ کافی خراب تھا۔ اور مدحت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یک کیا ہو گیا ہے۔ اتنے دن ہو گئے تھے اُسے شاہ پور آئے ہوئے' ابھی تک اس کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔
''مدحت بیٹا! تم ابھی تک یہاں بیٹھی۔''
میاں جی کی نرم آواز اُس کے کانوں میں آئی اپنے خیالات سے چونک کر اُس نے سر اُٹھایا تو وہ کی اُس کے پاس کھڑے تھے۔ اور محبت و شفقت سے اُسے دیکھ رہے تھے۔
''میاں جی! آپ آج باہر نہیں گئے۔''
وہ احتراماً کھڑی ہو گئی۔
''بس جا ہی رہا تھا۔ تمہیں دیکھ کر رُکا ہوں۔ دھوپ برآمدے تک آ گئی ہے۔ اور تم۔''
وہ ناشتا کر کے برآمدے میں ہی بیٹھ گئی تھی۔
''کیا سوچ رہی تھی ہماری بٹی!''
میاں جی نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔
''کچھ نہیں میاں جی! بس یونہی۔''
''بیٹا! ایک بات پوچھنا تھی تم سے۔''
''جی میاں جی!''

''یہ باصر میاں گھر سے خفا ہو کر گئے ہیں کیا؟''
''جی میاں جی!''
''بات کیا تھی؟''
''اُنہوں نے آپ کو بتایا نہیں تھا۔''
''نہیں یہاں بس وہ ایک رات ہی تو رکا تھا۔ دن بھر مصروف رہا۔ پولیس کے پاس ہی بھاگتا رہا۔''
''میاں جی! مجھے کاکا سائیں کی موت کا بہت دکھ ہوتا ہے۔''
''بس بیٹا اُس کی موت اسی طرح لکھی تھی۔ ناحق مارا گیا بے چارا۔''
''آپ بیٹھیں نا میاں جی!''
''نہیں بیٹا! اَب جاتا ہوں۔ باہر لوگ انتظار کر رہے ہوں گے۔ بے چارے دور دور سے آتے ہیں۔ ذرا سی تسلی سے بہل جاتے ہیں۔
اور تم خوش رہا کرو بیٹا''۔
وہ جاتے جاتے مڑے۔
''کھایا پیا کرو' ہنسا بولا کرو' تمہارا دل نہیں چاہتا تو نہ جانا لاہور' یہاں ہی رہ لو' میں مراد علی سے بات کر لوں گا۔ فاطمہ کے پاس چلی جایا کرو۔ آج کل وہ شاہ پور میں ہی ہے۔''
''جی میاں جی!''
وہ ایک دم خوش ہو گئی۔
''میں بی۔ اے کا امتحان پرائیویٹ دے لوں گی۔ میرا سچ وہاں دل نہیں لگتا میاں جی! وہاں بہت گھٹن ہے۔ ڈاکٹر انکل صحیح کہتے تھے۔ میاں جی!'' اُس کی آواز بھرا گئی۔
شہر والے دوغلے ہوتے ہیں۔ اُن کے ظاہر و باطن کا پتا نہیں چلتا۔ اُن کے چہروں پر اور اُن کی زبان پر جو کچھ ہوتا ہے' وہ اُن کے دل میں نہیں ہوتا میاں جی! اُن کو سمجھنا بہت ہی مشکل ہے میاں جی!''
میاں جی نے بہت غور سے اُسے دیکھا۔
''یقیناً اسے کوئی دُکھ پہنچا ہے۔''
''میاں جی!'' اُس نے اُنہیں اپنی طرف دیکھتے پا کر کہا۔
''میں بہت محنت کروں گی میاں جی اور انشاء اللہ اچھے نمبر لے لوں گی۔''
''مجھے پتا ہے' میری بچی بہت ذہین ہے'' میاں جی نے اُس کے سر کو چوما۔
''اچھا اَب تم کمرے میں جاؤ میں باہر جا رہا ہوں۔''
''میاں جی! میں آج فاطمہ کی طرف جاؤں گی۔''
''ہاں ہاں ضرور جاؤ۔''
اور وہ اسی وقت چادر اوڑھ کر فاطمہ کی طرف چل دی۔ فاطمہ کا بیٹا بہت پیارا تھا گول مٹول سا۔ جتنی دیر وہ فاطمہ کے پاس رہی۔ اُسے گود میں ہی لئے بیٹھی رہی۔ جب وہ گھر آئی تو بھاگاں کچن میں دن کے لئے کھانا بنا رہی تھی۔
''ماسی بھاگاں!'' اُس نے کچن کے اندر جھانکا۔
''بٹی آ گئی ہو۔''

بھاگاں نے سلاد کی پلیٹ ایک طرف کرتے ہوئے اُسے دیکھا۔

''آج تو ماشاء اللہ چہرے پر رونق ہے۔ بیٹی میں تو روز ہی کہہ رہی تھی تم سے کہ کسی دن سہیلیوں [illegible] آؤ۔ گھر بیٹھ بیٹھ کر تو آدمی اوب جاتا ہے' زنگ لگ جاتا ہے اُسے۔ جب سے شہر سے آئی ہو' پیلی پڑی ہوئی ہو''

''مرغ کی خوشبو آ رہی ہے اور یہ ادھر اور کیا پکا رہی ہو۔ کیا کوئی مہمان آیا ہے۔''

''جی تبریز میاں آئے ہیں''

''تبریز!'' اُس نے حیرت سے پوچھا۔'' مجھے لینے آئے ہیں؟''

''پتا نہیں جی!'' بھاگاں نے آنچ دھیمی کی

''نہیں''

اُسے یاد آیا۔'' انہوں نے بتایا تو تھا کہ وہ پشاور سے واپسی پر میاں جی کے پاس آئیں گے اگر انہوں نے مجھے ساتھ چلنے کے لئے کہا بھی تو انکار کر دوں گی۔ بتا دوں گی۔ اُنہیں کہ مجھے اَب پرائیویٹ اے کرنا ہے۔''

''بیٹی! تم اندر جا کر آرام کرو۔ اَب تھکن ہو گئی ہو گی۔ ابھی کمزور بھی تو بہت ہو۔''

اور وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور اپنے کورس کی کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ لیکن ذہن پڑھنے کی [illegible] مائل ہی نہیں ہو رہا تھا۔ دھیان ایک بار پھر تبریز اور باصر کی طرف چلا گیا تھا۔

خدا جانے باصر کہاں تھا۔

اُس نے پھر اپنے متعلق کوئی خبر بھی نہیں دی تھی۔

البتہ جب رمیض اُسے چھوڑنے آیا تھا تو اُس نے بتایا تھا کہ باصر بھائی کا فون آیا تھا بدر [illegible] میں اُنہوں نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ ڈاکٹر حارث ملے تھے مجھے اور بتا رہے تھے کہ اُس نے جاب کر لی [illegible] کراچی میں'' ''تو باصر کراچی میں ہے۔'' اُس نے سوچا تھا۔

شاید اَب وہ وہاں ہی رہے اور کبھی واپس نہ آئے اور شاید وہ اَب کبھی بھی اُسے نہ دیکھ سکے ڈاکٹر شاہ محمد اَب بھی شاہ پور میں ہاسپٹل کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ کل بھی وہ کتنے یقین سے کہہ رہے تھے کہ یہاں ضرور ہاسپٹل بنوائے گا۔ ابھی جب وہ آیا تھا تب بھی اُس نے مجھے یقین دلایا ہے۔

اور ڈاکٹر شاہ محمد کو کیا پتا کہ پاپا شاہ پور میں ہاسپٹل تو کیا ایک چھوٹا سا کلینک بھی بنوا کر دینے [illegible] تیار نہیں ہیں۔ اور باصر بھلا اُس کے پاس اتنا پیسہ کہاں ہے۔ اُسے بھلا کتنی تنخواہ ملتی ہو گی۔ زیادہ سے زیا[illegible] سات ہزار سے اور تبریز۔ تبریز اگر اس کی مدد کریں۔

مگر بھلا۔ اُن کے پاس بھی اتنا روپیہ کہاں ہے؟

تبریز کے تصور کے ساتھ ہی اُسے خیال آیا کہ تبریز آیا ہوا ہے' پتا نہیں وہ اندر آرام کر رہا ہے [illegible] میاں جی کے پاس ہے اور۔

باصر کہتا تھا۔ میں تبریز کا خیال رکھا کروں۔ پتا نہیں بھاگاں نے چائے وغیرہ بھجوائی نہیں۔ تبریز کس قدر نرم خو' کم گو اور سادہ مزاج ہے۔

لیکن پتا نہیں کیوں۔

پتا نہیں کیوں! ابھی تک میرے دل میں اُس کے لئے کوئی ایسا جذبہ پیدا نہیں ہو سکا۔

وہ کتاب ایک طرف رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''دیکھوں تو۔''

تبریز اگر کبھی تھوڑی دیر کے لئے رکتا بھی تھا تو ہال کمرے میں ٹھہرتا تھا۔ میاں جی تو ابھی شاید باہر [illegible]اں اور وہ عموماً دوپہر کے کھانے کے بعد ہی اندر آتے تھے۔

ہال کمرے کا دروازہ بند تھا۔

''شاید تبریز آرام کر رہا ہو۔'' اُس نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔

بالکل سامنے تبریز اور میاں جی پاس پاس بیٹھے تھے۔ وہ ٹھٹھک کر رُک گئی۔

''آ جاؤ بیٹا! رُک کیوں گئی ہو۔ یہ تبریز آیا ہے۔''

اُس نے تبریز کو سلام کیا۔

''کیوں آئی تھیں؟''

''وہ کوئی کتاب لینے آئی تھی میاں جی! اُس نے بہانہ بنایا۔

''آپ کب اندر آئے تھے؟''

''تبریز میاں کے ساتھ ہی آ گیا تھا۔''

وہ کوئی کتاب نکالنے کے لئے ایک الماری کی طرف بڑھ گئی۔ تو تبریز جو اُسے ہی دیکھ رہا تھا چونک کر [illegible]ں جی کی طرف دیکھنے لگا۔

''میاں جی! میں نے بہت کھوجا ہے اُسے دھمکی بھی دی ہے' لیکن داؤد خان کا کہنا ہے اُسے مہراں کا [illegible]پتا نہیں ہے۔ وہ شاہ پور سے واپس آ کر سیدھا کراچی چلا گیا تھا۔ میں بھی اُس کے ساتھ ہی گیا تھا میاں جی [illegible]ت نہیں بول رہا۔''

''تو تبریز پشاور مہراں آپا کو تلاش کرنے گیا تھا۔

ڈاکٹر شاہ محمد بھی تو کہتے ہیں کہ اُنہیں داؤد خان پر شک ہے۔ وہی مہراں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا [illegible] اور کسی کو بھلا مہراں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

وہ کتاب نکال کر باہر چلی آئی تو میاں جی نے آواز دی۔

''بھاگاں سے کہنا۔ تبریز کا کھانا ادھر ہی بھیج دے۔''

اور پھر میاں جی سارا دن اندر ہال کمرے میں ہی رہے۔ شام کر چائے بھی انہوں نے اندر ہی پی تھی۔

حالانکہ میاں جی شام کو بھی باہر والے مہمان خانے میں جا کر بیٹھتے اور لوگوں سے ملاقات کرتے تھے [illegible] آج نہ جانے ایسا کیا مسئلہ تھا کہ وہ دن کو بھی باہر سے جلدی آ گئے تھے اور اَب بھی اندر ہی تھے۔ شاید وہ تبریز [illegible]ہراں آپا کے سلسلے میں ہی بات چیت کر رہے ہوں گے۔

مدحت نے سوچا۔

اُنہیں مہراں کے اُس طرح اغوا ہونے کا شدید صدمہ تھا۔ وہ دن میں دو ایک بار ضرور اُس کا ذکر [illegible]تے تھے۔ تبریز کی عادت تھی کہ وہ جب بھی آتا تھا رات شاہ پور میں نہیں ٹھہرتا تھا۔ لیکن آج خلافِ معمول [illegible]ی نے بھاگاں سے صحن میں تبریز کے لئے بھی بستر بچھانے کو کہا تو مدحت کو بے حد حیرت ہوئی۔

''ضرور کوئی اہم مسئلہ ہے۔''

مدحت نے بھاگاں کے ساتھ مل کر صحن میں چھڑکاؤ کر کے میاں جی اور تبریز کے لئے بستر بچھاتے [illegible] سوچا۔

عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر میاں جی باہر صحن میں اپنے بستر پر بیٹھے دیر تک ہولے ہولے… باتیں کرتے رہے۔ مدحت نے دو ایک بار جھانک کر انہیں دیکھا اور پھر سو گئی۔

صبح اُس کی آنکھ کھلی تو صحن میں چارپائیاں خالی تھیں۔ میاں جی اور تبریز شاید اندر چلے گئے… پڑھ کر وہ کچن میں آ گئی چائے دم دے کر اُس نے دودھ گرم کرنے کے لئے رکھا اور الماری سے کپ… کے لئے مڑی تو تبریز پر نظر پڑی وہ کچن کے دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑا اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''ایک کپ چائے میرے لئے بھی بنا دینا مدحت'' اُسے اپنی طرف متوجہ پا کر تبریز نے کہا

''جی۔!''

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔'' تبریز نے پوچھا

''اچھی ہوں۔''

''اپنا خیال رکھا کریں۔ مدحت۔ اور۔''

وہ بات کرتے کرتے چپ کر گیا۔

مدحت نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''مجھے آپ سے بات بھی کرنا تھی مدحت! میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ سب ٹھیک ہو… میں نے میاں جی سے بات کر لی ہے۔ میں جانتا ہوں مدحت کہ جب سے ماما نے آپ کی اور میری بات… تب سے آپ پریشان رہنے لگی ہیں۔ آپ کی پریشانی بجا تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی جگہ کوئی بھی لڑکی… پریشان ہو جاتی۔ آپ نے ماما سے سونی سے اور سب گھر والوں سے جو کچھ بھی میرے متعلق سنا ہے… بہت حد تک حقیقت ہے۔ آپ کی رفاقت یقیناً میرے لئے ایک اعزاز تھی۔ مگر میں شاید اس اعزاز… تھا۔ میں نے میاں جی سے بات کر لی ہے۔ انہیں سمجھا دیا ہے۔''

''میاں جی کو بہت دُکھ ہوا ہو گا۔''

مدحت کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''ہاں دُکھ تو ہوا لیکن بعض فیصلے تقدیر کے ہوتے ہیں۔ اور آدمی اُن میں بے اختیار ہوتا… اختیار میں اگر ہوتا تو میں کبھی بھی انہیں دکھ نہ پہنچاتا مدحت! لیکن بہت سی باتیں میرے اختیار میں… سب کچھ ایسا نہیں ہے جیسا دکھائی دیتا ہے۔ میں کچھ عجیب طرح سے اُلجھ گیا ہوں۔ میرے راستے سب… ہو گئے ہیں۔ یوں سمجھ لو ایک دلدل ہے جس میں دھنستا جا رہا ہوں۔''

''مگر وہ۔!'' مدحت نے پریشان ہو کر اُسے دیکھا پریشان اور اُلجھے اُلجھے سے تبریز کے… دل دُکھ گیا۔

یہ تبریز تھا میاں جی کا سب سے لاڈلا اور پیارا۔

''سونی نے تو کہا تھا کہ آپ اب ٹھیک ہیں''

''ہاں جسمانی طور پر تو ٹھیک ہوں۔''

تبریز نے افسردگی سے کہا۔

''لیکن میں نے اپنی روح کو گروی رکھ دیا ہے ان راستوں پر میں آپ کو ساتھ لے کر… بہت پُر خار راہیں ہیں۔ میں آپ کو ذرا سا بھی دکھ دینے کا تصور نہیں کر سکتا۔ میں ماما اور میاں جی کی… آپ کی خوشیوں کو قربان نہیں کر سکتا۔ میں نے میاں جی کو تھوڑا بہت بتایا ہے' اور میاں جی سے باصر…

…کی ہے۔ اور اس وقت مجھے آپ سے یہی کہنا تھا کہ باصر بہت اچھا ہے۔ وہ یقیناً آپ کو وہ تمام خوشیاں دے گا …جن کی تمنا کوئی بھی لڑکی کر سکتی ہے۔''

مدحت کو یوں لگا جیسے ابھی اُس کا دل رُک جائے گا۔

مدحت! میرے اس فیصلے سے اگر آپ کو دکھ پہنچا ہو تو میں اس کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ آپ بہت خوش رہیں گی۔''

یہ تبریز کیا کہہ رہا تھا۔

یہ اُس کے کان کیا سن رہے تھے۔

اُس نے تو ایک بار بھی' ایک بار بھی باصر کے ساتھ کی تمنا نہیں کی تھی۔ خاموشی کے ساتھ اس فیصلے کو قبول کر لیا تھا۔

خدا اتنا مہربان' اتنا رحیم ہے۔

کہ بن مانگے اُسے سب کچھ مل رہا تھا وہ جو اُس کے دل کی اولین تمنا تھی۔

''مدحت پلیز! آپ دل میں کوئی خدشہ نہ پالیں۔''

اُسے خاموش دیکھ کر تبریز نے کہا۔

''یہاں آنے سے پہلے میری باصر سے بہت تفصیل سے بات ہوئی ہے اور اُسے میری بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''جی!'' مدحت کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

''مدحت میرے لئے بھی دُعا کیا کرنا۔''

تبریز کی آواز بھرا گئی۔ وہ یکدم واپس پلٹ گیا اور مدحت کے آنسو بہہ نکلے۔

پتا نہیں یہ کیسے آنسو تھے' خوشی کے یا تبریز کی پریشانی پر اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں رو رہی تھی۔ دودھ اُبل اُبل کر گر رہا تھا۔ لیکن وہ روئے چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆

''ریتا!''

رتن نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ناول ایک طرف رکھتے ہوئے ریتا کو آہستہ سے آواز دی۔

''ہوں۔'' ریتا نے جو آنکھیں موندے کرسی پر آگے پیچھے جھول رہی تھی۔ آنکھیں موندے موندے کہا۔

''ریتا یہ جو محبت ہوتی ہے۔ یہ کیسے فیل ہوتی ہے' میرا مطلب ہے آدمی کیسے محسوس کرتا ہے اسے۔''

''کیوں؟'' ریتا نے ایکدم آنکھیں کھول دیں۔

''کیا تمہیں کسی سے محبت ہو گئی ہے۔؟''

''نہیں۔'' رتن نے گھبرا کر اُسے دیکھا۔

''میں تو یونہی پوچھ رہی تھی۔ یونہی کہ تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ تمہیں کیفی سے محبت ہے''

''پتا نہیں'' ریتا ہولے سے ہنسی'' اسے بیان کرنا تو بہت مشکل ہے لیزا۔ میں اور کیفی بہت دنوں سے …ہے تھے۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ کیفی مجھے بہت غور سے دیکھتا ہے۔ اور جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو مجھے …اُس کی آنکھوں میں کچھ محسوس ہوتا تھا۔ کوئی آنچ دیتا ہوا سا جذبہ' اُس کی قربت میں مجھے ڈسٹربنس سی ہونے لگتی

تھی۔ بس یوں ہی لیزا ہولے ہولے وہ میرے دل میں اُترتا چلا گیا۔ وہ کبھی کبھار کوئی معنی خیز بات کر
میں گھنٹوں اس بات کی سوچ سوچ کر خوش ہوتی رہتی تھی۔ وہ میری تعریف کرتا تو مجھے اچھا لگتا۔

"شاید اپنی تعریف مرد کے منہ سے سُننا ہر عورت کو ہی اچھا لگتا ہے لیزا۔ لیکن جن سے
کرتے ہیں' اُن کے لبوں سے اپنی تعریف سُننا کس قدر اچھا لگتا ہے' تمہیں کیا بتاؤں۔

اور پھر ایک روز جب اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے' محبت کرنے لگا ہے تو
لگا لیزا! جیسے میں بھی اُس سے محبت کرتی ہوں۔ برسوں سے کر رہی ہوں۔"

"شروع شروع میں تو وہ اکثر تمہیں ڈسٹرب کرتا ہوگا۔ جب تم راتوں کو بستر پر لیٹتی ہوگی
خیال خود بخود ہی آ جاتا ہوگا۔"

رتن نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں ایسا ہی تھا شاید۔ لیکن شروع کی کیا بات ہے میں تو اب بھی اُسے گھنٹوں سوچتی ہوں۔ دن
وشام ہر وقت کسی نہ کسی حوالے سے مجھے یاد آتا رہتا ہے۔ ویسے سچ بتاؤ لیزا کیا چکر ہے کیا دفتر میں کوئی بندہ۔"

"نہیں۔ نہیں چکر تو کوئی نہیں"

رتن نے تیزی سے کہا۔

"خیر' تمہارے دفتر میں اس قابل کوئی بندہ ہی نہیں ہے' سب بوڑھے کھوسٹ اور وہ تمہارا
خرانٹ بڈھا لگتا ہے۔ دیکھو ریٹا! تم کہیں ان کی ان میں سے کسی کی باتوں میں نہ آ جانا۔ یہ بڈھے
بڑے خبیث ہوتے ہیں۔ اور دیکھو' وہاں کسی کو اپنی کہانی بھی مت سنانا۔ وہاں کسی کو تم سے ہمدردی نہیں
اور نہ ہی تمہارے جذبہ حق سے کسی کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ سب تو ہمدردی کے بہانے تمہیں۔"

"میں جانتی ہوں ریٹا! ممی نے سمجھایا تھا۔ اور پھر وہاں تو میری کسی سے بھی کبھی بات ہی نہ
اور میرا باس تو میری بہت عزت کرتا ہے۔ وہ جان کا دوست ہے۔ بھابھی کہتا ہے مجھے۔"

"اچھا پھر ٹھیک ہے ہمارے ہاں' یعنی ادھر پاکستان میں اگر کوئی کسی کے ساتھ کوئی معتبر رشتہ
ہے تو پھر حتی الامکان اس رشتے کا بھرم رکھنے کی ضرور کوشش کرتا ہے۔ ارے ہاں۔"

وہ جھولتے جھولتے ایک دم سیدھی ہو گئی۔

"ممی نے بتایا تھا تمہیں' آج جان کا فون آیا تھا۔"

"نہیں" رتن کا چہرا یکدم سپید پڑ گیا۔

"کیا وہ آ رہا ہے؟"

"ہاں تین چار روز تک۔ تمہارے جاب کرنے پر وہ خاصا خفا ہوا تھا۔ اور اس کا مطلب سمجھی"

"نہیں۔" رتن نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے بی بی کہ اسے تم سے دلچسپی ہے۔ اور وہ تمہیں اپنی بیوی سمجھتا ہے۔
کی بلا سے تم جاب کرو یا کہیں بھی جاؤ۔"

"ریٹا! تمہارے مذہب میں اگر میاں بیوی علیحدگی اختیار کرنا چاہیں' تو کیا طریقہ کار ہے۔"

"کیوں کیا تم جان سے علیحدگی حاصل کرنا چاہتی ہو۔"

"پتا نہیں۔ مجھے کچھ نہیں پتا۔ میں بس یوں ہی پوچھ رہی تھی۔"

"دیکھو لیزا۔ جان میں بہت سی خرابیاں ہیں۔

اس کی کئی لڑکیوں سے دوستی بھی ہے۔ اور میں مانتی ہوں تمہارے ساتھ بھی وہ مخلص نہیں تھا۔ لیکن
اس کی اچھائیاں بھی ہیں۔ بائے نیچر وہ اچھا آدمی ہے' فراخ دل' ہمدرد' دوستوں اور عزیزوں پر بے دریغ
خرچ کرنے والا۔ کیا خبر اب جب کہ تم بحیثیت بیوی کے اُس کی زندگی میں داخل ہو چکی ہو' وہ تمہارے
لئے مخلص ہو چکا ہو۔ اگر وہ تمہارے لئے مخلص ہے۔

اور اس نے دل سے تمہیں اپنی وائف تسلیم کر لیا ہے تو وہ تمہارے لئے جان بھی دے سکتا ہے۔ دیکھو
فیصلہ کرنے میں جلدی مت کرنا۔ ابھی تم نے جان کے ساتھ صرف چند دن گذارے ہیں۔ وہ آ رہا ہے' تم
اُسے سمجھو' پرکھو اور اگر پھر بھی تم مطمئن نہ ہو تو پھر تم جو بھی فیصلہ کرو گی' میں تمہارے ساتھ ہوں' میں ہر طرح
تمہاری مدد کروں گی لیزا۔"

"تھینک یو ریٹا!" رتن نے متشکر نظروں سے اُسے دیکھا۔

"میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔"

"اور وہ پروفیسر صاحب بھی یہی کہتے ہیں کہ جو بھی فیصلہ میں کروں بہت سوچ سمجھ کر کروں۔"

"پروفیسر صاحب سے یاد آیا۔ تمہارا سبق کس منزل پر ہے۔"

"ابھی تو راستوں میں ہی گھوم رہی ہوں۔ ریٹا! کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے منزل بالکل سامنے ہو'
پلوں کی دیر ہے' میں منزل کو چھو لوں گی۔ لیکن پھر ایکا ایکی تمام راستے تاریکی میں ڈوب جاتے ہیں۔ اور
اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہ جاتی ہوں۔"

رتن یکدم افسردہ ہو گئی تھی۔

"پروفیسر صاحب بہت مشکل باتیں کرتے ہیں۔ ریٹا! کبھی کبھی تو اُن کی باتیں میرا ذہن کیچ ہی
کر پاتا۔"

"وہ یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں لیزا۔ بہت قابل استاد ہیں۔ اُن کا گفتگو کا انداز یہی ہے۔ اُس روز
... بھی کہہ رہی تھی کہ اُن کے لیکچر اُسے سمجھ نہیں آتے' بہت زیادہ قابلیت بھی عذاب ہی ہوتی ہے۔"

"ریٹا! تمہارا فون ہے" ممی نے باہر سے آواز دی۔

"وینا آنٹی کے گھر۔"

"اور ضرور کیفی کا ہوگا۔" ریٹا کا سانولا چہرا تمتمانے لگا۔

"وینا آنٹی کا فون نمبر صرف کیفی کے پاس ہے۔" وینا آنٹی کا فلیٹ بالکل اُن کے فلیٹ کے ساتھ ہی
...ٹا تیزی سے باہر نکل گئی تو لیزا نے ناول اُٹھا لیا۔ مگر لفظ آگے پیچھے بھاگنے لگے۔

تصور میں پھر وہی اجنبی چہرا ہلچل مچانے لگا۔

وہ حزن میں ڈوبی آنکھیں۔

چہرے پر پھیلا ملال

پیشانی پر ناگواری سی شکنیں۔

تبریز مراد علی خان۔

بیزاری اور اُکتاہٹ سے داؤد خان کو دیکھتا "عورت تمسخر یا مذاق نہیں ہے۔ قابل احترام ہستی ہے۔
تم کیسے مسلمان ہو داؤد خان! جو عورت کا احترام نہیں کرتے۔"

خدا جانے داؤد خان نے کیا کہا تھا جس کے جواب میں اُس اجنبی نے یہ بات کہی تھی۔

اور آج اتنے دن گذر گئے تھے لیکن پتا نہیں کیا بات تھی اُس اجنبی کا خیال اُس کے ذہن سے
نہیں تھا۔ وہ چہرہ ہر آن اس کا تصور میں رہتا تھا۔ پتا نہیں وہ کون تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔ زندگی میں کبھی پھر
سے ملاقات ہوئی بھی تھی۔ یا نہیں۔ لیکن اُس کے دل کے اندر کہیں یہ خواہش پیدا ہوگئی تھی کہ ایک بار بھی تو
میں ایک بار وہ چہرا اُسے پھر دکھائی دے۔ اور نہ جانے اس میں کیا اسرار ہے۔ اُس نے سوچا۔

ہزاروں چہرے ہمارے سامنے سے گزرتے ہیں۔ مگر کوئی چہرا یوں ذہن سے چمٹ کر نہیں رہ جاتا
اور وہ ریٹا کہتی ہے کہ اُسے ہولے ہولے کیفی سے محبت ہوئی تھی۔

اچانک ایک نظر دیکھ کر نہیں۔ اور کیا میں اُس اجنبی اسے محبت کرنے لگی ہوں۔ اُس نے اپنے آپ
سے پوچھا۔ ''شاید نہیں۔'' اُس نے خود ہی جواب دیا۔

''دراصل اُس کی آنکھوں میں عجیب سی اُداسی اور دُکھ کے ملے جلے سائے تھے۔ اُسکے چہرے
چھایا ملال صاف نظر آتا تھا۔ شاید اُسے کوئی پرابلم تھا۔ شاید وہ دنیا سے خوش نہیں تھا۔

شاید اُس کی طرح وہ بھی حق کی تلاش میں سب اپنوں سے بچھڑا ہوا ہو۔

وہ اُٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

میرے چہرے پر بھی تو ایسا ہی ملال ہے۔

آنکھوں میں ویسا ہی حزن ہے۔

بہت کچھ کھو دینے کا ملال۔

اور کچھ پا نہ سکنے کا غم۔

شاید اس لئے وہ میرے ذہن میں رہ گیا۔

پاپا تو میں نے ابھی تک کچھ بھی نہیں۔ اور کھو سب کچھ دیا ہے۔

او۔ ریٹا کہتی ہے کہ جان اچھا بھی ہے وہ اگر میرے لئے مخلص ہو جائے تو۔ مگر مجھے کیا۔ مجھے
سے کیا لینا۔ اور پروفیسر احسان فتح پوری کہتے ہیں۔ کہ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو جان کے ساتھ میرا رشتہ
بخود ٹوٹ جائے گا۔ لیکن جان سے الگ ہو کر میں کہاں جاؤں گی۔

اس اجنبی ملک میں کون ہے میرا۔

ریٹا، آن اور ممی ابھی تو بہت محبت کرتی ہیں۔ لیکن ممکن ہے کل کو۔ جب میں اُن کا مذہب چھوڑ دوں
وہ بھی مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔ پر کہاں ہوگا میرا ٹھکانا۔ کتنی بڑی غلطی ہوئی مجھ سے۔ اپنا گھر اپنا وطن چھوڑنے کی
مجھے چاہیے تھا وہیں رہ کر حق کو تلاشتی سچ کو ڈھونڈتی اور پروفیسر احسان فتح پوری کہتے ہیں کہ ''
پختہ ہو تو منزل خود بخود آواز دے لیتی ہے۔''

شاید مجھے بھی منزل خود ہی پکار لیتی۔ شاید وہیں کہیں سے مجھے راستہ مل جاتا۔

''یہ آئینے میں کیا دیکھا جارہا ہے؟'' ریٹا نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں۔ یونہی خود کو دیکھ رہی تھی۔'' رتن ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹ آئی۔

''خود کو۔'' ریٹا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

O☆O

''تم۔ اگر تم بھی ساتھ چلو تو شاید ممی جانے دیں''۔

ریٹا کا بہت دل چاہ رہا تھا جانے کو۔

''نہیں''۔ رتن نے بے اختیار کہا۔

میں بھلا کیسے جا سکتی ہوں میری تو ابھی نئی نئی
جاب ہے۔ اور باس کافی سخت آدمی ہے۔

''ویسے جان بھی تو آنے والا ہے؟ ریٹا نے مایوسی سے کہا۔
اور پتا ہے، وہ کیفی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔''

''ریٹا، لیزا۔''

ممی نے باہر سے آواز دی۔

''یہ تم لوگ کیا کرتا ہے۔ آفس سے آتے ہی اپنے اپنے کمروں میں گھس کے پڑ جاتا ہے۔ کبھی
اد، گھڑی کو بوڑھا ممی کے پاس بھی آ بیٹھا کرو۔''

ممی شاید اکیلے بیٹھے بیٹھے بور ہوگئی تھیں۔

''کم آن لیزا! باہر ممی کے پاس جا کر بیٹھتے ہیں۔''

وہ دونوں باہر آگئیں۔

آن شاید کچن میں رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ ممی ان کو دیکھ کر خوش ہوگئیں۔ ''ادھر میرے پاس بیٹھو''۔

انہوں نے اپنے گرد بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹ کر اُن کے لیے جگہ بنائی۔

''کس کا فون تھا؟''

''کیفی کا۔'' ریٹا نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو یاد کر رہا تھا۔''

''اچھا۔'' ممی ایک دم خوش ہو گئیں۔

''کیسا ہے وہ؟ بہت دنوں سے ادھر نہیں آیا''۔

''ان دنوں بہت مصروف تھا۔ مجھ سے بھی نہیں ملا''

''کسی چھٹی کے دن اس کو کھانے پر بُلاؤ۔ ارے یہ
مرد لوگ کا دل اسی طرح ہاتھ میں لیا جاتا۔ اُس پر
ظاہر کرو کہ تم اس کو کتنا چاہتا ہے۔ کتنا محبت کرتا ہے''

''ممی!'' ریٹا ہنس دی۔

''آپ پتا نہیں کس دُنیا کی بات کرتی ہیں۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں اسے کھانے پر بُلاؤں نہ بُلاؤں اُس پر اپنی محبت کی شدت کا اظہار کروں یا نہ کروں۔ اس کی محبت میں کمی نہیں ہو سکتی۔ جس طرح محبت کبھی گھٹ نہیں سکتی۔ چاہے وہ مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ چاہے بے وفائی کر جائے محبت تو محبت ہوتی ہے۔ ممی اُس کے لیے کسی ظاہری وسیلے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو دل سے ربط ہوتا ہے''

''ریٹا! تم افسانوں اور کہانیوں کا بات کرتا ہے
اور تمہارا ممی حقیقت بولتا ہے۔ فیکٹ (حقیقت) بتاتا ہے تم کو''۔

''محبت بھی تو ایک کہانی ہوتی ہے ممی! ایک افسانہ کسی کا انجام اچھا ہوتا ہے کسی کا بُرا''

''اور ریٹا ڈارلنگ!''

ممی زور سے ہنس دی۔

''تم ڈائیلاگ بولنے لگا ہے' ایسا کرو ٹی۔ وی۔ ڈراموں میں کام کرنے لگو۔ تمہارا فگر' تمہارا بیوٹی ام فرسٹ کلاس ہے اور تم ڈائیلاگ بھی اچھا بولتا ہے''

''ہم صحیح بولتا ہے ریٹا! تم ٹرائی کرو جب ہم تمہارا ایج
میں تھا تو ہم کو بڑا شوق تھا۔ ٹی۔ وی۔ پر جا کر کام کرنے کا' لیکن ہمارے پاس تمہارے جیسا بیوٹی نہیں تھا!''

''ارے ممی ڈارلنگ!''

ریٹا نے اُن کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''آپ کے پاس تو اب بھی بڑا بیوٹی ہے''۔

''اپنا ممی کو مت بناؤ بیٹا''۔

ممی نے محبت سے اُس کے رخساروں کو چھوا۔

''ہمارے پاس تمہارے بیوٹی نہیں تھا' نہیں تو ہم ضرور ٹرائی کرتا''۔

ممی! تم بہت سادہ ہو' صرف بیوٹی سے کام نہیں چلتا،
ٹی وی میں رول لینے کے لیے تعلقات بھی ضروری ہوتے ہیں''۔

وہ تمہارا کیفی جو ہے اس کو بولو ناں''۔

''تمہارا کیفی! وہ ممی ڈارلنگ!''

ریٹا نے اُن کے رخساروں کو بوسہ دیا۔

''کبھی کبھی تم بڑی خوبصورت بات کرتی ہو''۔

''ریٹا۔ ریٹا ڈارلنگ! اتنا دیوانگی اچھا نہیں ہے' کبھی کبھی تم تمہارا محبت سے مجھے ڈر لگنے لگتا ہے''۔

ممی نے تشویش سے کہا۔

''ڈرنے کی کیا بات ہے ممی! کیفی مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ پتا ہے ممی! وہ پندرہ دن کے لیے اسلام آباد جا رہا ہے تو اُس نے مجھ سے بھی ساتھ چلنے کو کہا ہے۔ اُسے اتنی سی جدائی گوارا نہیں۔ وہ کہہ رہا تھا ممی کہ وہ اتنے دن مجھ سے نہیں ملے گا تو پاگل ہو جائے''۔

''کیفی نے تم کو اسلام آباد چلنے کو بولا''

ممی نے اس کی بانہیں گلے سے نکال کر ناگواری سے کہا۔

''ہاں ممی!''

''تو تم اُس کے ساتھ جائے گا اسلام آباد!''

''کیا ہرج ہے ممی!'' ریٹا نے شرارات سے کہا۔

''میری بھی آؤٹنگ ہو جائے گی''۔

''ہرگز نہیں، ہم اس کا ہرگز اجازت نہیں دے گا، مجھے
تو پہلے دن کا ہے پتا تھا، یہ کیفی صحیح آدمی نہیں ہے۔ اُس
کا نیت خراب ہے۔ ایک دم خراب، ارے اس کا نیت

ٹھیک ہوتا تو تم کو کیوں بولتا اسلام آباد چلنے کو۔"

"ممی پلیز!" ریٹا نے احتجاج کیا۔

"مت کہیں اُسے کچھ"۔

"میری بات کو سمجھو ریٹا ڈیر! وہ تم کو ایسی ویسی لڑکی سمجھتا ہے، تب ہی اس نے تم کو ساتھ چلنے کا دعوت دیا ہے"۔

"ممی!" ریٹا کا رنگ یک دم سرخ پڑ گیا۔

"کیفی ایسا آدمی نہیں ہے اور وہ مجھے بھی کوئی غلط لڑکی نہیں سمجھتا۔ ہم ایک سال سے مل رہے ہیں اُس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی"۔

"بے وقوف لڑکی! وہ کس رشتے سے تم کو ساتھ لے جا رہا ہے۔ تم اس کا وائف نہیں ہے۔ اس کو ساتھ لے جانا ہے تو تم سے نکاح کر لے"۔

"ممی! میں نے آپ کو کتنی بار بتایا ہے کہ وہ میرے ساتھ مخلص ہے۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے، لیکن اُس کی کچھ مجبوریاں ہیں"۔

"تو نہیں سمجھتا ریٹا! یہ مرد لوگ اسی طرح شادی کا دانہ ڈالتا ہے اور پھر لڑکیوں کو پھانس لیتا ہے۔ تم کو بول رہا ہے ریٹا! یہ کیفی تم سے شادی نہیں بنائے گا، کسی قیمت پر نہیں بنائے گا۔ مسلمان لڑکا جس سے شادی بناتا ہے، اُس لڑکی کو اس طرح ساتھ لے کر نہیں جاتا پندرہ دن کے لیے"۔

"ممی!" ریٹا کا چہرا غصے سے تمتمانے لگا۔

"میں کیفی کی مزید انسلٹ (توہین) برداشت نہیں کر سکتی آپ کیفی کو غلط سمجھتی ہیں۔ شروع سے آپ کی رائے اس کے خلاف ہے، اس لیے کہ وہ مسلمان ہے۔ آپ اُسے پسندی نہیں کرتیں۔ لیکن ممی! میں آپ کو بتا رہی ہوں، مجھے کیفی سے ہی شادی کرنی ہے۔ چاہے مجھے اپنا مذہب ہی کیوں نہ بدلنا پڑے، آپ اُس سے نفرت کرتی ہیں"۔

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"اور ممی! میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں کیفی کے ساتھ اسلام آباد جا رہی ہوں"۔

وہ غصے سے اپنے پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رتن حیرت سے اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ پہلی بار اُس نے ریٹا کو اتنے غصے میں دیکھا تھا۔ محبت بھی کتنی عجیب چیز ہوتی ہے۔ آدمی اپنے محبوب کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سُن سکتا۔

"پوُور گرل! محبت میں میں پاگل ہو رہا ہے، بات کو سمجھتا ہی نہیں"۔

ممی نے ہاتھ ملے۔

"اُس کو سمجھاؤ لیزا! منع کرو، مت جائے اسلام آباد بوڑھا ممی کی بات بالکل ٹھیک ہے لیزا! ہم کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ تم اس کو بولو لیزا! ہم کیفی سے نفرت نہیں کرتا پر ہم نے دُنیا دیکھی ہے، مرد کا نیچر سمجھتا ہے"۔

اُن کی آواز بھرا گئی۔

"ارے اُس کو کیا پتا، بوڑھا ممی کا دل کتنا محبت بھرا ہے۔ ہمارا فادر نے ہم کو ہمیشہ محبت کا سبق دیا اور ہم کسی بھی مذہب سے نفرت نہیں کرتا۔ وہ پچھتائے گا لیزا! تم اُس کو سمجھاؤ"۔

"جی ممی!" لیزا اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اُس کی تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، یہ یکا یک ریٹا کو کیا ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو اُس سے کہہ رہی تھی وہ اسلام آباد نہیں جائے گی کیونکہ ممی اُس پسند نہیں کریں گی اور اب۔!"

ریٹا بستر پر اوندھی لیٹی رو رہی تھی۔

"ریٹا!" لیزا نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں آخر ممی نے کیا کہہ دیا ہے، اُٹھو۔!"

"ممی نے"! ریٹا نے روتے روتے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

ممی نے کیفی کی انسلٹ (توہین) کی ہے، وہ ہمیشہ ہی ایسا کرتی ہیں۔ ہمیشہ مجھے کیفی سے بدظن کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں میں اُس پر اعتماد نہ کروں، اُس سے محبت نہ کروں، اگر اُن کو کسی مرد نے ماضی میں دھوکا دیا ہے تو اس میں کیفی کا کیا قصور۔ تمام دُنیا کے مرد بے وفا نہیں ہوتے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا۔ تم جانتی ہو میں نے کیفی کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا، لیکن میں اب جاؤں گی، صرف اور صرف ممی کو بتانے کے لیے کہ کیفی ویسا مرد نہیں ہے، جیسا ممی سمجھتی ہیں، وہ مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے"۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھوں سے ابھی بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

"یقین کرو لیزا! وہ مجھ سے سچی محبت کرتا ہے"۔

"مجھے یقین ہے ریٹا! لیکن ممی بھی غلط نہیں کہتیں"۔

"نہیں لیزا! تم نہیں جانتی"۔

اُس نے ہاتھوں کی پُشت سے آنسو پونچھے۔

"نہیں ریٹا! ممی تو کسی سے نفرت نہیں کر سکتیں، میں اچھی طرح جانتی ہوں"۔

"پلیز! اب اس موضوع پر مجھ سے بات نہ کرو۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں کیفی کے ساتھ جاؤں گی۔"

"اور اگر۔"

لیزا نے اُس کی طرف دیکھا۔

"اگر ممی کی بات سچ ہوئی، اُس کی نیت میں کھوٹ ہوا تو کیا تم ہرٹ نہیں ہو گی؟"

"جو بھی ہو، کم از کم پتا تو چل جائے گا کہ ممی کا تجربہ صحیح ہے یا کیفی کی محبت سچ ہے"۔

"نہیں ریٹا! تم مت جاؤ پلیز، مت آزماؤ اُسے بھاجی کہتے تھے کبھی کسی کو آزمانا نہیں چاہیے۔ خاص کر مرد کو تو بالکل نہیں مرد تو۔"

"پلیز لیزا! نو مور۔ میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں" ریٹا نے اُس کی بات کاٹ دی۔

لیزا اُس وقت تو چپ ہو گئی اور اُسے خاموشی سے کیسٹ ڈھونڈتے اور ٹیپ لگاتی دیکھتی رہی، لیکن صبح اُس نے پھر اُسے سمجھایا۔ آن اور ممی نے بھی اُسے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ دو دن کے بعد کیفی کے ساتھ اسلام آباد روانہ ہو گئی۔

ممی سارا دن روتی رہیں اور اُس کے لیے دعائیں کرتی رہیں۔

خداوند یسوع مسیح اُس کا اعتبار قائم رکھے اور اُس کی محبت ٹوٹنے نہ پائے۔

رتن جو سارا دن پریشان رہی اور اُس کے لیے دعائیں کرتی رہی۔

اُسے خود کیفی پر اعتبار نہیں تھا۔

وہ اُس واقعے کے بعد کبھی بھی اُس کے ساتھ اکیلی باہر نہیں گئی تھی۔ کیفی کے بار ہا یقین دلانے کے [illegible] اس کے دل میں شک اُسی طرح موجود تھا کہ اُس کی نیت ٹھیک نہیں ہے اور اب بھی اُسے ممی کی بات سچ لگی تھی کہ اُس [illegible] نیت ٹھیک نہیں ہے، لیکن کیا پتا ریتا سچ ہی کہتی ہو۔ بھاجی بھی کہتے تھے کہ بُرے سے بُرا شخص بھی کسی ایک کے لیے [illegible] ہوسکتا ہے ممکن ہے، کیفی بھی ریتا کے ساتھ مخلص ہو۔ ریتا کا اعتبار قائم رہے، اُس کی محبت ٹوٹنے نہ پائے۔

وہ دفتر سے آکر خود کو تسلی دینے کے ساتھ ساتھ ممی کو بھی بہلاتی رہی۔

''وہ بچہ نہیں ہے ممی! آن نے بھی اُنہیں سمجھایا۔

''وہ اپنی حفاظت کرسکتی ہے اور نہ ہی وہ کوئی بے وقوف اور احمق لڑکی ہے کہ محبت کے نام پر سب لٹا دے۔''

لیکن ممی پھر بھی اُداس تھیں۔

''ارے اُس نے مجھ پر، بوڑھا ممی پر شک کیا ہم اُس سے، تُم سے، چارلس سے، مونی سے، تم [illegible] سے کتنی محبت کرتا ہے۔ کاش! ہم اپنا دل تم کو چیر کر دکھا سکتا''۔

''ممی پلیز! روئیں مت''۔

آن نے محبت سے اُن کے آنسو پونچھے۔

''آج میں آپ کی پسند کی ڈش بناؤں گی''۔

وہ کچن میں چلی گئی تو رتن نے ممی سے کہا۔

''ممی! چلیں میرے ساتھ، پروفیسر صاحب کے پاس چلتے ہیں، بہت دن ہوگئے ہیں مجھے وہ[illegible] گئے ہوئے وہ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں ممی! آپ کا بھی دل بہل جائے گا''۔

اور ممی اُس کے ساتھ جانے کو تیار ہوگئیں۔

آن کو بتا کر وہ دونوں باہر نکل آئیں۔

آج خلافِ معمول پروفیسر صاحب اکیلے تھے اور گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے کچھ پڑھ رہے تھے

''آؤ، آؤ لیزا بی بی! بڑے دنوں بعد آئیں''۔

''جی سر!! بس آ نہیں سکی''۔

''میں سمجھ رہا تھا شاید تھک گئی ہو، ہمت ہار گئی ہو''۔

''نہیں تھکی تو نہیں، ہمت بھی نہیں ہاری، بس کبھی کبھی ستانے لگتی ہوں''۔

پروفیسر احسان مسکرائے۔

''کبھی کبھی ستانے سے منزل پیچھے رہ جاتی ہے''۔

''یہ ریتا کی ممی ہیں''۔ اُس نے تعارف کروایا۔

''بیٹھیے خاتون''۔ پروفیسر احسان احتراماً کھڑے ہوگئے۔

ممی بیٹھ گئیں تو وہ دوبارہ بیٹھتے ہوئے لیزا کی طرف متوجہ ہوئے، جو ممی کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔

''اب کیسی کیفیت ہے ذہن کی؟''

''ویسی ہی۔'' لیزا نے بے بسی سے اُن کی طرف دیکھا۔

''کوئی خاص فرق نہیں پڑا وہی تذبذب وہی شکوک۔۔!''

''بی بی! جب تک یہ تذبذب ختم نہیں ہوگا، شکوک دور نہیں ہوں گے، یقین کا سرا ہاتھ نہیں آئے گا۔ [illegible]حقیقت تھی میں نے تم سے کہہ دی۔ خدا کو پانا یا ڈھونڈنا مشکل نہیں ہے۔ بی بی! بس جذبے کا رنگ پختہ ہو، [illegible]ین کامل ہو تو منزل خود تمہارے پاس آجائے گی''۔

''جی سر!'' لیزا نے سر ہلایا۔

''پہلے اپنے دل کے جالے صاف کرو، اندر کا میل دھولو، کوئی مہمان آتا ہے تو گھر کی صفائی کرتے [illegible]و، صاف ستھرا کر کے چمکا کر رکھ دیتے ہو گھر کو، خدا کو مہمان بنانا ہے تو دل کو بھی ایسے ہی چمکالو، ہر قسم کے شکوک [illegible]ے پاک کر کے بس ایک خدا پر ایمان لے آؤ، لیکن اُس وقت جب تمہارا دل گواہی دے۔

تمہاری روح پکارے۔

کہ خدا ہاں ہے۔

پھر تم خدا کو پالو گی''۔

''بڑا صاحب!'' ممی نے اُن کی طرف دیکھا۔

''تم کیسا بات کرتا ہے، یہاں آدمی کو پانا بڑا مشکل ہے، خدا کو کیسے پایا جاسکتا ہے؟''

''بی بی!'' پروفیسر کے ہونٹوں پر اُن کی مخصوص دھیمی مسکراہٹ آگئی۔

''آدمی کو پانا شاید مشکل ہو، لیکن خدا کو پانا مشکل نہیں ہے۔ بات جذبے کی سچائی اور یقین کی ہے، [illegible] میں تو سمجھتا ہوں، جذبہ سچا اور یقین پختہ ہو آدمی کو بھی پایا جاسکتا ہے''۔

''لیکن صاب! اپنا تجربہ ہے کہ یقین پختہ اور جذبہ سچا ہو تو بھی پانا آسان نہیں ہے''۔

''تو پھر دوسری طرف یقیناً جذبہ سچا اور یقین پختہ نہیں ہوگا''۔

پروفیسر نے بے اختیار کہہ دیا۔

''کمی کہیں تو ہوگی ناں، اس لیے آدمی کو پانا مشکل کام ہے''۔

''پروفیسر: ہم ایک بات پوچھ لے؟''

''ضرور''۔

''تمہارا مذہب میں دھوکا دینا جائز ہے''۔

''قطعی نہیں''۔

''پھر تمہارا مذہب کا لوگ دھوکا کیوں دیتا ہے فریب کیوں کرتا ہے۔ محبت کا دھوکا۔۔!''

''بی بی!'' پروفیسر احسان نے سنجیدگی سے کہا۔

''دنیا کا کوئی بھی مذہب بُرائی کی تلقین نہیں کرتا۔ لوگ بذاتِ خود بُرے ہوتے ہیں' مذہب بُرا نہیں [illegible]وتا۔ میرے مذہب کے لوگ' آپ کے مذہب کے لوگ' کسی بھی مذہب کے لوگ اگر فریب کرتے ہیں' دھوکا [illegible]یتے ہیں۔ غلط کام کرتے ہیں تو یہ مذہب انہیں نہیں سکھاتا''۔

ممی سوال کرتی رہیں اور پروفیسر احسان جواب دیتے رہتے اور رتن سوچتی رہی کہ وہ اپنے دل کے [illegible]الے کیسے صاف کرے۔

شکوک کی یہ دھند کیسے ختم ہو۔

وہ تو ابھی تک بیچ دوراہے میں ہی کھڑی تھی۔

''نہیں بی بی!'' پروفیسر احسان کی آواز بات کرتے کرتے بلند ہوئی تو وہ اپنے خیالات سے

چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

جذبہ جھوٹ نہیں ہوتا۔

محبت سچی ہوتی ہے۔

عشق سچا ہوتا ہے۔

لوگ جھوٹے ہوتے ہیں۔

فریب لوگ کرتے ہیں' محبت فریب نہیں ہوتی لوگ تو عشق مجازی سے عشقِ حقیقی تک کی منز کرتے ہیں۔

''سر پلیز۔'' رتن نے درخواست کی۔

''مجھے کچھ راستہ دکھائیں' مجھے بتائیں' میں کیا کروں''

''بی بی! راستہ تو میں نے دکھایا' رہنمائی بھی کر دی ہے۔' سفر تو تمہیں خود کرنا ہے۔ منزل تک چل کر پہنچا ہے' جذبہ ابھی خام ہے' اس لئے راستے میں بھٹک رہی ہو' اسے اور پختہ کرو' ابھی قفل لگے ہیں۔''

''سر!'' رتن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اگر میرا جذبہ خام ہوتا تو کیا میں اپنے لوگ' اپنا وطن چھوڑتی؟''

''جذبہ ہے بی بی! لیکن ابھی اسے اور تپاؤ۔''

''سر!'' وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ کچھ ملاقاتی آ گئے۔

''اچھا سر! اب ہم چلتے ہیں' پھر کبھی حاضر ہوں گے۔'' وہ کھڑی ہو گئی اور خدا حافظ کہہ کر دو آ گئیں۔

''کیا انکا فیملی نہیں ہے۔'' ممی نے باہر آ کر پوچھا۔

''نہیں' کیفی نے بتایا تھا' انہوں نے شادی نہیں کی۔''

رتن نے قریب سے گذرتی ہوئی ٹیکسی کو روکا۔

اور تب ہی اُس کی نگاہیں سڑک کے دوسری طرف اُٹھ گئیں۔

سر جھکائے گردوپیش سے بے خبر آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ یقیناً تبریز مراد علی خان تھا۔ یکا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

اُس کے بالکل پیچھے وہ دوسرا شخص بھی تھا جس کا نام داؤد خان تھا۔

''بیٹھو۔۔۔بیٹھو۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے کہا تو وہ چونک کر بیٹھ گئی۔

لیکن اُس کی پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی اور دل کے اندر ہلچل مچی تھی۔

کیا ہے اس شخص میں کہ اسے دیکھ کر دل کی حالت عجیب ہونے لگتی ہے۔

رات دیر تک وہ سوچتی رہی۔

اُلجھتی رہی' لیکن اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

کیسی پرسکون اور اطمینان بھری زندگی گذار رہی تھی وہ۔

نہ کوئی غم' نہ کوئی فکر۔

پھولوں بھرے راستوں پر چلتے چلتے خاردار راہوں پر آ نکلی تھی اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوا زخم تھے اور آبلے تھے۔

اب یہ اور اُلجھن آ پڑی تھی۔

یہ اجنبی شخص جیسے دل کے اندر دھرنا مار کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ دو حصوں میں بٹ رہی تھی۔

ایک طرف حق کی تلاش کی طلب تھی۔

اور دوسری طرف اُس شخص کو جان لینے کی خواہش کبھی کانوں میں پروفیسر احسان فتح پوری کے الفاظ گونجتے تو کبھی اُس شخص کا چہرا تصور میں آ جاتا اور اُس کی آواز ____

پروفیسر احسان کی آواز پر غالب آ جاتی۔

''عورت کا احترام سیکھو داؤد خان۔''

رات بھر وہ ٹھیک طرح سے سو نہ سکی تھی' اس لئے جب صبح اٹھی تو اُس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں درد تھا۔

''آج اگر دفتر نہ جاؤں تو کیا حرج ہے' چائے پیتے ہوئے اُس نے سوچا۔

''باس اچھا آدمی ہے یقیناً ایک چھٹی کرنے پر خفا نہیں ہوگا۔''

''لیکن نہیں۔'' اُس نے خود ہی تردید کی۔

''کیا خبر' وہ شخص۔۔۔ وہ اجنبی شخص آج دفتر میں آ ے۔ وہ اگر دفتر میں آئے تو آج وہ اُس سے ضرور بات کرے گی۔ اُس سے اُس کے متعلق پوچھے گی' اُسے بتائے گی کہ وہ لاشعوری طور پر اسے سوچتی ہے۔ جانے کیوں؟''

ممی نے بھی اُسے دفتر جانے سے منع کیا' لیکن وہ چلی آئی۔

سارا دن مختلف قسم کے لوگ آتے رہے۔

پرانے آنے والے۔

نئے آنے والے۔

وہ انہیں باس سے ملواتی رہی' وہ شخص نہ آیا' جس کا اُسے انتظار تھا اور جب آفس بند ہونے والا تھا تو اُسے داؤد خان نظر آیا۔

وہ شخص' جس کی آنکھوں میں مکاری تھی۔

اور چہرے پر خباثت۔

وہ غیر ارادی طور پر کھڑی ہو گئی اور اُس نے اُس کے پیچھے دیکھا' کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلا آیا تھا۔ وہ سیدھا اُس کے پاس آیا۔

''ہیلو مسز جان! کیسی ہیں۔''؟

''فائن۔'' وہ بیٹھ گئی۔

''آپ بیٹھیں پلیز' باس بزی ہیں' کچھ گیسٹ بیٹھے ہیں اُن کے پاس۔ میں انہیں آپ کے آنے کا بتا دیتی ہوں۔''

''داؤد خان۔'' وہ مسکرایا۔

''جی مجھے پتا ہے۔''

''آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے' حالانکہ یہ ہماری دوسری ملاقات ہے۔''

رتن نے کوئی جاب نہ دیا اور انٹرکام پر باس سے بات کرنے لگی۔

''آج رات کی فلائٹ سے جان آرہا ہے۔'' اُس نے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔

''آج رات کی فلائٹ سے!'' رتن نے زیرِ لب دہرایا۔

ریٹا نے جان کے آنے کا تو بتایا تھا' لیکن صحیح تاریخ نہیں بتائی تھی۔ اُس کا دل جان کی قرب[illegible] تصور سے ڈوبنے لگا۔

''آپ کو اطلاع نہیں تھی؟''

''نو۔۔! اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ جان بہت کمینہ ہے' اتنی خوبصورت بیوی کو بھلائے بیٹھا ہے۔ بھئی اگر کبھی جان سے کوئی [illegible] ہو تو ہمارے پاس آجائے گا۔ جان تو ناقدرا۔ ہم قدر کرنا جانتے ہیں۔''

''شٹ اَپ۔'' وہ غصے سے کھڑی ہوگئی۔

''آپ کو واقعی خواتین سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔''

داؤد خان کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ باس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ اپنے مہمانوں کے ساتھ [illegible] کرتے ہوئے باہر نکلے۔ انہیں خدا حافظ کہہ کر وہ داؤد خان کو ساتھ لئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اور وہ جتنی دیر تک آفس میں رہی کھولتی رہی گھر آ کر بھی وہ بے چین سی رہی۔

ممی الگ پریشان پریشان سی تھیں۔

آن بھی چپ چپ سی تھی۔

''ریٹا نے یوں کیفی کے ساتھ جا کر اچھا نہیں کیا۔ ممی صحیح کہتی ہیں' کیفی سمجھے گا' ریٹا ایسی ویسی لڑکی ہے۔'' کچن میں کام کرتے ہوئے اُس نے لیزا سے کہا۔

''مگر وہ بچپن سے ہی ضدی ہے۔''

''خیر اب جو ہو سو ہو۔''

کھانا کھا کر آن اپنے کمرے میں چلی گئی اور وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ ایک اور بے چین [illegible] کبھی اُٹھ کر بیٹھ جاتی' کبھی لائٹ جلاتی' کبھی بند کر دیتی' بہت سے وسوسے' بہت سے خواب اُس کے دل میں تھے۔

شاید ابھی کسی وقت جان آجائے گا۔

اور پھر شاید اس بار وہ اُس کی قسمت کا فیصلہ کر دے۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ عورت کو پاؤں کی [illegible] نہیں بناتا۔ پھر شاید ایک نیا سفر شروع ہو' مگر رات جان نہیں آیا تھا۔

صبح صبح جب وہ سب ناشتا کر رہے تھے کہ بیل ہوئی۔

''شاید جان آگیا ہے۔'' ہاتھ میں پکڑا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اُس نے سوچا۔

آن نے دروازہ کھولا تو وہ ریٹا تھی۔

ممی ایک دم کھڑی ہوگئیں۔

''تم ___!''

وہ بہت تھکی تھکی اور نڈھال سی لگ رہی تھی۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں؟'' ممی نے اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''یس ممی!'' وہ بیٹھ گئی۔

''اتنی صبح تم کیسے آگئیں۔''

'میں صبح پہلی فلائیٹ سے آئی ہوں۔''

''مگر تم تو پندرہ دن کے لئے گیا تھا۔''

ممی بھی بیٹھ گئیں۔

''ممی ___!''

وہ یک دم ہی اُن کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی تھی۔

''ریٹا ڈارلنگ!'' ممی نے اُسے اپنے بازوؤں میں بھرتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''ممی! تم ٹھیک کہتی تھیں' اُس کی نیت میں کھوٹ تھا۔''

تم ___ تم ٹھیک تو ہے ناں' سب خیریت ہے ناں' کیفی نے تمہیں' نقصان تو نہیں پہنچایا؟''

''نو ممی! میں تو ٹھیک ہوں' لیکن میرا بھرم ٹوٹ گیا ہے' میرا اعتبار ختم ہو گیا ہے' وہ کہتا ہے اُس نے [illegible]ے کبھی محبت نہیں کی' کبھی نہیں چاہا اُس نے مجھے' وہ تو بس وقت گزار رہا تھا' اُس کی ساری محبتیں وقتی تھیں' [illegible]ٹ فار انجوائے منٹ۔''

وہ ممی کے کندھے پر سر رکھے روتی رہی۔

آن اور رتن اُسے خاموشی سے روتا دیکھتی رہیں۔

''بوڑھا ممی کا بات تم نہیں سُنتا تھا ناں' ہم نے دنیا دیکھا ہے ڈارلنگ۔''

ممی بھی اُس کے بالوں میں چہرا چھپائے رو رہی تھیں۔

''تمہارا ممی نے بھی محبت کیا تھا ریٹا' محبت میں دھوکا بھی کھایا تھا' اُس کا بھی بھرم ایسا ہی ٹوٹا تھا۔ ہم [illegible]ہارا درد جانتا ہے ریٹا' ہم نے خود یہ دُکھ سہا ہے۔ ہم یونہی تو نہیں بولتا تھا۔ محبت نرا روگ ہے' درد ہے۔''

وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹی رو رہی تھیں۔

آن اور لیزا ساکت بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھیں اور باہر دروازے پر مسلسل بیل ہو رہی تھیں۔

☆☆☆☆

تبریز چلا گیا تھا' اور مدحت کی کئی دن تک یقین ہی نہ آیا۔ یہ اچانک کیا ہو گیا تھا۔ شاید خدا نے [illegible]ں کی بے آواز دُعا سن لی تھی۔

یہ تبریز نے کیا کہہ دیا تھا۔

کیا وہ اور باصر۔

کیا ایسا ہو سکتا ہے۔

کیا آنٹی یہ پسند کریں گی۔

پتا نہیں یہ صحیح ہوا ہے یا غلط۔ شاید وہ تبریز کے ساتھ انصاف نہ کر سکتی۔ شاید وہ اُس سے اتنی محبت نہ کر [illegible]تی' جتنا اُس کا حق تھا۔ خدا کرے اُسے بہت اچھی' بہت محبت کرنے والی لڑکی مل جائے۔

جو اُس کا خیال رکھے' اُس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا' اُس سے محبت کرے۔

اُس نے بڑے خلوص سے تبریز کے لئے دُعا کی۔

باصر نے کہا تھا کہ ماما کو چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہیں ہوتا۔اور تبریز بھائی کے لئے ضروری ... کوئی ان کا خیال رکھے۔

اور وہ لڑکی۔وہ بہت ماڈسی لڑکی۔جس نے تیز سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا رکھی تھی' اور جو اُس ... تبریز کو چھوڑنے آئی تھی۔اور پھر اُس روز۔مسز وہاب کے گھر سے واپسی پر تبریز اُس کے ساتھ تھا۔کیا ... اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔؟

لیکن وہ لڑکی!

وہ لڑکی تو ایسی نہیں لگتی تھی۔چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنے والی۔

اُس نے سچے دل سے تبریز کے لئے دُعا کی تھی۔

لیکن خود وہ بہت پریشان تھی۔

پتا نہیں باصر کہاں تھا؟

وہ گھر لوٹ کر آیا تھا یا نہیں۔

تبریز نے کہا تھا کہ اُس نے باصر سے بات کر لی ہے' پھر کیا آنٹی نے اور انکل نے اُس کی بات ... لی ہے۔؟

مگر نہیں' آنٹی اور انکل نے تو جنرل ہادی سے بات کی ہوئی ہے۔وہ کبھی نہیں مانیں گی' اور وہ ... بھی تو بتا رہا تھا کہ آنٹی اُس بابا کے پاس جاتی ہیں۔جادو کے لئے' تا کہ باصر اُن کی بات مان لے۔اور ... باصر اُن کی بات مان لے۔

پھر۔۔پھر۔

اور وہ گھبرا کر فاطمہ کی طرف چلی جاتی' کچن میں ماسی سے باتیں کرتی۔

میاں جی کے لئے اپنے ہاتھوں سے پرہیزی کھانا تیار کرتی' لیکن دل میں جو بے چینی سی تھی ... نہیں ہوتی تھی۔

کہیں سے کوئی خبر ملے۔

کہیں باصر ہی آ جائے۔

آنٹی اور آنکل آ جائیں اور میاں جی سے آ کر کہیں کہ وہ مدحت کو باصر کے لئے مانگنا چاہتے ہیں ... اور میاں جی۔

میاں جی کو بھلا کیا انکار ہوگا۔

انہوں نے تبریز سے وعدہ کر لیا ہے' لیکن وہ کتنے اُداس اور کتنے پریشان سے لگتے ہیں۔ہر وقت ... سوچتے رہتے ہیں' زیادہ تر کمرے میں رہتے ہیں۔

اُس روز مہمان آئے ہوئے تھے' تب بھی باہر نہیں نکلے۔

کیا تھا۔کیا تھا اگر میں میاں جی کی خوشی کے لئے تبریز کا ساتھ قبول کر لیتی۔جب تبریز نے ... وہ خود کو میرے قابل نہیں سمجھتے تو میں کہہ دیتی کہ وہ جیسے بھی ہیں میرے لئے میاں جی کا انتخاب ہیں اور ... حال میں قبول ہیں۔لیکن پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔ہونٹ سل گئے تھے' اندر باہر سات ہونے لگی تھی۔

اور میاں جی۔

میں جی پتا نہیں کیا سوچتے ہیں۔

پتا نہیں کیوں اتنے چُپ چُپ سے رہنے لگے ہیں۔اور ڈاکٹر شاہ محمد بھی تو کتنے دنوں سے نہیں آئے۔اُن کے آنے سے میاں جی کی طبیعت بہل جاتی ہے۔کیوں نہ کسی کو بھیج کر ڈاکٹر شاہ محمد کو بُلا لوں۔

مدحت جو بہت دیر سے کتابیں سامنے کھولے بیٹھی تھی' اُٹھ کھڑی ہوئی' اور کتابیں بیگ میں ڈال کر کمرے سے باہر نکل آئی۔اور کام کرتی ہوئی بھاگاں کو آواز دی۔

''سنو ماسی! آج کسی کو ذرا ڈاکٹر انکل کی طرف تو بھیجنا' بہت دنوں سے آئے نہیں۔''

''بیٹا! وہ تو ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئے ہیں۔''

''اچھا!'' وہ ایک دم خوش ہو گئی۔

''میاں جی کہاں ہیں' باہر؟''

''نہیں بی بی! وہ اندر ہی ہیں اور ڈاکٹر صاحب بھی اُن کے پاس ہی ہیں۔''

''اور لوگ بھی ہیں کیا؟''

''نہیں جی' صرف ڈاکٹر صاحب اور میاں جی ہیں۔''

''اچھا!''

اُس نے لمحہ بھر رُک کر کچھ سوچا اور پھر میاں جی کی طرف چلی آئی۔

''آہا! ہماری مدحو بیٹی کیسی ہیں۔''

ڈاکٹر شاہ محمد نے اُسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح خوشی کا اظہار کیا۔

''میں تو ٹھیک ہوں' لیکن میاں جی ٹھیک نہیں ہیں۔''

اُس نے میاں جی کی طرف دیکھا' جو اَب بھی کچھ چُپ چُپ سے بیٹھے تھے۔

''یہ تو پاگل ہے' شاہ محمد! تم نے ابھی چیک نہیں کیا' میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔''

''ہاں۔ہاں میاں جی بالکل ٹھیک ہیں۔''

ڈاکٹر شاہ محمد نے ان کی تائید کی۔

''اب ہماری بیٹی آ گئی ہے۔اب میاں جی بیمار نہیں ہوں گے۔''

اُس نے میاں جی کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر اُن کے پاس بیٹھ گئی۔

''لیکن ڈاکٹر انکل! میاں جی بہت چُپ چُپ رہنے لگے ہیں۔مجھ سے بھی بات نہیں کرتے۔ان کو کچھ ہے' آپ انہیں شہر لے جائیں نا۔وہاں کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھائیں۔''

''کیا؟'' ڈاکٹر شاہ محمد نے آنکھیں نکالیں۔

''ہماری بیٹی کے خیال میں ہم اچھے ڈاکٹر نہیں ہیں۔''

''نہیں! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

وہ یکدم شرمندہ ہو گئی۔

''میرا مطلب ہے کہ شہر میں زیادہ سہولتیں ہوتی ہیں نا۔زیادہ اچھی طرح سے چیک اَپ ہو سکتا ہے۔''

''تو یوں ہی وہم کرتی ہے۔بیٹا! مجھے کچھ نہیں ہے۔''

میاں جی نے محبت سے اُسے دیکھا۔

''اچھا آپ کہتے ہیں تو مان لیتی ہوں' لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ ایک بار آپ شہر جا کر چیک اَپ ضرور کروا لیں۔''

''اچھا بھئی' کروالوں گا۔ تبریز آئے گا تو چلا جاؤں گا اُس کے ساتھ۔''

''ہاں میاں جی! تبریز کا کوئی خط وغیرہ آیا۔''

''نہیں' کوئی خط نہیں لکھا۔ کہہ کر تو گیا تھا کہ کراچی سے واپس آ کر خط لکھوں گا۔ شاید ابھی کراچی سے آیا ہی نہیں۔''

میاں جی نے ڈاکٹر شاہ محمد کی بات کا جواب تفصیل سے دیا۔

''اور وہ ہمارے ڈاکٹر صاحب کن حالوں میں ہیں' یہاں سے جا کر پھر خبر ہی نہیں دیتے۔''

''باصر۔ باصر بھی کراچی میں ہے۔''

''وہ کراچی چلا گیا؟''

ڈاکٹر شاہ محمد نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں تبریز تو یہی بتا رہا تھا۔''

''کیا اُس نے بدر ہاسپٹل کی جاب چھوڑ دی۔

معلوم نہیں۔ تبریز نے بتایا نہیں''

پھر انہوں نے مدحت کی طرف دیکھا۔

''بیٹا جاؤ چائے بھجواؤ' ڈاکٹر صاحب کے لئے۔''

''جی!'' وہ کھڑی ہوگئی۔

''وہ ڈاکٹر انکل آپ بہت دنوں بعد آئے ہیں۔ جلدی جلدی آیا کریں۔ میاں جی اُداس رہتے ہیں۔''

''ہاں' ہاں۔ اس دفعہ کچھ تاخیر ہوگئی۔ میں کسی کام سے چلا گیا تھا۔''

''کہاں؟''

''پشاور۔''

''کیا مہراں آپا کو ڈھونڈنے۔''

اُس نے جاتے جاتے پوچھا۔

نہیں بھئی' یوں ہی اپنے کسی کام سے گیا تھا۔''

''وہ غریب نہ جانے کہاں ہوگی۔؟''

میاں جی نے اُداسی سے کہا۔

وہ میری پناہ میں آئی تھی۔ میں اُس کی حفاظت نہیں کر سکا۔ اُس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔''

میاں جی نے افسردگی سے کہا۔

''شاید خدا کو اسی طرح منظور تھا۔''

ڈاکٹر شاہ محمد نے انہیں تسلی دی۔ اور مدحت بھاگاں کو چائے بنانے کا کہہ کر پھر اپنے کمرے میں
گئی۔ اُسے یہاں آئے کتنے دن ہوگئے تھے۔ لیکن مراد منزل سے کسی نے خبر ہی نہ لی تھی۔ حالانکہ آنٹی کو
رہتی تھی اُس کی پڑھائی کی' کہ پڑھائی ضائع نہ ہو' اور اب تو کالج کھلے ہوئے بھی کتنے دن ہو گئے تھے۔ اور
سے کوئی اُسے لینے ہی نہ آیا تھا۔

لیکن بھلا کون لینے آتا۔

تبریز' باصر دونوں ہی کراچی میں ہیں۔ میاں جی بتا رہے تھے' اور رمیض ایبٹ آباد۔ انکل مراد

بڑی ہوتے ہیں۔ مگر آنٹی خلیل کو بھی تو بھیج سکتی تھیں' خود آ سکتی تھیں۔

شاید میاں جی نے انہیں بتا دیا ہو کہ میں اب واپس وہاں نہیں جاؤں گی بلکہ یہاں ہی رہ کر پڑھوں گی۔ اور پرائیویٹ امتحان دے دوں گی آنٹی نے بڑی مشکل سے میاں کی بات مانی ہوگی۔ آنٹی کو کتنا کریز ہے کہ میں اُن کے جیسی ہو جاؤں۔ میرے اندر سے گاؤں کی لڑکی کی چھاپ ختم ہو جائے' انہیں نے بہت غصہ آیا ہوگا۔ میاں جی سے پوچھوں گی۔ اُس نے سوچا' اور بیگ اُٹھا کر کتابیں نکال لیں۔

مجھے خوب محنت کرنا چاہئے۔ تاکہ بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤں۔ اور میں نے میاں جی سے یہی تو وعدہ کیا ہے کہ بہت محنت کروں گی' بہت اچھے نمبر لوں گی۔

پھر وہ بہت دیر تک پڑھتی رہی' جب تھک گئی تو سو گئی' جب سو کر اُٹھی تو مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

''ارے میں اتنی دیر سوئی رہی۔''

وہ نماز پڑھ کر باہر آ گئی۔ بھاگاں نے صحن میں چھڑکاؤ کر کے چار پائیاں بچھا دی تھیں' اور میاں جی نماز پڑھ کر وہیں باہر ہی آ بیٹھے تھے۔ وہ بھی میاں جی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''آج بہت سوئی ہو؟''

''جی میاں جی۔'' وہ شرمندہ ہوگئی۔ بس پڑھتے پڑھتے نیند آ گئی تھی۔ ڈاکٹر انکل کب گئے تھے۔؟''

''کھانا کھا کر چلے گئے تھے۔'' تم سو رہی تھیں' اس لئے تمہیں جگانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے' تم جتنا ریسٹ کرو' تمہارے لئے بہتر ہے؟

''میں تو بالکل اچھی ہوں میاں جی۔''

اُس نے محبت سے اُن کا ہاتھ تھام لیا۔

''آپ میری فکر نہ کیا کریں۔''

''اچھا نہیں کرتا۔''

''میاں جی! آپ نے لاہور خط لکھ دیا تھا کہ میں اب نہیں آؤں گی۔ ادھر ہی رہ کر امتحان دے لوں گی۔''

''ہاں بیٹا!''

''پھر آنٹی تو بہت ناراض ہوئی ہوں گی' انہوں نے خط لکھا' یا فون کیا۔ کچھ کہا؟''

''نہیں بیٹا! نہ خط لکھا نہ فون کیا۔''

''کیا پتا فون کیا ہو' اور بابو نے آپ کو نہ بتایا ہو۔'' (بابو قصبے' میں ایک پی۔ سی۔ او چلاتا تھا۔ اور ماسی بھاگاں کا بھانجا تھا۔ لاہور سے جب بھی کوئی فون آتا تھا۔ اُسی کے پاس آتا تھا' شام کو وہ گاؤں آتا تو پیغام دے دیتا تھا۔)

''بھلا بابو کیوں نہیں بتائے گا۔''

میاں جی نے حیرت سے کہا۔

''دراصل آنٹی کو بہت غصہ آیا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے غصے میں کوئی خط وغیرہ نہیں لکھا۔''

''ارے نہیں بیٹا! ڈاکٹر شاہ محمد لاہور سے ہو کر آئے ہیں۔ تمہاری آنٹی نے کہا ہے۔ اچھا ہے وہیں رہ کر پڑھ لے۔ یہاں تو ویسے ہی خوش نہیں رہتی تھی۔''

''اچھا!'' اُسے اندر سے مایوسی سی ہوئی۔

شاید اُس کا خیال تھا کہ آنٹی اور سونیا اُسے گاؤں میں نہیں رہنے دیں گی' ضد کریں گی' کہ وہ لاہور

واپس آ جائے۔

''سونیا نے بھی کچھ نہیں کہا؟''

سونیا سے تو ڈاکٹر کی ملاقات نہیں ہوئی۔

''اچھا۔ میاں جی کسی دن لاہور چلیں گے' سب سے مل بھی آئیں گے' اور میری کچھ کتابیں اور کپڑے وغیرہ بھی ہیں وہاں' لے آئیں گے۔''

''جس دن تمہارا دل چاہے بتا دینا۔ شاہ محمد سے کہہ دوں گا اور وہ ہم دونوں کو لے جائے گا۔''

''جی میاں جی!'' وہ خوش ہو گئی۔ ''سونیا بہت اچھی ہیں' مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ بہت خیال رکھتی ہیں میرا۔''

''اور زینت؟''

''آنٹی بھی خیال رکھتی تھیں' لیکن پتا نہیں کیوں کچھ دنوں سے اُن کا موڈ خراب رہنے لگا تھا۔''

''کیوں؟'' میاں جی نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ شاید باصر کی وجہ سے۔''

''باصر نے کیا کیا ہے؟''

''وہ۔۔'' وہ تھوڑا سا جھجکی۔ پتا نہیں تبریز نے میاں جی کو باصر کے ناراض ہو جانے کے متعلق بتایا ہے کہ نہیں۔

''ہاں۔''

میاں جی اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''وہ باصر نے یہاں شاہ پور میں ہاسپٹل بنوانے کی بات کی تھی' آنٹی اس پر خفا تھیں کہ یہاں ان کا وقت ضائع ہو گا۔''

''ہاں!'' میاں جی نے ایک گہری سانس لی'۔ میں نے سمجھایا تھا اُسے کہ یہ خیال دل سے نکال دے' لیکن اب تو اُس نے تبریز کو بھی ہم خیال بنا لیا ہے۔ وہ کہہ کر گیا ہے کہ یہاں شاہ پور میں ہاسپٹل ضرور بنوائے گا' سمجھاؤں گا۔ پھر سمجھاؤں گا اُنہیں کہ ماں باپ کو ناراض نہ کریں۔''

''بابو آیا ہے میاں جی!''

بھاگاں نے پاس آ کر کہا تو وہ اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''بُلا لو اُسے۔''

بابو نے اندر آ کر میاں جی اور مدحت کو سلام کیا۔

''خیریت ہے بابو! فون آیا ہے لاہور سے؟''

''نہیں میاں جی فون تو نہیں آیا' چاچا لاہور گیا تھا' میاں صاحب نے بُلوایا تھا۔ چاولوں کی فصل کے حساب کتاب کے لئے۔ بیگم صاحبہ نے اُس کے ہاتھ خط بھیجا ہے۔''

اُس نے جیب سے لفافہ نکال کر اُنہیں دیا۔

''بھاگاں! بابو کو چائے پلاؤ۔''

''نہیں میاں جی! میں اب چلوں گا۔ سیدھا اِدھر ہی آ رہا ہوں۔ ماں انتظار کر رہی ہو گی۔''

''اچھا کام تو ٹھیک جا رہا ہے ناں۔''

''جی میاں جی! آپ کی دعا سے آمدنی ہو ہی جاتی ہے۔''

بابو کے جانے کے بعد میاں جی نے لفافہ مدحت کی طرف بڑھا دیا۔

''لو بیٹی! پڑھ کر مجھے بھی سُنا دو۔ میرا چشمہ اندر رہ گیا ہے۔''

''جی۔۔!'' مدحت نے خط کھولا۔

آنٹی کا خط تھا' انہوں نے لکھا تھا کہ مدحت اگر وہاں ہی رہ کر پڑھنا چاہتی ہے تو اُس کی مرضی' جہاں تک باصر اور مدحت کی بات ہے تو تبریز نے اس سلسلے میں مجھ سے بات کی تھی۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ باصر کی بات تو اس سے پہلے ہی جنرل ہادی کے ہاں طے پا چکی ہے' اور رمیض تو ابھی کاکول میں ہے اور شاید رمیض کے فارغ ہونے تک آپ انتظار نہ کر سکیں۔ تبریز سے آپ خود ایک بار پھر بات کریں' یوں بھی لڑکیوں کے نام جس کے ساتھ۔''

بہت لمبا چوڑا خط تھا۔ مدحت نے باقی خط پڑھے بغیر میاں جی کی طرف بڑھا دیا۔

''آپ خود ہی پڑھ لیں میاں جی! میں آپ کا چشمہ لا دیتی ہوں۔''

چشمہ میاں جی کو دے کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

تو یہ خوشی' یہ سکون صرف تھوڑی دیر کے لئے تھا۔ مجھے پتا تھا آنٹی نہیں مانیں گی ___ اور ___ کیا باصر نے اُن کی بات مان لی ہے۔ یقیناً وہ واپس آ گیا ہو گا' ماں باپ سے ناراض ہو کر کوئی کب تک رہ سکتا ہے' وہ بھی مان گیا ہو گا۔ شاید بابا کا جادو کام کر گیا ہو۔

آنسو خود بخود ہی اس کی آنکھوں میں آ گئے۔

پتا نہیں میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا۔

میرے دل میں کیوں باصر کے لئے چاہت پیدا ہوئی۔ اور پھر میں نے اُسے بھول جانے کی کتنی کوشش کی۔ اور جب میں نے اپنے دل کو اس بات پر تیار کر لیا کہ باصر کا ساتھ میرا مقدر نہیں ہے تو پھر اچانک تبریز نے آ کر میرے دل میں پھر سے امید کا چراغ روشن کر دیا۔ میں تو راضی بہ رضا ہو گئی تھی۔ پھر کیوں۔ کیوں؟

اُس کے آنسو زیادہ تیزی سے بہنے لگے تو اُس نے اپنا چہرا گھٹنوں پر رکھ یا' اور نہ جانے کتنی دیر تک وہ یوں ہی گھٹنوں پر سر دھرے روتی رہی۔

''بیٹی۔۔!'' میاں جی نہ جانے کب اندر آئے تھے' اُنہوں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اُس نے چونک کر سر اُٹھایا۔

''جی۔''

''بیٹی!'' میاں جی نے تڑپ کر اُسے دیکھا۔

''بیٹا! کیوں روتی ہو؟''

''کچھ نہیں میاں جی! بس یوں ہی دل بھر آیا تھا۔''

اُس نے جلدی سے آنسو پونچھے۔

''بیٹا۔۔!''

میاں جی اُس کے قریب بیٹھ گئے اور انہوں نے اُس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''بیٹا! آج تک میں نے تم سے بات نہیں کی تھی' میرا خیال تھا کہ وقت آئے گا تو تم سے بات کر لوں گا' لیکن اب میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہیں سب کچھ بتا دوں' خاص طور پر اس لئے بھی کہ تبریز کی باتوں سے مجھے

اندازہ ہوا ہے کہ وہاں لاہور میں اس طرح کی بات ہوتی رہی ہے' اور تم اس بات سے آگاہ ہو چکی ہو۔''
انہوں نے اُس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ وہ نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے
بعد انہوں نے پھر کہنا شروع کیا۔
''تمہاری ماں جی کی خواہش تھی کہ تمہاری شادی تبریز کے ساتھ ہو اور اس خواہش کا اظہار
نے کئی بار مراد سے بھی کیا تھا' اور مراد کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ یوں بچپن میں ہی یہ بات بزرگوں میں طے پا گئی
لیکن جب مراد لاہور چلا گیا۔ تو میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ ممکن ہے بچوں کا معیار اور سوچ بدل گئی
لئے تبریز کے امریکہ جانے سے پہلے میں نے خود تبریز سے بات کی' اُسے کوئی اعتراض نہیں تھا' بلکہ وہ اسے
خوش نصیبی سمجھتا تھا۔ اُن دنوں تم چھوٹی تھیں۔ اس لئے میں نے تم سے بات نہیں کی۔ لیکن میرا ارادہ تھا کہ
وقت آئے گا تو تم سے رائے ضرور لوں گا۔''
''کاش میاں جی! آپ نے مجھے اُس وقت بتا دیا ہوتا تو شاید باصر کا خیال میرے دل میں پیدا نہ ہوتا
مدحت نے سوچا۔
''لیکن پھر یوں ہوا۔ کہ تبریز امریکہ میں ایک مصیبت میں پھنس گیا۔ وہ پچھلے دنوں آیا تو اُس نے
مجھ سے بات کی۔''
''میاں جی!''
مدحت نے سر اُٹھا کر انہیں دیکھا۔
''وہ کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں؟ کیا آپ انہیں اس مصیبت سے نجات نہیں دلا سکتے؟''
''پتا نہیں۔ اُس نے کچھ زیادہ تفصیل نہیں بتائی' لیکن مجھے شک ہے کہ وہ کسی گینگ کے چکر
گیا ہے۔ میں اس کے لئے دعا کر سکتا ہوں' خدا بہتری کرے گا انشاءاللہ۔''
انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
''تبریز نے مجھ سے کہا کہ ماما اُس کی اور تمہاری منگنی کا فنکشن دھوم دھام سے کرنا چاہ رہی ہیں
اور تم اس سلسلے میں پریشان رہنے لگی ہو۔ اور۔ اور یہ کہ وہ اب خود کو اس قابل نہیں سمجھتا اور
ساتھ زیادتی ہے۔ باصر کے لئے اُس نے تمہاری خواہش کی تھی۔ مجھے تو دونوں ہی عزیز ہیں۔ دونوں
پیارے بچے ہیں۔ میں نے مراد کو تبریز کی خواہش کے متعلق لکھا تھا اور غالباً تبریز نے خود بھی گھر میں اس
تھا۔ تمہاری آنٹی نے اِس سلسلے میں خط لکھا ہے۔ اگر وہ باصر کے لئے جنرل ہادی کی بیٹی سے بات کر چکی
کوئی بات نہیں۔ تم کیوں رو رہی ہو۔
بیٹا! خدا تمہارے لئے بہتری کرے گا۔ اس میں تمہاری کوئی توہین نہیں ہے بیٹا!''
انہوں نے اُسے سمجھایا۔
''میاں جی!''
آنسو ایک بار پھر اُس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے' تو میاں جی نے اُسے اپنے ساتھ
بہت دیر تک اُن کے سینے سے لگی روتی رہی' اور وہ ہولے ہولے اُسے تھپکتے رہے۔ اب میاں جی کو کیا بتا
میں کس عذاب میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ کون سا درد میرے دل کو چیر رہا ہے۔
میری آنکھیں کیوں برس رہی ہیں۔
میرے دل میں تو دوسری بار اُمید کے چراغ جل کر بجھے ہیں۔

دوسری بار پھر میں اُسی کرب سے گذر رہی ہوں۔ نہ پا سکنے کا' بچھڑ جانے کا کرب۔
''زینت کا مزاج کچھ عجیب سا ہے۔''
میاں جی نے اُسے الگ کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔
''میں نے تمہیں شاید وہاں بھیج کر غلطی ہی کی تھی' وہ۔''
''نہیں میاں جی!'' مدحت نے جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا آنٹی بہت خیال رکھتی تھیں میرا'
اور رمیض تو کہتا تھا کہ امی نے کبھی ہم سب کو اتنی توجہ نہیں دی' جتنی توجہ وہ آپ کو دیتی ہیں۔''
''بھتیجی بھی تو ہو تم ان کی۔ شیراز کا کبھی ذکر ہوا وہاں۔''
میاں جی نے پوچھا۔
''شیراز کون؟''
غیر ارادی طور پر اُس کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ خود ہی شرمندہ ہو گئی۔ اپنے باپ کا نام بھی اُسے اجنبی
لگتا تھا۔
''نہیں تو' آنٹی نے تو کبھی ذکر نہیں کیا۔''
''عجیب آدمی ہے' کبھی مڑ کر بیٹی کا حال بھی نہیں پوچھا۔''
''میرے تو سب کچھ آپ ہی ہیں میاں جی۔''
''ہاں' ہاں۔''
میاں جی نے پیار سے اُس کے رُخسار تھپتھپائے اور کھڑے ہو گئے۔
''چلو اُٹھو' منہ ہاتھ دھو کے باہر آ جاؤ۔ بھاگاں نے روٹی پکالی تھی۔ کھانا کھا کے اور عشاء کی نماز پڑھ
کر سو جاؤ۔''
''جی میاں جی۔۔؟
اُس کا کھانا کھانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ میاں جی کے خیال سے منہ ہاتھ دھو کر باہر
چلی آئی۔
میاں جی کی طبیعت اچانک ہی بہت خراب ہو گئی تھی۔ رات' اچھے بھلے وہ سوئے تھے بلکہ سونے سے
پہلے بہت دیر تک وہ مدحت سے باتیں کرتے رہے تھے۔ اُس کی امی کی اور مراد علی کے بچپن کی باتیں۔
ماں جی کا ذکر۔
اپنی زندگی کے مختلف واقعات کے متعلق اور مدحت کا ذہن بھی بٹ رہا تھا۔ لیکن صبح جب وہ نماز کے
لئے اُٹھے تو گر پڑے۔ مدحت انکے وضو کا پانی رکھ کر مڑی ہی تھی۔ کہ انہیں گرتے دیکھ کر اُن کی طرف لپکی۔
بڑی مشکل سے انہیں سہارا دے کر چارپائی پر لٹایا۔ لیکن وہ بے ہوش ہو چکے تھے۔ بھاگاں نے فوراً ہی باہر سے
کسی کو بھیجا کہ ڈاکٹر شاہ محمد کو بُلا لائے۔ اُن کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک ہائی تھا۔ برین ہیمرج فالج کچھ بھی ہو
سکتا تھا' لیکن میاں جی شہر جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے لاہور بھی خبر دینے سے منع کر دیا تھا۔
''خوامخواہ پریشانی ہو گی مراد کو۔ اتنا مصروف تو رہتا ہے وہ اور باصر' تبریز گھر پر نہیں ہیں۔''
''وہ بیٹے ہیں آپ کے میاں جی۔''
ڈاکٹر شاہ محمد نے کہا۔
''مصروفیات آپ سے زیادہ اہم ہیں۔''

''میں نے کہاناں کہ میں ٹھیک ہوجاؤں گا۔'' میاں جی نے دلاسا دیا۔
''کچھ ہوگیا آپ کو تو میاں صاحب۔ وہ ہم سے کہیں گے کہ ہم نے انہیں اطلاع نہیں دی۔''
''ابھی بلاوا نہیں آیا بے وقوف۔''
انہوں نے آہستگی سے کہا۔ لیکن ڈاکٹر شاہ محمد نے سُن
لیا۔ اور پھر اس کے بعد انہوں نے ضد نہیں کی، البتہ خود وہ تین دن سے ادھر ہی مقیم تھے۔ بلڈ پر
اب نارمل تھا۔ لیکن میاں جی کو سانس کی تکلیف ہوگئی تھی۔ اور سانس کی یہ تکلیف ہمیشہ ہی ان کو نچوڑ کر رکھ دی
۔ انہوں نے کئی بار ڈاکٹر شاہ محمد سے کہا کہ جاؤ اب تمہارے مریض پریشان ہوں گے۔ اکلوتے ڈاکٹر ہو۔''
''مریض پریشان نہیں ہوتے افضل ہے وہاں۔'' (افضل ایک ماہ قبل ہی جہلم سے ڈسپنسر کا کور
کرکے آیا تھا، اور ڈاکٹر شاہ محمد کے کلینک پر بیٹھنے لگا تھا) اگر کوئی سیریس کیس ہوا تو بلالے گا وہ مجھے۔''
مدحت کو اپنی پریشانی تو بھول ہی گئی تھی اُسے تو بس میاں جی کی پریشانی لگ گئی تھی۔ میاں جی کو
ہوگیا تو میرا کیا بنے گا۔ میں کہاں جاؤں گی۔
ڈاکٹر شاہ محمد نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
''تم اتنی پریشان نہ ہوا کرو مدحو بیٹا! پہلے ہی تم کمزور ہو۔ کچھ مت سوچو۔ تمام مصیبتیں اللہ کی طر
سے آتی ہیں۔ اور وہ ہی ان کا سدِ باب کرتا ہے۔ خدا میاں جی کو لمبی زندگی دے گا پتا نہیں ابھی خدا نے ان
ہاتھوں کتنے بندگانِ خدا کو فیض پہنچانا ہے۔ پتا ہے مدحو بیٹی، جب میں پہلی بار شاہ پُور آیا تھا تو بالکل بے یار و مد
تھا، پہلی بار ڈاکٹر شاہ محمد نے اپنے بارے میں بات کی۔
''بہت تھکا ہوا نڈھال۔
اور زندگی سے تنگ آیا ہوا۔
میں زندگی سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ لیکن حرام موت سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں نے سوچا کسی گ
میں کسی کونے میں پڑا رہوں گا، اور ایک دن خود ہی موت میرے دروازے پر آکر دستک دے گی، اور پھر قسمت
مجھے یہاں لے آئی۔
میاں جی کے در پر۔
میاں جی نے مجھے سینے سے لگایا۔
میرے اندر زندگی کی امنگ پیدا کی۔
اور زندہ رہنے کا مقصد سمجھایا۔''
''آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر انکل آپ کے عزیز، ماں، باپ، بہن، بھائی سب۔''
''پھر کبھی۔۔۔ پھر کبھی سہی مدحو بیٹا! فی الحال کتاب زندگی کا وہ باب بند ہی رہنے دو۔ جسے مدتوں
میں نے بند کر دیا تھا۔''
وہ میاں جی کی طرف متوجہ ہوگئے تھے اور مدحت سوچتی رہ گئی تھی کہ یہ ہر وقت ہنسنے ہنسانے
ڈاکٹر اندر سے کتنے دکھی ہیں۔ پتا نہیں ان کے ساتھ کیا ہوا ہے، اور وہ ریمی بھی تو کہتا تھا۔ کہ ڈاکٹر شاہ
ساتھ ضرور کوئی المیہ ہے۔
ورنہ بندہ دنیا میں یوں اکیلا تو نہیں ہوتا۔ کوئی تو اپنا ہوتا ہے۔ اور ڈاکٹر شاہ محمد نے کبھی ذکر نہیں
کسی کا۔

رمیض نے گھر فون کیا ہوگا تو پتا نہیں آنٹی نے کیا کہا ہوگا رمیض نے وعدہ کیا تھا کہ وہ خط لکھے گا مگر
ٹ آباد جا کر اُس نے خط نہیں لکھا تھا۔
اور سونیا نے بھی تو خط نہیں لکھا۔
کسی نے یاد تک نہیں کیا۔
اتنی بیمار تو تھی جب میں وہاں سے آئی تھی۔ اور پتا نہیں سونیا مطمئن ہوئی ہے یا نہیں۔
اُس روز کتنی پریشان تھی وہ۔ عبید بھائی سے محبت کرنے لگی تھی۔ اور اُس کا خیال تھا کہ عبید بھائی اُس
ے محبت نہیں کرتے۔ اُن کی آنکھوں میں اُس کے لیے محبت کے دیئے نہیں جلتے، وہ بس عام سرسری سی نظر سے
ے دیکھتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں کوئی جذبہ لَو دیتا دکھائی نہیں دیتا۔ جبکہ سونی۔۔۔ پتا نہیں ہم سب لڑکیاں
وں کے متعلق اتنی بے وقوف کیوں ہوتی ہیں۔ اتنی کمزور، محبت کے ایک لفظ سے ہار جانے والی۔
پگھل جانے والی۔
یاصر نے بھی تو بس ایک بار ہی تو وہ چند لفظ کہے تھے، اور میں ہار گئی۔ پتا نہیں یہ محبت چیز ہی ایسی ہوتی
ہے، کیوں ہوتی ہے یہ محبت، کس لیے ہوجاتی ہے، سونیا ملے گی، تو میں اُس پوچھوں گی، کیا وہ بھی ہر وقت میری
طرح عبید کو سوچتی ہے۔
کیا اُس کے دل میں بھی وسوسے اور وہم آتے ہیں۔
مگر نہیں میری طرح کیوں۔
اُس کے پاس تو ابھی امید کا دیا ہے۔
ابھی اس کی لو ہے۔
وہ ابھی مایوس نہیں ہوئی۔
پھر اس کے لیے عبید کو پانا مشکل نہیں۔
اس کی محبت کو بھی۔
اور میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔
کوئی امید کوئی آس۔
اور تبریز جو امید کا آنچل تھما گئے تھے۔ وہ تو ہاتھ سے چھوٹ بھی گیا۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں دل مایوس
نہیں ہوتا۔ محبت ختم نہیں ہوتی۔ یہ محبت بھی عجیب شے ہوتی ہے۔
محبت اوس کی صورت۔
پیاسی پنکھڑی کے ہونٹ کو سیراب کرتی ہے۔
گلوں کے آستینوں میں انوکھے رنگ بھرتی ہے۔
محبت کے دنوں میں دشت بھی محسوس ہوتا ہے۔
کسی فردوس کی صورت۔
اور جب محبت بچھڑ جاتی ہے تو فردوس بھی دشت بن جاتی ہے۔ ویرانہ بن جاتی ہے ہر طرف خاک
انے لگتی ہے۔
''مدحو بیٹا! میاں جی کے لیے سُوپ لے آؤ۔''
''جی!'' اُس نے چونک کر ڈاکٹر شاہ محمد کی طرف دیکھا۔ ''اور زیادہ مت سوچا کرو، یہ چھوٹا سا جو

تمہارا دماغ ہے نا۔ اتنا بوجھ برداشت نہیں کر سکے گا۔"

ڈاکٹر شاہ محمد مسکرا رہے تھے وہ بھی مسکرا دی۔

پھر میاں جی کو سُوپ پلاتے ہوئے اُس نے ڈاکٹر شاہ محمد کی طرف دیکھا۔

مسکراتے ہونٹ۔

روشن اور کشادہ پیشانی۔

کس قدر مطمئن اور پُرسکون۔

پتا ہی نہیں لگتا کہ کبھی زندگی نے ان کے ساتھ بُرا سلوک کیا ہوگا۔

میاں جی اب آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے نا۔" انہیں اُن کو سُوپ پلاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"بالکل۔"

"میاں جی! آپ میرے لیے پریشان نہ ہوا کریں، میں اپنی زندگی سے بالکل خوش، پُرسکون مطمئن ہوں۔"

"ہاں بیٹا! خدا تمہیں ہمیشہ خوش اور پُرسکون رکھے۔

"میاں جی اسوپ اچھا بنا ہے نا۔"

"ہاں بیٹا! بہت اچھا ہے۔"

میاں جی مسکرائے، تب ہی بھاگاں اندر آئی۔

"باہر کوئی پروفیسر عبید آئے ہیں لاہور سے۔"

"اندر بھیج دو انہیں۔"

میاں جی نے کہا۔ اور مدحت کی طرف دیکھا۔

"یہ غالباً وہی عبید میاں ہونگے، وہ جو تم لوگوں کے ساتھ آئے تھے لاہور سے۔"

"جی، شاید وہی ہوں گے۔"

مدحت خالی پیالی لے کر کمرے سے باہر نکلی تو صحن میں بیگ اُٹھائے عبید اِدھر ہی آتے نظر آئے۔

"السلام علیکم!"

مدحت کو دیکھ کر وہ خوشدلی سے مسکرائے۔

"السلام علیکم عبید بھائی۔"

"آپ یہاں کیسے۔"

"بس چھٹیاں تھیں تین چار، سوچا میاں جی کی صحبت سے فیض اُٹھایا جائے۔ آپ کیسی ہیں۔ بور تو نہیں ہوئیں۔"

"نہیں بالکل ٹھیک ہوں، اور گھر میں سب ٹھیک ہیں۔ نورا آپی، سویرا اور آنٹی، انکل۔"

"سب مزے میں ہیں۔ سویرا اکثر آپ کو یاد کرتی ہے، کالج میں اس کا آپ کے بغیر دل نہیں لگتا۔"

"ہاں، مجھے بھی وہ یاد آتی ہیں۔"

"آپ پھر واپس نہیں آئیں۔"

"وہ میاں جی بھی بیمار رہتے ہیں' میں نے سوچا' پرائیویٹ ہی بی اے کرلوں۔"

"کیا میاں جی بیمار ہیں کچھ؟"

"ہاں' کچھ طبیعت خراب ہے اُن کی۔"

"لیکن آنٹی نے تو ذکر نہیں کیا۔ دو تین دن پہلے وہ آئی تھیں۔"

"اُن لوگوں کو میاں جی نے اطلاع نہیں کرنے دی۔ ویسے اُدھر سب ٹھیک تو ہیں نا۔"

"ہاں' سب ٹھیک ہی ہیں۔ میں تو بہت دنوں سے اُدھر گیا نہیں۔ تبریز اور باصر تو کراچی گئے ہوئے ہیں۔ آنٹی اور سونیا بالکل خیریت سے ہیں۔"

"جی۔ آپ چلیں' میاں جی انتظار کر رہے ہوں گے۔" مدحت نے کمرے کی طرف اشارا کیا تو عبید نے سر ہلایا۔

مدحت کچن میں آگئی۔ تاکہ ماسی بھاگاں کے ساتھ مل کر چائے کا بندوبست کر سکے۔

"تو باصر ابھی تک کراچی سے واپس نہیں آئے۔"

چائے کا پانی رکھتے ہوئے اُس نے سوچا۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آنٹی نے یوں ہی لکھ دیا ہے۔ باصر نے ابھی تک آنٹی کی بات نہیں مانی۔ اگر وہ آنٹی کی بات مان لیتے تو ضرور واپس آ جاتے امید کی ننھی سی کرن پھر اُس کے اندر جل اُٹھی۔

چائے بھیجو کر وہ اپنے کمرے میں آ کر بیٹھی ہی تھی' کہ ڈاکٹر شاہ محمد ایک بڑا سا سادا کاغذ اُٹھائے اُس کے کمرے میں چلے آئے۔

"مدحو۔۔ مدحو بیٹی!"

وہ بہت پُرجوش ہو رہے تھے۔

"ارے یہ دیکھو بیٹی! یہ دیکھو۔"

"یہ کیا ہے؟"

مدحت اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"ارے یہ نقشہ ہے__ نقشہ' شاہ پور کے ہاسپٹل کا' ابھی ڈاک سے آیا ہے۔ تبریز میاں نے بھیجا ہے کراچی سے۔"

"یہ دیکھو۔"

انہوں نے نقشہ ٹیبل پر پھیلایا۔

"تبریز میاں جاتے ہوئے سب پیمائش اور نقشہ وغیرہ لے گئے تھے۔ یہ انہوں نے بنوایا ہے۔ یہ ڈبل اسٹوری ہوگا۔ لیکن وقت لگے گا۔

یہ دیکھو بیٹا! تبریز میاں نے لکھا ہے کہ کسی اچھے ٹھیکیدار سے بات کروں۔ وہ چاہتا ہے کہ بہت جلد ہاسپٹل کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے۔ وہ باصر سے ملا تھا۔ اچھے ہیں' وہ خیریت سے ہیں"

"لیکن پیسہ؟ پیسہ کہاں سے آئے گا اتنا؟"

"پیسہ بھی آ جائیگا' جب کام شروع ہو جائیگا۔ تو خود بخود راستے آسان ہو جائیں گے۔"

ڈاکٹر شاہ محمد کو اتنا زیادہ خوش' اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"ایک دن ایسا ہوگا جب یہاں شاہ پور میں ہمارا یہ ہاسپٹل ہوگا۔"

انہوں نے نقشہ لپیٹتے ہوئے کہا۔

''پھر۔۔۔ سید پور سے' شاہ پور سے رنگ نگر سے' سارنگ سے' اردگرد کے سب دیہاتوں
مریض یہاں آیا کریں گے۔ڈاکٹر شاہ محمد اور باصر کا خواب' ایک ہاسپٹل جدید سہولیات سے آراستہ۔
اچھا مدحو بیٹا! تم دُعا ضرور کیا کرو' ہر نماز کے بعد کہ ہمارا یہ خواب پورا ہو جائے۔''
''انشاء اللہ ضرور پورا ہوگا۔''
''میں چلوں پروفیسر عبید کو میاں جی کے پاس چھوڑ کر تمہاری طرف بھاگا آیا ہوں۔عبید میاں
ہی کہوں گا کسی اچھے ٹھیکیدار کا بتائے مجھے۔میں تو برسوں سے گاؤں میں ہوں۔مجھے کیا پتا کون کیسا ہے۔دھو
بڑا دھوکا ہو گیا ہے۔بی بی۔لوگ لالچی ہو گئے ہیں۔اپنے نفع کے لئے دوسروں کو نقصان پہنچا دیتے ہیں
نہیں سوچتے کہ وہ کیسے اور کہاں نقصان پہنچا رہے ہیں۔''
ڈاکٹر شاہ محمد بڑبڑاتے ہوئے باہر چلے گئے تو وہ مُسکرا دی۔
ڈاکٹر شاہ محمد اس طرح اتنے بے آپے تو کبھی نہیں ہوئے تھے۔لیکن آج یہ خوشی اُن سے سنبھالی
جا رہی تھی۔
''خدا کرے ڈاکٹر شاہ محمد اور باصر کا یہ خواب ضرور پورا ہو۔''
اُس نے صدق دل سے دُعا کی' اور اپنی چیزیں ترتیب سے رکھنے لگی۔تین دن سے وہ میاں
پاس ہی تھی' اُنہیں کے کمرے میں تھی' اور اُس کے اپنے کمرے میں کتابیں یونہی پلنگ پر بکھری پڑی تھیں
کے کپڑے کچھ تو کرسی پر پڑے تھے۔کچھ پلنگ پر۔اُس نے کپڑے تہ کر کے الماری میں رکھے' کتابیں
ترتیب سے رکھیں۔کچھ بیگ میں ڈال کر الماری میں رکھ دیں۔پڑھنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔حالانکہ اس
فارغ تھی' میاں جی کے پاس ڈاکٹر شاہ محمد اور پروفیسر عبید تھے' لیکن پتا نہیں کیوں موڈ ہی نہیں بنتا تھا
کا۔بس۔دل چاہتا تھا' ہر وقت چُپ چاپ لیٹی رہے' کچھ سوچتی رہے۔اور کوئی اسے ڈسٹرب نہ کرے۔
اس وقت بھی وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔اور اُس نے آنکھیں موند لیں۔اور مراد منزل میں گزارا
دن' جب تبریز کی آمد کی خوشی میں فنکشن تھا' اس کے تصور میں چلا آیا۔پھر ایک کے بعد ایک خیال آتا
باصر کی شرمندگی اور معذرت۔
تبریز کی شاہ پور آمد۔
آنٹی کا خط۔
اور بند آنکھوں سے آنسو پھسل پھسل کر تکیے لیں۔جذب ہونے لگے۔

☆☆☆☆

میاں جی آج چھ سات دنوں بعد باہر مردانے میں گئے تھے' کوئٹہ سے کچھ لوگ تین دن سے
ٹھہرے ہوئے تھے۔اور میاں جی سے ملنے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔سو میاں جی باہر چلے گئے تھے' آ
طبیعت بھی کافی بہتر تھی۔ڈاکٹر شاہ محمد بھی آج صبح اپنے کلینک میں چلے گئے تھے۔پروفیسر عبید۔میاں جی کی
میں تھے' غالباً اُن کی کتابوں سے فیض اُٹھایا جا رہا تھا۔مدحت نے چائے بنوا کر اُن کے لئے بھجوائی تو وہ چا
ہاتھ میں لئے باہر ہی آ گئے۔مدحت اپنا چائے کا کپ لئے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی' اُنہیں دیکھ کر رُک
''کیسے ہیں آپ؟''
'فائن!'' وہ مُسکرائے۔''میاں جی کے پاس سے جانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔اتنا علم
بصیرت افروز گفتگو کہ بس وہ بولتے رہیں اور آدمی سُنتا رہے۔

''جی' میاں جی ایسے ہی ہیں۔''
مدحت کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔جب کوئی۔میاں جی کی تعریف کرتا تھا' تو وہ یوں ہی خوش ہو جاتی تھی۔
''آپ بہت خوش قسمت ہیں مدحت کو آپ نے میاں جی جیسی شخصیت کے زیرِ سایہ تربیت پائی ہے۔''
انہوں نے ایک نظر مدحت کے چہرے پر ڈالی۔
نکھری نکھری آنکھیں۔
دُھلا دُھلا سا پاکیزہ چہرہ۔
کتنی معصومیت اور پاکیزگی ہے اس لڑکی کے چہرے پر۔
''مدحت! مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنا تھی۔لیکن آپ پھر مجھے نظر ہی نہیں آئیں۔''
''جی کہیے۔''
''بیٹھ جائیں کہیں۔''
انہوں نے مڑ کر برآمدے میں پڑی ہوئی کرسیوں کو دیکھا۔''یہاں ہی بیٹھ جائیں یا اندر چلیں۔''
''جی۔'' مدحت نے بھی کرسیوں کی طرف دیکھا۔
''یہاں ہی بہتر ہے۔''
''مدحت! انہوں نے بیٹھتے ہوئے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔
میں چاہتا تھا کہ میاں جی سے بات کرنے سے پہلے آپ سے بات کرلوں۔حلانکہ ڈیڈی آنا چاہ
رہے تھے میاں جی کے پاس، لیکن میں نے انہیں روک دیا؟''
''کیسی بات۔''
مدحت نے انہیں پریشان ہو کر دیکھا۔
''بہت دن پہلے سویرا نے مجھ سے کہا تھا کہ بھائی میں نے آپ کے لیے ایک لڑکی ڈھونڈ لی ہے۔
بالکل ایسی ہی جیسی آپ چاہتے ہیں۔لیکن پھر پتا چلا کہ وہ لڑکی کسی اور سے منسوب ہے۔مگر اب۔۔''
انہوں نے پھر چائے کا ایک گھونٹ بھر کر گہری نظروں سے مدحت کو دیکھا۔
''پلیز' آپ صاف بات کریں۔'' مدحت نے الجھ کر کہا۔
''آل رائیٹ۔'' وہ مسکرائے۔
''کچھ دن ہوئے سونیا نے نویرا کو بتایا تھا، کہ تبریز نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔''
مدحت کا چہرا ایک دم سُرخ پڑ گیا۔پتا نہیں کیسا احساس تھا۔شاید توہین کا وہ اسے سمجھ نہ سکی، اور نگاہیں
جھکائے نیچے دیکھتی رہی۔
''اور وہ ایک خواہش جو پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گئی تھی، وہ پھر پیدا ہو گئی، میں نے جب آپ کو
پہلی بار دیکھا تھا تو سوچا تھا، سویرا کا خیال بالکل صحیح ہے، اور وہ یہ کہ آپ ہی وہ لڑکی ہیں زندگی کے سفر میں، جس کی
ہمراہی میری خوش نصیبی ہے۔میں چاہتا ہوں کہ میاں جی سے بات کرنے سے پہلے آپ کی رائے معلوم ہو سکے۔
اپنے متعلق اتنا بتا دوں کہ میں نے اب تک کی زندگی بڑی صاف شفاف گزاری ہے، پیچھے مڑ کر دیکھوں تو مجھے
اپنی زندگی کی سڑک پر کہیں کوئی گرد، مٹی اور دھول نظر نہیں آتی۔''
''نہیں پلیز نہیں۔''
مدحت نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''کیوں؟'' پروفیسر عبید نے حیرت سے اُسے دیکھا، اور ہاتھ میں پکڑا ہوا کپ نیچے جھک کر ز[illegible]
رکھ دیا۔

''پلیز، آپ میاں جی سے کوئی اس طرح کی کوئی بات نہیں کریں۔'' مدحت نے سر اُٹھا کر انہیں دیکھا۔

''یقین کریں مدحت! میں ہمیشہ آپ کی خوشیوں کے لیے کوشاں رہوں گا میری ذات سے آ[illegible]
کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

''جی، میں جانتی ہوں میں ایسا نہیں چاہتی، پلیز میں ایسا نہیں چاہتی۔''

اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

''آپ۔۔آپ روئیں نہیں پلیز۔''

پروفیسر عبید کے چہرے پر سایہ سا پھیل گیا۔

''میرا مقصد آپ کو دکھ دینا نہیں تھا۔۔ میں صرف آپ کی رائے جاننا چاہتا تھا۔ اگر آپ ایسا
چاہتیں تو ٹھیک ہے، میں میاں جی سے بات نہیں کروں گا۔ پلیز آپ روئیں نہیں۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔''

مدحت نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کئے۔

''میں آپ سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ آپ ایسا کیوں نہیں چاہتیں۔'' تاہم اگر آپ کہیں تو میں
سے بات کروں۔ تبریز تو بہت سنجیدہ اور سمجھدار لڑکا ہے، پتا نہیں اس نے ایسا کیوں کیا۔''

''نہیں۔ آپ کو اُن سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ انہوں نے میرے لیے۔۔۔میرے لیے

وہ چپ ہو کر ہونٹ کاٹنے لگی۔

''آل رائیٹ۔''

وہ کھڑے ہو گئے۔

''اگر میری بات سے آپ کو رنج ہوا ہو تو اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔''

''نہیں کوئی بات نہیں۔''

مدحت بھی کھڑی ہو گئی۔ اس کی نگاہیں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔ اور وہ کچھ مضطرب سی کھڑی تھی۔
کیا آپ کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔؟ پلیز بلا جھجک کہیں اور بھول جائیں اس بات کو جو میں نے ابھی کہ[illegible]

''وہ۔ آپ سونیا سے۔ سونیا سے شادی کر لیں۔'' مدحت نے بالآخر کہہ دیا۔

''بہت اچھی ہے وہ۔''

''ہاں مجھے پتا ہے وہ اچھی ہے، لیکن کچھ لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں، دل کو بھا جاتے ہیں''

''وہ'' مدحت نے ان کی بات نظر انداز کر دی۔'' وہ بہت محبت کرتی ہیں آپ سے' بہت
ہیں آپ کو۔''

''مگر میں نے میں نے تو اس طرح کی کوئی بات نہیں کی ان سے، کوئی امید نہیں دلائی انہیں۔''

''مگر محبت تو محبت ہوتی ہے۔ خود بخود ہو جاتی ہے' آپوں آپ۔''

مدحت نے اب کی بار بڑے یقین سے کہا۔

''اچھا آپ کو پتا ہے محبت کا؟''

عبید کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر کے وہ سرخ ہو گئی پلکیں جھک گئیں۔

پروفیسر عبید نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

اس لڑکی کے دل میں ضرور کسی کی محبت نے بسیرا کر رکھا ہے۔'' تب ہی تو اس نے مجھے رد کر دیا۔ خدا
اسے اپنی محبتوں میں کامیاب کرے۔ خدانہ کرے اگر اسے محبت نہ مل سکی تو یہ شیشے سی لڑکی تو ٹوٹ جائے گی۔

''آپ نے کسی نہ کسی سے تو شادی کرنا ہے۔ تو پھر سونیا سے کر لیں۔ مجھے یقین ہے آپ اُس سے
محبت کرنے لگیں گے!

''ہاں' شاید میں اُس سے محبت کرنے لگوں۔''

انہوں نے آہستگی سے کہا۔

''یہ تو ایک حقیقت ہے سچ ہے کہ اگر کوئی ہم سے محبت کرتا ہے تو ہم بھی اُس سے محبت کرنے پر مجبور
ہو جاتے ہیں۔''

''ہاں' یہ کوئی سچ نہیں ہے۔ ایسا ضروری نہیں ہوتا۔ بعض اوقات یہ عمل بالکل ایک طرفہ ہی رہتا ہے''

''لیکن۔'' مدحت نے نگاہیں اُٹھا کر انہیں دیکھا۔

''پانی قطرہ قطرہ کر کے بھی پتھر پر گرتا رہے۔ تو ایک نہ ایک دن اُس میں سوراخ ہو جاتا ہے۔''

''اچھا!'' وہ ہنس دیے۔

''شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مگر بہت سی باتیں آدمی کے اختیار میں نہیں ہوتی ہیں۔ بی بی!''

اور یہ بات تو وہ بھی جانتی تھی کہ بہت سی باتیں آدمی کے اختیار میں نہیں ہوتی ہیں۔

''مدحت!'' اُسے خاموش دیکھ کر انہوں نے آہستگی سے کہا۔

''میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں آپ سے کوئی شدید قسم کی محبت کرنے لگا تھا۔'' تاہم آپ کے ساتھ کی تمنا
ضرور میرے دل میں پیدا ہوئی تھی' اور ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی بہت اچھی چیز کو دیکھ کر دل میں اُسے پانے
کی خواہش پیدا ہو' اور نہ پا کر اُس کی کسک کچھ عرصہ عرصہ تک دل میں رہے میرے دل میں بھی شاید یہ کسک کچھ
عرصہ تک رہے اور پھر وقت کے ساتھ خود ہی ختم ہو جائے۔

تاہم میں کوشش کروں گا کہ سونیا سے محبت کر سکوں۔ میں آپ کی بات نہیں ٹال سکتا مدحت! کیونکہ
جو ہمیں اچھے لگتے ہیں' اور جن کے لئے ہمارے دل میں کوئی اچھا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ہم اُس کا مان نہیں توڑ
سکتے۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے مدحت کہ اگر آپ زندگی کے سفر میں میری شریک نہیں بن سکتیں تو پھر کوئی اور
بھی نہیں بنے گا' سوائے سونیا کے۔ اس لئے کہ یہ آپ کی خواہش ہے۔''

O☆O

انہوں نے افسردگی سے کہا۔ اور چائے کا کپ وہیں چھوڑ کر واپس بڑے کمرے میں چلے گئے
میاں جی کی لائبریری بھی تھی اور خواب گاہ بھی۔

مدحت پھر وہیں بیٹھ گئی۔ دم بخود اور حیران سی۔

یہ سب کیا؟

اور اسی کے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ اور شکر ہے عبید نے میاں جی سے بات کرنے سے
اس سے بات کر لی۔ ورنہ شاید وہ میاں جی کے سامنے انکار نہ کر پاتی۔ اور میاں جی شاید عبید کا رشتہ قبول
لیتے۔ کیونکہ جب سے آنٹی زینت مراد کا خط آیا تھا۔ وہ کچھ پریشان سے تھے، اور انہوں نے بیماری کے د
دو ایک بار ڈاکٹر شاہ محمد سے اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ کاش وہ اپنی زندگی میں ہی مدحت کو محفوظ ہاتھو
دے جاتے اور ڈاکٹر شاہ محمد نے ان کو باصر کا انتظار کرنے کو کہا تھا۔ شاید انہیں کچھ اندازہ تھا، یا پھر باصر نے
بتا رکھا تھا، کہ وہ گھر سے کس بنا پر جا رہا ہے۔ شاید ڈاکٹر شاہ محمد کو سب کچھ پتا تھا۔

اس نے اطمینان بھری سانس لے کر سر کرسی کی پشت سے ٹکا ہی تھا کہ بڑا گیٹ کھلا اور میاں جی
داخل ہوئے، مدحت سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور انہیں اندر آتے ہوئے دیکھنے لگی۔ برآمدے تک پہنچتے پہنچتے ا
سانس اکھڑی سی گئی۔

انہوں نے برآمدے کے ستون کا سہارا لیا۔ تو مدحت نے بھاگ کر انہیں تھام لیا۔

''میاں جی! کیا ہوا؟ آپ کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں تھی، آپ کو باہر نہیں جانا چاہیے تھا''

''وہ لوگ تین دن سے منتظر تھے''۔

''اندر ہی بلوا لیتے آپ''۔

مدحت نے انہیں سہارا دیا۔

''اور لوگ بھی تو تھے۔ بڑی دور سے بڑی آس لے کر آتے ہیں''

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

''اور تم پریشان نہ ہو۔ یونہی کمزوری سے چکر آ گیا ہے، اتنے دن بیمار رہا ہوں تو کمزوری آہستہ
آہستہ ہی جائے گی نا''

وہ انہیں سہارا دے کر بڑے کمرے میں لائی۔ اور انہیں بستر پر لٹایا۔ عبید کی پیٹھ ان کی طرف تھی، اور
بڑی الماری کھولے اس میں سے کچھ کتابیں دیکھ رہے تھے۔ آہٹ پر چونک کر مڑے۔ اور مدحت کو میاں جی
سہارا دے کر لاتے دیکھ کر گھبرا کر ان کی طرف پلٹے۔

''کیا ہوا؟ میاں جی! ٹھیک تو ہیں ناں''

''کمزوری سے چکر آ گیا ہے'' میاں جی نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو ابھی چند دن آرام کرنا چاہیے'' عبید۔۔۔ ان کے پلنگ کے پاس کھڑے تھے۔ اور ان کے ہاتھ
میں ایک پھول دار کپڑے کا تھیلا سا تھا۔

''میاں جی! میں آپ کے لیے دودھ لاتی ہوں۔ آپ لیٹے رہیں'' ''نہیں بیٹا! اس وقت دودھ کو
دل جی نہیں چاہ رہا۔'' ''گلوکوز ڈال دوں؟'' ''کچھ بھی جی نہیں چاہ رہا۔''

''نہیں، میاں جی!'' عبید ان کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئے۔ اور ہاتھ میں پکڑا ہوا تھیلا قریب ہی رکھ
دیا ''آپ ضرور کچھ لیں۔ مدحت''۔ انہوں نے پاس کھڑی مدحت کی طرف دیکھا۔

''فی الحال پانی میں گلوکوز ڈال دیں کچھ دیر بعد دودھ دے دینا''۔

''جی۔!'' مدحت سرہانے پڑی میز کی طرف بڑھ گئی، جس پر پانی گلوکوز وغیرہ پڑا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' میاں جی نے پاس پڑے تھیلے کو دیکھا۔ ''اوہ۔!'' عبید چونکے۔

''یہ تھیلا بڑی الماری میں کتابوں کے درمیان پڑا تھا۔ میں نے نیچے والی کتاب نکالی تو یہ نیچے گر گیا۔
شاید اس میں آپ کے کچھ کاغذات ہیں۔ میں رکھنے ہی لگا تھا کہ آپ آ گئے''۔

''میرے کاغذات''۔

''اوہ!'' میاں جی ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''بیٹے۔ یہ تو مہراں کی امانت ہے'' انہوں نے تھیلا ہاتھ میں لے لیا۔ تھیلے کا منہ سلائی سے بند کر دیا گیا تھا۔

''پتا نہیں کیا ہے اس میں شاید کچھ کاغذات ہی ہیں''

انہوں نے ہاتھ سے اسے ٹٹولا۔

''جب مہرو آئی تھی نا یہاں تو اس نے مجھے یہ تھیلا دیا تھا کہ اسے سنبھال کر رکھ لوں، پھر اتنے سال وہ یہاں
رہی نہ اس نے اس کا ذکر کیا، نہ مجھے ہی خیال آیا۔ میں نے یہاں الماری میں رکھ دیا تھا۔ تب سے یہاں ہی پڑا ہے۔''

''یہ لیں میاں جی!''

مدحت نے گلاس ان کی طرف بڑھایا۔

''یہ گلوکوز پی لیں''۔

انہوں نے گلاس تھامتے ہوئے تھیلا مدحت کی طرف بڑھا دیا۔

''بیٹا یہ لو۔۔۔ یہ رکھ لو اپنے پاس، مہراں کی امانت ہے یہ وہ جب کبھی آئی اور مجھے یقین ہے، اگر وہ
زندہ ہوئی تو ضرور آئے گی۔ میں ہوں یا نہ ہوں۔ تم یہ امانت اسے دے دینا''۔

''میاں جی!'' مدحت تھیلا پکڑتے ہوئے رو سی دی۔
''آپ ہمیشہ رہیں گے۔ ہمیشہ''۔
''پاگل ہو بالکل۔ پہلے کب کوئی ہمیشہ رہا ہے جو میں رہوں گا۔ جانا تو ہے ہی۔ آج یا کل''
''پر آپ۔ آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔''
''اچھا نہیں کرتا۔ جاؤ شاباش! یہ تھیلا سنبھال کر رکھ لو۔ اور بھاگاں سے کہو۔ آج کھانا ذرا جلد کر دے۔ عبید میاں کھانا کھا کر جائیں گے''
''اچھا!'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا باہر نکل گئی۔
تھیلا اس نے اپنی کپڑوں والی الماری میں رکھ دیا، اور کچن میں آگئی تا کہ کھانا بنانے میں بھا... مدد کر سکے۔ اس نے سوچا تھا کہ فارغ ہو کر وہ تھیلا لاکر میں سنبھال کر رکھ دے گی، لیکن کھانے سے فار... ...سو گئی اور اسے تھیلا سنبھالنا یاد ہی نہ رہا۔

☆☆☆☆

پروفیسر عبید چلے گئے تھے، اور رات کو ڈاکٹر شاہ محمد آ گئے تھے۔
''آج تو میں ٹھیک تھا ڈاکٹر شاہ! تم نے تو یوں ہی تکلیف کی۔''
''ارے میاں جی! مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ خوشی ہوتی ہے کہ کچھ دیر کے لیے آپ ... میسر آگئی۔ آپ کی باتوں سے مستفیض ہوتا ہوں۔ آپ کے علم سے فائدہ اٹھاتا ہوں''۔
''میں کیا اور میرا علم کیا شاہ محمد''
''آپ نے بہت اچھا کیا ڈاکٹر انکل! اگر آپ نہ آتے تو میں آپ کو بلوا لیتی۔ دن میں ان کی ... بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی''۔
مدحت نے میاں جی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔
''عبید صاحب چلے گئے۔ ڈاکٹر شاہ محمد نے پوچھا۔
''ہاں۔'' میاں جی نے کہا۔
''بہت اچھا لڑکا ہے، علم کا رسیا، مزاج کا بھی بہت اچھا ہے۔ بہت معلومات ہیں۔ اپنی عمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ علم ہے اس کے پاس۔ ایسے علم دوست لوگوں سے مل کر خوشی ہوتی ہے''۔
''ہاں۔!'' ڈاکٹر شاہ محمد نے بھی تائید کی۔
''بڑے باپ کا بیٹا ہے، لیکن مزاج میں عجیب سی انکساری ہے''۔
پھر وہ مدحت کی طرف متوجہ ہوئے۔
''ہاں مدحو بیٹا! تم آج بہت تھکی تھکی سی لگ رہی ہو۔ جلدی سو جانا۔ میں ہوں نا میاں جی کے...
''میں دن کو بھی سوئی رہی ہوں۔ ابھی کچھ دیر بیٹھوں گی میاں جی کے پاس''۔
''اچھا بیٹھو بھئی لیکن چہرے سے تھکی تھکی سی لگ رہی ہو۔''
''سر میں ہلکا ہلکا سا درد ہے''
''ذرا سی مجھے تکلیف ہو تو پریشان ہو جاتی ہے، رونے لگتی ہے''۔
میاں جی نے محبت سے اسے دیکھا۔
''اس کی ماں بھی ایسی ہی تھی۔ اتنے ہی چھوٹے سے دل کی، گھر میں ذرا کسی کو سر درد...

...نے بیٹھ جاتی تھی، اور رو رو کر خود کو بخار چڑھا لیتی تھی۔''
''میاں جی! آپ نے وہ نقشہ دیکھا تھا نا ہاسپٹل کا۔ بہت مکمل ہے، بہت خوب صورت ہے۔ دونوں ...ل لان رکھے گئے ہیں۔''
ڈاکٹر شاہ محمد اپنے ہاسپٹل کی باتیں کرنے لگے۔
مدحت اور میاں جی دلچسپی سے ان کی باتیں سنتے رہے پھر میاں جی عشاء کی نماز کے لیے اٹھے تو ...حت بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
''بیٹا! ہمارے بستر باہر ہی بچھا دینا۔ اندر بہت گھٹن ہے''۔
''جی بہتر!''
''رات کو بے فکر ہو کر سونا، میاں جی کی فکر نہ کرنا''
ڈاکٹر شاہ محمد نے بھی تاکید کی۔
صحن میں بستر بچھوا کر وہ کمرے میں آئی تو اندر بہت گھٹن اور حبس تھا۔ میاں جی صحیح ہی کہہ رہے تھے ...اس نے سوچا اور بھاگاں سے کہا کہ اپنا اور اس کا بستر چھت پر بچھا دے۔
''ہاں میں بھی یہی سوچ رہی تھی بی بی! آج تو بہت ہی حبس ہے، شاید صبح تک بارش ہو جائے''۔
پھر نماز پڑھ کر وہ بستر پر لیٹتے ہی سو گئی۔ چھت پر موسم اچھا تھا۔ فضا میں خنکی تھی۔ وہ بہت گہری نیند سو گئی تھی۔
...اؤں میں اکثر لوگ گرمیوں کی راتوں میں چھت پر ہی سوتے ہیں۔ لیکن جب سے وہ لاہور سے آئی تھی نیچے کمرے میں ...ں سو رہی تھی۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب اچانک اسکی آنکھ کھل گئی نیچے کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی۔
''میاں جی۔ کہیں میاں جی کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔''
وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ اور اس نے بستر سے پاؤں نیچے رکھا ہی تھا کہ بھاگاں نے قریب سے سرگوشی کی۔
''بی بی! اٹھیں نہیں؟''
''کیوں؟''
''نیچے ڈاکو ہیں۔''
''کیا؟''
حیرت سے اس کی آواز بلند ہو گئی۔
''ڈاکو۔''
بھاگاں بھی شاید جاگ رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔
''ہاں ڈاکو ہیں''
ابھی لفظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ نیچے سے دھڑا دھڑ گولیاں چلنے کی آواز اور پھر بھاگتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔
''میاں جی! میاں جی!''
اس کی سسکی سی نکل گئی۔ اور اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ لیکن بھاگاں نے اسے پکڑ لیا۔
''کیا کر رہی ہو بی بی!''
''مجھے نیچے جانے دو، وہ میاں جی کو مار ڈالیں گے۔'' لیکن بھاگاں نے اسے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اور وہ بھاگاں کے بازوؤں میں دبکی ہوئی ہولے ہولے سسک رہی تھی''

"مجھے نیچے جانے دو۔ میرے میاں جی، میرے میاں جی"۔

پتا نہیں اسی طرح کتنا وقت گزر گیا۔

نیچے پہلے خاموشی ہوئی، پھر گاؤں کی چھتوں پر سے لوگ جھانک جھانک کر ایک دوسرے سے
لگے کیا ہوا۔ حویلی کے باہر کافی لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔

لنگر خانے سے باہر مردانے سے لوگ دروازے پر جمع ہو گئے تھے، اور دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے

بھاگاں نے مدحت کو چھوڑ دیا۔

وہ بھاگتی ہوئی نیچے اتری۔ بھاگاں بھی اس کے پیچھے تھی۔ نیچے برآمدے میں لائٹ جل اٹھی
نے آخری سیڑھی پر سے میاں جی کو دیکھا جو سوئچ بورڈ کے پاس کھڑے تھے۔

"میاں جی!"

وہ بھاگ کر ان سے لپٹ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔

"سب ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے بیٹا حوصلہ کرو"

تب ہی بڑے کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر شاہ محمد باہر نکلے۔

"انکل! آپ ٹھیک ہیں۔"

وہ میاں جی کو چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئی

"ہاں۔ ہاں بالکل ٹھیک ہوں"

انہوں نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

"بس یہ ذرا سی گولی لگ گئی تھی"

انہوں نے بازو آگے کیا جو سرخ ہو رہا تھا۔

"زخم گہرا تو نہیں ہے ڈاکٹر؟"

میاں جی نے پوچھا۔

"نہیں میاں جی! بس گولی چھو کر گزری ہے؟

"کون لوگ تھے وہ؟ کیوں آئے تھے؟" مدحت نے بے چینی سے پوچھا۔

"شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو گی"

میاں جی نے آہستگی سے کہا۔

"ہاں شاید ڈاکو تھے، زیورات اور نقدی کی تلاش میں تھے"

ڈاکٹر شاہ محمد نے بتایا۔

"اندر ہال کمرے میں سب سے الماریاں کھلی ہیں اور کتابیں زمین پر ڈھیر ہیں۔ تمہارے کمرے
کا لاکر ٹوٹا ہوا ہے۔ کوئی زیورات تو نہیں تھے اس میں؟"

"نہیں۔ شاید دو چوڑیاں اور ایک چھوٹا سا لاکٹ سیٹ تھا۔ باقی زیور تو بینک میں ہے"۔

"اس کی ماں کا زیور میں نے بینک میں رکھوا دیا تھا"

میاں جی نے بتایا۔

باہر شاید پورا گاؤں اکٹھا ہو گیا تھا۔ لوگ بے چین ہو رہے تھے۔ بھاگاں نے اگرچہ انہیں بتا دیا
کہ سب خیریت ہے۔ شاید ڈاکو تھے۔ لیکن لوگ میاں جی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ان سے ملنا چاہتے تھے۔

"بیٹا! تم اندر جاؤ۔"

میاں جی نے صحن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"جی!" مدحت اپنے کمرے میں آ گئی، لیکن پھر باقی رات وہ سو نہیں سکی تھی۔

شاہ پور میں اس طرح کا واقعہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور پھر میاں جی کی حویلی۔ کئی دن تک یہ موضوع
م بحث رہا۔ دور دور کے گاؤں سے لوگ میاں جی کے پاس آتے رہے۔

"یقیناً یہ باہر کے لوگ تھے، ارد گرد کے علاقے کے لوگ اتنی جرات نہیں کر سکتے"۔

سب کا یہی خیال تھا۔ میاں جی نے تھانے میں رپورٹ درج نہیں کروائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ
ب کچھ نقصان نہیں ہوا رپورٹ کیوں کروائی جائے خوامخواہ کی خواری۔

وہ لوگ پچھلی دیوار پھاند کر آئے تھے۔ اور بڑی خاموشی سے کمروں کی تلاشی لے رہے تھے کہ
انک ڈاکٹر شاہ محمد کی آنکھ کھل گئی۔ انہیں بڑے کمرے میں آہٹ سنائی دی تو انہوں نے پوچھا کون ہے، جواباً
ہوں نے فائر کر دیا۔ ار پھر اسی طرح فائر کرتے ہوئے پچھلی دیوار سے پھاند گئے تھے۔ پچھلی ہی طرف ہی ان کی
یپ کھڑی تھی۔ وہ نہر کی طرف سے آئے تھے، جیپ کے ٹائروں کے نشان ادھر ہی جا رہے تھے۔

کئی دن تک تو فرصت ہی نہ ملی، لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ جو حویلی پر ٹوٹ پڑا تھا۔ عقیدت مند، بے
ن اور مضطرب تھے۔ بڑے دنوں بعد میاں جی کو فرصت ملی تو وہ مدحت کے کمرے میں آئے۔ مدحت اپنے
مرے میں بیٹھی کچھ نوٹس بنا رہی تھی۔

"ہماری بیٹی پڑھ رہی ہے"

"جی میاں جی"

"ڈاکٹر انکل کیسے ہیں میاں جی! ان کا زخم ٹھیک ہوا۔؟"

مدحت نے فائل بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ کافی بہتر ہے" میاں جی نے کہا۔

"شاہ محمد نے مستری بھیجا تھا لاکر کا۔ نیا لاک لگ گیا"

"جی۔ میاں جی"

"بے چارے ڈاکوؤں کو بہت مایوسی ہوئی ہو گی، یہاں کچھ نہ پا کر۔ غصے میں وہ میری چوڑیاں اور
ٹ بھی چھوڑ گئے"۔

"کیا۔؟"

میاں جی نے چونک کر کہا۔

"جی میاں جی لاکر کا تالا ٹوٹا ہوا تھا لیکن سیٹ اور دونوں چوڑیاں تو اسی طرح پڑی ہیں۔
وہ سمجھتے ہوں گے۔ آپ کے پاس بہت دولت ہو گی بے چارے"

"مدحت!" میاں جی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تم نے وہ تھیلا۔ وہ مہراں کا تھیلا لاکر میں رکھا تھا۔ اس کی امانت وہاں ہے دیکھو۔ دیکھو ذرا۔
ہوں نے بے چینی سے کہا۔

مدحت نے اٹھ کر لاکر کھولا۔

"نہیں میاں جی! لاکر میں تو صرف میرا یہ زیور ہے۔ اور یہ جائیداد کے کاغذ کی فائل ہے اور بس"۔

''وہ تھیلا''

میاں جی نے سرگوشی کی۔

''مہراں کی امانت۔کیا جواب دوں گا اسے میں۔ اگر وہ کل کو آگئی اپنی امانت لینے تو۔''

''اوہ!'' مدحت کو اچانک یاد آیا۔

''وہ تھیلا تو میں نے لاکر میں رکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا لاکر میں رکھنا۔اپنی کپڑوں والی الماری میں رکھا تھا کہ پھر فارغ ہو کر رکھ دوں گی''۔

''دیکھو دیکھو بیٹا! وہاں ہے'' انہوں نے بے چینی سے کہا مدحت نے الماری کھول کر دیکھا۔

بھاگاں نے شاید اور کپڑے دھو کر اوپر رکھ دیے تھے۔دو چار کپڑے ہٹا کر اس نے دیکھا۔

تھیلا وہیں پڑا تھا۔

''یہ رہا میاں جی!''

اس نے تھیلا میاں جی کو دیا۔

''شکر ہے خدایا۔''

میاں جی نے ایک گہرا سانس لیا اور تھیلا ہاتھ میں لے کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

☆☆☆☆

ریٹا بہت دیر سے تکیے میں منہ چھپائے لیٹی ہوئی تھی۔رتن نے دو تین بار سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا وہ یونہی منہ چھپائے لیٹی رہی۔وہ کچھ دیر پہلے ہی آفس سے آئی تھی، لیکن ریٹا نے اس کے آنے کا کوئی نوٹس لیا تھا۔وہ یونہی لیٹی رہی تھی۔ایک بار اس نے اسے آواز دی بھی تھی، لیکن پھر سوتا سمجھ کر اخبار لے کر بیٹھ گئی تھی۔

مگر کیا تھا اخبار میں۔

وہی روزمرہ کی خبریں۔

کوئی نئی بات نہیں تھی۔

اس نے اخبار رول کر کے ایک طرف رکھ دیا۔کہیں کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا۔

دل چاہتا تھا کہ بس روئے جائے، روئے چلی جائے۔ایک ریٹا تھی جس سے کبھی کبھار وہ دل کی کر لیتی تھی اور اس کا دل بہل جاتا تھا۔ٹوٹے ہوئے حوصلے بحال ہو جاتے تھے، لیکن اب ریٹا نے بھی چپ لی تھی۔جب سے اسلام آباد سے آئی تھی خاموش تھی' اور اس روز کے بعد کسی نے اسے چھیڑا بھی نہیں تھا، کچھ نہیں پوچھا تھا اس سے اور خود اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔شاید اس وقت وہ کچھ مزید بتاتی کہ جان آگیا تھا۔

جان کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے سب حیران رہ گئے تھے۔حالانکہ سب کو پتا تھا کہ وہ ان دنوں آنے والا ہے۔خود رتن دم بخود سی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''ہا۔! وہ اسے دیکھ کر مخصوص انداز میں ہنسا۔

''تم تو اور بھی پیاری ہو گئی ہو سویٹ! لگتا ہے پاکستان کی فضا راس آگئی ہے تمہیں''۔

رتن کی نگاہیں جھک گئیں۔

''مجھے وہاں جا کر بہت افسوس ہوا تمہیں ساتھ لے کر نہ جانے کا، وہاں کی لڑکیوں میں ایک بھی تم جیسی نہیں''۔

جان کی نظریں اس کے وجود کے پار ہو رہی تھیں اور اندر ہی اندر وہ ساری جان سے لرز رہی تھی۔

کاش! جان نہ آتا کبھی نہ آتا۔

جان بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے اندر تک آیا۔

ریٹا اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

''سویٹ ممی! کیسی ہو؟''

اس نے رتن کا ہاتھ چھوڑ کر ان کے رخساروں پر بوسہ دیا۔

''تم نے اس بار بڑا دیر لگایا ڈیر'' ممی نے بھی اپنے آنسو صاف کر لیے تھے۔

اور پھر وہ اسے ممی سے باتیں کرتے چھوڑ کر ریٹا کے پاس آگئی تھی۔وہ بستر پر اوندھی لیٹی رو رہی تھی۔

''کیا ہوا تھا ریٹا، کیفی نے ____؟''

ریٹا اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''سنو لیزا! تم ____ تم نے اس روز جھوٹ بولا تھا ناں، کیفی کے ارادے تمہارے ساتھ اچھے نہیں تھے۔''

''پتا نہیں شاید ____''

اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''جھوٹ مت بولنا''۔

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی، لیکن میں ڈر گئی تھی، بھاگ آئی تھی''۔

''اور تم نے ____ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

اس نے شکوہ کیا۔

میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کا امیج ٹوٹے۔تم جو اسے اتنا چاہتی ہو ہو سکتا ہے، مجھے غلط فہمی ہوئی ہو اور یہ ____ یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ تمہارے ساتھ مخلص ہو، اور میری باتوں سے تمہارا دل بُرا ہو''۔

''لیکن وہ میرے ساتھ مخلص نہیں تھا۔مخلص نہیں تھا لیزا! اس نے مجھ سے کبھی محبت نہیں کی، وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا تھا، بس وقت گزارنا چاہتا تھا، لیکن میں تو اس سے محبت کرتی تھی، محبت کرتی ہوں، میں اس کے لیے اس کی خاطر مر سکتی تھی، اس کی بہنوں کا جہیز اکٹھا کرنے کے لیے نوکری کر سکتی ہوں، مٹ سکتی ہوں اس کے لیے، لیکن جو وہ چاہتا تھا میں وہ نہیں کر سکتی تھی۔میرے فادر پادری تھے۔میری ممی ____ تمہیں پتا ہے ممی کے اخلاقی نظریات کیا ہیں۔وہ مجھے کیفی کے ساتھ شادی کی اجازت تو دے سکتی ہیں۔لیکن نہیں، اس طرح نہیں' سو میں کیفی کو چھوڑ کر چلی آئی۔''

وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور اس نے اسے رونے دیا۔اور پھر اس کے بعد یک دم ہی اس نے چپ سادھ لی تھی۔سارا دن کمرے میں چپ بیٹھی رہتی۔نہ تو وہ اپنی موسیقی کی کلاسیں لینے گئی تھی اور نہ ہی جاب پر۔آنٹی یا لیزا اس کی چائے اور کھانا اس کے کمرے میں پہنچا دیتے تو دو چار نوالے کھا لیتی، لیکن کسی سے بات نہیں کرتی تھی اور ممی نے کہا تھا، اسے اپنے حال پر چھوڑ دو۔

اس کا اعتماد ٹوٹا ہے۔

یقین ٹوٹ گیا ہے۔

اس کی محبت بچھڑ گیا ہے۔

اسے اپنی محبت بچھڑ جانے کا اور یقین ٹوٹ جانے کا ماتم کرنے دو ابھی اسے مت چھیڑو۔

جی بھر کر رو لینے دو۔

لیکن اس کے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔

دس دن ہو گئے تھے اسے اسلام آباد سے آئے ہوئے، لیکن اس دن کے بعد سے وہ پھر نہیں روئی تھی۔
جیسے آنسو اس کی آنکھوں میں ہی کہیں منجمد ہو گئے تھے۔

جان صبح ناشتا کر کے گھر سے نکلتا تو رات کو گھر آتا۔ سوائے ریٹا کے المیے کا کچھ علم نہیں ہو سکا تھا۔
خلاف توقع اس بار وہ رتن پر بہت مہربان تھا۔ اس کے لہجے میں ایک نرمی سی آ گئی تھی۔

"کیا ریٹا صحیح کہتی ہے کہ جان نے اسے اپنی وائف (بیوی) تسلیم کر لیا ہے؟"

وہ سوچتی

"لیکن نہیں اس کی منزل تو کہیں آگے ہے۔

اسے یہاں نہیں رکنا۔

اس کا سفر تو ابھی جاری ہے۔

اور پروفیسر احسان کہتے ہیں۔

ابھی جذبہ خام ہے اسے پتاؤ۔

ابھی یقین شک کے دھندلکے میں لپٹا ہے۔

آنکھیں بند کر کے کوئی فیصلہ مت کرو۔

دل اور روح کی پکار سنو۔

دل کی گواہی پر یقین کرو۔

دل کہتا ہے___"ہے"___تو ہے۔

دل کہتا ہے "نہیں" تو نہیں ہے۔

لیکن اسکا دل تو کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ کوئی واضح بات کہتا ہی نہیں تھا، کبھی "ہے" اور کبھی "نہیں"
تکرار جاری تھی۔ جب کہ وہ جلد سے جلد___ کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتی تھی۔

جب سے جان آیا تھا وہ بے چین تھی۔ کتنی بار تو اس نے اصغر بابا سے پوچھا تھا۔

"بابا مجھے اپنے دھرم کے بارے میں بتاؤ۔ سب کچھ چھوٹی سی چھوٹی بات۔"

پروفیسر احسان فتح پوری کی باتوں میں فلسفہ ہوتا تھا۔ بہت سی باتیں اسکی سمجھ میں نہیں آتی تھیں
گھنٹوں انہیں سوچتی رہتی تھی۔ دل میں کھبتی تھیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتی تھیں، لیکن اصغر بابا نے تو بالکل سیدھے
سادے لفظوں میں اسے بتایا تھا۔

اسلام کیا ہے۔

اسکی تعلیمات کیا ہیں۔

آپ اللہ کے آخری نبی ہیں اور حضرت عیسیٰ بھی اللہ کے پیغمبر تھے۔

اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ خدا ہے اور یہ کہ اسلام سچا دین ہے۔

اس نے اصغر بابا سے کلمہ طیبہ بھی سیکھا تھا اور ان دس دنوں میں کئی بار سوچا تھا کہ پروفیسر احسان
پوری کے پاس جائے اور ان کے سامنے کلمہ پڑھ کر کہے کہ مجھے اپنے مذہب میں داخل کر لیں۔

میں آپ کے خدا اور آپ کے رسول پر ایمان لاتی ہوں۔

لیکن پھر اس کے اندر "ہے" اور "نہیں" کی تکرار شروع ہو جاتی ہے۔

پہلے بھی تو اس نے ایک بار جلد بازی کی تھی اور پروفیسر احسان فتح پوری کہتے تھے کہ جب تمہارا دل
بے اختیار پکار پکار کر کہے کہ وہ "ہے" تو آ جانا میں تمہیں اپنے مرشد سے ملواؤں گا۔

وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچی تھی اور جان نے اسے نوکری چھوڑ دینے کے لیے کہا تھا۔

"نہیں مجھے جاب نہیں چھوڑنی"۔

"کیوں، کیا دل لگا لیا ہے وہاں کسی سے"؟

جان خباثت سے مسکرایا تھا۔

"دل!" اس نے سوچا تھا۔

ہاں شاید دل ہی تو لگ گیا تھا کہیں۔

وہ اجنبی۔

وہ ملوک آنکھوں والا اجنبی تبریز مراد علی خان۔

وہ غیر ارادی طور پر ہر روز اس کا انتظار کرتی تھی، لیکن اس روز کے بعد وہ پھر اسے دکھائی نہیں دیا
تھا۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا وہ۔ کئی بار اس نے دل کو ٹٹولا تھا۔ کیا وہ اس اجنبی سے محبت کرنے لگی ہے۔

کیا اس کے دل نے اس اجنبی کے دل سے ناتا جوڑ لیا ہے اور اس اجنبی کو شاید خبر بھی نہ ہو کہ ریسپشن
پہ بیٹھنے والی ایک عام سی لڑکی۔

معمولی سی لڑکی

اسے سوچتی ہے۔

اسے سوچنے لگی ہے۔

حالانکہ وہ اس راہ کی مسافر نہیں ہے۔

اسے تو کہیں اور جانا ہے۔

اس کا سفر تو کسی اور راہ کا ہے۔

لیکن وہ یہ کہاں الجھ گئی ہے۔

اسے تو حق کی تلاش ہے۔

اور اسے تو خدا کو ڈھونڈنا ہے۔

پھر وہ ایک بندے کو کیوں سوچنے لگی ہے

نہیں یہ غلط ہے۔

اسے اپنا مقصد نہیں بھولنا چاہیے۔

وہ مقصد جس کے لیے اس نے سب کو چھوڑا۔ اپنے اتنے پیاروں کو۔

وہ ذہن سے تبریز مراد علی کا خیال جھٹک جھٹک دیتی، لیکن وہ پھر نہ جانے کیسے کن چور راستوں سے
اس کے تصور میں چلا آتا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کی سوچوں میں فرق آ گیا ہو۔ پہلے وہ ہر وقت سوچتی رہتی تھی
سچ کیا ہے حق کیا ہے، اور اب اس کے ذہن میں اس اجنبی کا خیال در آیا تھا۔ وہ سوچتی۔

پتا نہیں وہ کون ہے۔

کہاں رہتا ہے؟

پھر کبھی زندگی میں اسے ملے گا بھی یا نہیں، پتا نہیں کبھی اس نے بھی مجھے سوچا ہو یا نہیں۔

اسے خود پر غصہ آتا تھا۔
لیکن وہ بے بس ہو جاتی تھی۔
خیالات پر اس کا اختیار نہیں تھا۔ سوچیں خود بخود اس کے اندر دائرے بناتی رہتیں۔ تب اس نے
پروفیسر احسان سے پوچھا تھا۔
"سر! اگر حق کی تلاش کرتے کرتے یقین کا سرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے آدمی راہ میں ہی الجھ جائے تو؟"
"الجھ گئی ہو بی بی"
انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔
"ہاں شاید" اس کی آنکھیں گیلی ہو گئی تھیں۔
"تڑپ سچی ہوئی تو الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔ ان بھول بھلیوں سے نکل آؤ گی"۔
"سر! آپ شاید میری بات سمجھے نہیں، اگر آدمی خدا کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے، اسے سوچتے سوچتے
اس کے بندوں کو سوچنے لگے تو ___؟"
اب کے پروفیسر احسان پھر مسکرائے اور دیر تک مسکراتے ہونٹوں سے اس چہرے پر نگاہیں جمائے
رہے۔
"سمجھ گیا تھا بی بی! سمجھ رہا ہوں، خدا کے بندوں کو سوچنا، ان سے محبت کرنا اسے بھی پسند ہے۔
اسی کی مخلوق ہیں سب اور بی بی میں نے کہا نا کہ تڑپ سچی ہوئی تو ان الجھنوں سے نکل آؤ گی۔ اس
تک پہنچنے کے لیے بھی تو کئی راستے ہیں۔ کیا پتا اس تک پہنچنے کے لیے اس کا بندہ ہی تمہارا وسیلہ بنے؟
اور کیا وہ ___ وہ اجنبی اس کا وسیلہ بنے گا۔ بن سکے گا اور جان کو بھی تو اس نے وسیلہ بنایا تھا، لیکن وہ مگر گیا
وہ اس کا راہبر نہیں بن سکا تھا۔
کیونکہ وہ تو خود اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اسے منزل تک پہنچانا، اس کا مقصد نہ تھا سو وہ بیچ راہ
کھڑی تھی۔ اور فی الحال کوئی راستہ کسی منزل کی طرف نہیں جا رہا تھا۔
"خیر ___!" جان نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔
"صبح ریزائن دے دینا"
"کیوں؟" اس نے پوچھا تھا۔
"اس لیے کہ یہ میں کہہ رہا ہوں"
"مگر مجھے جاب نہیں چھوڑنی"
پتا نہیں کہاں سے اس کے اندر اتنی خود اعتمادی آ گئی تھی۔
"اچھا!" جان نے تمسخر سے کہا۔
"تم نے جاب نہیں چھوڑنی"۔
"ہاں" اس نے اسی یقین اور اعتماد سے کہا
"تم نے کہا تھا کہ تم عورت کو اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بناتے اور میں ___ مجھے اپنے آنے وا
بھی سوچنا ہے"۔
"ہاں"۔ وہ ہنسا۔
"آنے والا کل تمہارا آنے والا کل بہت اچھا ہوگا لیزا ڈارلنگ، یہ میرا تم سے وعدہ ہے"۔

معاشی پرابلم نہیں ہوگا۔
"لیکن میں جاب نہیں چھوڑوں گی؟"
وہ کمرے سے باہر نکل آئی تھی اور جان کے ہنسنے کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔
پھر جان دو روز کے لیے کہیں چلا گیا تھا اور آج ہی باس نے اسے آفس میں بلا کر کہا تھا۔
"سوری مسز جان! ہمیں اب آپ کی ضرورت نہیں رہی، آپ اپنا حساب لے لیں"
"جی!" وہ حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔
"مگر اس طرح اچانک بغیر کوئی نوٹس دیئے"
"یہ ایک پرائیویٹ کمپنی ہے بی بی! یہاں کوئی اصول لاگو نہیں ہوتے"
داؤد خان جانے کب آفس میں آ گیا تھا اور عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
وہ خاموشی سے باہر آ گئی۔
اس نے سوچا تھا کہ وہ فادر کے پاس جائے اور انہیں بتائے کہ اسے بلا جواز جاب سے نکال دیا گیا
لیکن نہیں جواز تو تھا۔ جان نہیں چاہتا تھا کہ وہ جاب کرے۔ یقیناً جان نے ہی اسے منع کیا ہوگا۔
تب وہ گھر چلی آئی تھی۔
وہ پروفیسر احسان سے کہے گی۔
اس نے سوچا۔
یقیناً وہ اسے کوئی نہ کوئی جاب دلوا دیں گے۔" ریٹا نے کروٹ بدلی تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔
"ریٹا" اس نے آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"ہوں!" ریٹا نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔
اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔
ملگجے سے کپڑے۔
بکھرے بال۔
زرد رنگت۔ چند ہی دنوں میں وہ مرجھا کر رہ گئی تھی۔ یہ وہ ریٹا تو نہیں تھی۔
ہر دم ہنسنے ہنسانے والی۔
قہقہہ لگاتی، کھلکھلاتی ریٹا۔
محبت سے سرشار۔
محبت کے نشے میں پور پور ڈوبی۔
پُر امید اور پُر یقین۔
کتنا یقین تھا اسے کیفی کی محبت پر۔
کتنا مان تھا اسے۔
اب کس قدر ٹوٹی اور بکھری بکھری لگ رہی تھی۔
"ریٹا!" اس نے پھر اسے پکارا
"حوصلہ کرو، اپنے آپ کو سنبھالو، بھول جاؤ سب کچھ سمجھ لو، وہ تمہارے قابل نہیں تھا۔ نکال دو اسے
دل سے"۔

"کیسے؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"کیسے نکال دوں؟"
اس نے بے بسی سے اسے دیکھا۔
"ریٹا!" رتن نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔
"وہ دل سے نکلتا ہی نہیں لیزا"
اس کی آواز بھرا گئی۔
"تم نے کسی سے محبت نہیں کی۔ عشق نہیں کیا۔
تمہیں نہیں پتا، یہ کیسا درد ہوتا ہے، کیسی آگ لگی ہے میرے اندر"۔
"تو پھر یوں چپ ہو کے مت بیٹھو ریٹا، رولو، اسے برا بھلا کہہ لو۔ اپنے دل کی بھڑاس نکال لو"
"ہاں میرا بھی دل چاہتا ہے، خوب رووں، چیخوں، بیوہ عورتوں کی طرح ہاتھوں کی چوڑیاں [illegible]
ڈالوں، بال کھول لوں اور بین کروں۔ ماتم کروں اپنی محبت کا، مگر___ مگر میرے آنسو نہیں نکلتے۔
لیزا___ لیزا اس نے ایسا کیوں کیا؟
کیوں کیا؟
میری محبت میں تو کوئی کھوٹ نہیں تھا۔
میں تو اس کی محبت میں اپنا مذہب تک چھوڑنے کو تیار تھی۔
میں تو اس کی محبت کے رنگوں میں بھیگ رہی تھی۔
وہ تو کہتا تھا لیزا، وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ چاہتا ہے مجھے۔ وہ کہتا تھا، تم میری جان ہو ریٹا، زندگی [illegible]
میری۔
پھر___ پھر وہ کیوں بدل گیا۔ پتا ہے لیزا جب میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ میری دوری برداشت
نہیں کر سکتا تو مجھ سے شادی کر لے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس کے مسائل کو شیئر کروں گی۔
ہم دونوں مل کر اس کی بہنوں کی شادیاں کریں گے۔ میں قدم قدم اس کے ساتھ چلوں گی تو وہ ہنسنے لگا۔
کتنی مکروہ سی ہنسی تھی اس کی۔
وہ نشے میں تھا۔ شاید زیادہ پی گیا تھا اور نشے میں کبھی کبھی آدمی سچ بول جاتا ہے اور اس کے سچ [illegible]
مجھے مار دیا لیزا۔
اس نے کہا۔
وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ اس نے مجھ سے کبھی محبت نہیں کی۔ وہ تو صرف وقت گزار رہا تھا اور شا[illegible]
___ شادی تو اسے اپنی ماں کی پسند کی لڑکی سے کرنا ہے'۔
ریٹا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
وقت پاس کرنے کے لیے اسے بہت سی لڑکیاں مل سکتی تھیں۔ پھر اس نے مجھے ہی دھوکا کیوں [illegible]
میرے ساتھ محبت کا یہ کھیل کیوں کھیلا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا لیزا اس سے کہا تھا کہ اسے ایسی لڑکیاں [illegible]
تھیں' جو خود بھی وقت پاس کرنا چاہتی ہیں تو اس نے کہا۔
ہاں مگر ایسی لڑکیاں اسے پسند نہیں ہیں' پہلے سے مفتوح قلعے اسے پسند نہیں ہیں، وہ تو خود [illegible]
کرنا چاہتا ہے اور قلعہ جتنا مضبوط ہو اتنا ہی وہ انجوائے کرتا ہے میں اس سے نفرت کرنا چاہتی ہوں مگر [illegible]

محبت میرے دل سے نکلتی ہی نہیں۔ دس دنوں میں ایک لمحے کے لیے بھی اس کا خیال میرے دل سے نہیں نکلا۔
میں اسے بھول جانا چاہتی ہوں لیکن بھلا نہیں پا رہی ہوں۔
ممی سچ کہتی تھیں۔
یہ مرد لوگ بڑے بے وفا ہوتا ہے۔
ان کا محبت جھوٹ ہوتا ہے۔
فریب ہوتا ہے۔
کیٹی کا محبت بھی جھوٹ تھا فریب تھا۔
"لیکن میرا محبت تو سچا تھا لیزا ایک دم سچا۔"
وہ زور زور سے رونے لگی۔ لیزا نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور ہولے ہولے تھپکنے لگی۔
"یہ محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔"
رتن نے ریٹا کو ساتھ لگائے لگائے سوچا۔
محبت دل۔
محبت جان۔
محبت روح کا درماں۔
محبت مورتی ہے۔
اور کہیں جو دل کے مندر میں کہیں پر ٹوٹ جائے تو۔
محبت کانچ کی گڑیا۔
فضاؤں میں کسی کے ہاتھ سے گر چھوٹ جائے تو۔
محبت آبلہ ہے کرب کا۔
اور پھوٹ جائے تو۔
محبت روگ ہوتی ہے۔
محبت سوگ ہوتی ہے۔
محبت شام ہوتی ہے۔
اور ریٹا کے لیے اب محبت محض روگ بن گئی تھی۔
کیا اب بھی ریٹا پورے طور پر خوش ہو سکے گی۔
کیا کبھی کسی شخص کی محبت کیٹی کی محبت پر غالب آ جائے گی۔ کیا کبھی کوئی اور شخص ریٹا کے لیے اتنا اہم
ہو سکے گا جتنا کہ کیٹی تھا۔
اور محبت کتنی خوبصورت اور دلکش چیز ہوتی ہے اور جب چھن جائے تو روگ عذاب۔
محبت شام ہوتی ہے
محبت روگ ہوتی ہے
اس نے زیر لب کہا۔
اور ریٹا کے سر پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ وہ اسکے کندھے سے لگی سسکیاں لے رہی تھی۔
بہت دیر بعد وہ سنبھلی تو لیزا نے اسے الگ کرتے ہوئے پیار سے کہا۔

"چلو اٹھو اب منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔ ممی تمہاری وجہ سے پریشان ہیں۔ میں تمہارے ک
نکال دیتی ہوں۔

ریتا خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔

"گڈ گرل" ارتن اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"زخم گہرے ہوں تو بھرنے میں وقت لگتا ہے۔
ریتا تمہارے زخم بھی گہرے ہیں' مجھے پتا ہے لیکن ممی کے لیے پلیز __ ان کے لیے اور میرے لیے

"اچھا" ریتا نے سر ہلایا۔ اور لیزا اُس کے لئے کپڑے نکالنے لگی۔

نہا کر اور کپڑے بدل کر ریتا تیار ہوئی تو لیزا نے غور سے اسے دیکھا۔
اور وہ اب بھی تھکی تھکی اور نڈھال نڈھال سی لگ رہی تھی۔

"چلو باہر چلتے ہیں"۔

لیزا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

ممی اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی تھیں' لیکن اس وقت ان کے ہاتھ میں نہ سوئی دھاگہ تھا نہ سلائیاں
گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ ریتا کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ادھر آ جاؤ ڈارلنگ ادھر میرے پاس بیٹھو"۔

ریتا خاموشی سے سر جھکائے ان کے پاس ہی لکڑی کے تخت __ پر بیٹھ گئی۔

"تم کیسا ہے ڈارلنگ؟"

"ٹھیک ہوں ممی!؟"

اس کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ آ گئی' لیکن اس کی آنکھیں اور چہرا بے رنگ ہی رہے اور پہلے
وہ ہنستی تھی' مسکراتی تھی تو چہرا اور اس کی آنکھیں بھی ہنستی تھیں۔

ممی نے افسردگی سے سوچا۔

اور اب شاید اس کی آنکھیں کبھی اس کے ہونٹوں کا ساتھ نہ دے سکیں اور وہ اس کے چہرے پر اس کی آ
کے رنگ کبھی نہ دیکھیں گی یہ محبت ایسا ہی ظالم شے ہے۔ انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔

"خداوند یسوع مسیح تمہیں ہر آفت سے بچائے گا"۔

"سوری ممی!" ریتا نے ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگایا۔

"میں نے آپ کا دل دکھایا۔ آپ کی بات نہیں مانی اور مجھ سے میری محبت چھن گئی۔ میں
خفا کیا تھا ممی! مجھے معاف کر دیں پلیز!"

"ارے نہیں میری جان!"

ممی نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"میں خفا نہیں ہوں تم سے۔ ینگ لوگ تمہارے ایسا ہی ہوتا ہے ریتا۔ وہ بوڑھا لوگ کا
سنتا۔ ان کے تجربوں سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ وہ اپنے تجربوں سے سیکھنا چاہتا ہے اچھا ہے __ ٹھیک
نے خود تجربہ کر لیا' دیکھ لیا خود' ہم تمہارا دشمن نہیں ڈارلنگ! بس ہمارا تجربہ ہمیں بتاتا تھا کہ کیفی کا محبت سچ نہیں

"ممی!" ریتا ان کے کندھے سے لگی لگی سسکنے لگی تھی۔

"تمہیں محبت ضرور ملے گا ریتا! ہمارا دل کہتا ہے بالکل سچا اور کھرا محبت جس میں کھوٹ

وٹ نہیں ہوگا"۔

"ممی!" ریتا نے آنکھیں پونچھتے ہوئے انہیں دیکھا۔
اب مجھے محبت کی ضرورت نہیں ہے"۔

"ارے تم پاگل ہے' بالکل پاگل ہے۔ محبت کا ضرورت ہمیشہ رہتا ہے' اور وہ بڑے صاحب کہتے ہیں"

محبت جھوٹ نہیں ہے۔
محبت فریب نہیں ہے۔
آدمی جھوٹے اور فریبی ہوتے ہیں۔
تمہیں ایسا بندہ ضرور ملے گا جانی جو جھوٹا اور فریبی نہیں ہوگا۔
یہ بوڑھا ممی کا دعا ہے۔
تم اپنے دل میں محبت کا خواہش رکھو۔
تمہارا خواہش شدید ہوگا' پاور فل ہوگا محبت خود بخود تمہاری طرف آئے گا تمہیں ملے گا اور ممی کو کیا پتا
کہ میرے دل میں اب محبت کی خواہش نہیں پیدا ہوگی۔
کیفی نہیں تو کوئی بھی نہیں۔

ریتا نے سوچا۔

میرا دل تو ہمیشہ اس کی محبت میں مبتلا رہے گا تڑپے گا' روئے گا۔

اس نے ان دس دنوں میں دیکھ لیا تھا۔ آزما لیا تھا خود کو' کئی بار اسے گمان گزرا تھا کہ وہ کیفی سے نفرت کرنے لگی
ہے لیکن ہر بار جب اس نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا تو کیفی کی محبت کا چراغ اسی طرح جھلمل کر رہا تھا۔
وہ شاید زندگی بھر کیفی سے نفرت نہیں کر سکے گی۔ اس کے کردار کے اس پہلو کو دیکھنے کے بعد بھی اسکی
محبت اس کے دل میں یونہی زندہ تھی اور ممی کہہ رہی تھیں کہ وہ کسی اور شخص کا انتظار کرے۔
جو اسے محبت دے گا۔ ممی کو کیا پتا' محبت مر نہیں سکتی۔

اتر آئیں بلائیں ہاتھ میں زہر آب لے کر
فضا بارود بن کر بھی سلگ اٹھے تو کیا ہوگا
محبت مر نہیں سکتی

اور اس کی محبت بھی ہمیشہ زندہ رہے گی

"اچھا تم بیٹھو' لیزا سے باتیں بناؤ' میں تمہارے لیے چائے بناؤں"۔

"نہیں ممی! آپ بیٹھیں' میں بناتی ہوں"

لیزا نے کہا۔

"نہ آج میں اپنا بیٹی کے لیے خود چائے بناؤں گی" ممی بولیں۔

"آن کہاں ہے؟" ریتا نے پوچھا۔

"وہ کہیں باہر گئی ہے' آتی ہی ہوگی"۔

ممی بتا کر کچن کی طرف مڑی ہی تھیں کہ دروازہ کھلا۔ لیزا نے سمجھا کہ آن ہوگی مگر آنے والا جان تھا۔

"ہا!" وہ ریتا کی طرف دیکھ کر خوش دلی سے ہنسا۔

"آج تمہاری شکل بھی نظر آئی ہے' کیسی ہو؟"

''اچھی ہوں'' وہ مسکرائی۔
''کچھ بیمار لگتی ہو؟''
''ہاں کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے''۔
''سوری بھئی تم سے اتنے دنوں میں ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔ صبح میں اٹھتا تو تم غالباً اپنی مو
کلاس لینے جا چکی ہوتی اور واپس آتا تو سو چکی ہوتی تھیں''۔
''اور تم لیزا ڈیئر'' وہ بائیں آنکھ دبا کر مسکرایا۔
''آج آفس گئیں تھیں''
لیزا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ کمینگی سے مسکرا رہا تھا۔
''ہاں گئی تھی، لیکن مجھے تمہاری مہربانی سے آفس سے نکال دیا گیا ہے''
''کیا!'' ریٹا نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''تمہیں جاب سے جواب مل گیا ہے''۔
''ہاں!'' لیزا نے بے دردی سے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کچل ڈالا۔
''کیوں''۔
''میں نہیں چاہتا تھا اس لیے۔ تمہیں یاد نہیں ہے تم نے ہی کہا تھا کہ میری بیوی کو جاب کی
ضرورت ہے''۔
''ہاں کہا تو تھا''۔
ریٹا نے الجھی نظروں سے لیزا کو دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسو آئے ہوئے تھے۔
''ہاں تو پھر جاب سے جواب مل گیا۔ لیزا ڈارلنگ تم نے کہا نہیں کہ تمہیں ہر صورت جاب کرنی ہے
''مجھے جاب کرنی ہے یہاں نہیں تو کہیں اور مل جائے گی۔
''ہاں___!'' وہ ہنسا۔ اور پھر ریٹا کی طرف متوجہ ہو گیا۔
''یہ تمہاری لیزا جاب کرنے کے بعد کچھ تیز نہیں ہو گئی' مجھے یہ تیزی پسند نہیں ہے''
وہ بات کرتے کرتے رتن کی طرف مڑا۔
''ہمیں تو بس وہی معصوم سی لیزا پسند ہے ڈری ڈری سہمی سہمی سی۔''
''لیکن جان! تم تو گھر پر رہتے نہیں ہو اور تنہائی میں یہ بور ہوتی ہے۔ کیا حرج تھا جاب کرنے
پھر یہ جاب پاپا نے اسے دلوائی تھی اور وہاں اس کے آفس میں اچھے لوگ ہیں۔ تم کچھ دنوں بعد پھر غائب ہو
گے اور___!''
''اب کے اکیلا نہیں جاؤں گا اسے ساتھ لے کر جاؤں گا''۔
''کیا؟'' رتن نے بے اختیار کہا۔
''اب کے تم میرے ساتھ جاؤ گی___ہا!''
''نہیں مجھے کہیں نہیں جانا''
رتن نے سختی سے کہا۔
''واہ کیسے نہیں جاؤ گی میری بیوی ہو اور وہی کرو گی جو میں چاہوں گا اور یہ میں تمہارے پا
کے چکر میں ہی تو گیا ہوا تھا''۔

''نہیں میں نہیں جاؤں گی'' رتن نے سختی سے کہا۔
''اور مجھے تمہارے ساتھ رہنا بھی نہیں ہے مجھے علیحدگی چاہیے''۔
''ہو جانا علیحدہ بھی' اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی تو میں___!''
ریٹا حیرت سے جان کو دیکھ رہی تھی۔
''تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو جان اور لیزا کیا تم سنجیدہ ہو۔ کیا تم واقعی علیحدگی چاہتی ہو؟''
''ہاں'' رتن کھڑی ہو گئی۔
''کہاں جا رہی ہو ڈیر! ابھی علیحدگی نہیں ہوئی ہے۔ جان نے پیچھے سے آواز دی، لیکن وہ ریٹا کے
کمرے کی طرف بڑھتی گئی۔
''خیر اس وقت جاؤ''
اس نے پھر پیچھے سے آواز دی۔
''لیکن رات کو اپنے کمرے میں آ جانا''
''اگر وہ تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو تم اسے مجبور تو نہیں کر سکتے جان! اور پھر تم نے کہا بھی تھا کہ
پاکستان جا کر تم اسے آزاد کر دو گے''۔
''یہ تمہارا سر درد نہیں ہے ڈیر اس لیے دماغ مت کھپاؤ اور سنو! تمہارے لیے ایک اچھی نیوز ہے۔
مجھے ایک پروڈیوسر ملا تھا۔ دوستی ہو گئی ہے اس سے۔ اسے اپنے ایک پروگرام کے لیے نئے گلوکاروں کی ضرورت
ہے۔ میں نے تمہارا بتایا تھا تم چلنا کسی دن میرے ساتھ آڈیشن کے لیے___
تمہاری آواز اچھی ہے پسند کریں گے لوگ تمہیں''
اور جان کی یہ ہی باتیں تو اسے اچھی لگتی تھیں وہ باہر جیسا بھی تھا، لیکن اس گھر اور گھر کے افراد سے
بھی محبت کرتا تھا۔ اس نے انہیں بہت سہارا دیا تھا۔ بہت پہلے کبھی ایک روز یونہی اس نے ذکر کیا تھا کہ وہ ٹی
وی پر گانا چاہتی ہے اور اس نے یہ بات ذہن میں رکھ لی تھی۔
''کاش! لیزا کے ساتھ بھی اتنا ہی مخلص ہوتا'' ریٹا نے افسردگی سے سوچا۔
لیکن پتا نہیں کیا بات تھی وہ روز اول سے ہی اس کے ساتھ مخلص نہیں تھا اور اب بھی___اب بھی پتا
نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ وہ لیزا کو کسی محبت کی وجہ سے ساتھ لے کر نہیں جانا چاہتا بلکہ یونہی اسے تنگ کرنے
کے لیے، اذیت پہنچانے کے لیے ساتھ لے جا رہا ہے۔
''وہ ممی سے کہے گی'' اس نے سوچا۔ ''کہ وہ لیزا کو اس کی مرضی کے خلاف مجبور نہ کرے۔ یقیناً وہ ممی
کی بات نہیں ٹالے گا، لیکن جب اس نے ممی سے بات کی تو انہوں نے اسے سمجھایا۔
''تم پاگل ہے ریٹا! ارے اس کو ساتھ لے جانے دے۔ ساتھ رہنے سے محبت بڑھتا ہے۔ میاں
بیوی کو اکٹھا ہی رہنا چاہیے ساتھ ساتھ۔ دوریاں فاصلے پیدا کرتی ہیں۔ اس نے ہنی مون بھی نہیں منایا۔ یہ ان کا
ہنی مون ٹرپ ہو جائے گا۔ دیکھ لینا جب دونوں واپس آئے گا تو کتنا خوش ہوگا۔ پھر ہم پارٹی بنائے گا
اور اسے ممی کی بات کا یقین آ گیا۔
ممی کا تجربہ یقیناً اس سے زیادہ تھا۔ اس نے رتن کو سمجھایا کہ وہ اس کے ساتھ چلی جائے۔
''جان زیادہ عرصہ تو باہر رہتا نہیں۔ پندرہ دن یا پھر زیادہ سے زیادہ ایک ماہ تمہاری بھی سیر ہو جائے گی اور
پھر یوں بھی ممی کہتی ہیں کہ قربت سے محبت بڑھے گی۔ ممکن ہے تم واپس آؤ تو جان سے علیحدگی کا فیصلہ بدل چکا ہو''

رتن نے ریٹا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن دل ہی دل میں فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ جان کے ساتھ نہیں جائے گی اور پروفیسر احسان کے پاس جا کر دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے گی۔ دل ''ہے'' اور ''نہیں'' کی تکرار میں الجھا ہے تو الجھا رہے۔

یقین کا سرا ہاتھ نہیں آ رہا تو نہ آئے خود ہی یقین مل جائیگا۔

اور پھر اس طرح اس کا اور جان کا رشتہ ختم ہو جائے گا۔ خود بخود ریٹا نے ایک بار یہی تو بتایا تھا اسلام قبول کر لینے سے اس کا اور جان کا رشتہ خود بخود ختم ہو جائے گا اور پھر کیا خبر کبھی وہ دکھ جائے۔ نظر آ جائے۔

وہ اجنبی۔

تبریز مراد علی خان۔

وہ بھی اسی مذہب کو ماننے والا ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی دن وہ چلی جائے گی، لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ جان اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتی تھیں۔ ایک دو بار دروازے تک آئی تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔

''خیریت؟ کہاں کے ارادے ہیں؟''

''کہیں نہیں''۔

''میں نے سوچا جاب تلاش کرنے جا رہی ہو۔ میں مدد کروں''۔

''مجھے پاپا سے ملنے جانا ہے''۔

''پاپا سے!'' اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

''تمہارا مطلب ہے میرے پاپا سے''؟

''ہاں''۔

''کیا میری عدم موجودگی میں تم پاپا سے ملتی رہی ہو؟''

''ہاں وہ بہت اچھے ہیں''۔

''یقیناً انہوں نے میرے خلاف ورغلایا ہوگا؟''

''نہیں، انہوں نے کچھ نہیں کہا''۔

''دراصل ہر باپ کی طرح انہیں بھی مجھ سے شکایتیں ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر انہوں نے تمہیں نہیں ورغلایا تو اب ضرور ورغلائیں گے اس لیے میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔ اس وقت مجھے کسی کا انتظار ہے شام کو اکٹھے چلیں گے''، لیکن پھر شام کو اس نے بتایا کہ پاپا گھر پر نہیں ہیں وہ انگلینڈ چلے گئے ہیں''۔

''کیوں؟'' ممی نے حیرت سے پوچھا۔

''بس___ ممی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے بائیں آنکھ کا کونا دبایا۔

''دل اچاٹ ہو گیا ہوگا یہاں رہنے سے''۔

اسے لگتا تھا جیسے وہ یہاں قید ہو کر رہ گئی ہو۔ اس روز کئی دنوں بعد جان باہر نکلا تھا۔ ریٹا اس کے ساتھ تھی وہ ریٹا کو ٹی۔ وی اسٹیشن پر آڈیشن کے لیے لے جا رہا تھا۔

آنی اسکول گئی ہوئی تھی۔

ممی کچن میں تھیں۔

اس نے اپنے دو تین جوڑے کپڑے بیگ میں ڈالے اور چپکے سے دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ گھر سے باہر نکلتے ہی اسے ٹیکسی مل گئی۔

''تھینک گاڈ!''

اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹیکتے ہوئے گہری سانس لی۔

بالآخر وہ جان سے بچ گئی تھی۔

''کدھر جانا ہے''۔

اور پروفیسر احسان کا ایڈریس بتاتے ہوئے اچانک ہی اس کی نظر آئینے پر پڑی۔ آئینے میں داؤد خان مسکرا رہا تھا۔

لفظ اس کے ہونٹوں پر ہی رک گئے۔

''رک کیوں گئی ہو بتاؤ''۔

داؤد خان مڑ کر مسکرایا۔

''مجھے کہیں نہیں جانا'' اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا''۔

''چپکی بیٹھی ہو''۔

پیچھے مڑ کر اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ غرایا۔

''تم مجھے کہاں لے جاؤ گے؟'' اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''جہاں جان نے کہا تھا''۔

''جان! اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں جان!'' اس نے قہقہہ لگایا۔

''جان کچی گولیاں نہیں کھیلتا بی بی! وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ موقع ملتے ہی تم بھاگنے کی کوشش کرو گی''

''تو تم میری نگرانی کر رہے تھے''۔

''ذہین بھی ہو''۔

وہ پھر ہنسا اور اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ رتن بے دم سی ہو کر سیٹ کی پشت سے سر لگا کر بیٹھ گئی۔

یہ سب کیا ہے اور آخر جان اس کی اتنی نگرانی کیوں کر رہا ہے۔

شاید اس نے جان لیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔

پتا نہیں کیا بات تھی، کوئی چیز اندر سے اسے روک رہی تھی۔ منع کر رہی تھی کہ وہ جان کے ساتھ نہ جائے، کسی طرح رک جائے اور اسے یقین تھا کہ اگر وہ پروفیسر احسان فتح پوری کے پاس پہنچ گئی تو وہ ضرور کوئی راہ نکال لیں گے، لیکن وہ تو راستے ہی میں پکڑی گئی تھی اور داؤد خان اسے ایک فلیٹ میں چھوڑ کر چلا گیا تھا اور وہ تب سے اب تک یونہی صوفے پر بیٹھی تھی۔

پتا نہیں یہ کس کا گھر ہے۔

داؤد خان کا شاید۔

اور داؤد خان جانے کہاں چلا گیا ہے۔

اس نے اٹھ کر دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔

لیکن دروازہ باہر سے لاک تھا۔ اس نے مڑ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک صوفہ ایک سینٹر ٹیبل تھی اور

ایک طرف ایک سنگل بیڈ تھا۔ داہنی طرف ایک دروازہ تھا جو کھلا تھا۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا۔
شاید یہ بیڈروم تھا' لیکن اس میں صرف چند کرسیاں اور ایک بڑی میز پڑی تھی ___ وہ بھی باہر سے
لاک تھا۔ بہت دیر تک وہ ادھر ادھر چکراتی پھری۔ شاید یہ دو کمروں کا ہی فلیٹ تھا۔ تھک کر وہ پھر صوفے پر
آ کر بیٹھ گئی اور اپنی گزشتہ زندگی کے متعلق سوچنے لگی کہ کہاں سے اس نے سفر شروع کیا تھا اور کہاں پہنچ گئی ہے۔
پتا نہیں منزل پھر بھی ملے گی یا نہیں۔ پتا نہیں راستوں میں ہی کہیں بھٹک جائے گی اور یہ شخص داؤد خان جا
جان کی ایما پر ہی اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ یا یونہی اتفاقاً وہ اس کی ٹیکسی میں آ بیٹھی تھی اور وہ اسے یہاں لے آیا۔
نہیں اس کی نیت کیا ہے۔ شکل سے کس قدر مکار اور چالاک لگتا ہے۔ کتنی گندی اور غلیظ نظروں سے دیکھتا ہے۔
ابھی پتا نہیں کتنی آزمائشیں باقی ہیں نہ جانے کیا ہوگا۔

نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔

وہ گھبرا کر پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر نیچے جھانکا۔ یہ فلیٹ چوتھی منزل پر تھا اور سڑک
سے کافی ہٹ کر تھا۔ دور سڑک پر گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ اگر وہ یہاں سے چیختی چلاتی تب بھی شاید اس کی آواز
نہ پہنچ پاتی۔ کھڑکی پر گرل لگی تھی۔ لوہے کی مضبوط گرل تھی۔

اگر یہاں گرل نہ ہوتی تو خود کو بچانے کے لیے یہاں سے کود جاتی۔

''بس ساری جدوجہد کا حاصل ایک اذیت ناک موت۔

کیا وہ صرف یہ موت پانے کے لیے اتنا لمبا سفر کر کے آئی تھی۔

انکل رابرٹ کی لیزا کی طرح ایک صبح اس کی لاش بھی مسخ شدہ حالت میں سڑک پر پڑی ملے گی
کسی معلوم بھی نہیں ہو سکے گا کہ وہ کون تھی۔

اور دور بہت دور ہندستان میں۔

بھابھو، دیپو ماتا جی اور بھاجی کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ حق کی تلاش میں ان سب کو چھوڑ کر جانے والی
ان کی لاڈلی پیاری تینو کراچی کی ایک سڑک پر گر کر مر گئی ہے۔

اس نے جھرجھری سی لی اور کھڑکی کی گرل سے چہرا ٹکا کر باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ تب
دروازے پر آہٹ ہوئی۔ وہ چونک کر مڑی۔ باہر کوئی لاک کھول رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ
پڑے اور خوف سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پتا نہیں داؤد خان اب اس سے کیا سلوک کرے گا، لیکن اندر آنے
والا جان تھا۔ جان کو اندر آتے دیکھ کر اس نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

بہرحال وہ اس کا شوہر تھا۔

''تم ___!'' وہ یک دم ایک قدم آگے بڑھ آئی۔

''یہ تم نے مجھے اغوا کروایا ہے، کیوں؟''

''اڑنے کی کوشش جو کر رہی تھیں''۔ وہ مسکرایا۔

''نہیں تو میں نے کہاں جانا تھا؟''

وہ افسردہ سی ہو گئی۔

''کہاں جا سکتی تھی۔ ذرا پروفیسر احسان صاحب کی طرف جا رہی تھی۔ دل گھبرا رہا تھا کوئی سرا
نہیں آ رہا''۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تم نے بھی وعدہ کیا تھا کہ تم میری مدد کرو گے۔ مجھے صحیح اور غلط کا ادراک دو گے''۔

''کن باتوں میں الجھتی ہو میری جان! زندگی کو انجوائے کرو۔ یہ عمران باتوں کی نہیں ہے۔ بہت
وقت پڑا ہے غلط اور صحیح کا ادراک کرتی رہنا''۔

''لیکن پروفیسر احسان کہتے ہیں کہ وقت کبھی بھی نہیں ہوتا۔ ایک لمحہ بھی قابل اعتبار نہیں ہے۔ ابھی
ہم یہاں کھڑے ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں اور ابھی بلاوا آ گیا تو سب ختم۔ وقت تیزی سے گذر رہا ہے جان''۔

جان آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

''کیا دیکھ رہی تھیں کہ یہاں سے کود سکتی ہو کہ نہیں''

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر لے آیا۔

''بیٹھو لیزا!''

وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

''سنو مجھے کچھ دنوں تک اپنے بزنس کے سلسلے میں امریکہ جانا ہے اور میں تمہیں ساتھ لے کر جانا
چاہتا ہوں۔ تم میری بیوی ہو اور اب مجھے تمہارے بغیر جانا اچھا نہیں لگتا۔ تمہارے بغیر اب دل نہیں لگتا۔
میں تمہارا ویزا لگوانے کی کوشش کر رہا ہوں، لگ جائے گا، گرین کارڈ ہولڈر ہوں بھئی، نو پرابلم۔ اور
اگر کوئی پرابلم ہے بھی تو داؤد خان کس دن کام آئے گا اور اگر امریکہ کا ویزا نہ مل سکا تو ہم کچھ دنوں کے لیے انگلینڈ
جائیں گے، تمہارا ہنی مون ٹرپ ہو جائیگا بقول ممی''۔

''لیکن اگر میں نہ جانا چاہوں تو___''

''تو___!'' جان اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''تو میری جان، ہم تمہیں زبردستی لے جائیں گے کہا ناں کہ تمہاری جدائی اب ہم سے برداشت نہیں
ہوتی''۔

''اب گھر چلیں، ممی اور ریٹا وغیرہ پریشان ہوں گی''۔

''نہیں ہوں گی۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ میں تمہیں کچھ دن کے لیے گھمانے لے جا رہا ہوں''۔

''تو کیا میں یہاں قید رہوں گی''۔

''ارے نہیں میری جان! تمہیں قید کس نے کرنا ہے، یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ ساری زندگی تو ممی کے
گھر نہیں رہنا، گھومو پھرو کچن میں سب سامان موجود ہے، کھاؤ پکاؤ''

''کیا میں باہر جا سکتی ہوں''۔

''نہیں''۔ وہ مسکرایا۔

''اور داؤد خان کیا وہ بھی یہاں رہے گا؟''

''نہیں، لیکن میری عدم موجودگی میں وہ فلیٹ کی نگرانی کرے گا''۔

''مجھے اس سے ڈر لگتا ہے جان پلیز، مجھے گھر لے چلو میں تمہارے ساتھ امریکہ چلی چلوں گی ہم
جلدی واپس آ جائیں گے ناں؟''

''ہاں واپس تو جلدی آ جائیں گے ایک ماہ تک لیکن تم اب یہاں ہی رہو گی، اس لیے کہ وہاں ہر
وقت تمہاری نگرانی نہیں ہو سکتی اور مجھے تم پر اعتبار نہیں ہے''۔

جان کھڑا ہو گیا۔

"میں رات کو آؤں گا۔ تم اپنے لیے چائے وغیرہ بنانا چاہو تو بنا لو۔ رات کا کھانا باہر سے ہی لے آؤں گا۔"
جان نے ڈرائنگ روم کو لاک نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکل آئی۔ چھوٹا سا کوریڈور تھا۔ جس کی ایک طرف چھوٹا سا کچن تھا اور سامنے ہی داخلی دروازہ تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی، لیکن حسب وہ باہر سے لاک تھا۔ موٹی لکڑی کا مضبوط دروازہ اس نے ادھر اُدھر دیکھا کہیں سے کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھک کر وہ کچن میں چلی آئی۔

وقت جیسے گزر ہی نہیں رہا تھا۔ پتا نہیں کتنے دن گزر گئے تھے اس فلیٹ میں آئے۔

دن بھر وہ اکیلی رہتی تھی۔ جان رات کو آتا۔ "دیکھو جان!" ایک روز رتن نے کہا۔

"تمہیں امریکہ کا ویزا نہیں ملے گا۔ مجھے پتا ہے میری بھابو کی ایک سہیلی تھی۔ اس کے پتی کے بھی گرین کارڈ تھا، پھر بھی اسے امریکہ کا ویزا ملنے میں بہت وقت لگا تھا۔ تم مجھے ممی اور ریتا کے پاس لے چلو میں اکیلے رہ رہ کر بور ہو گئی ہوں۔"

"ہا...!" جان زور سے ہنسا۔

"وہ تمہاری بھابو کی سہیلی تھی میری جان اور تم جان کی وائف ہو سمجھیں؟ کل تمہیں انٹرویو کے لیے میرے ساتھ چلنا ہے اور یہ تو محض رسمی کاروائی ہے، ورنہ بگ باس۔ میرا مطلب ہے میرا بزنس پارٹنر ایک دن میں تمہارا ویزا لگوا سکتا ہے" اور پھر اس کا ویزا بھی لگ گیا، لیکن جان ابھی تک جانے کا پروگرام نہیں بنا رہا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ رتن نے تو اب اسے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ تنہائی اور اکیلے پن نے اسے خود بخود آگہی دے دی تھی سارا دن فارغ بیٹھی سوچتی رہتی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کے ذہن و دل کے بند دروازے کھل رہے ہوں۔

قفل ٹوٹ رہے ہوں۔

بس لمحوں کی بات ہے۔

جب قفل ٹوٹ کر گر جائیں گے اور اس کے اندر سے آواز آئیگی۔

یہ ہے سچ۔

حق یہ ہے۔

ایک خدا۔

ایک رسول۔

ایک کتاب پر ایمان۔

جو کچھ ہے بس اسی کی ذات ہے، باقی سب نظر کا دھوکا ہے۔

پروفیسر احسان اس کے کان میں سرگوشی کرتے۔

"ہاں جو کچھ ہے بس اسی کی ذات ہے"

اس کا دل گواہی دیتا۔

ہونٹوں سے بے آواز صدا آتی۔

اس کا دل چاہتا' وہ چیخ چیخ کر بلند آواز میں اقرار کرلے کہ جو کچھ ہے بس اسی کی ذات ہے، لیکن اس کے حلق میں گھٹ جاتے، دروازے بند ہو جاتے۔

اور قفل لگ جاتے۔

ایک دم جیسے اندر اندھیرے اتر آئے۔

گھپ سیاہ اندھیرے

"روشنی"

اس کی آنکھیں برسنے لگتیں۔

"روشنی___ روشنی بھیج اے پیغمبروں کے خدا! مجھ سے تیرہ شبوں کی صدا روشنی۔"

اس کا جسم پسینے میں ڈوب جاتا۔ پانی کے قطروں کی طرح ہر مسام سے پسینہ پھوٹ پڑتا۔ اور وہ بھی پکارے چلی جاتی۔

روشنی___ روشنی لیکن اندھیرے جانے کہاں سے یلغار کر کے آ جاتے، وہ ہمت ہارنے سی لگتی۔

مایوسی اس کے اندر بہت دور تک اترنے لگتی۔ شاید میرا جذبہ خام ہے۔

میرا یقین ناقص ہے۔

میں کبھی بھی اس روشنی کو نہیں پا سکوں گی، جو ذرا سی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہے۔

فرید گلیاں چکڑ دور گھر نال پیارے نیند

اے فرید گلیوں میں کیچڑ ہے اور محبوب کا گھر دور ہے۔

فرید اگلیاں چکڑ۔

وہ دھیرے دھیرے گنگناتی

میری منزل بھی دور ہے اور گلیوں میں کیچڑ ہے۔ اور پتا نہیں میرے خدا کو کیا امتحان مقصود ہے۔ کیا کوئی اس بڑا امتحان ابھی باقی ہے۔

سب پیاروں کا چھوڑ دینا۔

کیا وہ امتحان نہیں تھا۔

امتحان کتنا بھی کڑا کیوں نہ ہو جاتا تو ہے۔ آنکھیں جل تھل ہو جاتیں تو دروازے پھر کھلنے لگتے۔ قفل ٹوٹنے لگتے۔

جیسے ابھی ٹوٹ کر گر جائیں گے۔

اور دل با آواز بلند گواہی دے گا۔

"ہے"۔

کوئی ہے، سب سے ماورا سب سے بلند جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا۔

قل ھو واللہ احد

جو ایک ہے، بے نیاز ہے جس نے کائنات کو پیدا کیا اور جو نہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا۔

آوازیں۔ بے شمار آوازیں۔

اس کے اندر ایک آوازوں کا ہجوم تھا۔

لفظوں کا شور تھا۔

لیکن آوازیں اور لفظ ہونٹوں تک آ کر گم ہو جاتے۔ اس وقت بھی وہ دو زانو کارپٹ پر بیٹھی تھی۔ اس کا پورا جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ قفل ٹوٹنے والے تھے۔ دروازے کھل رہے تھے۔ اور بند ہو رہے تھے جب جان بریف کیس ہاتھ میں اٹھائے اندر داخل ہوا۔

اس نے چونک کر جان کو دیکھا اور ہاتھوں کی پشت سے پسینے کے قطرے پونچھے۔

''سنو لیزا! پرسوں صبح چار بجے فلائٹ سے ہم جا رہے ہیں۔ یہ رہے ہمارے ٹکٹ''۔
اس نے بریف کیس کھولا۔
''اس میں تمہارے سارے کاغذات ہیں۔ پاسپورٹ وغیرہ۔
''کیا ہم جانے سے پہلے ممی اور ریٹا سے ملنے جائیں گے؟''
''ہوں!'' جان نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا۔
''کم آن ٹل آتے ہیں۔ واپسی پر ہم وہاں کے لیے کچھ شاپنگ بھی کر لیں گے۔ میرا مطلب ہے ڈریسز وغیرہ لے لینا۔ وہاں گھر میں بھی تمہارے کچھ کپڑے ہوں گے۔ لے لینا۔ کم از کم ایک ماہ کا ٹور ہے زیادہ بھی ہو سکتا ہے''۔
جان بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔
رتن نے ایک نظر اسے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
''منہ ہاتھ تو دھو لو''۔
جان کی نظر اچانک ہی اس کے چہرے پر پڑی تھی۔ اترا ہوا چہرا سوجی سوجی آنکھیں۔
''ممی تو مجھے بہت ڈانٹیں گی کہ شاید میں تم پر ظلم کرتا رہا ہوں۔ بھئی ہم تو پیار کرنے والے لوگ ہیں''
وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا اور بریف کیس اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔
ریٹا' آن اور ممی اس سے بڑی گرم جوشی سے ملیں۔
''اوہ لڑکی لوگ تم ادھر سے جا کر بالکل ہم کو بھول ہی گیا۔
نہیں تو ممی! میں آپ لوگوں کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولی''۔
تو پھر مڑ کر خبر ہی نہیں لیا''۔
''اوہ ممی ڈارلنگ آپ کو بتایا تو تھا کہ ہم گھومنے جا رہے ہیں۔ بہت گھومے۔ سوات، کاغان، اسلام آباد۔ دو دن قبل ہی تو آیا ہوں'' جان نے جلدی سے کہا۔
''تو دو دن سے کہاں تھے تم؟ لیزا کو کہاں رکھا ہوا تھا''۔
آن نے پوچھا۔
''اپنے فلیٹ میں لے گیا تھا ڈیر۔ اب ساری زندگی اسے یہاں تو رہنا نہیں''۔
''تم نے فلیٹ لے لیا؟'' ممی نے حیرت سے پوچھا۔
''کب کا لے رکھا ہے؟''
''بتایا ہی نہیں''۔
''عارضی طور پر لیا تھا۔ اب کوٹھی لے رہا ہوں۔ کلفٹن کے قریب''
''اوہ ریئلی''۔
آن نے پوچھا۔
''پر تمہارے پاس یکدم اتنا پیسہ کدھر سے آ گیا'' ممی نے تشویش سے پوچھا۔
''اوہ ممی ڈیر! کوئی نوکری تو نہیں ہے۔ بزنس ہے بزنس۔ اور بزنس میں پیسہ ایسے ہی آتا ہے دم سے''۔
''تم کیسی ہو ریٹا؟''

رتن نے آہستگی سے پوچھا۔
''اچھی ہوں لیکن تم کچھ کمزور لگ رہی ہو۔ خیریت تھی نا سب۔ جان ٹھیک تو رہا تمہارے ساتھ؟''
''ہوں'' اس نے اثبات میں سر ہلا کر جان کی طرف دیکھا جو ممی سے لاڈ کر رہا تھا۔ اور آن کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ یکایک اس نے سر اٹھا کر رتن کی طرف دیکھا۔
''لیزا ڈیر! تم اپنا سامان لے لو۔ ہمیں ابھی شاپنگ بھی کرنا ہے''۔
''کیا تم پھر کہیں جا رہے ہو؟'' آن نے پوچھا۔
''ہاں صبح چار بجے کی فلائٹ سے میں اور لیزا ایک ماہ کے ٹور پر امریکہ جا رہے ہیں''۔
''اوہ''۔ آن نے رشک سے اسے دیکھا۔
''ہاؤ لکی یو آر لیزا۔ امریکہ خوابوں کا شہر''
''کیا تم یہاں سے نہیں جاؤ گے؟ ریٹا نے پوچھا۔
''نہیں رات ہم وہاں اپنے فلیٹ میں ہی رہیں گے۔ ادھر سے ذرا آسانی رہے گی۔ ایئر پورٹ بھی نزدیک ہے''۔
جان نے وضاحت کی اور رتن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
''کوئی بہت ضروری سامان ہے تو لینا۔ فالتو نہیں۔ دو تین ڈریس رکھ لینا بس''۔
جان نے اسے جاتے جاتے پکارا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ریٹا اس کے پیچھے پیچھے ہی کمرے میں آئی۔
''تم خوش نہیں ہو لیزا!؟''۔
رتن خاموش ہی رہی۔
''جان اتنا برا نہیں ہے لیزا۔ اس نے تم سے شادی کی ہے۔ اور اب اس نے تمہیں بحیثیت بیوی کے قبول کر لیا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہے۔ تم بھی حالات کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرو۔ میری خواہش ہے کہ جب تم واپس آؤ تو ایک بدلی ہوئی لیزا ہو۔ خوش اور مطمئن''۔
''تم خوش ہو؟'' رتن نے سر اٹھا کر دیکھا۔
ریٹا ہونٹ کاٹنے لگی۔
''بھول گئی ہو اسے؟''
''بھولنا اور یاد رکھنا اپنے اختیار میں کب ہوتا ہے''۔
ریٹا کی آنکھیں جھلملا گئیں۔
''وہ مجھے پل بھر کے لیے بھی نہیں بھولتا لیزا۔ اس کی یاد ایک زخم بن کر تکلیف دیتی رہتی ہے ہر لمحہ ہر پل یوں لگتا ہے جیسے میں مرنے کی اذیت سے گزر رہی ہوں۔ اس سے بچھڑنے کا۔ اس کے کھو جانے کا۔ اس کی جدائی کا تصور پل پل مجھے مارتا ہے''۔
''ریٹا!'' رتن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔
''لگن سچی ہو تو منزل ضرور ملتی ہے۔ ایک بار تم نے ہی تو کہا تھا۔ شاید کوئی معجزہ، کوئی انہونی اسے پھر تم تک لے آئے''۔
''نہیں''۔ ریٹا نے سر ہلایا۔

"اب نہیں۔ اگر وہ آ بھی جائے تو میں اسے دیکھے بنا' اس کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر اس کے
سے گزر جاؤں گی۔ اب مجھے اس کی طلب نہیں ہے۔ اس کی رفاقت کی چاہ نہیں ہے۔ میرے دل میں ذرا
بھی نہیں۔ اگر وہ رو رو کر معافی بھی مانگے۔ تو بھی میں اس کی طرف نہیں پلٹوں گی۔

مجھے اس کی رفاقت کی خواہش تھی لیزا' میں اس کے سنگ سنگ چلنا چاہتی تھی۔

قدم سے قدم ملا کر۔ تصور سے میرے اندر پھلجھڑیاں سی چھوٹتی رہتی تھیں۔ رنگ سے بکھرتے رہتے
۔ جیسے کوئی میرے اندر رنگوں کی ہولی کھیل رہا ہو۔ اور پھر جب اس نے اپنا اصل چہرہ دکھایا تو یہ سارے رنگ مرگئے۔

مگر اس کی محبت اسی طرح زندہ ہے۔ پہلے سے زیادہ مضبوط اور مستحکم۔ بس اس کی طلب مرگئی۔
بس محبت ہی محبت رہ گئی ہے۔ طلب ختم ہو گئی ہے

محبت صرف محبت۔

بے غرض' بے طلب محبت۔

اس نے آنکھیں موند لیں جیسے اپنے اندر موجود اس محبت کی حلاوت سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔

اس سمے اس کے چہرے پر ایسی الوہی روشنی تھی کہ رتن کی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹھہری گئیں۔
کا سانولا رنگ دمک رہا تھا۔ اور ہونٹوں پر دلفریب سی مسکراہٹ تھی۔

چند دن پہلے ایک ماہ یا شاید اس سے کچھ زیادہ دن ہوئے تھے۔ جب وہ یہاں اسی کمرے میں
بکھری اور اتنی ٹوٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ اور صرف ایک ماہ میں اس نے اتنا فاصلہ کیسے طے کر لیا۔

بے یقینی سے یقین تک۔

کتنی طمانیت تھی اس کے چہرے پر جیسے اس نے منزل کو پا لیا ہو۔

ایک وہ تھی جو نہ جانے کب سے سفر میں تھی۔ اور منزل ابھی تک دور تھی۔ اس کی آنکھیں نم ہو
ریٹا نے اسی لمحے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"لیزا! تم کچھ پریشان لگ رہی ہو۔ کچھ گڑبڑ تو نہیں ہے۔ جان تمہارے ساتھ ٹھیک ہے ناں
کیا وہ تمہیں سچ مچ سوات لے گیا تھا؟"

رتن نے سر اٹھا کر ریٹا کی طرف دیکھا۔ وہ اسے بتانا ہی چاہتی تھی کہ کہیں نہیں گئی تھی اور یہ
کی نہیں، پرسوں صبح کی فلائٹ سے اسے جانا ہے۔ کہ جان دروازے پر نمودار ہوا۔

"لیزا ڈیر! ابھی تک تم نے اپنے کپڑے نہیں لیے۔ ڈیر مجھے کچھ گفٹ وغیرہ بھی لینے ہیں۔ دو
دوستوں کے لیے کچھ لے لیے ہیں۔ میں نے لکڑی کے ڈیکوریشن پیسز' کچھ اور لینے ہیں۔ پھر تمہارے
کچھ کپڑے خریدنے ہیں۔ اور کچھ اور کام بھی ہیں۔ تم جلدی کرو پلیز۔"

"ایسا کرو جان! تم چلے جاؤ۔ لیزا کو میں شاپنگ کروا دیتی ہوں۔ اور پھر صبح میں اسے
پر پہنچا دوں گی۔ اتنے دنوں بعد تو ملے ہیں"۔

"ایک مہینہ یوں پلک جھپکتے میں گزر جائے گا"۔ جان نے چٹکی بجائی۔

"پھر لیزا کو اپنے پاس ہی رکھ لینا دو تین ماہ کے لیے۔ لیکن اس وقت مائی ڈیر سسٹر اسے
رات ہماری ایک دوست کے ہاں دعوت ہے۔ جانے کب فارغ ہوں۔ یہاں آئیں گے تو خواہ مخواہ
ڈسٹرب ہو گے"۔

ریٹا خاموش ہو گئی۔ رتن نے وارڈروب سے اپنی دو تین ساڑھیاں نکالیں اور مڑ کر جان کی طرف

"کم آن"۔ جان اسے اشارہ کرتا ہوا باہر نکلا تو وہ اور ریٹا بھی اس کے پیچھے ہی نکل آئیں۔

ممی نے رتن کو پیار کیا۔

"ہم بہت خوش ہے ڈیر کہ تمہارا اور جان کا پیار ہو گیا ہے۔ بس اب جلدی سے بے بی لوگ کو لاؤ۔
زیادہ دیر مت کرنا۔ یہ جان۔ انہوں نے مڑ کر جان کی طرف پیار سے دیکھا۔

"پورا الفنگا ہے۔ ایک دم شریر آدمی ہے مضبوطی سے نہیں پکڑو گی تو پھسل جائے گا"۔

"ممی!" جان نے پیار سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اب تمہارا جان نہیں پھسلے گا۔ دیکھ لینا تم"۔

"اچھا اچھا مجھے تم پر ذرا بھی اعتبار نہیں لیزا ڈیر۔ اس کا خاص دھیان رکھا کرنا"۔

"اچھا بائے"۔ جان نے سب کو خدا حافظ کہا۔

"بائے"۔ ممی نے اس کے رخسار پر بوسہ دیا۔

ریٹا نے رتن کو پیار کرنا چاہا تو اس نے بے اختیار بازو پھیلا دیے۔

ریٹا سے گلے لگتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے اب وہ کبھی ریٹا سے نہ مل سکے گی۔ کبھی نہیں اور آنسو اس
کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔ ریٹا کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

"لیزا ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہی بھئی۔ جلد ہی واپس آ جائیں گے"۔

جان ہنسا۔

"اب تو آنا جانا لگا رہے گا۔ لیزا ہر ٹرپ پر میرے ساتھ ہو گی"۔

"اچھا ہے۔ اچھا ہے" ممی نے سر ہلایا۔

"میاں کو اپنا بیوی ساتھ ہی رکھنا چاہیے۔ اس کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے"۔

پھر سب کو خدا حافظ کہہ کر وہ باہر نکل آئے۔

رات رتن بہت بے چین نیند سوئی تھی۔ صبح اس کی آنکھ بہت جلد کھل گئی تھی۔ رات کو جان نہیں آیا تھا۔
اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کمرے کے وسط میں اس کا اٹیچی کیس پڑا تھا۔ قریب ہی ہینڈ بیگ تھا جس میں اس
کا پاسپورٹ وغیرہ تھا۔ اٹیچی کیس میں اس کے کپڑوں کے علاوہ چند ڈیکوریشن پیسز تھے۔ لکڑی کے۔ جو جان
اپنے دوستوں کے لیے لے جا رہا تھا۔ جان کل صبح سے ہی غائب تھا حالانکہ وہ کہہ کر گیا تھا کہ وہ دوپہر تک
آ جائے گا۔ لیکن وہ رات کو بھی نہیں آیا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اس وقت چار بجے تھے اور سات بجے اس کی فلائٹ تھی۔ جان نے کہا تھا کہ وہ پانچ
بجے گھر سے نکل پڑیں گے۔

اس نے منہ دھویا اور اپنے لیے چائے بنائی اور تیار ہو کر جان کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن جان کے
بجائے داؤد خان آ گیا۔

"تم تیار ہو؟" خلاف معمول وہ سنجیدہ تھا۔

"ہاں! وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو" اس نے اس کا اٹیچی کیس اٹھا لیا۔

"جان کہاں ہے؟" اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ۔ اسے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ دو روز میں آ جائے گا"۔

''تو پھر میں بھی'' اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن داؤد خان نے ٹوک دیا۔
''نہیں تمہارے لیے اس نے کہا ہے کہ تم چلی جاؤ۔ وہاں ایر پورٹ پر اس کی آنٹی تمہیں ریسیو کر لے گی۔ اس نے اطلاع دے دی ہے''۔

رتن نے کچھ نہیں کہا۔

یہ جان کو اچانک کیا کام پڑ گیا ہے۔ اس نے سوچا لیکن داؤد خان سے کچھ نہیں پوچھا۔ ایر پورٹ تک خاموشی ہی رہی۔ داؤد خان اس کے ساتھ ہی تھا۔ پھر وہاں اسے کوئی شخص مل گیا۔

یہ مسز جان ہیں اس نے تعارف کروایا۔

''اکیلی جا رہی ہیں، پلیز ذرا راستے میں خیال رکھیے گا''

''ضرور'' اجنبی خوش اخلاق اور نفس لگتا تھا۔

اس نے لیزا کا پاسپورٹ وغیرہ کلیر کروایا۔

پتا نہیں وہ اس سے کیا کیا پوچھتا رہا لیکن رتن بالکل خالی الذہن سی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اجنبی کی باتوں کا کیا جواب دے۔ اجنبی مایوس ہو کر دوسری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

جہاز میں اس کے ساتھ کوئی غیر ملکی لڑکی تھی۔

وہ پریشان سی بیٹھ گئی۔ آنے والے لمحوں سے لاشعوری طور پر وہ خوفزدہ سی تھی۔

نہ جانے جان کی آنٹی کیسی ہوں گی۔

ممی کی طرح محبت کرنے والی یا۔

اور اتنا لمبا سفر وہ بھی اکیلے زندگی میں پہلی بار کر رہی تھی۔

بیلٹ کھولنے کے لیے کہا جا رہا تھا۔ بیلٹ کھول کر اس نے غیر ملکی لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ مسکرائی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔

''تم کیا اسے پڑھنا پسند کرو گی''۔

''ہاں شکریہ''

لیزا نے پاکستان ٹائمز کا آج کا پرچہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

یہ اندر کا صفحہ تھا اور ٹیوٹا کرولا اور فلائنگ کوچ کے درمیان تصادم کی خبر تھی۔ کرولا کا مالک جان مائیکل موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ جان کے والد کچھ عرصہ پہلے ایک گرجا میں پادری کے فرائض سرانجام دیتے رہے تھے۔ جان کی تصویر تھی۔ اور خبر کافی تفصیل سے چھپی تھی۔ لیزا کو یوں لگا جیسے اس کے ہاتھوں پیروں سے جان نکل رہی ہو۔ اور اس کا دل نیچے ہی نیچے ڈوبتا جا رہا ہو۔ اخبار اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹیک کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

☆☆☆☆

باصر کی نگاہیں مدحت کے چہرے پر جمی تھیں اور مدحت سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر دھنک رنگ بکھرے تھے۔ باصر وارفتگی شوق اور دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کئی لمحے دبے پاؤں ان کے پاس سے گزر گئے۔ بڑی دیر بعد باصر نے پوچھا۔

''کیسی ہو مدحو؟''

''اچھی ہوں''

مدحت نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔

''آپ کیسے ہیں''۔

''اچھا ہوں''

''لاہور میں سب ٹھیک تھے؟''

''میں کراچی سے سیدھا ادھر ہی آ رہا ہوں''

''آپ لاہور کیوں نہیں گئے؟''

''مدحت نے حیرت سے پوچھا''

''کیا تم نہیں جانتیں؟'' وہ مسکرایا۔

''بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گی؟''

''ہاں سوری''۔ وہ چونکی۔ ''آپ بیٹھیں پلیز''

باصر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور مشتاق نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''تم کچھ کمزور نہیں ہو گئی ہو مدحو''

''نہیں تو ٹھیک ہی ہوں''

''میاں جی بھی صحیح نہیں لگتے''

''ہاں وہ کچھ بیمار رہتے ہیں'' مدحت نے بتایا۔

باصر ایک دن قبل آیا تھا اور زیادہ تر میاں جی یا ڈاکٹر شاہ محمد کے ساتھ ہی رہا تھا۔ آج میاں جی ابھی باہر گئے تھے اور وہ ناشتا کر کے مدحت کے کمرے میں آ گیا تھا۔

''مدحو!'' باصر نے سرگوشی کی۔

''مجھے یاد کیا تھا کبھی؟'' مدحت خاموش ہی رہی۔

''بتاؤ ناں''

''میرے خیال میں آپ کو آنٹی کی بات مان لینا چاہیے''

''لاحول ولاقوۃ۔ یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے'' باصر نے بے اختیار کہا۔

''پتا ہے۔ میں بہت خوش ہوں بے حد۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔ ایسا ممکن ہے لیکن جب تبریز بھائی نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے ___ تو بہت ساری دیر تک مجھے یقین نہیں آیا۔ یقین کرو مدحو بظاہر میں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا لیکن جب میں اکیلا ہوتا تو تمہارا خیال جانے کہاں سے' جانے کن چور دروازوں سے میرے دل میں چلا آتا۔ میں بہت کوشش کرتا تھا مدحو! کہ تمہارا تصور نہ آئے۔ میں تمہارے لیے نہ سوچوں لیکن خیالات پر مجھے اختیار نہیں تھا۔ بالکل نہیں تھا مدحو! مجھے یقین ہے۔ تم بھی مجھے ضرور سوچتی ہو گی۔ میں نے تبریز بھائی سے کہا تھا کہ وہ یعنی تم ایسی ہو کہ ہر حال میں ان کے ساتھ رہ لو گی۔ تم میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اور پتا ہے تبریز بھائی نے کیا کہا؟''

مدحت نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''انہوں نے کہا میں جانتا ہوں کہ وہ کیسی ہے۔ اس لیے تو چاہتا ہوں کہ اسے بہت ساری خوشیاں ملیں۔ وہ تمام زخم جو اسے بچپن میں لگے ہیں۔ ان کا ازالہ ہو جائے میاں جی کی نسبت سے وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ باصر تم انکار مت کرنا۔ اور میرا تو ہر موئے تن اقرار کر رہا تھا۔ مدحو کیا معجزے آج کل بھی ہوتے ہیں۔ جب

آدمی ہر طرف سے مایوس ہو جائے۔ زندگی کی ساری بازیاں ہارے بیٹھا ہو۔ اور اچانک اسے پتا چلے کہ پا
پلٹ گیا ہے۔ تو اس کی کیفیت کا اندازہ تم کر سکتی ہو۔ شاید نہیں پتا ہے۔ مدحو! میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں
کروں۔ پھر تبریز بھائی کے ساتھ کھانا کھانے باہر چلا گیا۔ ہم کھانا کھا کر آئے تو تبریز بھائی سو گئے۔ اور میں
کر باہر فٹ پاتھ پر آ گیا۔ رات کا ایک بجنے والا تھا۔ میں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بہت دیر تک روتا رہا۔
نہیں کیوں۔ بعد میں بھی کئی دن تک میں سوچتا رہا کہ میں کیوں رویا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں۔
بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیوں رویا تھا۔ تم بتا سکتی ہو کہ میں کیوں رویا تھا"۔

"پتا نہیں" مدحت نے باصر کی طرف دیکھا۔

وہ کتنا خوش اور مطمئن لگ رہا تھا۔ اور اسے کیا پتا کہ یہ تو محض چند لمحوں کی خوشی ہے۔ آنٹی ز
ایسا ہرگز نہیں چاہتیں۔ اور شاید ایسا کبھی نہ ہو سکے عمر بھر کی رفاقت کا خواب کبھی پورا نہ ہو سکے۔

"کیا سوچنے لگی ہو مدحو! کیا تم خوش نہیں ہو۔

کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا جیسے کوئی معجزہ ہو گیا ہے کوئی انہونی بات۔

"معجزے اس دور میں نہیں ہوتے" اس نے افسردگی سے کہا۔

"شاید آپ کو نہیں پتا آنٹی"۔

"مجھے سب پتا ہے میں نے ماما کا خط پڑھا ہے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے"۔

"پڑتا ہے باصر وہ جنرل ہادی کی بیٹی"

"جنرل ہادی کی بیٹی۔ ہوں"۔

باصر کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

"میں پاپا کی فیکٹری کی بنائی ہوئی مصنوعات میں سے نہیں ہوں۔ جیتا جاگتا انسان ہوں۔ ز
گزارنے کے لیے میرا اپنا ایک نقطہ نظر ہے۔ میں کوئی فروخت ہونے والی شے نہیں ہوں جس کا سودا و
مرضی سے کر لیں"۔

"لیکن وہ آنٹی"۔

"فضول باتیں مت کرو۔ میں سوچ رہا تھا کہ تم کھلے ہوئے گلاب کی طرح ہو گی۔ خوش اور م
لیکن اب پتا چلا کہ اسی طرح کی فضول باتیں سوچ سوچ کر دماغ خراب کرتی رہی ہو۔ اسی لیے اتنا پیلا رنگ
ہے تمہارا"۔

مدحت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"خوش رہا کرو مدحو!"

باصر نے بے چینی سے کہا۔

"اور میرا یقین کرو۔ کوئی جنرل ہادی یا اس کی بیٹی مجھے نہیں خرید سکتی۔ میاں جی کی خواہش ا
کا فیصلہ مجھے عزیز تھا اور اس کے لیے میں تمہیں کھو سکتا تھا۔ کھونے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ لیکن دنیا کی اور کوئی
میرے اور تمہارے راستے الگ نہیں کر سکتی۔ سمجھتی ہو"۔

"ہوں" مدحت نے سر ہلایا۔

"صرف سر ہلانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ پیاری لڑکی۔ دل میں اس کا یقین بھی رکھو۔ پتا ہے
شروع میں ہفتوں مہینوں میں نادم رہا کہ یہ مجھ سے کیا ہو گیا۔ یہ میرے دل نے تمہیں کیوں چاہا۔ تم جو

ھائی سے منسوب ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے آپ کو کیا سزا دوں۔ کس طرح سنگسار کروں کہ میں نے ایک
صوم لڑکی کے دل کے تاروں کو چھیڑا ہے۔ میں نے انجانے میں بے ایمانی کی ہے۔ لیکن پھر میں نے کہیں پڑھا
کہ محبت بے اختیار ہوتی ہے۔

وہ لمحے جب آدمی کسی کے لیے اپنے دل میں کوئی جذبہ محسوس کرتا ہے۔ وہ لمحے آدمی کے اپنے نہیں
ہوتے۔ اس وقت وہ ___ ان لمحوں کا قیدی ہوتا ہے۔ اسیر ہو جاتا ہے اس وقت کچھ پتا نہیں ہوتا کہ یہ محبت ہم کس
کے لیے محسوس کر رہے ہیں۔

وہ کون ہے۔

مناسب نامناسب کچھ ذہن میں نہیں ہوتا۔ بس ایک جذبہ ہوتا ہے۔

ایک احساس ہوتا ہے۔

رنگوں کی برسات میں بھیگا' خوشبو بھرا احساس مجھے محبت کی حقیقت جاننے میں کچھ عرصہ لگا لیکن جب
ں نے اسے جان لیا تو پھر میں نے خود کو مجرموں کے کٹہرے سے باہر نکال لیا۔ کہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں
ا۔ بس سارا قصور ان لمحوں کا تھا جنہوں نے مجھے اسیر کر لیا تھا۔ گرفت میں لے لیا تھا۔ یہ محبت بھی بس ایک عجیب
ی شے ہوتی ہے مدحو۔

محبت کائناتی وسعتوں سے بھی کہیں آگے کی لامحدود وسعت ہے۔

کسی چہرے کو آنکھوں اور خوابوں کی دعا پر نقش کرنا۔

اس کے بارے میں سوچنا۔

اور اپنی ہر خواہش کو بس اس ذات تک محدود کر لینا محبت ہے۔

ٹھٹھرتی آبشاروں میں بجھی ٹھنڈی ہوا سہنا۔

شبوں کے گنبدوں میں گونجتی بے چینوں کے درمیان رہنا۔

ہر اک موسم کو اپنے اندرونی موسموں کی زد میں لے آنا محبت ہے۔

مدحو کچھ بولو ناں تم بھی کچھ کہو۔ اتنی خاموش کیوں بیٹھی ہو۔ پتا ہے میں تب سے جب سے تبریز بھائی
ے میری بات ہوئی تھی ___ یہاں آنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ مگر نئی جاب تھی۔ آنا مشکل تھا۔ بولو ناں مدحو"۔

"کیا کہوں؟" مدحت نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا "مجھے ڈر لگتا ہے"۔

"کیسا ڈر مدحو۔ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ ہر قدم پر۔ اب کیا ڈر"۔

"امیدوں کا بار بار ٹوٹنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں کوئی ایسی امید دل میں نہیں رکھنا چاہتی۔ جس
کے پورا ہونے کا امکان نہ ہو"۔

پاگل ہو۔ بالکل پاگل ہو تم مدحو۔ یونہی ڈرتی ہو۔ میں کہہ رہا ہوں ناں تم سے کہ زندگی کے سفر میں ہم
ں قدم سے قدم ملا کر چلیں گے۔ ایک ساتھ۔ یہ خواب میں نے اتنی بار دیکھا ہے کہ حقیقت لگنے لگا ہے۔

"بعض خوابوں کی تعبیریں نہیں ہوتیں"

"اوہ خدایا تم اتنی مایوسی کی باتیں کیوں کرنے لگی ہو۔

میں کہہ رہا ہوں ناں تم میرا اعتبار کرو۔ یقین کرو میرا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اور وہ آنٹی"۔

"ان کو میں منا لوں گا۔ کچھ وقت ضرور لگے گا۔ لیکن دیکھ لینا۔ ایک دن ہمارے خواب ہماری مٹھی

میں ہوں گے۔ سب خواب"

اس نے ہاتھوں سے وکٹری کا نشان بتایا۔

شاہ پور میں ایک ہاسپٹل۔

اور مدحت کی رفاقت کا خواب۔

مدحت کے چہرے پر رنگ سے بکھر گئے۔ باصر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

ایسے ہی رہا کرو خوش۔ بہت پیاری لگ رہی ہو اس وقت"

مدحت کا چہرا تمتما اٹھا

تب ہی بھاگاں اندر آئی "ڈاکٹر شاہ محمد آئے ہیں"

"اچھا!" باصر اٹھ کھڑا ہوا لیکن پھر بیٹھ گیا۔ کیونکہ ڈاکٹر شاہ محمد ادھر ہی آ رہے تھے۔

"کیسی ہے ہماری بٹی؟" انہوں نے اندر آ کر مدحت کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"فائن! وہ مسکرائی۔

"پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟"

"اچھی"

"اوہ ہاں مجھے یہ پوچھنا تو یاد ہی نہیں رہا کہ تم لاہور سے آ کیوں گئیں۔ پڑھائی چھوڑ دی کیا؟

باصر نے پوچھا۔

"نہیں تو۔ بس گھر میں ہی تیاری کر کے امتحان دے دوں گی۔ وہاں میرا دم گھٹتا تھا۔ پتا [illegible]

ہو گیا تھا۔

"ماما کا رویہ تو ٹھیک تھا ناں؟" باصر نے پوچھا

"ہاں" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"انکل آپ کے لیے چائے بناؤں"

"ضرور" ڈاکٹر شاہ محمد مسکرائے "ساتھ مٹھائی بھی لے آنا۔ ہاسپٹل کا نقشہ منظور کروا کے آ رہا ہوں"

"بہت خوب!" باصر کا چہرا چمک اٹھا "یہ تو آپ نے بڑی اچھی خبر سنائی۔ بس اللہ کا نام لے کر

شروع کروا دیجیے"۔

"ہاں۔ وہ پروفیسر عبید نے ٹھیکیداروں سے بات کی ہے۔ کچھ فائنل کر کے ہی بتائیں گے"

"تبریز بھائی نے فی الحال دس لاکھ روپے آپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروائے ہیں"۔ باصر نے

"پھر ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ ہوتا رہے گا"

"ہاں" ڈاکٹر شاہ محمد نے بھی تائید کی۔

"نیک کام کی ابتداء ہو جائے تو پھر راستے خود بخود کھلتے جاتے ہیں۔ میاں جی کہتے ہیں کہ

خدا خود اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے"۔

وہ دونوں ہاسپٹل کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ اور مدحت چائے بنانے کے لیے اٹھ گئی۔

O☆O

باصر کی چھٹی ختم ہونے والی تھی۔ میاں جی نے اُسے سمجھایا۔

"بیٹا! لاہور سے ہو کر جانا۔"

"مگر میاں جی! لاہور جانے کا مطلب یہ ہے کہ میں ماما کی بات مان لوں اور مجھے ماما یا پاپا کا فیصلہ ہر

[illegible]منظور نہیں ہے۔"

"لیکن بیٹا! ماں باپ کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔ وہ اولاد کو پالتے پوستے ہیں' بڑا کرتے ہیں تو

[illegible]ی کچھ تمنائیں بھی ہوتی ہیں، خواہشیں بھی ہوتی ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے میاں جی! لیکن زندگی تو میں نے گزارنی ہے اور پھر یہ شادی تھوڑی ہی ہے یہ تو ہے

[illegible]سودے بازی ہے۔"

"ٹھیک ہے' تم انہیں اپنا نقطۂ نظر سمجھا دو لیکن بیٹا! ان سے مل کر جاؤ۔ ماں تمہارے لیے پریشان

[illegible]ی ہوگی۔ تبریز کی وجہ سے پہلے ہی وہ کافی پریشان رہے ہیں۔ کوشش کرنا بیٹا! کہ ماں باپ کو خفا نہ کرو۔ جنرل

[illegible]ی کی بیٹی نہ سہی، کوئی اور جسے تمہاری ماں پسند کریں۔"

"میاں جی!" باصر نے جھجکتے جھجکتے پوچھا۔ "کیا تبریز بھائی نے آپ سے کوئی بات نہیں کی۔"

"ہاں تبریز نے۔" میاں جی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "لیکن میں سمجھتا ہوں کوئی مجبوری نہیں ہے،

[illegible]ت کے لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے ملک خورشید احمد خان میرے بہت مہربان ہیں۔ میں نے اُن سے

[illegible]کیا تھا مدحت کے رشتے کے لیے' پچھلے دنوں وہ میری عیادت کو آئے تو خود اپنے بیٹے کے لیے خواہش مند

[illegible]۔ میں نے مدحت کے باپ کو خط لکھ دیا ہے۔"

باصر کا چہرا ایک دم سفید پڑ گیا۔ "نہیں میاں جی! پلیز۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ "کوئی ایسا

[illegible]مت کیجیے گا___ جو!"

میاں جی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''یہ صرف تبریز بھائی ہی کی نہیں میری بھی زندگی کی شدید ترین خواہش ہے۔ میں۔۔۔ میں میاں
۔'' وہ کچھ کہتے کہتے جھجکا۔
میاں جی پُرخیال نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔
''میں آپکو مدحت کے اچھے مستقبل کی ضمانت دیتا ہوں۔ آپ یقین کریں میاں جی، مدحت
خوش رہے گی''
اس کی نظریں جھک گئیں۔ میاں جی کی نظریں اُس کے چہرے پر جمی تھیں اور جیسے انہیں کسی
ادراک ہوا۔ لیکن اُس سچ کے ادراک نے انہیں پریشان کردیا۔ ''یہ تمہاری ماں جی کی بھی خواہش تھی کہ مد
مراد علی کی بہو بنے، لیکن تماری ماما! بیٹے۔۔۔۔!
''ماما کی آپ فکر مت کریں۔'' باصر کے چہرے کی رنگت لوٹ آئی۔ ''بس میرا اعتبار کریں میاں
، بہت جلد سب ٹھیک ہوجائے گا۔''
''مگر زیادہ دیر مت کرنا بیٹا! زندگی بڑی ہی بے اعتبار شے ہے اور میں اپنی زندگی میں ہی مدحت
ہاتھ کسی معتبر ہاتھ میں دینا چاہتا ہوں۔''
''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا میاں جی۔''
باصر کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر گئی۔ اس نے جھک کر میاں جی کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور باہر آ گیا۔
باہر صحن میں مدحت، ماسی بھاگاں کے ساتھ مل کر کپڑے دُھلوا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک برآمدے
کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ آج میاں جی نے اُسے معتبر کردیا تھا۔ اور اگر
میاں جی سے اس کی بات نہ ہوتی تو، اُس نے ایک جھرجھری سی لی، پتا نہیں بے خبری میں کیا ہوجاتا۔ میاں جی
رشتہ کہیں اور طے کردیتے تو۔۔۔؟ تبریز کی اور بات تھی، لیکن مدحت کا رشتہ کہیں اور ہوجاتا، کس قدر تکلیف دہ
تھی، کتنی اذّیت ناک، شاید وہ زندہ نہ رہ پاتا۔ مدحت کے بغیر جینے کا تصور کس قدر مشکل لگتا تھا اُسے۔ پتا
اچانک کیا ہوگیا تھا۔ اتنے کم عرصے میں وہ اُس کے اتنے قریب آ گئی تھی، اتنا چاہنے لگا تھا وہ اُسے۔
اُس کا اندازہ ابھی اسے کچھ دیر پہلے ہوا تھا۔ جب میاں جی نے اُس سے ملک خورشید خان کا
تھا۔ لمحہ بھر کو تو اُسے یوں لگا تھا جیسے اُس کے دل کی دھڑکن رُک گئی ہو، سانسیں الجھنے لگی تھیں۔ معلوم نہیں
کے دل میں بھی میرا اتنا ہی خیال ہے جتنا کہ میرے دل اُس کا ہے۔ مدحت کی طرف اُس نے دیکھتے ہو
۔ اُسی لمحے مدحت نے مُڑ کر اُس کی طرف مڑ کر دیکھا تو اس کی آنکھیں جیسے روشنی ہوگئیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ
آ گئی۔ وہ ہاتھ دھو کر برآمدے میں آ گئی۔
''آپ میاں جی کے ساتھ باہر نہیں گئے۔''
''نہیں میاں جی بھی اندر کمرے میں ہی ہیں۔
''اُن کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں ''۔ اُس نے پریشان ہوکر پوچھا۔
''ہاں، ہاں بالکل ٹھیک ہیں' کچھ پڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے فاضل سے کہلوا دیا تھا، کہ دو
تک باہر جائیں گے''۔
''اچھا!'' مدحت نے اطمینان بھری سانس کی۔ ''آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟''
''یونہی تمہیں دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں پھر کب دیکھنا نصیب ہو''۔

''کیوں، کیا آپ بہت دنوں بعد آئیں گے''۔
''کچھ کہ نہیں سکتا۔ ہوسکتا ہے جلد آجاؤں، ہوسکتا ہے، دیر ہوجائے''۔ اُس نے گہری نظروں سے
حت کو دیکھا۔
''مدحو! ابھی، ابھی میاں جی نے مجھے بتایا ہے کہ اُن کے دوست نے اپنے بیٹے کے لیے تمہاری
واہش کی ہے اور!''
بات نامکمل چھوڑ کر اس نے مدحت کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اُس کا رنگ خطرناک حد تک زرد پڑ گیا
ا، ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ اُس نے ایک نظر باصر پر ڈالی اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر
قریباً بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ لمحہ بھر کو وہ حیران ہوا اور پھر اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ
گئی۔ تو آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے۔ لبوں پر مسکراہٹ سجائے وہ اُس کے پیچھے ہی اُس کے کمرے گیا
وہ گھٹنوں پر سر رکھے زمین پر بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔
مدحو!'' اس نے آہستگی سے پکارا۔
مدحو!''
ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے اُس نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو مدحت نے ایک جھٹکے سے سر
ٹھا کر اسے دیکھا اور روتی آواز میں بولی۔
''یہ روز روز کی اذیت مجھ سے برداشت نہیں ہوتی ہے۔ ایک بار ہی جو کچھ ہونا ہے ہوجائے۔ یہ روز
روز اُمید نااُمیدی کا کھیل بھی''۔
بات نامکمل چھوڑ کر وہ زور زور سے رونے لگی۔ تو باصر گھبرا گیا۔
''خدا کے لیے مدحو! پوری بات تو سُن لیتیں، کوئی نااُمید، کچھ نہیں ہے، کچھ بھی تو نہیں ہے، میاں جی
نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ میرا انتظار کریں گے۔ سنو! تم بھی میرا انتظار کرنا''
وہ بولتا رہا، مدحت روتی رہی۔
''پلیز، اب تو چپ ہوجاؤ ناں، غلطی ہوگئی بابا! میں تو دیکھنا چاہ رہا تھا کہ بھلا تمہارے دل میں بھی
را اتنا خیال ہے جتنا میرے دل میں''۔
''تو کیا آپ نے جھوٹ بولا تھا؟'' مدحت نے آنسو پونچھتے ہوئے کسی قدر ناراضگی سے کہا۔
''جھوٹ تو نہیں بولا تھا ''۔ باصر مسکرایا اور ساری بات تفصیل سے بتائی۔
''اور اگر پھر ملک خورشید خان نے میاں جی سے بات کی تو۔۔۔!
''پاگل ہو تم، اب کچھ نہیں ہوگا، انشاءاللہ سب ٹھیک ہوجائے گا، تم پریشان نہ ہوا کرو، اگر مجھے کچھ دیر
ں ہوگئی تو گھبرانا مت۔ میں ماما اور پاپا کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ ماما خود تمہارے لیے میاں جی سے درخواست
ریں گی ''۔
''پتا نہیں کیوں مجھے ڈر لگتا ہے۔ ایسے لگتا ہے میں کبھی بھی آنٹی کا سامنا نہیں کر پاؤں گی۔ پتا نہیں
دل میں کیا سوچتی ہوں گی۔ وہ مجھے اور میاں جی کو برا بھلا کہتی ہوں گی ''۔
''تم فضول کے واہموں سے اپنا دماغ نہ خراب کیا کرو، وہ کچھ نہیں کہتیں ہوں گی۔ بس تم میرا انتظار کرنا مدحو! میں
ن کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں تمہارا ہوں، صرف تمہارا مدحو۔ میں نے تم سے کہا ہے ناں کہ ہوسکتا ہے کچھ دیر ہوجائے،
ن اس دیر کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوگا کہ کہ مجھے آنا ہی نہیں ہے یا میں نے تمہیں بھلا دیا ہے، تم میرے خون میں

شامل ہوچکی ہو، اس بات کا یقین رکھنا کہ میں جہاں کہیں بھی ہوا تمہارا تصوّر میرے ساتھ ہوگا۔ میں چاہو
آج ہی میاں جی سے کہہ کر تمہارے ساتھ نکاح کر سکتا ہوں، لیکن مدحو! میں تمہیں ماما اور پاپا کی رضامندی
ساتھ تمام تر خوشیوں کے جلو میں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں"۔

"جی ٹھیک ہے" اُس نے آہستگی سے کہا۔

"صرف ٹھیک ہی نہیں ہے بلکہ بہت ٹھیک ہے۔" باصر نے خوشدلی سے کہا۔

"پتا ہے مدحت! میں آج بہت خوش ہوں۔۔ بے حد۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا مدحو کہ میر
شدید ترین خواہشوں کے پورا ہونے کے لیے یوں اچانک خود بخود راستے کھل جائیں گے۔ یقین کرو، جب
تو میرا دل چاہتا تھا کہ بس مر جاؤں، ندامت، شرمندگی اور محبت کا بوجھ اُٹھا نہیں پا رہا تھا۔ تمہارا خیال جھٹکا
اسپتال کے متعلق سوچنے لگتا تو جیسے مایوسی کے پہاڑ سامنے آ کھڑے ہوتے۔ میں ایک پانچ چھ ہزار ماہ وا
پانے والا ڈاکٹر ہوں اور میں نے کتنا بڑا خواب آنکھوں میں چھپا رکھا تھا۔ شاہ پور میں ایک خوبصورت اسپ
قیام۔ پاپا کے بغیر یہ خواب پورا نہیں ہو سکتا تھا۔

لیکن پھر تبریز بھائی نے اس خواب کو پورا کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اُس روز میں بہت مایوس اور دل گرفتہ
اُسی روز انکل شاہ محمد کا خط مجھے ملا تھا جس میں ہمیشہ کی طرح انہوں نے مجھے یاد دلایا تھا کہ مجھے شاہ پور میں اس
بنوانا ہے۔ یہ خط مجھے بدرا اسپتال سے ہوتا ہوا مجھے کراچی ملا تھا۔ میں ڈاکٹر بدر سے کہہ آیا تھا کہ میری ڈاک اس
بھجوا دی جائے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں ڈاکٹر شاہ محمد سے لکھ دوں کہ میں گھر چھوڑ آیا ہوں اور یہ کہ وہ اس خواب
دل سے نوچ کر پھینک دیں کہ تبریز بھائی مجھے ڈھونڈتے ہوئے میرے اسپتال میں آ گئے تھے۔

یہ ڈاکٹرز ہاسٹل تھا، جس میں، میں مقیم تھا۔ تبریز بھائی نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے کسی پرسنل کام
کراچی آئے تھے اور بدرا اسپتال سے میرا پتا لے کر آئے تھے اور یہ کہ وہ ایک دو روز تک واپس جائیں گے
پور بھی جائیں گے، تب میں نے اُن سے کہا کہ وہ ڈاکٹر شاہ محمد سے کہہ دیں کہ میں اپنا وعدہ ہار گیا ہوں۔ میں
سال بھی محنت کرتا رہوں تو بھی شاید شاہ پور میں اسپتال بنوانے کا خواب پورا نہیں کر سکوں گا۔ تب بھائی تبریز
کہا کہ یہ خواب ضرور پورا ہوگا اور وہ اس سلسلے میں مدد کریں گے۔"

"مگر تبریز بھائی کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا۔ وہ تو انکل کے دفتر میں کام کرتے ہیں؟"

"یہ بات میں نے اُن سے پوچھی تھی، تو انہوں نے بتایا تھا کہ وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ
اشتراک ایک پرسنل بزنس بھی کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ کراچی گئے ہوئے تھے اور یہ جو کبھی کبھار وہ
کراچی کے ٹور لگاتے ہیں تو اسی سلسلے میں۔ پتا ہے انہوں کہا تھا کہ میں سمجھوں گا۔ میں نے ایک اچھا اور
کر دیا ہے۔ شاید اسی کے طفیل میرے ناکردہ گناہ بخشے جائیں۔ پتا ہے مدحو! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے،
بھائی اندر سے اب بھی پریشان ہیں۔ کوئی چیز ہے جو ہر وقت انہیں پریشان رکھتی ہے۔ وہ جتنے دن وہاں
میرے پاس، میں نے نوٹ کیا، جیسے انہیں دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہی، جیسے وہ کوئی روبوٹ ہوں
کنٹرول کسی اور ہاتھ میں ہے اور وہ اُس ہاتھ کی مرضی سے کام کر رہے ہوں۔"

کیا پتا، وہ اس بات سے خوفزدہ رہتے ہوں کہ وہ پھر کہیں نشہ کرنا نہ شروع کر دیں۔ میں
ہے اور سُنا ہے کہ کوئی بھی کمزور لمحہ ان مریضوں کو دوبارہ نشے کی طرف راغب کر سکتا ہے۔"

"ہاں یہ صحیح ہے، لیکن تبریز بھائی۔" باصر نے پُرسوچ نظروں سے اُسے دیکھا۔

"خوفزدہ تو لگتے ہیں لیکن یہ خوف کچھ اور طرح کا ہے۔ ایک رات وہ سوتے میں ڈر گئے اور چ

بیٹھے۔ میں نے پوچھا، کیا ہوا بھائی، تو کہنے لگے وہ میری زندگی کو عذاب بنا دیں گے۔ سسکا سسکا کر ماریں گے۔
میں موت مانگوں گا تو موت بھی مجھ سے دور بھاگے گی۔"

میں نے انہیں جھنجوڑ ڈالا۔

"کون۔۔ کون لوگ؟"

تو چونک کر مجھے دیکھنے لگے، مگر پھر سنبھل گئے۔

"شاید میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔"

"خدا جانے تبریز بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔"

باصر یک دم اُداس ہو گیا تھا۔

"وہ کچھ بتاتے بھی تو نہیں کہ یہ سب کھیل کیسے اور کس طرح شروع ہوا تھا۔ یہ لت کیسے پڑ گئی تھی۔
بہرحل کچھ نہ کچھ بہتر ہی ہوگا۔ تم دعا کرتی رہا کرو مدحت! پتا نہیں مجھے کیوں یقین ہے کہ تمہاری دعاؤں میں ضرور
اثر ہوگا۔ سچ بتانا تم نے اپنے اور میرے ساتھ کی دُعا کی تھی ناں۔" باصر نے شوخی سے پوچھا۔

"نہیں۔۔ نہیں تو۔" مدحت کے رخساروں پہ سُرخی دوڑ گئی۔

"میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا اور کیوں ہو گیا۔ میں نے اپنے دل میں
آپ کے لیے اپنے دل میں ایسا جذبہ کیوں محسوس کیا۔ تبریز کے لیے کیوں نہیں کیا۔"

"اس لیے میری جان! کہ یہ محبت کا عمل خود بخود وجود میں آتا ہے۔ محبت کوئی سائنس کا فارمولا نہیں
ہے کہ اسے سمجھایا جا سکے۔ مدحو! یہ تو محسوس کرنے کی بات ہے۔ یہ محبت جو کچھ بھی ہے مدحو! بہت خوبصورت۔ بہت
دلکش جذبہ ہے۔ بہت پاورفل جذبہ۔

جیسے محبت کی کونپل پھوٹتے ہی زندگی خود بخود مکمل ہو جائے۔

ہنسنے لگے۔

گنگنانے لگے۔

رنگ ہی رنگ بکھر جائیں۔

محبت ان کو بھی آباد اور شاداب کرتی ہے۔

جو دل ہیں قبر کی صورت۔

محبت ابر کی صورت۔

دلوں کی سرزمیں پہ آتی اور برستی ہے۔

چمن کا ذرہ ذرہ جھومتا ہے۔

مسکراتا ہے۔

ازل کی بے نمومٹی میں سبزہ سر اُٹھاتا ہے۔

محبت اَبر کی صورت۔

اُترتی ہے سوادِ ہجر میں کچھ اس طرح جیسے۔

صدائے آشنا کوئی۔

اور سُنو مدحو!" باصر نے سرگوشی سی کی۔ "محبت گھنے، گہرے اندھیرے جنگلوں کی بے یقینی میں رُہ
منزل دکھاتی ہے۔"

روشنی کا کام دیتی ہے۔
اور تمہاری محبت بھی میری حیات میں ہمیشہ روشنی کا کام دے گی۔ اگر میں کبھی بھٹکنے لگا تو تمہار محبت میری راہبر بنے گی۔ مدحو! یہ مجھے کبھی بھٹکنے نہیں دے گی۔
یہ محبت ایسی شے ہے۔ سوچتا ہوں وہ لوگ جو اس جذبے سے کبھی آشنا نہیں ہوتے، اُن کی زندگی کتنی بنجر اور بے رنگ ہوتی ہوگی۔ جب سے تمہاری محبت نے میرے دل میں ٹھکانا بنایا ہے تب سے میرے اندر پھو ہی پھول کھلے ہیں اس محبت کے بھی کتنے رنگ ہیں کبھی بچھڑ جانے کا ملال اور خوف!
کبھی پالینے کی خوشی اور مسرت۔
"آج آپ!" مدحت نے سر اُٹھا کر شرگیں نظروں سے اسے دیکھا۔
کیا آج۔۔۔ کہو ناں، کہہ بھی دو ناں۔"
"کچھ نہیں۔" مدحت نے پھر سر جھکا لیا۔
"کہہ دو ناں، آج آپ پاگل ہو گئے ہیں۔"
"نہیں تو، میں کہنے لگی تھی کہ آج آپ بہت باتیں کر رہے ہیں۔"
"ہاں، آج میں پاگل ہو گیا ہوں مدحو! میرا دل چاہتا ہے تم سے بہت ساری باتیں کروں۔ وہ سار باتیں جو ان بیتے دنوں میں، میں نے سوچیں اور وہ ساری محبتیں جو میرے دل میں تمہارے لیے ہیں، تمہار۔ سامنے کھول کر رکھ دوں، لیکن مجھے لفظ نہیں مل رہے، سارے لفظ جیسے کہیں کھو گئے ہیں، اندر ایک گڑ بڑ سی مچی۔ مدحو شاید میں کہیں کچھ غلط بول گیا ہوں گا' کچھ بے ربط سا۔ شاید میری باتوں میں ربط نہ ہو۔ شاید کچھ اوٹ پٹا نگ کہہ گیا ہوں۔ لیکن تم میری کیفیت کا اندازہ کر سکتی ہو، انتہائی نا امیدی سے امیدی کا سفر کرتے ہوئے اچانک پھ امیدی کی جھلک دیکھ کر پھر امید کا آنچل تھام لینا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ ابھی کچھ دیر پہلے جب میاں جی ملک صاحب کا ذکر کر رہے تھے تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میرا دم گھٹنے لگا ہو، سانس ٹھہر سا گیا ہو۔ شاید میں اس کیفیہ سے ابھی تک باہر نہیں نکلا ہوں، ہو سکتا ہے میں نے کچھ قبل از وقت کہہ دیا ہو، شاید ابھی اُن جذبوں کے اظہار وقت نہ تھا لیکن پلیز کچھ خیال نہیں کرنا۔ میں شاید کچھ زیادہ جذباتی ہو گیا تھا، سوری"۔
تب ہی بھاگاں نے اندر جھانک کر دیکھا۔
"ڈاکٹر صاحب آئے ہیں جی آپ کو بُلا رہے ہیں"۔
"اچھا! میں آرہا ہوں"۔
باصر نے بھاگاں سے کہا اور پھر مدحت کی طرف متوجہ ہو گیا۔
"سُنو! تم چلو گی ہمارے ساتھ"۔
"کہاں؟"
میں ڈاکٹر شاہ کے ساتھ اسپتال والی زمین دیکھنے جا رہا ہوں۔ نقشہ تو بن گیا۔ منظور بھی ہو گیا ہے لیکن ڈاکٹر شاہ اُس میں کچھ تبدیلی چاہ رہے تھے' کچھ ڈسکس کریں گے تم بھی چلو' تمہاری تفریح ہو جائے گی"۔
"اچھا! آپ میاں جی سے پوچھ لینا۔"
"ہاں بھئی پوچھ لوں گا۔"
باصر باہر چلا گیا تو وہ تیار ہونے لگی۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر شاہ محمد نہر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بڑے جوش و جذبے سے باتیں کر رہے تھے۔

میرے ذہن میں بڑے منصوبے ہیں باصر! میں بیٹھے بیٹھے خواب دیکھنے لگتا ہوں کہ ہمارا یہ اسپتال ایک دن پورے ملک کا بہترین اسپتال ہوگا۔"
"انشاءاللہ!" باصر اور مدحت نے بیک وقت کہا۔
"پتا ہے باصر! ہم اس میں ایک شعبہ معذور بچوں کے لئے رکھیں گے۔ ایسے بچے جو ذہنی اور جسمانی طور پر معذور ہوں گے' ہم انہیں یہاں ہر طرح کی سہولتیں مہیا کریں گے۔
میں چاہتا ہوں۔
ڈاکٹر شاہ محمد نے نقشے کی فوٹو کاپی کھول کر دیکھی۔
"یہاں جہاں بچوں کے لئے وارڈ ہے' وہاں اس کے ساتھ ہی یہ ادھر خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔ اس خالی جگہ میں ان بچوں کے لئے رہائشی کمرے بنائے جائیں۔"
"آپ جیسا بھی مناسب سمجھیں' تبدیلیاں کروالیں۔"
"اور ہاں سنو!"
انہوں نے دوبارہ نقشہ لپیٹ کر بغل میں دبا لیا۔
"میاں جی نے کہا تھا کہ راستے ایک بار کھل جائیں تو پھر کھلتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نیکی کے کاموں میں اپنے بندوں کی خود مدد کرتا ہے۔ کل شام سندھ سے میاں جی کے ایک عقیدت مند آئے ہوئے تھے۔ یونہی اسپتال کی بات چھیڑی تو انہوں نے فوراً ہی دو لاکھ کا چیک لکھ کر دے دیا۔"
"خدا مسبب الاسباب ہے۔ ڈاکٹر شاہ محمد"۔
باصر نے آہستگی سے کہا۔
انشاءاللہ ہمارا خواب ضرور پورا ہوگا۔" وہ چلتے چلتے رُک گئے۔
"یہ جگہ یہ جگہ دیکھ رہے ہو باصر؟"
"ہوں!" باصر نے چاروں طرف دیکھا۔
وہ ابھی تک نہر کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر درختوں کے جُھنڈ تھے۔
"کبھی کبھی جب میرا دل بہت گھبراتا ہے تو میں یہاں اس جھنڈ میں آکر بیٹھ جاتا ہوں' بیٹھا رہتا ہوں۔"
"آیئے کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔"
باصر نے کہا تو وہ تینوں درختوں کے جُھنڈ کی طرف چل پڑے۔
"میاں جی سے میری پہلی ملاقات یہاں ہی ہوئی تھی۔"
ڈاکٹر شاہ محمد نے بیٹھتے ہوئے کہا۔
"انکل! آپ نے کہا تھا کہ کسی روز آپ اپنے متعلق بتائیں گے"
مدحت نے بھی ہنستے ہوئے پوچھا۔
"کیا بتاؤں؟"
ڈاکٹر شاہ محمد نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔
"کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ زندگی سے تھک کر' بیزار ہو کر موت کی تلاش میں نکلا تھا لیکن میاں جی نے اپنے دامن میں پناہ دے دی اور سمجھایا کہ خدا کی دی ہوئی نعمت کو ٹھکرانا کفر ہے۔ مصائب سے ہار کر زندگی کو اپنے ہاتھوں ختم کرنا عمر بھر کے لئے عذاب مول لینا ہے۔ میں جانتا تھا کہ خودکشی حرام ہے پھر بھی بڑی شدت

سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ میں اپنی زندگی ختم کر ڈالوں اور اگر مجھے میاں جی نہ ملتے تو شاید کہ
دن میں اپنی خواہش سے مغلوب ہو کر ایسا کر گزرتا لیکن میاں جی کی باتوں میں جانے کیا اثر تھا کہ میرے اند
زندگی کی اُمنگ پیدا ہو گئی اور میں نے سوچا کہ اپنی زندگی گاؤں کے ان لوگوں کے لئے وقف کر دوں جن
بروقت علاج معالجہ کی سہولت میسر نہیں ہے۔''

''آپ کا گھر' ماں باپ' بہن بھائی؟'' مدحت نے پوچھا۔

''آخر آپ نے ان سب کو کیوں چھوڑ دیا تھا۔''

''میں نے ان سب کو نہیں چھوڑا تھا بی بی! اُن سب نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ میں بہت چھوٹا سا تھا جب
میری والدہ کا انتقال ہوا۔ ہم دو بھائی تھے میرے والد نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ وہ ہمارے لئے ماں بھی
تھے اور باپ بھی۔ میرا چھوٹا بھائی نویں جماعت میں پڑھتا تھا' جب اسکول میں ایک استاد نے کسی غلطی پر اُس
کے سر پر ڈنڈے مارے۔

وہ یکا یک خاموش رہنے لگا۔ اُس نے اسکول جانا بھی چھوڑ دیا۔ پہلے ہم نے یہی سمجھا کہ نفسیاتی ا
ہے۔ اُسے ایک ماہر نفسیات کے پاس لے کر گئے۔ علاج کیا' لیکن روز بروز اُس کی ذہنی حالت خراب ہوتی گ
اور پھر اُسے وقفے وقفے سے دورے پڑھنے لگے۔ ابا جی اُس کے لئے پریشان رہتے۔ جہاں کہیں سرجن کا
چلتا اُسے لے کر دکھاتے۔''

تمام بڑے ڈاکٹرز کی متفقہ رائے یہ تھی کہ اُس کا دماغ اندر سے پچک گیا ہے اور کوئی علاج بھی اُ
نارمل نہیں کر سکتا۔ وقتی علاج کے لئے اُسے انجکشن لگا کرتے تھے۔ اگر بروقت انجکشن نہ لگائے جا سکتے تو اُ
دورہ پڑ جاتا تھا اور پھر اُسے زنجیروں سے باندھنا پڑتا تھا۔

میرا بھائی بہت ذہین تھا باصر! بہت سمجھدار۔ ابا جان کہا کرتے تھے کہ اسے سول سروس میں بھیجوا
گا۔ سی۔ ایس۔ ایس کرواؤں گا باہر بھیجوں گا اور جانے کیا کیا خواب دیکھا کرتے تھے وہ اُس کے متعلق کبھی کبھ
اس کے متعلق باتیں کرتے ہوئے وہ خود ہی ہنس پڑتے۔

''بھئی جس طرف اُس کا رجحان ہو گا۔ وہیں چلا جائے گا' میں تو بس یونہی خواب دیکھتا ہوں۔''

اور وہ کہا کرتا تھا۔

''ابا جان! مجھے آرمی لائف پسند ہے' لیکن میں آپ کے خواب پورے کروں گا۔'' آدمی بھی کیا ک
خواب دیکھتا ہے' لیکن پھر اُس کے سارے خواب بکھر جاتے ہیں۔''

''لیکن بعض اوقات لوگوں کو پتا بھی نہیں چلتا اور وہ کسی ایک انسان کی زندگی کو ختم کر دیتے ہیں' ما
ڈالتے ہیں اُسے۔''

مدحت نے افسردگی سے کہا۔

''اور اب اُس اُستاد کو پتا بھی نہیں ہو گا کہ اُس کی مار نے ایک باپ سے اُس کے خواب چھین لے
ایک بھائی سے اُس کا سہارا لے لیا اور ایک انسان کو جیتے جی زندہ درگور کر دیا۔''

''کاش! میرے اختیار میں ہوتا تو۔''

باصر نے زمین سے گھاس نوچتے ہوئے ڈاکٹر شاہ محمد کی طرف دیکھا۔

''تو میں تعلیمی اداروں میں ایسے اساتذہ کا داخلہ بند کرا دیتا۔ ایسے اساتذہ دراصل نفسیاتی مریض
ہوتے ہیں۔''

''ہمارے اسکول میں بھی ایسی ہی ایک ٹیچر تھیں۔''

مدحت نے بتایا۔

''مس فرحانہ' وہ بھی بچوں کو اتنی ہی بے دردی سے مارتی تھیں۔ ایک بار انہوں نے ایک بچے کا بازو
توڑ دیا۔

ایک بار بچے کی پیٹھ پر اتنے ڈنڈے مارے کہ کھال پھٹ گئی۔

ایک بار ایک بچے کا سر پھاڑ دیا۔''

''بس کرو' مجھے تکلیف ہوتی ہے' اس طرح کی باتیں سن کر۔''

باصر نے اُسے روک دیا۔

''کیا وہ ٹیچر ابھی تک اسی اسکول میں ہیں؟''

''معلوم نہیں۔'' مدحت نے ڈاکٹر شاہ محمد کی طرف دیکھا۔

جو سر جھکائے جانے کیا سوچ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اردگرد سے بالکل لاتعلق ہوں۔

''آپ کا بھائی اب کہاں ہے؟''

مدحت نے آہستگی سے پوچھا۔

''اب!'' ڈاکٹر شاہ محمد نے چونک کر اُسے دیکھا۔

''اب وہ اس دُنیا میں نہیں ہے۔ ابا جان کو اس کے غم نے بیمار کر ڈالا تھا۔ انہوں نے وقت سے پہلے
ہی ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور شاہ احمد کے پاس زیادہ وقت گزارتے تھے۔ اُس کی دوا خوراک ہر چیز کا خیال
رکھتے۔ کپڑے استری کر کے دھو کر اُسے پہناتے۔ جب تک ابا جان زندہ رہے۔ شاہ احمد کی حالت اتنی خراب
نہیں ہوئی تھی۔ بظاہر دیکھنے میں وہ بالکل ٹھیک لگتا تھا۔ بات چیت بھی کر لیتا تھا۔ کبھی کبھار حالت اچانک خراب
ہو جاتی تھی۔ لیکن اکثر نارمل ہی رہتا تھا' لیکن ابا جان اندر سے کھوکھلے ہو گئے تھے۔

جس روز مجھے اسپتال میں جاب ملی' پہلی بار ہارٹ اٹیک انہیں اُسی رات ہوا' جب وہ اسپتال سے
گھر آئے تو انہیں یہ ہی فکر تھی کہ وہ اپنی زندگی میں میری شادی کر دیں۔

''میں بھی کچھ خوشی دیکھ لوں شاہ محمد۔ میں نہ رہا تو تمہاری عدم موجودگی میں احمد کا خیال کون رکھے گا۔
تم جاب پر چلے جایا کرو گے تو یہ گھر اکیلا ہو گا۔''

''نہیں ابا جان آپ بہت۔ بہت سارے سال زندہ رہیں گے' میرے لئے' احمد کے لئے' ہمیں
آپ کی بہت ضرورت ہے۔''

میں اُن سے زیادہ خود کو تسلی دیتا لیکن ابا جان مُسکرا دیتے پھر بہت جلدی انہوں نے میری منگنی اپنے
ایک جاننے والوں کے ہاں کر دی' لیکن میری شادی کی خوشی دیکھنا اُن کے نصیب میں نہ تھا۔ میری منگنی کے چند
ہفتوں بعد ہی ایک رات اُن کو شدید اٹیک ہوا اور اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے دم دے دیا۔''

ڈاکٹر شاہ محمد نے ایک گہری سانس لی اور کچھ دیر کو چپ ہو گئے۔ باصر اور مدحت خاموشی سے اُن کی
باتیں سُن رہے تھے۔

''کیا خیال ہے اب واپس نہ چلا جائے۔''

ڈاکٹر شاہ محمد نے لمحہ بھر بعد پوچھا۔

''نہیں' چھ دیر بیٹھتے ہیں اچھا لگ رہا ہے' ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں بیٹھنا۔'' باصر نے کہا۔

اگرچہ دن کے دس گیارہ بجے کا وقت تھا' لیکن بادل آئے ہوئے تھے اور موسم بہت اچھا ہو رہا تھا
"پھر شاہ انکل؟" مدحت نے پوچھا۔
"چھوڑو مدحت بی بی! کیا کرو گی کچھ جان کر"۔
"کچھ نہیں انکل! لیکن آپ کے دل کا بوجھ تو ہلکا ہوگا ناں۔"
"دل کا بوجھ۔"
ڈاکٹر شاہ محمد کے لہجے میں افسردگی تھی۔
"مدت ہوگئی کبھی کچھ سوچا ہی نہیں۔ بس جو گذر گیا۔ سو گزر گیا۔"
"پھر بھی ڈاکٹر انکل! آپ نے بات شروع کی ہے تو آج مکمل کر ہی دیں۔"
باصر نے اصرار کیا۔
"اچھا!" ڈاکٹر شاہ محمد کچھ دیر تک سوچتے رہے۔
"کیا کہوں میاں!

ہم اپنی کہانی کس سے کہیں
خود ہم کو جھوٹی لگتی ہے

ابا جان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد سادگی سے میرا نکاح رباب سے ہوگیا۔ رباب ایک ڈاکٹر تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ وہ بہت خوبصورت تھی تو شاید یہ کچھ غلط نہ ہوگا' لیکن میری بدقسمتی ایسی نہ تھی' جیسا ابا جان نے سوچا تھا۔ وہ شاہ احمد کو پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اُس سے وہ خوف کا اظہار کرتی اور شروع دنوں میں مجھے اس کی نفرت کا احساس نہیں ہوا تھا میں سمجھتا تھا کہ وہ صرف خوفزدہ ہوتی ہے۔ میں اُسے سمجھایا کرتا تھا کہ شاہ احمد عام حالت میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ زیادہ تر وہ ٹی۔ وی لگا کر بیٹھا تھا۔ ہاں' کبھی کبھار اُسے دورہ پڑتا تھا' تب اُسے کمرے میں بند کر دیا جاتا۔ تب وہ کچھ توڑ پھوڑ بھی کرتا تھا' پتا نہیں کیوں اس کے دل سے خوف جاتا نہیں تھا۔

پھر ایک دن مجھے احساس ہوا کہ وہ شاہ احمد سے نفرت کرتی ہے۔ وہ صرف خوف نہیں ہے۔ کوشش کرتا تھا کہ احمد کے سارے کام خود کروں۔ اگر کسی دن مجھے دیر ہو جاتی تو احمد بھوکا بیٹھا رہتا۔ بھوک اُ برداشت نہیں ہوتی تھی۔ تب وہ ہنگامہ کرتا۔ شور مچاتا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں احمد کو کسی پاگل خانے میں کسی ادار میں دے دوں' اور میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے ابا جان سے وعدہ کیا تھا کہ میں مرتے دم تک احمد کا خ رکھوں گا اور وہ مجھے جان سے زیادہ عزیز ہوگا۔

پھر بھی دن رات کے جھگڑوں سے تنگ آ کر اور احمد کی حالت کے پیش نظر میں نے اُ فاؤنٹن ہاؤس میں ایڈمٹ کروا دیا کہ وہاں وہ گھر سے بہتر رہے گا' لیکن وہ نہ جانے کیسے وہاں سے بھاگ آ تین دن بعد وہ مجھے اسٹیشن سے ملا تو پھر اُس کے بعد دوبارہ میری ہمت نہ ہوئی کہ اُسے کہیں چھوڑوں۔ میں اُ کھونا نہیں چاہتا تھا اور اس بات پر رباب سے اکثر جھگڑا رہتا۔ میں سوچتا تھا کہ رباب کی اپنی اولاد ہو جائے گ شاید مامتا اُس کے دل کو نرم کر دے' لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد سے تو وہ اور بھی غصے : رہنے لگی تھی' اس لئے کہ ہمارا بیٹا ذہنی طور پر نارمل نہیں تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ احمد کی نحوست ہے۔

یہ ہمارے لئے خدا کی طرف سے ایک آزمائش تھی' لیکن رباب عجیب عورت تھی۔ وہ اپنے بچے سے نفرت کرتی تھی۔ میں نے اُس کے لئے ایک نرس رکھ لی تھی۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ بھی بچے کو توجہ د۔

پھر جب سے ڈاکٹروں نے یہ بتایا تھا کہ بچہ نارمل نہیں ہے' تب سے اُس نے اُسے فیڈ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ...ل عورتوں کی طرح وہ ہر وقت احمد سے لڑتی جھگڑتی رہتی اُسے گالیاں دیتی' برا بھلا کہتی۔ موقع ملتا تو پٹائی بھی کر ...تی۔ میں گھر آتا تو احمد مجھے بتاتا کہ آج بھابی نے اُسے مارا تھا۔ میں باز پُرس کرتا تو ڈھٹائی سے کہتی۔
"ماروں گی' گالیاں دوں گی۔ اسی کا سایہ پڑا ہے میرے بیٹے پر۔"
ڈاکٹر شاہ محمد آہستہ آہستہ اپنی زندگی کی کہانی سُنا رہے تھے۔ باصر اور مدحت خاموش بیٹھے سُن رہے تھے۔
مدحت کو حیرت ہو رہی تھی کہ کیسی ماں تھی' وہ جس کو اپنے بیٹے سے ذرا سی بھی محبت نہیں تھی۔
"میرا بیٹا چھ سال کا ہو گیا تھا۔
میں اُسے یورپ بھی لے کر گیا۔ لیکن بے فائدہ۔ وہ چھ سال کا ہونے کے باوجود ابھی تک چل نہیں سکتا تھا' بول نہیں سکتا تھا اور نہ ہی ذہنی طور پر وہ صحیح تھا۔
چار سال کی عمر میں اُس نے بیٹھنا شروع کیا تھا۔
حالانکہ میں ذاتی طور پر اُس کی دیکھ بھال کرتا تھا اور مسلسل ڈاکٹروں سے رابطہ رکھتا تھا۔ جب وہ چھ سال کا ہوا۔ تو رباب ایک بار پھر ماں بن گئی لیکن بدقسمتی سے میری بیٹی بھی نارمل نہ تھی۔ اُس کے دل میں پیدائشی طور پر سوراخ تھے۔ وہ صرف چند ہفتے زندہ رہی' لیکن اُس کی پیدائش کے بعد سے تو رباب نفسیاتی مریض بن گئی تھی۔ اب وہ مجھے الزام دینے لگی تھی۔
"تمہارا خاندان ہی پاگلوں کا ہے۔ تمہارے ہاں کبھی نارمل بچے پیدا نہیں ہو سکتے۔"
"احمد پیدائشی پاگل نہیں ہے اور ہماری فیملی میں اس سے پہلے کبھی ایسا بچہ پیدا نہیں ہوا۔ یہ خدا کی قدرت ہے۔"
میں نے اُسے بہت سمجھاتا' لیکن اُس پر اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ اب تو وہ غصے میں بلال کو بھی پیٹ ڈالتی تھی۔

وہ معصوم نہ بول سکتا تھا۔
نہ کچھ کہہ سکتا تھا' روتا رہتا۔
"تم کیا چاہتی ہو"؟ ایک روز میں نے تنگ آ کر پوچھا۔ تو اُس نے جواب دیا۔
"علیحدگی۔"
"ٹھیک ہے اچھی طرح سوچ لو۔"
میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اس روز روز کے جھگڑے سے بہتر ہے کہ میں اُسے طلاق دے دوں' لیکن ابھی میں نے اُسے طلاق نہیں دی تھی کہ وہ حادثہ ہوگیا۔"
"کیسا حادثہ انکل؟"
مدحت نے جو بہت انہماک سے اُن کی بات سُن رہی تھی چونک کر پوچھا۔
"حادثہ ہی تھا وہ" ڈاکٹر شاہ محمد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"میری رات کی ڈیوٹی تھی۔ میں شام کو ہی احمد کو کھانا وغیرہ دے کر گھر سے نکل گیا تھا۔ صبح جب میں واپس آیا تو نہا دھو کر احمد کے کمرے میں گیا یہ میرا معمول تھا لیکن احمد کمرے میں نہیں تھا۔
"احمد کہاں ہے؟"
میں نے رباب سے پوچھا' جو سو رہی تھی۔

’’مجھے نہیں معلوم۔‘‘

اُس نے کروٹ بدل لی تو میں باہر نکل آیا۔ بلال کی گورنس بھی چھٹی پر تھی اور گھر میں جز وقتی ملازمہ تھی جو صبح آتی اور شام کو چلی جاتی تھی۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو بلال کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے سوچا۔ شاید احمد بلال کے کمرے میں چلا گیا ہو۔ وہ اکثر بلال کے پاس بیٹھا رہتا تھا‘ اُس سے کھیلتا رہتا تھا۔

اُس کے کپڑے بدل دیتا۔

اُس کا منہ صاف کر دیتا۔

اُسے کھانا کھلا دیتا تھا۔

میں بلال کے کمرے میں گیا تو میری نظر احمد پر پڑی وہ اوندھے منہ زمین پر گرا تھا۔ اُس کا سر پھٹا ہوا تھا اور خون بہہ بہہ کر جم گیا تھا۔

’’احمد۔۔احمد!‘‘

میں نے دوڑ کر اُسے سیدھا کیا۔ بلال اوں اوں کر کے اُس کی طرف اشارا کر رہا تھا اور رو رہا تھا۔

’’احمد‘‘۔ احمد کو بے چینی سے ہلاتے ہوئے میں نے اُس کے مُنہ پر پانی کے چھینٹے مارے‘ لیکن زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اُسے نقاہت ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے دونوں بازوؤں میں اُٹھا لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پہلے کی نسبت بہت کمزور ہو گیا ہے۔ اُسے کار کی پچھلی سیٹ پر ڈالا اور دیوانوں کی طرح ڈرائیو کرتا ہوا اسپتال پہنچا۔ پتا نہیں وہ کیسے گرا تھا۔ گرتے ہوئے اُس کے سر میں دروازے کا کُنڈا لگا تھا۔ شاید وہ سار رات بے ہوش رہا تھا۔ نہ جانے اُس کا کتنا خون بہہ گیا تھا۔ اسپتال میں اُسے فوری طبی امداد دی گئی۔

سر میں بہت بڑا زخم تھا۔ کئی ٹانکے لگے۔ فوری طور پر خون۔ دیا گیا‘ لیکن زندگی ختم ہو گئی تھی۔ ایک بار صرف اُس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا‘ مسکرایا۔

’’بھائی!‘‘

’’کیا ہوا تھا تمہیں احمد کیسے گر گئے تھے۔؟‘‘

میں نے بے اختیار اُس سے پوچھا۔

’’بالی کو چُپ کرانے گیا تھا۔ وہ رو رہا تھا اُسے بھوک لگی تھی‘ لیکن بھابی نے مارا اور پھر دھکا دیا۔ میں گرا۔۔!‘‘

اُس نے ہاتھ اُٹھا کر سر کو ٹٹولا‘ پھر اُس کا ہاتھ خود بخود گر گیا اور کچھ دیر بعد سانس کی ڈور ٹوٹ گئی‘ وہ مر گیا۔ میرا بھائی‘ میرا معصوم بھائی۔ مجھے یوں لگتا تھا‘ جیسے میں مجرم ہوں ابا جان کا‘ احمد کا۔

میں اُن سے کیا گیا وعدہ پورا نہیں کر سکا۔ احمد کا دھیان نہیں رکھ سکا۔ میں نیم پاگل سا ہو رہا تھا اُن دنوں۔ رباب میرے سامنے آتی تو میرا خون کھولنے لگتا۔ میرا دل چاہتا‘ اُس کا گلا دبا ڈالوں۔ تب اُس کی خواہش پر میں نے اُسے طلاق دے دی۔

اب میں تھا اور بلال۔

اب بلال میرے پاس ہی رہتا۔ رات کو بھی میں اُسے اپنے کمرے میں سُلاتا تھا۔ لیکن میری ذہنی حالت روز بروز عجیب ہوتی جا رہی تھی۔ دوستوں نے مجھے دوسری شادی کا مشورہ دیا بلکہ ہماری کولیگ ڈاکٹر تھیں۔ بیوہ تھیں۔ اُن کے لئے اکثر نے مجھے کہا‘ وہ خود بھی خواہش مند تھیں۔ میں نے ایک بار سوچا بھی‘ لیکن میرے چاروں طرف جیسے رباب کے وحشیانہ قہقہے گونجنے لگتے۔

’’تمہارا خاندان پاگلوں کا خاندان ہے۔ تم صرف پاگل اور ابنارمل بچوں کے باپ بن سکتے ہو۔‘‘

اور پھر مجھے یوں لگتا جیسے میں ابنارمل بچوں میں گھر گیا ہوں۔

’’نہیں‘‘۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میں دُنیا میں ابنارمل بچوں کا اضافہ نہیں کروں گا۔ انہیں دنوں کویت کے لئے ڈاکٹرز کی جاب نکلیں تو میں نے بھی اپلائی کر دیا۔ میرے دوستوں کا خیال تھا کہ میں اگر زیادہ دیر تک اسی گھر کے ماحول میں رہا تو خود بھی پاگل ہو جاؤں گا۔

میں نے بھی سوچا کہ ماحول کی تبدیلی میرے لئے بہتر ہو گی۔ مسئلہ بلال کا تھا۔ جس کا حل یہ نکالا گیا بلال کی گورنس اُسے رکھ لے گی اور اس کی تنخواہ کے علاوہ بلال کے خرچ کے لئے اُسے رقم ملتی رہے گی۔ یہ طے پایا کہ اس دوران اگر میرا انتقال ہو گیا تو میرے گھر اور ہر چیز کا مالک بلال ہو گا اور اُس کی گورنس کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اس جائیداد اور ان اشیاء کی فروخت کر کے بلال کی ضروریات پر صرف کرے۔

وہ عورت جس کا نام گلزار بیگم تھا۔ رباب کی دور پار کی رشتے دار تھی ہم اُسے معقول تنخواہ دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ میری اور رباب کی شکر گزار رہتی تھی کہ ہم اُس کے بچوں کے لئے روٹی کا وسیلہ بنے ہیں اور چھ سال تو کوئی جانور کا بچہ بھی پاس رہے تو اس سے محبت ہو جاتی ہے اور پھر بلال تو انسان کا بچہ تھا‘ بے ضرر اور معصوم۔

گلزار نے مجھے یقین دلایا کہ وہ بلال کا ہر طرح سے خیال رکھے گی۔ اپنے بچوں سے بھی زیادہ۔

میں اُس کی طرف سے مطمئن ہو کر کویت چلا گیا۔

میرا کنٹریکٹ دو سال کا تھا۔ میں چاہتا تو دو سال کے لئے دوبارہ کنٹریکٹ کر سکتا تھا‘ لیکن ان دو سالوں میں‘ میں نے بہت حد تک خود کو سنبھال لیا تھا اور اس سب کو خدا کی طرف سے اپنے لئے آزمائش سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ ماحول کی تبدیلی نے بہر حال مجھ پر اچھا اثر ڈالا تھا اور مجھے سنبھلنے میں بہت مدد دی تھی۔ جب میری مدت ملازمت ختم ہوئی تو مجھے بلال کی یاد بہت شدت سے آئی۔

اپنا وطن‘ اپنے دوست یاد آئے۔

ابا جان اور احمد کی قبروں کی کشش نے مجھے کھینچا اور میں وطن واپس لوٹ آیا۔ ایئر پورٹ سے سیدھا میں کرشن نگر آیا۔ جہاں گلزار بیگم رہتی تھی۔ وہ سب مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان دو سالوں کے دوران اُن کے گھر کی حالت کافی بہتر ہو گئی تھی۔ برآمدے میں کین کی کرسیاں پڑی تھیں‘ جن پر گلزار‘ اُس کا خاوند دونوں بیٹے بیٹھے تھے۔ سامنے کین کی ہی شیشے والی ٹیبل تھی‘ جس پر چائے اور کچھ لوازمات یعنی دہی بھلے وغیرہ رکھے تھے۔ شاید اُس کا خاوند اب کام کرنے لگا ہے۔ میں نے سوچا اور گلزار سے پوچھا۔

’’بلال کہاں ہے؟‘‘

’’بلال اندر ہے کمرے میں‘‘

گلزار نے جو کھڑی ہو گئی تھی‘ میں نے گھبرا کر کہا۔

’’آپ بیٹھیں بھائی صاحب! میں بلال کو لاتی ہوں۔‘‘

’’آپ نے اطلاع بھی نہ دی ہم آپ کو لینے آتے۔‘‘

گلزار کے خاوند نے جسے شاید میں نے دوسری بار دیکھا تھا۔ کہا۔

’’ہاں بس یونہی اطلاع نہیں دی۔‘‘

میں بھی گلزار بیگم کے پیچھے لپکا۔ یہاں آ کر اب بلال سے زیادہ دیر دور نہیں رہا جا سکتا تھا۔ میں نے

سوچا۔۔خود ہی بلال کے کمرے میں پہنچ جاتا ہوں' لیکن باصر! مدحت جو کچھ میں نے وہاں دیکھا اُس
میرے اندر آگ لگا دی۔

وہ چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس میں ایک جھلنگا سی چارپائی کے اُوپر میلی سی چادر پر بلال لیٹا ہوا تھا
غلاظت میں لتھڑا ہوا اور اُس کی کوٹھڑی سے بدبو آ رہی تھی۔

''بلال !'' میں تڑپ کر اُس کی طرف بڑھا۔

''یہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کپڑے گندے کر دیتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو میں نے اس کے کپڑے
بدل کر گئی تھی۔''

گلزار جلدی جلدی بول رہی تھی۔

''آپ باہر چلیں' میں اس کے کپڑے بدل کراتی ہوں۔''

میں اُس کی بات سنے بغیر اُس کی چارپائی کی طرف بڑھا اور زمین پر بیٹھ گیا اور اُسے آواز دی۔

''بلال! بالی بیٹا ! دیکھو پاپا آئے ہیں۔''

اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ لمحہ بھر مجھے دیکھا۔ پھر مُسکرایا۔ اُس کی آنکھوں میں پہچان تھی۔

''باصر! یقین کرو' اُس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ نارمل نہیں تھا۔ لیکن اُس نے مجھے پہچان لیا۔ اُس
نے خوشی کے اظہار کے طور پر مُنہ سے آوازیں نکالیں اور اُٹھنے کی کوشش کی میں نے اُسے سہارا دے کر بٹھایا
مجھے احساس ہوا کہ اُسے تو بخار ہے۔

''اُسے کب سے بخار ہے۔؟''

میں نے مُڑ کر گلزار کی طرف دیکھا جو ابھی دروازے پر کھڑی تھی۔ کچھ پریشان سی۔

''بس دو تین روز سے دوا دے رہی ہوں۔ ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔''

''کہاں ہے دوا؟''

میں نے پوچھا تو وہ بوکھلا گئی میں نے بلال کی طرف دیکھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر چوم رہا تھا۔ میرے
اندر جیسے طوفان آیا ہوا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں بلال کو اپنے اندر سمولوں میں اُسے چومنے لگا۔ بے
تحاشا میں نے اُس کی غلاظت کی پروا کیے بغیر اُسے اپنے' بازوؤں میں سمیٹ لیا' بھینچ لیا اور میرے آنسو اُس
کے بالوں میں گرنے لگے۔

''پا۔۔!''

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھا' دبایا' اور پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بے آواز
رو رہا تھا۔''

ڈاکٹر شاہ محمد کی آواز بھرا گئی تو وہ لمحہ بھر کو چُپ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے سر اُٹھا کر مدحت اور
باصر کی طرف دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

''لمبی داستان ہے تفصیل کیا بتاؤں' میں اُسے وہاں سے لے آیا۔ اُسے نمونیا تھا۔ میں نے اُسے
اسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا۔ بہترین ڈاکٹروں کا علاج کیا' لیکن زندگی کے دن پورے ہو گئے تھے۔ میرے
آنے کے ٹھیک بیس دن۔ بعد وہ مر گیا۔ لوگ بڑے فریبی اور دھوکے باز ہوتے ہیں۔

گلزار بیگم اور اُس کے شوہر نے وہ سارا پیسہ جو میں بلال کے لئے بھیجتا تھا خود پر خرچ کیا۔ جاتے
ہوئے جو میں ڈھیروں کپڑے بلال کے لئے خرید کر دے گیا تھا۔ وہ سب اُس نے اپنے بچوں کو دے دیے

جو بلال کے ہم عمر ہی تھے۔ میں نے جب بلال کا کوئی دُھلا ہوا جوڑا مانگا تا کہ اُسے نہلا دُھلا کر ساتھ لے
جاؤں تو گلزار جو جوڑا لے کر آئی تو اُس کے بیٹے نے کہا۔

''یہ تو میرے کپڑے ہیں۔''

''اس کے اپنے کپڑے کہاں ہیں؟''

میں نے پوچھا۔

''اس کے پاس تو بس یہی دو جوڑے ہیں۔'' اُس کے بیٹے نے بتایا۔

گلزار اپنے بچوں کی اُترن میرے بیٹے کو پہناتی رہی۔

بلال کے بعد میں ذہنی طور پر اتنا اپ سیٹ ہوا کہ مسکن دواؤں کا سہارا لینے لگا۔ دُنیا سے میرا دل اُچاٹ
ہو گیا اور میں اسی بے زاری کے عالم میں گھر ایک ٹرسٹ کے نام کر کے گھر سے نکل پڑا۔ نہ جانے کب تک اور کہاں
کہاں بے خبری کے عالم میں پھرتا پھراتا یہاں آ گیا۔ اور میاں جی نے مجھے اپنی محبت کی آغوش میں لے لیا۔''

مدحت کی آنکھوں میں بھی آنسو چمک رہے تھے۔

باصر بھی ڈاکٹر شاہ محمد کی داستان حیات سُن کر افسردہ ہو گیا تھا۔

''دنیا میں لوگ اتنے دکھی ہوتے ہیں اور ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی۔''

مدحت نے سوچا۔

''یہ ڈاکٹر شاہ محمد بظاہر کتنے ہنس مکھ اور خوش مزاج ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا سینہ اتنا زخمی ہے۔''

''ارے بچو!'' ڈاکٹر شاہ محمد آنسو پونچھ کر مسکرائے۔

''میں نے تمہیں بھی افسردہ کر دیا''۔

''نہیں۔۔نہیں تو انکل۔''

باصر نے چونک کر کہا۔

''میں سوچ رہا ہوں' ہم اس وارڈ کا نام جو ذہنی معذور بچوں کے لئے ہو گا' احمد بلال وارڈ رکھیں
ٹھیک ہے ناں!''

''ہوں''۔ ڈاکٹر شاہ محمد نے سر ہلایا۔

''چلو اُٹھو' ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی ہے' بارش ہونے کا امکان ہے۔''

ڈاکٹر شاہ محمد کھڑے ہو گئے اور زمین پر پڑا ہوا نقشہ اُٹھا لیا۔

''میں اپنا خواب یہاں ہی بھولے جا رہا تھا''۔

انہوں نے قہقہہ لگایا۔

''آپ کا خواب انشاء اللہ بہت جلد تعبیر بن جائے گا۔'' باصر نے کہا۔

''چلو بچو! آج میرے ساتھ میرے غریب خانے پر تمہیں لسی کے ساتھ بیسنی روٹی کھلاتا ہوں۔''

''روٹی کون پکائے گا؟'' مدحت نے پوچھا۔

''بھئی ہماری روٹی تو نوراں بی بی کے ہی ذمے ہے' وہی پکاتی ہے' ہماری بھی اور ہمارے مہمانوں
کی بھی۔''

''اچھا چلیں' بہت عرصہ ہو گیا ہے مجھے تو پیاز والی بیسنی روٹی کھائے ہوئے۔'' باصر نے کہا۔

''ماں جی جب زندہ تھیں تو کبھی چھٹیوں میں' میں اور تبریز بھائی آئے ہوئے ہوتے تھے تو وہ بیسنی

روٹی ضرور پکاتی تھیں۔ گرم گرم روٹی پر تازہ مکھن رکھ کے لسی کے ساتھ روٹی کھانا بہت اچھا لگتا تھا۔"
"مکھن بھی ملے گا بھئی، فکر نہ کرو۔"
ڈاکٹر شاہ محمد نے پھر قہقہہ لگایا۔ شاید اس طرح وہ اپنی اُداسی دور کر رہے تھے۔ وہ تینوں باتیں
ہوئے درختوں کے جھنڈ سے نکلے ہی تھے، کہ نور پور کی طرف سے ایک جیپ دھول اُڑاتی ہوئی اُن کے قر
کر رُک گئی۔ اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے شیشہ کھول کر باہر دیکھا۔
"اے بات سُنو۔"
ڈاکٹر شاہ محمد نے اُس کی طرف دیکھا۔
"شاہ پور کے میاں جی کے ڈیرے پر جانا ہے"
"کہاں سے آئے ہیں جناب؟" ڈاکٹر شاہ محمد نے شائستگی سے پوچھا۔
"پشاور سے آئے ہیں! میاں جی سے ملنا ہے۔"
"تو چلیے میں آپ کو وہاں پہنچا دیتا ہوں۔"
باصر نے آگے بڑھ کر کہا اور پھر ڈاکٹر شاہ محمد کی طرف دیکھا۔
"آپ مدحت کے ساتھ گھر چلیں، میں مہمانوں کو پہنچا کر آتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے، ہم تمہارا انتظار کریں گے کھانے پر بھول نہ جانا۔"
"بالکل نہیں۔" باصر ہنسا
ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اُسے اشارا کیا تو وہ گھوم کر دوسری طرف سے اُس
والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اُس نے دیکھا پچھلی سیٹ پر ایک بڑی۔ سی مونچھوں والا شخص
دراز تھا اور اُس کے قریب ہی کلاشنکوف سیٹ پر پڑی تھی۔ باصر کو ایک نامعلوم سے خطرے کا احساس ہوا
جھٹک کر وہ ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆☆

ٹی۔ وی پر کوئی بہت پرانی فلم لگی تھی۔ کچھ جنگلیوں نے ایک مہذب انگریز مرد اور عورت کو گھیر
لے رکھا تھا اور وحشیانہ انداز میں ناچ رہے تھے اور ڈھول پیٹ رہے تھے۔ اُس انگریز مرد نے شاید کچھ کہ
جنگلی غصے میں آ گئے۔ انہوں نے ناچنا کودنا موقوف کر دیا اور انہیں گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے جانے لگے
عورت چیخ رہی تھی اور مرد بھی انہیں گالیاں دے رہا تھا
لیزا بظاہر ٹی۔ وی پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ لیکن اُس کا ذہن کہیں اور تھا۔ عورت کے چیخ
چونک کر ٹی وی کو دیکھنے لگی تھی۔ پاس پڑا ریموٹ کنٹرول اُٹھا کر اُس نے آواز قدرے اُونچی کی عورت چیخ
اپنے ساتھی سے کہہ رہی تھی۔ کہ ہیروں کے لالچ نے انہیں مروا دیا ہے۔"
وہ بھی تو اس عورت کی طرح بے بس تھی اور ان جنگلیوں میں پھنس گئی تھی، جو بظاہر بڑے مہذ
تہذیب یافتہ تھے لیکن اندر سے ان جنگلیوں سے بھی زیادہ وحشی تھی، لیکن وہ کسی لالچ میں گھر سے نہیں نکلی تھ
کی طلب تو اور تھی، لیکن شاید اُس کی قسمت میں حق کو پانا لکھا ہی نہیں تھا اور وہ انکل رابرٹ نے بھی تو کہا تھا۔
اس راہ میں بہت کانٹے ہیں۔
بہت کٹھن سفر ہے رہنے تھک جاؤ گی۔
تب اُس نے کتنے مان سے کہا تھا۔

"نہیں، وہ حق کی تلاش میں چلتے ہوئے کبھی نہیں تھکے گی۔
چاہے اُس کے پاؤں لہولہان ہی کیوں نہ ہو جائیں۔
چاہے اُس کے راستے کتنے ہی دشوار کیوں نہ ہوں۔"
لیکن وہ تو تھک گئی تھی، ہمت ہار بیٹھی تھی۔
پچھلی کئی راتوں سے وہ دیپو کو بھابھو کو یاد کر رہی تھی۔ کتنی بار اُس نے چپکے چپکے دل ہی دل میں دیپو کو
ا تھا اور دُعا مانگی تھی کہ کہیں سے دیپو ہی آ جائے۔ اُس کھوجتا ہوا اور وہ اُس کے پاؤں پر گر کر اپنی غلطی کی معافی
ے لے اور چپ چاپ اُس کے ساتھ چل دے۔ وہیں اُسی گھر میں جسے اُس نے خود ہی چھوڑ دیا تھا۔
اُس نے سجدے میں گر کر۔
دونوں آنکھیں موند کر پرارتھنا کے انداز میں بیٹھ کر ہر طرح سے دُعا مانگی تھی۔
جان کے یسوع مسیح سے
کیفی کے خدا سے
اور خود اپنے بھگوان سے، سب کو ہی پکارا تھا، لیکن شاید اُس کی دُعاؤں میں اثر ہی نہیں تھا۔ شاید
سے دُعا مانگنے کا قرینہ ہی نہیں آتا تھا۔
پروفیسر احسان بھی تو ایک روز اپنے ایک شاگرد سے کہہ رہے تھے۔
"ہر بندے کی دُعا قبول نہیں ہوتی بھئی، دُعا مانگنے کا بھی تو ایک قرینہ ہوتا ہے، ایک سلیقہ ہوتا ہے۔"
کاش وہ اُن سے ہی پوچھ لیتی کہ وہ جو سب سے ماورا ہے۔
جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے۔
وہ اپنے بندوں کی دعائیں کس طرح سُنتا ہے۔
اُس کے تو ہونٹ دُعائیں مانگتے مانگتے تھک گئے تھے۔ روتے روتے آنکھیں خشک ہو گئی تھیں۔
ن کوئی درد نہیں ہوا تھا۔
اُسے پاکستان سے آئے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ اور ان پندرہ دنوں میں۔
پے در پے واقعات نے جیسے اُس سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی تھی۔
جہاز میں اُسے جان کی موت کا پتا چلا تھا۔
جان کے ساتھ اُس کا کوئی جذباتی تعلق نہ تھا۔ بس اُس نے تو اُسے وسیلہ بنایا تھا۔
جان نے اُس کے ساتھ کوئی بہت اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اُس کا دل گداز ہو رہا تھا۔ عجیب سی
یت ہو رہی تھی۔ دل چاہتا تھا، دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اُسے پاپا کا خیال آ رہا تھا۔ جان جن کا اکلوتا بیٹا تھا۔
اُسے ریٹا اور آن کا خیال آ رہا تھا، جنہیں جان بہت عزیز تھا۔ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود اور ممی کا۔
ممی تو بہت روتی ہوں گی۔
وہ کتنی خوش تھیں اور کیسے خواب دیکھ رہی تھیں۔
"جان کا بے بی لوگ آئے گا تو ہمارا دل بہل جائے گا۔ دیکھنا جان! تمہارا بے بی لوگ کا پرورش ہم
ے گا، ہم پالے گا، انہیں۔ تم دونوں تو جاب کرنا، گھومنا عیش کرنا۔"
اور جان ہنس رہا تھا۔
"ٹھیک ہے ممی! ٹھیک ہے۔ ہمارا بے بی لوگ کا پرورش تم ہی کرنا اور انہیں میرے جیسا خبیث بنانے

کے بجائے پاپا جیسا نیک بنانا۔"

اور اب جان اس دُنیا میں نہیں رہا تھا اور اس کا بے بی لوگ دُنیا میں آیا ہی نہیں تھا۔ اور وہ جو جا[illegible] میں قانونی بیوی تھی۔ جان کی موت سے بے خبر جہاز میں سفر کر رہی تھی۔ ایک اجنبی ملک کی طرف جہاں ا[illegible] جاننے والا کوئی نہیں تھا اور ممی نے ریتا نے اور آن نے مجھے ڈھونڈا تو ہوگا۔

پتا نہیں وہ کیا سوچتی ہوں گی کہ میں کہاں گئی ہو۔ میں حیرت تو ہوئی ہوگی کہ میں جان کے ساتھ کیو[illegible] نہیں تھی۔

پھر شاید انہوں نے جان کے فلیٹ کا پتا کیا ہو۔ کیا خبر ڈھونڈ بھی لیا ہو اور مجھے نہ پا کر انہیں حیر[illegible] ہوئی ہو۔

سارا راستہ وہ پریشان رہی تھی۔ بار بار اُس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ دل ڈوبنے لگتا تھا۔ اُس [illegible] ہمسفر نے کئی بار اُس کی خیریت دریافت کی اور پھر اس کے ٹال دینے پر سر جھٹک کر بڑبڑائی۔

"یہ مشرقی لوگ بہت جذباتی ہوتے ہیں۔"

وہ اجنبی لوگوں کے درمیان تھی اور ایک اجنبی ملک میں جا رہی تھی۔ اُس کے اندر خوف' واہم[illegible] وسوسے تھے۔ داؤد خان نے اُسے جان کی موت کی اطلاع کیوں نہیں دی۔

اُس نے اُسے جہاز پر سوار کیوں کروا دیا۔ جان نہیں رہا تھا تو اُسے یہاں آ کر کیا کرنا تھا؟ کس لئے؟ یہ تو جان کی ضد تھی۔

کہیں کچھ غلط تھا۔

داؤد خان سے تو ویسے بھی اُسے خوف آتا تھا۔

عجیب پُر اسرار سا آدمی تھا۔

پتا نہیں وہ اُس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے تن تنہا کیوں اُسے یہاں بھجوا دیا تھا۔ سو[illegible] سوچ کر اُس کا دماغ تھک گیا تھا۔

سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

پتا نہیں جان کی آنٹی اُسے لینے بھی آئے گی یا نہیں اور اگر کوئی اُسے لینے نہ آیا تو۔

خوف' پریشانی اور دہشت سے اُس نے سارا راستہ کچھ کھایا پیا نہیں۔ حتیٰ کہ چائے یا کافی کا گھون[illegible] تک بھی نہیں لیا اور یہ خوف اُس وقت اور مزید بڑھ گیا۔ جب جہاز کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے اُس کی نظر دا[illegible] خان پر پڑی۔ وہ بھی اُسی جہاز پر سفر کر رہا تھا اور اُسے خبر تک نہ تھی۔

امیگریشن سے فارغ ہو کر وہ باہر نکلی تو ایک آن کی عمر کی خاتون سرخ اسکرٹ پہنے اُس کے قری[illegible] چلی آئی۔

"مسز لیزا جان!"

"یس!" رتن نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

"مجھے میڈم مارتھا نے بھیجا ہے' وہ خود نہیں آ سکیں۔"

"اوہ تھینک گاڈ!" اُس نے سکون کا سانس لیا۔

اُسے یوں لگا جیسے اُس کے تنے ہوئے اعصاب یک لخت ڈھیلے ہو گئے ہوں۔ وقتی طور پر ہی سہی اس وقت اکیلی نہیں تھی۔ اُس نے خاتون کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا' لیکن داؤد خان اُ[illegible]

[illegible]ہیں نظر نہ آیا۔

میڈم مارتھا اُسے بہت سلجھی ہوئی اور نرم خو لگیں۔ بہت خلوص اور محبت سے ملیں۔

جان کے نہ آ سکنے پر افسوس کا اظہار کیا۔

"گھبراؤ نہیں' وہ بہت جلد آئے گا' تم اتنے میں انجوائے کرو' گھومو پھرو' نینسی تمہیں گائیڈ کرے [illegible]گی۔" اُس نے اُس لڑکی کی طرف اشارہ کیا' جو اُسے ایئرپورٹ پر ریسیو کرنے گئی تھی۔

وہ مارتھا کو بتانا چاہتی تھی کہ اب جان کبھی نہیں آئے گا اور یہ کہ ایک حادثے میں اُس کا انتقال ہو چکا ہے' لیکن مارتھا ہائے کہہ کر کھڑی ہو گئی۔

"مجھے ایک بہت ضروری کام سے نیویارک سے باہر جانا ہے۔ اُمید ہے تم محسوس نہیں کرو گی۔ دو روز تک میں آ جاؤں گی۔ اس دوران نینسی تمہارا خیال رکھے گی۔"

اور نینسی نے واقعی اُس کا بے حد خیال رکھا۔

"کیا تم واقعی جان کی بیوی ہو؟"

ایک روز ناشتا کرتے ہوئے نینسی نے پوچھا۔

"ہاں' میں جان کی بیوی تھی' لیکن اب وہ اس دُنیا میں نہیں ہے۔"

"وہاٹ"؟

نینسی کو حیرت ہوئی۔

میڈم نے تو ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ وہ جان کو بہت عزیز رکھتی تھیں۔"

نینسی نے بتایا۔

"جان بہت بہادر لڑکا تھا۔ خوش مزاج بھی بہت تھا۔" نینسی نے اُس کی تعریف کی۔

"لیکن وہ شادی کرنے' بندھن باندھنے کا قائل نہیں تھا۔ معلوم نہیں اُس نے تم سے کیسے شادی کر لی۔ دراصل تم بہت پیاری ہو۔"

کچھ دیر بعد نینسی نے کہا۔

"بہات پیاری اور معصوم۔"

تب ہی ڈرائنگ روم کے دروازے پر داؤد خان نظر آیا۔

"یہ بات تو ہم بھی جانتے ہیں کہ لیزا بہت پیاری ہے۔"

"داؤد خان!" رتن یکدم کھڑی ہو گئی۔

"تم جھوٹے' مکار۔ تم نے میرے ساتھ جھوٹ کیوں بولا؟"

"کیا جھوٹ بولا ہے۔ میں نے؟"

"تم نے کہا تھا جان ایک دو روز میں آ جائے گا۔"

"اوہ تو بھئی' نہیں آیا تو آ جائے گا۔ کچھ کام پڑ گیا ہوگا۔"

"وہ نہیں آئے گا۔ وہ کبھی نہیں آئے گا۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ وہ مر چکا ہے۔"

"ہا۔" داؤد خان نے جان کے اندر میں آواز نکالی۔ اُس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے حیرت سی اُتر آئی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"جیسے بھی پتا چلا لیکن تم نے مجھے یہاں کیوں بھجوایا ہے کس لئے۔ کیا مقصد ہے تمہارا یہاں کون میرا؟"

"ہم ہیں ڈارلنگ تمہارے ہی تو ہیں"۔

وہ خباثت سے مسکرایا۔ اور نینسی کی طرف دیکھا۔ وہ برتن سمیٹ کر باہر نکل گئی۔

مجھے واپس بھجوا دو۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔"

"واپس بھی چلی جانا۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ اب آنا جانا تو لگا ہی رہے گا۔ کچھ دن انجوائے کرو۔ لوگ تو یہاں آنے کے لئے ترستے ہیں۔"

"لیکن مجھے واپس جانا ہے۔"

"کہاں؟ ہندوستان یا پاکستان؟"

وہ گہری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"پاکستان!"

اُس نے بغیر سوچے کہا۔

'دوہاں کون ہے تمہارا؟"

"ریتا ہے' آن ہے' ممی ہیں۔"

"کیا لگتی ہیں وہ تمہاری۔ جس کی وجہ سے رشتہ تھا۔ وہ ہی نہیں رہا تو۔ اور ہندوستان میں کون قبول کرے گا تمہیں۔ گھر سے بھاگ کر آئی ہو۔"

"مجھے پاکستان جانا ہے۔"

اُس نے ضد کی۔

"مجھے یہاں نہیں رہنا۔ معلوم نہیں تمہارا مقصد کیا ہے۔"

"مقصد بھی معلوم ہو جائے گا۔"

داؤد خان اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کچھ دن سیر و تفریح کر لو۔"

داؤد خان چلا گیا تو وہ پریشان سی سوچتی رہ گئی کہ داؤد خان کا مقصد کیا ہے۔

میڈم مارتھا کون ہیں۔؟

جان کی آنٹی یا داؤد خان کی کوئی کارندہ' کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ سوچ سوچ کر وہ تھک گئی تھی۔ نینسی اُس کے اس طرح کے کسی سوال کا جواب نہیں دیتی تھی۔ اُس روز کے بعد سے پھر داؤد خان نہیں آیا تھا اس اپارٹمنٹ میں وہ نینسی کے ساتھ اکیلی تھی۔

ایک صبح میڈم مارتھا آ گئیں۔ اور اُسے اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا۔ میڈم مارتھا کے ساتھ دو افراد بھی تھے۔

"یہ روڈی اور اسمتھ ہیں جان کے دوست۔"

مارتھا نے تعارف کروایا۔

"اور یہ مسز جان۔"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔

"البتہ جان کی موت کا دُکھ ہے۔ وہ اچھا لڑکا تھا۔"

"اور ہاں!" مارتھا نے بھی چونکتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہاں سے جا کر جان کی موت کا علم ہو لیزا مجھے بہت افسوس ہے۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

"جان کو ہم نے لکڑی کے کچھ ڈیکوریشن پیسز کہے تھے۔ کیا تم وہ لائی ہو۔ جان نے فون پر بتایا تو تھا اُس نے لکڑی کا سامان خرید لیا ہے اور تمہارے ساتھ بھیج رہا ہے۔"

"ہاں!" وہ اُٹھ کر اپنا بیگ لے آئی اور تمام ڈیکوریشن پیسز نکال کر ٹیبل پر رکھ دیے۔ یہ تعداد میں ریباً دس پندرہ تھے چھوٹے بڑے ملے جلے۔ اسمتھ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے اُن میں سے چھوٹا سا ہرن اُٹھا لیا اور اُس کے سنگ ہلانے لگا۔ کبھی دائیں۔ طرف موڑتا کبھی بائیں طرف۔ یکا یک ہرن سے ایک ڈبیا کی طرح کھل گیا۔

یہ ہرن دراصل سگریٹ کیس بنا ہوا تھا۔ لیکن اس میں سے سگریٹ کے بجائے پولتھین کی چھوٹی تھیلی جس میں سفید پوڈر تھا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہیروئن!" مارتھا مسکرائی۔

"اور یہ تم سمگل کر کے لائی ہو۔"

وہ آنکھیں پھاڑے ساکت بیٹھی تھی۔ اسمتھ نے ان کھلونوں میں سے دو تین کھلونے اور اُٹھا کر اسی طرح کھولا اور ان میں سے بھی ہیروئن کی تھیلیاں برآمد ہوئیں۔ باقی ڈیکوریشن پیسز کو اُس نے ہاتھ ے دھکیل کر ایک طرف کر دیا۔ اور اپنے ساتھ لائے ہوئے بریف کیس میں سے ڈالروں کی چند گڈیاں نکال کر س کی طرف بڑھائیں۔ لیکن وہ ہاتھ میں گود میں دھرے ساکت بیٹھی رہی۔

"لے لو یہ تمہارا حق ہے۔"

لیکن اُس نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تو مارتھا گرجی۔

"ہاتھ آگے بڑھاؤ اور رقم لے لو۔"

ایک مشینی انداز میں اُس کا ہاتھ آگے بڑھا اور گڈیاں پکڑتے ہوئے لرزنے لگا جس کے نتیجے میں ڈیاں نیچے گر گئیں۔ اسمتھ نے سوالیہ نظروں سے مارتھا کو دیکھا۔

"اوکے۔ ٹھیک ہے۔ اتنا ہی کافی ہے۔"

ڈالر سمیٹ کر انہوں نے دوبارہ بریف کیس میں رکھے اور ہیروئن کے تینوں پیکٹ بھی اُٹھا لئے۔

"اچھا میڈم اب ہم چلتے ہیں۔"

"اوکے۔"

میڈم مارتھا نے ہاتھ سے انہیں جانے کا اشارا کیا۔ لیزا ساکت بیٹھی تھی۔ یہ سب کیا تھا۔ یہ ہیروئن ے پیکٹ یہ لکڑی کے ڈیکوریشن پیسز میں سے تین کے اندر ہیروئن۔ بالکل عام اور سادا سا گھسا پٹا طریقہ ہیروئن نے اور لے جانے کے کتنے ہی طریقے نکل چکے تھے۔ وہ جب انڈیا میں تھی تو اکثر ڈرگ مافیا کے متعلق پڑھتی ی تھی۔ یہ لوگ نئے نئے طریقے ایجاد کرتے تھے۔ کتابوں کے کوروں کے اندر' مردہ بچوں کے پیٹوں تک میں'

ہیروئن رکھ کرلے جائی جاتی رہی تھی اور یہ کھلونوں کے ذریعے بھی کئی بار' ہیروئن اسمگل کی گئی ہوگی۔اوراب کے ذریعے یہ اسمگلنگ ہوئی تھی۔کیا جان کا تعلق ڈرگ مافیا سے تھا۔

کیا وہ کسی ایسے ہی گروہ میں پھنس گئی ہے۔نئی لائین یہ لوگ تو بہت خطرناک ہوتے ہیں۔

''کیا سوچ رہی ہو لیزا؟''

میڈم مارتھا نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

''میں۔میں کہاں ہوں۔کن لوگوں میں ہوں۔

تم کون ہو۔کیا جان کی حقیقی آنٹی ہو۔پلیز مجھے واپس بھجوا دو۔''

وہ روہانسی ہوگئی۔

''میں جان کی حقیقی آنٹی نہیں ہوں۔''

مارتھا نے بڑے سکون سے کہا۔

''جان ہمارا ایک بہت اچھا کارکن تھا اور ہمیں خوشی ہے کہ اس کی موت سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوا۔بلکہ تمہاری صورت میں ہمیں ایک اور اچھا کارکن مل گیا ہے۔''

''نہیں نہیں۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

''مجھے یہ سب نہیں کرنا۔میرا مقصد کچھ اور ہے۔میری منزل اور ہے۔میڈم پلیز مجھے واپس بھیج دیں۔''

''اچھا!''

مارتھا عجیب انداز میں مسکرائی اور انٹرکام پر نینسی کو بُلایا۔اور کچھ لانے کو کہا۔تھوڑی دیر بعد نینسی کمرے میں آئی۔اور وی سی آر پر کوئی فلم لگا دی۔

''یہ کیا؟'' لیزا نے چونک کر دیکھا۔

ٹی۔وی پر اُس کی تصویر آ رہی تھی۔وہ اسمتھ اور روڈی سے مل رہی تھی۔انہیں ڈیکوریشن پیسز نکال کر دے رہی تھی۔وہ سگریٹ کیس کھول کر اُن میں سے ہیروئن نکال رہے تھے۔روڈی اور اسمتھ کی پشت نظر آ رہی تھی۔جبکہ وہ بالکل صاف اور واضع نظر آ رہی تھی۔نجانے یہ حساس مووی کیمرے کہاں فٹ تھے۔اور کیسے بن رہی تھی۔اُسے تو کچھ پتا ہی نہیں چلا تھا۔

''یہ۔یہ''

اُس نے بوکھلا کر مارتھا کی طرف دیکھا۔

''ہاں یہ۔''

مارتھا نے اشارہ کیا تو نینسی نے ٹی۔وی آف کر دیا اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔

''تمہیں ہمارے لئے کام کرنا ہے لیزا۔اس میں تمہارے لئے کچھ خطرہ نہیں ہے اور اگر کبھی تم پکڑی بھی گئیں تو بگ باس تمہیں ہر طرح تحفظ دے گا۔ویسے آج تک اُس کا کوئی بندہ پکڑا نہیں گیا۔اچھی طرح سوچ لو۔ورنہ دوسری صورت میں یہ مووی اور تصاویر متعلقہ عملے تک پہنچا دی جائیں گی اور تم پاکستان جانے سے پہلے ایئرپورٹ پر ہی پکڑی جاؤ گی۔اس کے بعد کیا ہوگا۔یہ تم خود سوچ لو۔میرے ملک میں آج کل منشیات کے خلاف سخت مہم چل رہی ہے۔ساری عمر جیل میں سڑو گی۔یہ خوبصورت بدن' یہ پھول جیسا چہرا خاک ہو جائے گا وہیں جیل کی چار دیواری میں۔''

مارتھا کھڑی ہوگئی۔

''اچھی طرح سوچ لو۔فیصلے کا اختیار تمہیں ہے۔یا تو ہم میں شامل ہو جاؤ اور زندگی کی تمام سہولتیں حاصل کرلو۔کراچی میں فرنشڈ فلیٹ۔گاڑی۔تمہاری منتظر ہے۔اس کے علاوہ ماہانہ معاوضہ اتنا کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔میں جانتی ہوں کہ جان کے بعد اب تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ہمیں تمہاری ذاتی مصروفیات سے کوئی غرض نہیں ہوگی۔جو چاہو کرنا۔البتہ جب ہمیں تمہاری ضرورت ہوگی ہم تمہیں بتا دیں گے۔چاہو گی تو وہاں پاکستان میں تمہارے لئے بہترین ملازمت کا بندوبست بھی کر دیا جائے گا۔دوسری صورت میں عمر بھر کی قید اور خواری تمہارا مقدر بنے گی۔''

مارتھا نے بات مکمل کر کے ایک گہری نظر اُس پر ڈالی اور باہر نکل گئی۔

لیزا بہت دیر تک ہاتھ گود میں دھرے یونہی ساکت بیٹھی رہی۔یہ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔

پہلے جان نے اُس کے ساتھ دھوکا کیا۔

اُسے تلاش حق میں مدد دینے کا وعدہ کر کے پاکستان لے آیا۔اور پھر اب وہ ان خطرناک لوگوں میں پھنس گئی تھی۔کیا سچے دین کی کھوج کی خواہش گناہ تھی۔

کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی تھی۔

میں تو بس اتنا ہی جاننا چاہتی تھی کہ سچا دھرم کون سا ہے۔مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرا دھرم سچا نہیں ہے۔اس میں کہیں کھوٹ ہے۔سچ کہیں کچھ اور ہے۔

پھر کسی نے مجھے مطمئن بھی تو نہیں کیا تھا۔

نہ گوپی کے داؤ جی نے۔

نہ بھابی اور بھابھو نے۔

انکل رابرٹ کی باتیں دل کو لگتی تھیں۔لیکن پھر ریٹا کی باتوں سے اُن سے بھی دل اُچاٹ ہوگیا۔ہاں پروفیسر احسان کی باتیں دل میں کھب کر رہ گئی تھیں۔یہ دل کہیں ٹھہرتا ہی نہ تھا۔ہاں اور نہ کے درمیان پنڈولم کی طرح جھولتا رہتا جو دل ٹھہر جاتا تو آج وہ یہاں نہ ہوتی۔

شاید یہ بھی کوئی آزمائش ہے۔

لیکن کیا میں اس آزمائش میں سے نکل سکوں گی۔اور پروفیسر احسان کہتے تھے۔

''یہ کانٹوں کا سفر ہے۔لیزا۔

تھک تو نہیں جاؤ گی۔

یقین کی منزل تک پہنچنے کے لئے کبھی تو بہت لمبا سفر طے کرنا پڑتا ہے اور کبھی لمحوں میں آدمی یقین کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔اور میں۔میں شاید بہت بے یقین ہوں کہ میرا سفر طویل بھی ہوتا جا رہا ہے اور شاید یقین کی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی سفر ختم ہو جائے گا۔نہ آگے کوئی راستہ ہے نہ پیچھے۔

ایک طرف کھائی ہے تو دوسری طرف بھی موت تو پھر کیوں نہ موت کو ہی گلے لگا لوں۔

جی کر کیا کروں گی ایسی زندگی۔

ایسی بے آبرو اور مجرم زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے۔

اُس نے فیصلہ کر لیا اور جیسے مطمئن سی ہوگئی۔دو روز بعد جب مارتھا آئی تو وہ بہت اطمینان سے ٹی۔وی لگائے بیٹھی تھی۔

''ہیلو لیزا۔'' مارتھا نے خوشدلی سے کہا۔

''مجھے یقین ہے' تم نے اچھا اور بہتر فیصلہ کر لیا ہے۔''

''جی ہاں!'' لیزا نے سکون سے کہا۔

''مجھے آپ کے لئے کام نہیں کرنا۔ آپ یہ مووی اور تصاویر پولیس کے حوالے کر سکتی ہیں۔ میں اپ[نی] باقی ماندہ زندگی جیل میں گذارنے کے لئے تیار ہوں۔''

مارتھا کی نیلی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے حیرت سی اُتر آئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پُرسکون تھی۔

''مجھے تم سے ایسے کسی فیصلے کی امید نہیں تھی۔ کیا تمہیں اپنی زندگی خود اپنے ہاتھوں برباد کرتے ہو[ئے] کوئی افسوس نہیں ہوگا۔''

''نہیں۔'' لیزا بڑے اعتماد سے مارتھا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بات کر رہی تھی۔ یقین [ہی] نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی لیزا ہے۔ ڈری سہمی سی۔

''افسوس صرف اس بات کا ہے میڈم مارتھا! کہ میں جس مقصد کے لئے گھر سے نکلی تھی' وہ مقص[د] حاصل نہیں ہو سکا۔ تاہم میں اتنی بھی نامراد نہیں رہی۔ کچھ روشنی میرے اندر ضرور اُتری ہے۔ آگاہی پائی تو ہے میں نے بس اظہار نہیں کر پائی۔ قفل کھلتے کھلتے رہ گئے ہیں۔ شاید میرے مقدر میں یہی لکھا تھا۔ چلیے میں جیل جانے کے لئے تیار ہوں۔''

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

مارتھا کی آنکھوں میں پھر حیرت اُتر آئی تھی۔ وہ لمحہ بھر اُسے یوں ہی دیکھتی رہی۔ پھر اُسے بیٹھنے [کا] اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

پھر کئی دن گزر گئے۔ نینسی کے سوا کوئی اُس کے اپارٹمنٹ میں نہیں آیا۔ وہ سارا دن ٹی وی دیکھتی فیشن میگزین پڑھتی یا پھر گزری زندگی کو دہراتی رہتی۔ سود و زیاں کا حساب کرتی رہتی۔ کیا کھویا تھا اور کیا پایا تھا' بالکل تہی داماں وہ ایک بے بسی کی موت کا انتظار کر رہی تھی۔ اور کیا ہی اچھا ہو کہ اس موت کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے کسی دن وہ اجنبی کہیں نظر آ جائے۔

وہ ملوک آنکھوں والا اجنبی۔

تبریز مراد علی خان۔

پتا نہیں مارتھا پھر کیوں نہیں آئی تھی۔

اور نہ ہی داؤد خان پھر لوٹ کر آیا تھا۔

یہ لوگ کس بات کا انتظار کر رہے تھے۔

اُسے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کرتے تھے۔ کیا چاہتے تھے وہ۔

شاید اس طرح وہ اُس کا صبر آزما رہے تھے۔

لیکن میرا فیصلہ اٹل ہے۔ اب رہ ہی کیا گیا ہے زندگی میں۔ کئی بار اُس نے نینسی سے مارتھا کے متعلق پوچھا۔

لیکن نینسی اُسے کوئی جواب نہ دے سکی۔

''میڈم یہاں نہیں رہتی ہیں؟''

''وہ کہاں ہیں پلیز' اُن کو فون کرو۔''

اُس روز نینسی ناشتا لے کر آئی تو اُس نے التجا کی۔

''میڈم کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں ہے۔''

نینسی نے بتایا۔

''وہ خود ہی جب ضرورت محسوس کرتی ہیں رابطہ کر لیتی ہیں۔''

''پلیز۔ پلیز۔ نینسی''

اُس نے التجا کی۔

''اُن سے کہو' مجھے جیل بھجوا دیں۔ میں اس انتظار کی کیفیت سے تھک گئی ہوں۔ جو کچھ ہونا ہے ہو [جا]ئے۔ موت کے انتظار میں خلا میں معلق رہنا ایک ہی بار مر جانے سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔''

لیکن نینسی اُس کی بات کا جواب دیے بغیر ناشتا ٹیبل پر لگا کر چلی گئی۔ تب چائے کا ایک کپ پی کر [وہ] کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اُس نے پردہ ہٹایا۔ باہر دھند تھی اور نیچے سڑک پر دُھند میں گاڑیاں اور انسان [بہ]ت چھوٹے چھوٹے دھندلے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ یونہی بے مقصد نیچے دیکھتی رہی۔ تب ہی [د]روازے پر آہٹ ہوئی تو اُس نے مڑ کر دیکھا۔

داؤد خان تھا۔

''ہیلو۔'' اُس نے دانت نکالے۔

''کیا حال ہے میڈم لیزا جان۔''

''تم مجھے لینے آئے ہو؟''

وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''نہیں۔'' داؤد خان بھی اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''فی الحال تو نہیں۔''

''کیا مجھے جیل نہیں لے جاؤ گے؟''

''نہیں۔ اتنی خوبصورت دلکش لڑکی کو جیل میں تو نہیں ہونا چاہیے۔''

''پھر؟'' اُس نے سوالیہ نظروں سے داؤد خان کو دیکھا۔

''فی الحال تو تمہیں یہ دکھانے لایا تھا۔ میڈم نے بھجوائی ہیں۔''

اُس نے ایک براؤن لفافہ اُس کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟''

اُس نے لفافہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''کھول کر دیکھ لو۔''

لیزا نے لفافہ کھولا۔

''ارے یہ کیا۔''

وہ بے قراری سے ایک ایک تصویر دیکھنے لگی دیپو۔ بھابھو' بھاجی وکرم۔

''ارے وکی میری جان' میرا چاند۔'' وہ بے تحاشا تصویر کو چومنے لگی۔

یہ سب جو اُس کے اپنے تھے اور جن سے اُس نے ناتا توڑ لیا تھا۔

''یہ۔ یہ تمہیں کہاں سے ملیں۔''

آنسوؤں سے اُس کا چہرا بھیگ گیا تھا اور ایک ایک تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ چوم رہی تھی۔
داؤد خان نے اُس کی بات کا جواب نہ دیا اور خاموشی سے اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہ
کچھ دیر بعد اُس نے ہاتھ بڑھا کر تصویریں اُس سے لے لیں۔
"یہ۔ یہ میرے پاس ہی رہنے دو۔"
اُس نے التجا کی۔
کتنی غلطی ہوئی تھی اُس سے وہاں سے آتے ہوئے۔ وہ کسی کی تصویر بھی نہیں لائی تھی۔ بس تہ
من میں آگ لگی تھی۔ ایک ہی ذھن تھی اور وہ انکل رابرٹ بھی تو کہتے تھے۔ وہ سینٹ ہے اور اُس نے سو
شاید گوتم بدھ کی طرح وہ بھی۔ گھر۔ والوں کو چھوڑ دے گی تو گیان مل جائے۔ گا۔ سینٹ بن جائے گی ا
بننے جا رہی تھی۔ ڈرگ مافیا کی ایک رُکن۔
ایک قابل نفرت مجرم کردار۔
"جب یہ سب دُنیا میں ہی نہیں رہیں گے تو خالی تصویریں رکھ کر کیا کرو گی۔ بہر حال رکھ لو۔ ن
کے طور پر۔"
داؤد خان نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔
"کیا۔ کیا مطلب؟"
اُس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔
"کیا۔ کیا تم انہیں مار دو گے؟"
"ان کی زندگی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ تم جان کی جگہ لے لو۔
لیزا نے ایک گہرا سانس لیا۔
"دیکھو تو یہ بچہ کتنا معصوم ہے۔ ابھی تو اس کے کھیلنے کے دن ہیں۔ جب اس کے ماں باپ کو کسی
اس کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش ملے گی اور یہ نوجوان۔
ہا۔ کیا خوبصورت نوجوان ہے۔
زندگی سے بھرپور۔
ابھی اس کی شادی ہونا ہے۔
ابھی اس نے زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے۔ ابھی تو۔"
"چپ کرو۔ چپ کرو پلیز۔"
وہ چیخی۔
"اور یہ کچھ کچھ سفید بالوں والا بے چارا اس کی لاش دیکھ کر تو اس کی بیوی پاگل ہی ہو جائے گ
دیکھو تو تصویر میں کتنی عقیدت سے دیکھ رہی ہے۔ اس خالص ہندوستانی پتی ورتا قسم کی عورت ہے۔ اور یہ۔
چاری بوڑھی۔ مجھے ترس آ رہا ہے۔ اس پر دو جوان بیٹوں ایک پوتے کی لاش۔ اور پھر بہو۔"
"بھگوان کے لئے"
اُس نے دونوں ہاتھوں میں مُنہ چھپا لیا۔
"میرا تو خیال تھا کہ پہلے بوڑھی عورت اور اُس کی بہو کو ختم کیا جائے۔ لیکن میڈم کا حکم۔ اُن کا خیا
ہے کہ پہلے وکرم کو اسکول سے واپسی پر اغوا کیا جائے پھر اُس کی لاش کے ٹکڑے اُس کے گھر بھجوائے جائیں۔"

"نہیں۔ نہیں پلیز نہیں۔ بھگوان کے لئے نہیں۔
انہیں کچھ مت کہنا۔ تمہیں اپنے خدا اور رسول ﷺ واسطہ انہیں کچھ مت کہنا۔ میں تمہارے لئے کام
وں گی۔ جو کچھ تم کہو گے۔ کروں گی۔"
"سوچ لو۔ بعد میں مُکر نہ جانا۔"
"نہیں۔" اُس نے نفی میں سر ہلایا۔
"نہیں۔ وہ اُن کے ساتھ بھابھو ماں جی کے ساتھ یہ ظلم نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو پہلے ہی اندر سے زخمی دل
ے جی رہے ہوں گے۔ نہیں کبھی نہیں۔"
"ویسے اگر کبھی تمہارا ارادہ تبدیل ہوا بھی تو یہ لوگ ہماری دسترس میں ہیں۔ جس طرح چند دنوں میں ہم
ے اُن کی تصاویر منگوالی ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی بھی چھین سکتے ہیں۔"
داؤد خان نے تنبیہہ کی۔ وہ آنسو بہاتی آنکھوں کے ساتھ خاموش بیٹھی رہی۔
"اچھی طرح سوچ لو۔"
"نہیں۔" اَب سوچنے کے لئے رہ ہی کیا گیا تھا۔ وہ جتنا بھی سوچتی' اُس کا فیصلہ بدل نہیں سکتا تھا وہ اپنے
ندوں کی زندگیاں چھین نہیں سکتی تھی۔ کیا ہوا جو اُس نے ایک ارفع مقصد کے لئے انہیں چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اُن کی محبت
اُس کے خون میں گردش کر رہی تھی۔ رات کو جب وہ بستر پر لیٹتی تو سب کے چہرے باری باری اُس کی آنکھوں کے
منے آتے رہتے تھے۔
اور ایک دن بابا کہہ رہا تھا کہ دُنیا اور دُنیا کے لوگوں کی محبت دل سے نکال کر ہی آدمی خدا کو پا سکتا ہے۔ شاید
لئے وہ ابھی تک حق کو نہیں پا سکی تھی۔ کہ اُس کے دل میں اُن سب کی محبت چھپی ہوئی تھی۔ لیکن پروفیسر احسان فتح
ی کہتے تھے۔ خدا تک پہنچنے کا ایک راستہ خدا کے بندوں سے بھی ہو کر جاتا ہے۔
مخلوق خدا سے محبت خدا کو پسند ہے۔
اور ابراہیم بن ادھم کا نام خدا نے اپنے پسندیدہ بندوں میں شامل کیا تھا۔ اس لئے کہ وہ خدا کے بندوں
ے محبت کرتے تھے اور کیا خدا کبھی مجھے اپنے پسندیدہ بندوں میں شامل کرے گا۔
لیزا نے سوچا۔ اور پھر خود ہی اپنی سوچ پر حیران رہ گئی۔ میں یہ کیا سوچ رہی ہوں۔ ابھی تو میں نے خدا
ے وجود کو اُس کی وحدانیت کو تسلیم ہی نہیں کیا۔
دل نے گواہی تو دی ہے اُس کی وحدانیت کی لیکن اقرار نہیں کیا۔
پھر بھلا میں اُس کے پسندیدہ بندوں میں کیسے شامل ہو سکتی ہوں۔ اور پتا نہیں خدا ہے بھی یا نہیں۔
اُس کا دل ایک بار پھر شکوک میں گرفتار ہو گیا۔ اگر خدا ہوتا تو اب تک میرے دل کو یقین آ چکا ہوتا۔
اب تک اُس نے میری تڑپ' میری کوشش' میری خواہش کا صلہ دے دیا ہوتا۔ میرے دل کو یقین دلا کر
ے سیدھا راستہ دکھا کر۔
لیکن میں تو بالکل ہی بے دھرم ہو کر رہ جاؤں گی۔
ڈرگ مافیا کی ایک رُکن۔
اُس کے دل کے اندر جیسے کہیں خون رسنے لگا۔
اُس نے اپنے نچلے ہونٹ کو سختی سے دانتوں تلے کچل ڈالا۔ داؤد خان کھڑا ہو گیا۔
"اچھا میں اب چلتا ہوں میڈم کو تمہارے فیصلے سے مطلع کر دوں گا۔ وہ یقیناً تمہارے فیصلے سے خوش

ہوں گی۔انہیں تم بے حد پسند آئی ہو۔"

داؤد خان ایک گہری نظر اُس پر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔اور وہ تصویریں ہاتھ میں لئے انہیں دیکھتی رہی۔ جب تھک گئی تو اس نے تصویریں لفافے میں بند کر دیں۔اور آنے والے دنوں کے متعلق سوچنے لگی۔نئی زندگی کیسی ہوگی اور اُس زندگی میں پتا نہیں اُسے کیا کیا کچھ کرنا پڑے گا۔شاید وہ آزاد ہوگی۔

اور یہ آزادی بھی عجیب ہوگی۔

زنجیروں میں جکڑی ہوئی آزادی۔

پھر شاید میڈم اُسے کراچی جانے دیں گی۔

انہوں نے کراچی میں لگژری فلیٹ کا ذکر کیا تھا۔پھر وہ ریتا سے ملے گی تو ممی سے۔

پاپا سے بھی۔

پاپا کتنے اچھے ہیں۔کتنی محبت کرنے والے ممی تو جان کو یاد کر کے روتی ہوں گی۔اور ریتا' پتا نہیں ریتا کو ٹی۔وی چانس ملا یا نہیں۔اور اگر جان زندہ رہتا تو وہ ریتا کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کرتا۔اور پتا نہیں ریتا کیفی سے ملی ہے یا نہیں۔

لیکن نہیں' ریتا تو کہتی تھی کہ اُسے کیفی سے نہیں ملنا۔کبھی نہیں۔اس لئے کہ اُس کی طلب ختم ہو گئی ہے۔ بس محبت رہ گئی ہے۔

بے غرض' بے طلب محبت۔

اور کیا اس کے اندر سے طلب ختم نہیں ہو سکتی۔

صرف محبت رہ جائے۔

عشق باقی رہے۔

جنوں رہ جائے۔

اُس کے بندوں سے محبت' اُس سے محبت پھر شاید اُس تک پہنچنے کے راستے خود بخود کھل جائیں۔ پروفیسر سے ملے گی اور اُن کے دین کو اپنائے گی۔

بس پھر شاید سکون مل جائے۔

شاید اُن کا خدا خود ہی راستے آسان کر دے گا۔

وہ کراچی جا کر ضرور پروفیسر احسان سے ملے گی۔

ان سے پوچھے گی۔

کیا اُس کو چاہنے کا۔

اُس کو پانے کا' ڈھونڈنے کا یہی صلہ ملا کرتا ہے۔

یہ خوف میں لپٹی ہوئی زندگی۔

موت سے بدتر۔

اے خدا۔اے خدا تو کہاں ہے۔

میری پکار کیوں نہیں سنتا۔

اُس نے آنکھیں موند لیں۔

اور پھر وہی کیفیات۔

بہت دنوں کے بعد پھر دل انہی کیفیات کی زد میں تھا۔وہی ہاں اور نہ کی تکرار۔

وہی برسوں کے بند دروازے جیسے کھل رہے تھے قفل ٹوٹ رہے تھے اور تازہ ہوا کے جھونکے روح میں زندگی سی پیدا کر رہے تھے اور لبوں سے بے آواز دعائیں نکل رہی تھیں۔

جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

اے خدا۔اے پیغمبروں کے خدا۔

اے زمین و آسمان کے مالک۔

اے اس کائنات کے تخلیق کرنے والے۔

میری پکار سن۔

مجھے راستہ دکھا۔

مجھے روشنی دے۔مجھے آگاہی دے۔

مجھے اپنے ہونے کا یقین دے۔یقین کا وہ سرا جسے پروفیسر احسان نے میرے ہاتھ میں تھمایا تھا۔

وہ میرے ہاتھوں سے گر گیا ہے۔

اے خدا!! اگر تیرا وجود ہے۔

اگر تو ہے تو مجھے اپنے ہونے کا یقین دے میری آنکھوں کو روشنی اور بصارت عطا کر۔

اور اگر یہ تیری آزمائشیں ہیں تو انہیں میرے لیے آسان بنا۔بس ایک بار اپنے ہونے کا یقین دے دے پھر ہر آزمائش سے گزر جاؤں گی۔آگ کے دریا پار کر لوں گی۔بس ایک بار بند قفل کھول دے۔

اے کائنات کے مالک۔

آنسو اُس کے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔تصویروں کا لفافہ اُس کے ہاتھوں سے نیچے گر گیا تھا۔

پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔

گلابی ہونٹ لرز رہے تھے۔

پھر یکایک اُس کے سارے وجود پر لرزہ طاری ہو گیا۔اندر جیسے روشنیوں کے جھماکے ہو رہے تھے ۔پروفیسر احسان کانوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

"اس کائنات کا خالق و مالک اللہ ہے۔

اور باقی سب نظر کا دھوکا ہے۔وہ جو اس کو تسلیم کر لے' وہ مسلم ہے۔"

اُس کے دل نے بے اختیار گواہی دی ہاں ہے اُس نے جھرجھری سی لے کر آنکھیں کھولیں۔سامنے دروازے میں وہ کھڑا تھا۔

وہی ملکوک آنکھوں والا اجنبی۔

جس کا پورا وجود ایک حزن کی چادر میں لپٹا دکھائی دیتا تھا۔اُس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور اُس کا ایک ہاتھ دروازے کی چوکھٹ پر تھا۔وہ یکدم کھڑی ہو گئی۔روشنیوں کے جھماکے بند ہو گئے اور دل جیسے ایک زور دار دھماکے کے ساتھ دھڑک کر بند ہو گیا۔اس کا ہاتھ بے اختیار دل پر آیا۔لیکن نہیں دل تو دھڑک رہا تھا۔معمول کی رفتار سے کچھ تیز۔

آپ یہاں کیسے؟"

تبریز مراد علی دو قدم آگے بڑھا۔

اُس کی آنکھوں میں پہچان تھی اور اُس کے وجود سے ایک اپنائیت بھری خوشبو آرہی تھی۔لیزا دم بخود

اُسے دیکھ رہی تھی۔

''آپ پاکستان میں تھیں ناں۔ یاد ہے آپ کو۔ میں آپ کے دفتر میں آیا تھا۔ آپ وہی ہیں ناں۔''

لیزا نے بھیگی پلکیں۔

آنسوؤں سے بھیگی پلکیں اُٹھائیں۔

رخساروں پر ابھی تک آنسوؤں کے نشان تھے۔

''آپ رو رہی تھیں۔''

وہ ایک قدم اور آگے بڑھا۔

''آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ آپ یہاں کس کے ساتھ آئی ہیں اور کیوں۔''

وہ اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

جسے موت سے پہلے ایک بار دیکھنے کی خواہش کے دل نے کی تھی۔

یہ دلکش سراپے والا اجنبی جو راتوں کو اُس نے سوچا تھا۔

کئی بار دن میں اس کو دیکھنے کی خواہش اور اُس سے ملنے کی آرزو اُس کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ شخص اگر زندگی کے سفر میں رفیق بن جائے تو____

O☆O

ایکا ایکی ہی اُس کے دل میں اُس شخص کی رفاقت کی خواہش جاگ اُٹھی۔

اُس کی طلب نے من کو بے قرار سا کر دیا۔ تو اُس نے نگاہیں جھکا لیں۔ اُس کا دل چاہا۔ وہ ایک دم اور اُس سے کہے۔

''اجنبی آشنا میں نے تمہارا دین قبول کیا۔

تمہارے خدا اور رسولؐ پر ایمان لائی۔ تم مجھے اپنی ہمراہی کا شرف بخش دو۔ تمہارا دین سچا ہے۔ میں یقین کیا۔''

مگر یہ تو طلب ہی طلب تھی۔

صرف اُس اجنبی کی رفاقت کی طلب' اس میں اُس کے دین سے محبت کا تو کوئی دخل نہیں تھا۔ یقین کا اُس کے ہاتھ میں تھا ہی نہیں۔ گر گیا تھا۔

اُس نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں اندھیرا تھا اور صدیوں سے بند دروازوں پر زنگ آلود قفل تھے۔ اور چند لمحوں کی بات تھی۔ قفل ٹوٹنے والے تھے۔ دل نے گواہی دی تھی۔ اور لبوں سے اقرار ہونے تھا کہ یہ اجنبی آ گیا۔

وہ نڈھال سی ہو کر وہیں بیٹھ گئی۔ تبریز تیزی سے اُس کی طرف لپکا۔

''آپ کے طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔''

''ہاں!'' اُس نے پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کیے۔

''آپ وہی ہیں ناں؟''

''ہاں!'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہاں کیسے؟'' تبریز نے پھر سوال کیا۔

''یہاں۔'' وہ عجیب طرح سے مسکرائی۔
''ریکھاؤں کا کھیل ہے یا کوئی آزمائش۔ سفر کی صعوبتیں ہیں یا منزل سے دوری۔''
''خاتون! میں سمجھا نہیں۔'' تبریز نے اُلجھ کر اُسے دیکھا۔
''میں خود بھی نہیں سمجھی۔ گھر سے تو کسی اور منزل کی تلاش میں نکلی تھی لیکن مقدر نے اس راہ پر ا
''اوہ!'' تبریز نے ایک گہری سانس لی۔
''آپ اپنی مرضی سے نہیں آئیں؟''
''آپ اپنی مرضی سے آئے ہیں؟''
لیزا نے سوال کیا۔
اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ تبریز یوں ہی اُس کے پاس بیٹھا رہے۔ سوال کرتا رہے اور وہ جواب دیتی ر
''نہیں''
تبریز کا سر غیر ارادی طور پر نفی میں ہل گیا۔
''میں بھی اپنی مرضی سے نہیں آئی۔ داؤد خان دھوکے سے لے آیا ہے۔ اور میرے پاس ا
کوئی راستہ نہیں''
''کاش! میں آپ کی مدد کر سکتا خاتون۔''
''تبریز ایک ٹھنڈی سانس لیکر اُٹھ کھڑا ہوا۔
''لیکن میں بھی آپ کی طرح ہی مجبور ہوں۔'' خود قیدی ہوں۔ کسی کو رہائی کیا دلاؤں گا۔
داؤد خان سے درخواست کروں گا کہ وہ آپ پر رحم کرے۔ میں یہاں داؤد خان سے ہی ملنے آیا ہول
یہاں اُس کے بجائے آپ کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔''
لیزا کچھ نہ بولی بس گاہے گاہے اُسے دیکھ لیتی۔
''آپ کے ماں باپ۔ بہن بھائی۔'' اُس نے پھر پوچھا۔
لیزا کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔
''روئیں نہیں پلیز۔ اب مت روئیے گا۔ آپ پہلے ہی بہت رو چکی ہیں۔ میں۔ کاش میر
کے لئے کچھ کر سکتا۔''
تبریز نے بڑی یاس سے کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔
''کیا ہم دونوں مل کر بھی کچھ نہیں کر سکتے؟''
''شاید نہیں خاتون آپ نہیں جانتیں۔ میں کہاں کہاں پر کس کس طرح جکڑا ہوا ہوں۔''
''یہاں صرف نینسی ہے''۔
لیزا نے سرگوشی کی۔
''اُسے قابو میں کر کے بھاگ جائیں' اس اتنی بڑی وسیع دُنیا میں کہیں چھپ جائیں گے۔''
تبریز افسردگی سے مسکرایا۔
''اور ہمارے بعد ہمارے خاندان والے ان کے عذاب کا شکار ہو جائیں گے۔ بے قصہ
بلا جواز''
''ہاں۔ ہاں!'' لیزا نے جھپٹ کر لفافہ اُٹھا لیا۔

''نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے''
اُس نے بند لفافے پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔
''ٹھیک ہے۔ جو ہے۔ جو ہوگا ٹھیک ہے؟
لیزا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔
''ہمارا خدا شاید کسی دن ہماری پکار سُن لے۔
شاید کوئی قبولیت کی گھڑی۔
کوئی لمحہ ایسا ہو کہ ہماری فریاد سُنی جائے اور ہم اس چنگل سے آزاد ہو جائیں۔'' تبریز نے حسرت سے کہا۔
''تمہارا خدا'' لیزا نے آہستگی سے کہا۔
''اور میں۔ میری پکار کون سُنے گا۔
جان اور ریٹا کا خداوند یسوع مسیح۔
بھا بھو اور بھاجی کا بھگوان۔
یا پھر تمہارا خدا۔
میرا یقین تو کسی پر بھی پختہ نہیں ہے میری پکار کون سُنے گا۔''
''تم نے مجھ سے کچھ کہا؟'' تبریز نے پوچھا۔
''نہیں۔'' اُس نے اپنی دلکش آنکھوں کو پوری طرح کھول کر تبریز کو دیکھا۔ دل چاہا وہ اُس کی صورت کو اپنی آنکھوں میں سمو لے۔ بند کر لے اپنی آنکھوں میں اس صبیح چہرے کو۔
''داؤد خان کا پیغام ہے۔''
نینسی نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔
''کیا؟'' تبریز نے اُس کی طرف دیکھا۔
''یہ کہ تم کچھ دیر بعد اُس نمبر نو میں ملو۔''
''مگر صبح تو اُس نے یہاں اُسے کو کہا تھا۔ کیا وہ یہاں نہیں آیا تھا۔''
وہ جاتے جاتے مُڑا تو لیزا نے سر ہلا دیا۔
''آیا تھا مگر چلا گیا تھا۔''
نینسی جواب دے کر غائب ہو گئی۔ پتہ نہیں وہ سارا دن کیا کرتی رہتی تھی۔ بس ناشتے اور کھانے پر ہی دکھائی دیتی تھی۔ لیزا تو اس کمرے سے باہر ہی نہیں نکلی تھی۔ شاید وہ دو کمروں کا اپارٹمنٹ تھا جس کمرے میں لیزا تھی۔ یہ غالباً ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دوسرا شاید بیڈ روم تھا۔ غالباً یہ نینسی کا ہی اپارٹمنٹ ہوگا۔
''آپ پاکستان کب جائیں گی؟'' تبریز نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔
''پتا نہیں۔''
''میں ابھی کچھ دن یہاں ہوں۔ شاید ایک بار مزید ملاقات ہو جائے۔ جانے جانے سے پہلے آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔''
''آپ بھی غالباً مال لائی ہوں گی۔''
وہ جاتے جاتے مڑا تو لیزا نے سر ہلا دیا۔

"بے خبری میں مجھے علم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہے۔"

"ہوں۔" تبریز نے سر ہلایا۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔"

لیزا کا دل چاہا وہ اُسے روک لے۔

"مت جاؤ کچھ دیر تو اور۔" لیکن اُس نے کچھ نہیں کہا اور تبریز اُسے خدا حافظ کہتا ہوا چلا گیا۔ کچھ بعد نینسی کارڈ لے کر آ گئی۔

"میں فارغ ہوں۔ چلو کارڈ کھیلتے ہیں۔"

اُس نے پتے تقسیم کیے تو اُسے پھر دیبو یاد آ گیا۔ دیبو جب بھی ہوسٹل سے آتا تھا تو وہ رات گئے تک بیٹھ کر کارڈ کھیلتے۔ چھوٹی چھوٹی شرطیں لگا کر۔ کبھی آئس کریم کھلانے کی۔ کبھی پکچر۔

"کھیلو گی ناں؟" نینسی نے پوچھا۔

"ہاں!" لیزا نے پتے اُٹھا لئے۔

"آج پھر روتی رہی ہو۔"

اُس نے پتا پھینکتے ہوئے پوچھا۔

اور پھر اُس کے جواب کا انتظار کے بغیر خود ہی بولی۔

"رونے سے کیا ہوگا۔"

"کیا تم بھی اپنی خواہش اور مرضی سے ان میں شامل نہیں ہوئیں۔"

"نہیں۔" نینسی نے جواب دیا۔

"مجھے مجبوری ان تک لائی تھی۔ اور پھر۔ ہم تو پر کٹے پرندے ہیں جو اپنی مرضی سے اب کھلی فضاؤں میں کبھی بھی پرواز نہیں کر سکیں گے۔ اور جب ہمارے پر بڑھتے تو پھر کاٹ دیئے جائیں گے۔"

"کیا مجبوری تھی تمہاری؟"

لیزا نے پوچھا۔

"پیسہ۔ نوکری کی تلاش میں آئی تھی۔ میڈم مارتھا نے اپنی سیکریٹری کے طور پر رکھ لیا۔ بہت عرصے بعد مجھے پتا چلا تھا کہ میڈم کا تعلق ڈرگ مافیا سے ہے۔"

"اور تم؟" نینسی نے غور سے اُسے دیکھا۔

"مجھے تمہارے متعلق داؤد خان نے سب بتایا ہے۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو لیزا۔ ایک نیک روح ہو لیکن وہ داؤد خان۔ وہ تم پر ہنس رہا تھا۔ تمہیں بے وقوف سمجھ رہا تھا کہ تم اپنا گھر اپنے لوگ ایک موہوم مقصد کے لئے چھوڑ آئی ہو۔ لیکن لیزا میرا دل کہتا ہے تم نیک لڑکی ہو۔ تم نے بالکل صحیح مذہب کا دامن تھاما ہے۔ کاش میں تمہاری مدد کر سکتی۔ لیکن مجھے یقین ہے خداوند یسوع مسیح تمہاری ضرور مدد کریں گے؟"

"وہ صرف میری مدد کیوں کریں گے۔ تمہاری کیوں نہیں کریں گے؟"

لیزا نے بے دھیانی میں پوچھا۔

"اس لئے کہ تم نیک روح ہو اور میں ایک گناہگار لڑکی ہوں۔ لالچی اور حریص ہوں۔ میں صرف دُنیا سے محبت کرتی ہوں۔ مذہب سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔

مجھے تم پر ترس آتا ہے لیزا اور اُس پر بھی۔"

"اُس پر کس پر؟" لیزا نے پوچھا۔

"وہ جو ابھی ابھی یہاں آیا تھا علی۔ میڈم نے اُس کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔"

"تبریز مراد علی۔"

"ہاں۔ یہاں سب اُسے علی کہتے ہیں۔ میڈم اُس سے محبت کرنے لگی تھیں۔ لیکن اُس نے میڈم کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور میڈم نے اُس کے لئے زندگی تلخ بنا دی۔ یہ تو مس اینجل نے علی کی سفارش کی تھی بگ باس سے ورنہ میڈم تو اُسے سسکا سسکا کر مار دیتیں وہ بگ باس کا حکم نہیں ٹال سکتیں۔"

"یہ بگ باس کون ہے؟" لیزا نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ میں نے صرف نام سُنا ہے۔ ہمارا واسطہ تو صرف میڈم سے ہی ہے۔"

"تم خوش ہو؟ مطمئن ہو اپنی اس زندگی سے؟"

ہوں بہت حد تک"

نینسی نے کہا اور پتے ٹیبل پر رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"شاید باہر کوئی ہے۔"

اُس نے دروازے کے اوپر جلتے ہوئے سرخ بٹن کو دیکھا۔

"میڈم ہوں گی؟" لیزا نے کہا۔

"نہیں۔ میڈم کے پاس چابی ہے؟

تب ہی ٹیلی فون کی بیل بج اُٹھی۔ نینسی باہر جاتے جاتے رُک گئی۔ اور فون سننے لگی۔

"یس میڈم۔"

اُس نے ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہوئے لیزا کو دیکھا۔

"میڈم کا فون تھا۔ کچھ مہمان آئے ہیں۔ میڈم نے بھیجے ہیں۔ شاید وہی آ گئے ہیں۔"

سوری لیزا میں اب تمہیں کمپنی نہ دے سکوں گی۔ مجھے اس نئی مہمان خاتون کی رہائش کا بندوبست کرنا ہے۔"

"وہ ادھر ہی رہ لے گی اس کمرے میں"

لیزا نے تجویز پیش کی۔

"نہیں۔ فی الحال وہ میرے کمرے میں رہے گی۔"

"اور تم۔"

"میں لاؤنج میں چلی جاؤں گی۔"

"صرف چند روز رہے گی یہاں۔ دراصل وہ داؤد خان کسی کام سے انگلینڈ چلا گیا ہے۔ یہ لیڈی پہلے داؤد خان کے فلیٹ میں تھی۔ داؤد خان واپس آئے گا تو چلی جائے گی یہ۔"

نینسی نے تفصیل بتائی۔ باہر کچھ وقفے کے بعد پھر بیل ہونے لگی تھی۔ نینسی تیزی سے باہر نکل گئی۔

لیزا نے اُٹھ کر پھر ٹی۔ وی آن کر دیا۔

وہ تین دن گذر گئے تھے۔ لیزا نینسی اور وہ خاتون فلیٹ میں اکیلے ہی تھے۔ نینسی حسب معمول کھانا ناشتا سب کچھ کمرے میں ہی پہنچا دیتی تھی۔ آنے والی خاتون اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اور نہ ہی لیزا باہر نکل کر اُس کے کمرے تک گئی تھی۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں کھوئی رہتی تھی۔ کبھی تصویریں دیکھتی۔ کبھی رونے لگتی۔

کبھی اُسے تبریز کا خیال آ جاتا۔ تو اُس کے متعلق سوچنے لگتی۔

پتا نہیں وہ پاکستان چلا گیا ہوگا۔

پتا نہیں پاکستان میں کہاں رہتا ہے۔

کراچی یا کہیں اور میڈم مارتھا نے ایک روز فون پر اُسے بتایا تھا کہ وہاں پاکستان میں مس اینجل اُس کی باس ہوں گی۔ اور جب ضرورت پڑے گی وہ خود ہی اُس سے رابطہ کر لیں گی۔ اس کے علاوہ پاکستان میں تبریز ہے۔ داؤد خان ہے اور چند لوگ ہیں۔

پاکستان پہنچنے پر اُن لوگوں سے اُسے متعارف کروا دیا جائے گا۔

بند کمرے میں بیٹھے بیٹھے اُس کا دل گھبرا گیا تھا۔ نینسی کسی کام سے اندر آئی تو اُس نے پوچھا۔

''کیا میں یہاں قید ہوں اور اس کمرے سے باہر نہیں نکل سکتی؟''

''اوہ نو۔'' نینسی نے خوش دلی سے کہا۔

''اب تم ہم میں سے ہو۔ ہماری ساتھی اور دوست' تم جہاں چاہو جا سکتی ہو۔ تم خود ہی کمرے سے باہر نہیں نکلیں۔ تم نے شاید غور نہیں کیا۔ چند دن سے تمہارا کمرا لاک نہیں ہوتا۔ تم چاہو تو باہر بھی جا سکتی ہو۔ لیکن شاید تم اکیلی نہ جا سکو۔''

ویسے میں ذرا مارکیٹ تک جا رہی ہوں۔ اگر تم پسند کرو تو میرے ساتھ چلو۔ اپنے لئے کچھ خریدنا ہو تو خرید لینا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔'' لیزا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور تیار ہو کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ آج موسم کچھ بہتر تھا۔ دُھند نہیں تھی۔ اور سردی کی شدت بھی کم تھی۔ اُسے اس طرح نینسی کے ساتھ باہر آنا اچھا لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مدتوں بعد اُسے تازہ ہوا ملی ہو۔ وہ اردگرد کے لوگوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ ہنستے مسکراتے۔ ہشاش بشاش لوگ۔ پتا نہیں یہ لوگ اندر سے بھی اتنے ہی مطمئن اور خوش ہیں۔ جتنے باہر سے دکھائی دیتے ہیں۔

اُس نے ایک مسکراتی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر سوچا۔ سرخ اسکرٹ اور سیاہ ہاف کوٹ میں وہ ایک ایشیائی نوجوان لڑکے کے بازو میں بازو ڈالے ہنستی مسکراتی ہوئی جا رہی تھی۔ وہ کوئی خوبصورت لڑکی نہ تھی۔ سوائے سفید رنگت کے اُس میں کوئی خوبی نہ تھی۔ لیکن وہ ایشیائی لڑکا اتنا خوش دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے ہفت اقلیم کی دولت حاصل کر لی ہو۔

''پوئر بوائے۔'' (بے چارا لڑکا)

اُس نے زیر لب کہا اور مڑ کر نینسی کی طرف دیکھا جو ٹرالی میں سامان رکھ رہی تھی۔ مکھن جیم ڈبل روٹی پنیر۔ نینسی اُسے دیکھ کر مسکرائی اور ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی تو وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اسٹور سے باہر نکل آئی۔ سامنے فٹ پاتھ پر ایک سترہ اٹھارہ سالہ کا لڑکا گٹار بجا رہا تھا۔ وہ اسٹور کے گیٹ کے پاس کھڑی ہو کر اُسے دیکھنے لگی۔ وہ بڑے انہماک سے اُسے دیکھ رہی تھی کہ تب ہی کوئی اُس کے بالکل قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''آپ!'' اُس نے چونک کر مخاطب کو دیکھا۔

تبریز مراد علی آنکھوں میں کچھ کچھ حیرت لئے اُسے دیکھ رہا تھا۔ لیزا کی آنکھوں میں جیسے روشنی سی ہو گئی۔ وہ ایک ٹک اُسے دیکھے گئی۔

''آپ کیسی ہیں؟ یہاں کیوں کھڑی ہیں۔؟''

تبریز نے پوچھا تو اُس نے چونک کر نگاہیں جھکا لیں۔

''میں نینسی کے ساتھ آئی ہوں' وہ اندر ہے۔''

اُس نے مڑ کر اسٹور کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ پاکستان نہیں گئے؟''

''نہیں۔ کسی کام سے نیو جرسی چلا گیا تھا۔ کل رات ہی لوٹا ہوں۔''

''آپ اس وقت کچھ بہتر لگ رہی ہیں۔''

''ہاں حقائق کو جلد یا بدیر قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔''

''ہاں!'' تبریز نے افسردگی سے کہا۔

''کبھی کبھی قسمت انسان سے عجیب مذاق کرتی ہے۔ آدمی کے تصور میں بھی نہیں ہوتا کہ اُس کے ...ا ایسا ہوگا۔''

''آپ پاکستان کب تک جا رہی ہیں؟''

''معلوم نہیں۔ میڈم نے ابھی جانے کا نہیں کہا۔''

''آپ غالباً وزٹ ویزے پر آئی ہوں گی۔''

''معلوم نہیں۔ مجھے کچھ پتا ہی نہیں' جان کو ہی پتا تھا بس۔''

''جان؟'' تبریز نے کچھ دیر سوچا۔

''مجھے یاد نہیں آ رہا کہ کون لڑکا تھا۔'' اُس نے سر جھکا۔

''پاکستان جا کر آپ سے رابطہ کروں گا۔ میں نے داؤں خان سے بات کی تھی آپ کے متعلق۔''

''پھر؟'' لیزا نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ ''پھر۔'' اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''کچھ نہیں۔ خان کا خیال تھا کہ یہ میرا دردِ سر نہیں ہے۔ لیکن آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں ...ان جا کر مس اینجل سے بات کروں گا۔ کہ وہ آپ کے لئے کچھ کریں۔''

''تھینک یو۔'' لیزا کی آواز بھر آگئی۔

''میں۔ میرے لئے یہ سب بہت مشکل ہوگا۔ اس طرح کی زندگی گزارنا۔ میں نے ایسی زندگی میرا ...ب ہے ایسی مجرمانہ زندگی گزارنے کا کبھی نہیں سوچا تھا۔ میں تو کسی اور ہی خیال سے گھر سے نکلی تھی۔ مجھے کیا ...م تھا کہ یہ کانٹوں کا سفر میرا مقدر بن جائے گا۔''

''خاتون آپ۔''

تبریز نے پرخیال نظروں سے اُسے دیکھا۔

''داؤد خان نے کچھ بتایا تو تھا آپ کے متعلق۔ لیکن یقین نہیں آیا تھا مجھے۔''

''پتا نہیں داؤد خان نے آپ کو کیا بتایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے صرف سچے دھرم کی تلاش ...پنا گھر اور اپنے پیاروں کو چھوڑا ہے۔''

''ہاں داؤد خان نے یہ بھی بتایا تھا لیکن اُس کا خیال تھا کہ یہ محض بہانا ہے۔ حقیقت میں آپ نے ...کی محبت میں گھر چھوڑا تھا۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' لیزا نے تڑپ کر تبریز کی طرف دیکھا۔

''غلط ہے۔ جان صرف ایک ذریعہ تھا۔ ایک واسطہ تھا۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سچ کی

تلاش میں میری مدد کرے گا۔ اور انکل رابرٹ کہتے تھے کہ جان کا مذہب ہی صحیح مذہب ہے''۔

''اور پھر؟''

اب تبریز اُسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار اُس نے بہت غور سے لیزا کے چہرے کو دیکھا۔ اُ کے چہرے پر ایک پاکیزگی اور معصومیت کا پرتو سا تھا۔ میک اپ سے بے نیاز۔ سادہ سے کاٹن کے سوٹ اور جرسی میں سیاہ ہی شال لپیٹے وہ اُسے بہت اچھی لگی۔

''پھر کیا؟'' لیزا جھنجھلا گئی۔

''ریٹا نے میرے یقین میں دراڑیں ڈال دیں۔

میرے اندر اشک کے کانٹے اُگ آئے۔ یہ لمبے لمبے کانٹے۔ مجھے لگا جیسے مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں نے جلد بازی کی ہے۔ سچا دین اور دھرم کوئی اور ہے۔ میں نے جلد بازی میں غلط راستے پر قدم دھر دیے ہیں اور اب میں کسی نئے راستے پر قدم رکھنے سے پہلے اچھی طرح سوچنا چاہتی تھی تاکہ پھر پچھتانا نہ پڑے۔ میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ جان۔ جان مر گیا۔ پتا نہیں وہ زندہ رہتا تو شاید۔ شاید داؤد خان مجھے اس طرح ڈ مافیا کے ساتھ ملوث نہ کرتا۔ شاید میں وہاں پروفیسر احسان کے پاس کسی روز سچ کی روشنی پا لیتی''۔

اُس کی آنکھوں میں موتی چمک اُٹھے۔

''شاید میرے لیکھ یہی تھے۔ مجھے یوں ہی اسی طرح باقی ماندہ زندگی گزارنی تھی۔ افسوس تو یہ ہے میں اچھی نیت سے گھر سے نکلی تھی۔ میرے من میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ شاید میں نے ماتا جی کا بھاجی کا اور بھا کا دل دکھایا تھا۔ مجھے اس کی سزا ملی ہے۔ شاید میں ہی غلط تھی''۔

''نہیں''۔ تبریز نے بے اختیار کہا۔

''مایوسی کفر ہے خاتون۔ ذریعہ صرف ذریعہ ہے۔ مقصد نہیں۔ حاصل نہیں۔ ذریعے کی موت مقصد کی موت نہیں ہے۔ روشنی موجود ہے۔ آنکھیں بھی ہیں پھر ذریعے کی کیا ضرورت ہے۔ راستہ کھلا ہے''۔

''راستہ کہاں کھلا ہے؟'' لیزا نے افسردگی سے کہا۔

''راستے تو بند ہو گئے ہیں''۔

''نہیں بی بی! راستے کہاں بند ہوئے ہیں۔

آپ کا مقصد تو حق کی تلاش ہے۔ سچ کی کھوج ہے تو سچ کا سرا تو آدمی کو اپنے اندر سے ہی ملتا ہے۔

''ہاں پروفیسر صاحب بھی یہی کہتے تھے کہ یقین تو تمہیں اپنے اندر سے ہی ملے گا''۔

''ہاں! یقین اندر سے ہی ملتا ہے خاتون! مجھے آپ جیسے خاتون سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ یہ دُنیا مصیبتیں تو ہر ایک کے ساتھ ہیں۔ آپ کا مقصدِ حیات ارفع ہے۔ آپ لاہور میں ہوتیں ہم کسی اور طرح حالات میں ملے ہوتے تو میں آپ کو میاں جی سے ملواتا۔ میاں جی سے مل کر آپ کے تمام شکوک وشبہات ختم ہو جاتے''۔

''میاں جی کون ہیں''۔

''ایک نیک آدمی ہیں۔ ولی نہیں ہیں لیکن اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں''۔

''تو کیا میں اب اُن سے نہیں مل سکتی۔ مجھے پاکستان تو جانا ہے۔ میڈم نے کہا ہے کہ میں جا سکتی ہوں۔

''مجھے معلوم ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کی ملاقات میاں جی سے ہو سکے''۔

''ارے تم یہاں ہو''

نینسی دونوں ہاتھوں میں شاپر تھامے اُس کے قریب آ کر رُکی۔

''میں تمہیں اندر دیکھ رہی تھی''۔

''میں باہر آ گئی تھی۔ رونق دیکھ رہی تھی کہ پھر یہ آ گئے''۔

''ہیلو مسٹر علی ہاؤ آر یو''۔

''فائن''۔

''چلو اچھا ہوا تم مل گئے۔ مہربانی کر کے لیزا کو مع سامان کے گھر پہنچا دو۔ مجھے ایک بڑی پرانی دوست مل گئی ہے۔ میں کچھ دیر اُس کے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھوں گی۔ یہ اس اپارٹمنٹ کی چابیاں''۔

''رائٹ''۔ تبریز نے شاپر اُس کے ہاتھ سے لے لئے۔

''چلیں''۔ اُس نے سامنے پارکنگ کی طرف اشارہ کیا۔

لیزا تبریز کے ساتھ ساتھ چل پڑی۔

لاک کھول کر تبریز نے چابیاں اُس کے حوالے کیں اور گاڑی سے شاپر نکال کر اندر رکھے۔

''آپ بیٹھیں گے'' لیزا نے پوچھا۔

''نہیں مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ میں بہت جلد آپ سے پھر ملوں گا''۔

لیزا شاپر اُٹھائے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی۔ تمام سامان کچن کاؤنٹر پر رکھ کر وہ باہر نکلی تو کسی کے دھیمے سُروں میں کچھ گانے کی آواز آئی۔

آواز نینسی کے کمرے سے آ رہی تھی۔ وہ بے اختیار چند قدم نینسی کے کمرے کی طرف بڑھی اور پھر ٹھٹک کر رُک گئی۔ اب آواز بالکل صاف تھی۔ آواز میں بلا کا درد اور سوز تھا۔

دنیا ڈھونڈن والے کتے دردر پھرن حیرانی ہُو
کڈی اُتے ہونہاں دی لڑدیاں عمر وہانی ہو
عقل دے کوتاہ سمجھ نہ جانن پیون لوڑن پانی ہو

(دُنیا کے متلاشی کتے دربدر پھرتے ہیں۔ ان کی تمام عمر ہڈی پر لڑتے جھگڑتے گزر جاتی ہے یہ عقل کے اندھے کچھ نہیں سمجھتے۔ پانی مانگتے اور پیتے رہتے ہیں۔)

یہ لڑکی یقیناً پاکستانی ہے اور مسلمان ہے ایک بار کیفی نے گاڑی میں کیسٹ لگائی تھی اور بتلایا تھا یہ سلطان باہو کا کلام ہے۔ اُس نے آہستہ سے دروازے کو دھکیلا۔

سامنے زمین پر ایک بے حد چھوٹے قد کی عورت بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھی۔ اور بند آنکھوں سے آنسوؤں کا گویا سیلاب سا اُمڈ آیا تھا۔ اُس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے اور وہ آنکھیں بند کئے گا رہی تھی۔

اللہ با ہجوں ذکر اے باہو توڑی رام کہانی ہو

(اے باہو اللہ کے ذکر کے سوا سب کچھ بے معنی ہے)

کتنی ہی دیر تک وہ یونہی ساکت کھڑی اس بونے قد کی عورت کو دیکھتی رہی۔ اُس کی آواز اُس کے الفاظ اُس کے دل پر عجیب طرح سے اثر انداز ہو رہے تھے۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ خود بھی اُس کے پاس بیٹھ جائے اور اُس کے لبوں سے بھی یہی بول نکلنے لگیں۔ اللہ کے ذکر کے سوا سب کچھ بے معنی ہے۔

جانے کتنے لمحے گذر گئے۔ دل گداز ہو کر پگھلنے لگا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تب ہی اُس خاتون نے اچانک چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ ململ کا سفید دوپٹا جس سے اُس نے اپنے پورے وجود کو لپیٹ رکھا تھا

سے چہرا پونچھا اور سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

''میں لیزا ہوں۔''

''لیزا ایک قدم آگے بڑھی۔

''یہ ساتھ والے کمرے میں رہتی ہوں۔ پاکستان سے آئی ہوں۔''

''پاکستان سے''۔ خاتون نے آہستگی سے کہا۔

''ہوں۔ اور تم۔ بھی شاید پاکستان سے آئی ہو''۔

''آئی نہیں لائی گئی ہوں۔''

اُس نے ہاتھ سے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''بیٹھ جاؤ''

لیزا اُس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

''تم رو رہی تھیں۔؟''

''پتا نہیں شاید آنسو نکل آئے ہوں گے۔ میاں جی کہتے تھے۔ آنسو اُس کو بہت پسند' ہیں کیا پتا یہی نذرانہ وہ قبول کر لے اور کچھ عاجز گناہ گار بندی کی خطائیں بخش دے۔''

''تم یہاں کیسے لائی گئی ہو؟ پلیز مجھے اپنے متعلق بتاؤ۔ تمہارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔''

''کیا بتاؤں وہ مالک جس حال میں رکھے راضی ہوں۔''

''میں دشمنوں میں سے نہیں ہوں۔ تمہاری طرح ہی مظلوم ہوں۔ مجھے بھی لایا گیا ہے۔''

''اچھا'' اُس نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

''میرا نام مہراں ہے۔ مہر گل۔''

وہ ہولے ہولے اُسے اپنے متعلق بتانے لگی اور لیزا بہت انہماک سے اُس کی داستان سُننے لگی۔

☆☆☆☆

''یہ سب کیا ہو رہا ہے''

باصر نے تھکے تھکے انداز میں بستر پر گرتے ہوئے سوچا۔ ذہن عجیب طرح سے اُلجھ کر رہ گیا تھا۔

کبھی تصور تک نہیں کیا تھا کہ زندگی میں ایسے تغیرات آئیں گے۔ زندگی کتنے سکون اور آرام سے گزر رہی تھی۔ کوئی دُکھ کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ماما کی بے نیازی کبھی کبھی اُسے ذہنی طور پر پریشان ضرور کرتی تھی۔ خاص طور پر جب رمیض اُن پر تنقید کرتا۔ دبے دبے لفظوں میں احتجاج کرتا۔ تو وہ بھی اَپ سیٹ ہو جاتا تھا لیکن پھر وہ خود ہی دل کو سمجھا لیتا کہ ماما کا زندگی گزارنے کا طریقہ یہی ہے۔ اُن کے نزدیک محبتوں کا اظہار کرنا اتنا اہم اور ضروری نہیں ہے۔ سو زندگی بڑے سکون سے گذر رہی تھی۔ پہلی بار وہ تبریز کی واپسی پر ڈسٹرب ہوا تھا۔ اُس کا اتنا اچھا لائق خوبصورت اسمارٹ بھائی کس عادت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس دُکھ نے اُسے یکدم خاموش کر دیا تھا۔ وہ اکثر ڈاکٹر احمد سے اس موضوع پر بات کرتا تھا۔ یہ پہلا شدید دُکھ تھا جو تبریز کے حوالے سے اُسے ملا تھا۔ وہ اپنے پروفیسرز سے ملتا تبریز کے کیس پر اُن سے بحث کرتا۔ اُن سے مشورے طلب کرتا۔ اچھے ہاسپٹلز کا پتا پوچھتا جہاں تبریز کا صحیح طرح سے علاج ہو سکے۔

پھر مدحت سے محبت کا حادثہ۔

پاتے ہی کھو جانے کے کرب سے آشنائی۔

''مدحت!'' اُس نے زیرِ لب دُہرایا اور اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

''کچھ لوگ کس قدر جلد دل کے قریب آ جاتے ہیں۔ لمحوں میں صدیوں کا فاصلہ طے کر کے' اُس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ چھوٹے سے گاؤں شاہ پور میں میاں جی کی سرپرستی میں پرورش پانے والی اُس کی ن کسی دن اُس کی زندگی بن جائے گی۔

''کاش! ماما بھی اس بات کو جان سکتیں کہ مدحت کی ذات اُس کا وجود میرے لئے کیا ہے۔''

اُس نے آہستگی سے کہا۔ اور آنکھیں موند لیں۔

وہ آج ہی کراچی آیا تھا۔ اور بے حد تھکن محسوس کر رہا تھا۔ صبح اُسے ہاسپٹل بھی جانا تھا۔ حالانکہ اُس ل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک دو روز آرام کر لے لیکن گاؤں میں پہلے ہی اُسے میاں کی کی بیماری کی وجہ سے زیادہ نا پڑا تھا۔

اُس روز ڈاکٹر شاہ محمد اور مدحت سے رخصت ہو کر وہ اُن اجنبی مہمانوں کے ساتھ میاں جی کے ں پہنچا تو میاں جی اُٹھنے ہی والے تھے۔ فاضل نے بتایا کہ وہ اکیلے ہیں اور ملنے والے لوگ جا چکے ہیں۔

''لیکن یہ کچھ لوگ باہر سے آئے ہیں اور میاں جی سے ملنا چاہتے ہیں۔''

اس نے فاضل سے کہا۔

''مگر میاں جی کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ آپ لوگ مہمان خانے میں ٹھہر جائیں۔ شام کو میاں جی پ سے ملاقات کر لیں گے۔''

فاضل نے کہا تو اجنبی نے جو ڈرائیور کر رہا تھا۔ قدرے کرخت لہجے میں کہا۔

''لیکن ہمارا میاں جی سے ابھی ملنا ضروری ہے۔ ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ اور شام تک نہیں ٹھہر تے۔''

تب ہی کلاشنکوف والا اجنبی آگے بڑھا۔

''بھائی!'' اُس کے نرم لہجے میں درخواست کی۔

''ہماری طرف سے میاں جی سے التجا کرو کہ وہ ہمیں چند لمحے دے دیں۔ زیادہ وقت نہیں لیں گے۔''

''میاں جی تو۔''

دوسرے نے کچھ بولنا چاہا تو کلاشنکوف والے اجنبی نے اُسے ڈانٹ دیا۔

''گلریز خان! تم اپنی پتھر پھینکنے والی زبان کو بند ہی رکھا کرو۔ اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں۔ یہ بات ن میں رکھو۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہم میاں جی جیسے شخص سے شرف ملاقات حاصل کریں گے۔''

وہ پھر فاضل کی طرف مُڑا۔

''بھائی! آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ آپ ہماری درخواست میاں جی تک پہنچا دیں۔''

فاضل نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور ہال نما کمرے کی طرف مڑ گیا۔

باصر کا خیال تھا کہ وہ ان اجنبیوں کو پہنچا کر واپس پلٹ آئے گا۔ کیونکہ ڈاکٹر شاہ نے اور مدحت نے انے پر اُس کا انتظار کرنے کو کہا تھا۔ لیکن پھر۔

میاں جی کی طبیعت کی خرابی کا سُن کر وہ رُک گیا۔ اُس نے سوچا وہ میاں جی کا حال دریافت کرتا ئے کہیں طبیعت زیادہ ہی خراب نہ ہو اس لئے وہ فاضل کے پیچھے ہی چل پڑا تھا۔

میاں جی اندر گھر جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ فاضل کے بتانے پر کہ وہ اجنبی اُن سے ملاقات رنا چاہتے ہیں۔ وہ بیٹھ گئے۔ تو باصر نے اُن سے پوچھا۔

"فاضل کہہ رہا تھا کہ آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"
"ہاں کچھ سر بھاری ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا' کچھ دیر آرام کرلوں۔ تم واپس کیوں آ گئے؟ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ آج تم دونوں کھانا اُدھر ہی کھاؤ گے۔"
میاں جی نے پوچھا۔
"دراصل نہر کے پاس یہ لوگ مل گئے تھے۔ اور آپ کا پتا پوچھ رہے تھے۔ میں نے سوچا خود ہی لے آؤں' پھر لوٹ جاؤں گا۔ لیکن اگر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تو میں نہیں جاتا۔"
"نہیں نہیں' میں بالکل ٹھیک ہوں۔"
میاں جی مسکرائے۔
"تم جاؤ' شاہ محمد تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ یہ چھوٹی سی خوشی جو اُس نے ڈھونڈی ہے۔ اس سے اُسے لطف اندوز ہونے دو بیٹا! یہ شاہ محمد بھی اندر سے ٹوٹا ہوا آدمی ہے۔"
"جی میاں جی!"
باصر نے جواب دیا۔
"چھوٹی چھوٹی باتوں سے خود کو بہلاتا ہے ننھی ننھی خوشیاں اکٹھی کرتا رہتا ہے۔ کبھی گاؤں کے بچوں کو اکٹھا کر کے اُن کے ساتھ کھیل کود کر شور مچا کر۔ کبھی اپنے ہاتھ سے میرے لئے کھانا بنا کر کبھی یونہی کسی کی مدد کر کے۔ تم جاؤ۔ وہ آج بہت خوش تھا کہہ رہا تھا۔ باصر میاں کو بنی روٹی کھلاؤں گا۔ مکھن اور لسی کے ساتھ۔"
"جی میاں جی! چلا جاتا ہوں۔ لیکن آپ کا۔ بلڈ پریشر چیک کرلوں کہیں زیادہ نہ ہو گیا ہو۔ اگر زیادہ ہوا تو وہ گولیاں کھا لیجئے گا۔ جو آپ بلڈ پریشر کم کرنے کے لئے کھاتے ہیں۔"
باصر باہر نکلا تو فاضل اجنبی مہمانوں کو لا رہا تھا باصر کو کچھ دیر ہو گئی۔ جب وہ واپس آیا تو اجنبی جس کو گلریز خان کا نام سے دوسرے نے پکارا تھا۔ غصیلی نظروں سے میاں جی کو گھور رہا تھا۔
"ٹھیک ہے میاں جی! آج تو ہم جا رہے ہیں۔ لیکن ہم پھر آئیں گے۔ تب تک اپنی یادداشت درست کر لیجئے گا۔ ہم بہت جلد اپنی امانت لینے آئیں گے۔"
"یہ یہ سب کیا تھا میاں جی؟"
اجنبیوں کے جانے کے بعد باصر نے حیرت سے پوچھا۔
"یہ۔ یہ لوگ کون تھے اور کس امانت کا ذکر کر رہے تھے۔"
"یہ لوگ" میاں جی نے سوچ میں ڈوبے ڈوبے کہا۔ "معلوم نہیں یہ لوگ کون تھے باصر میاں! لیکن یہ لوگ کچھ اچھے لوگ نہیں تھے۔"

باصر ہی ان کو میاں جی کے پاس لایا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ میاں جی کے کوئی معتقد ہوں گے اُن کے پاس سرحد' بلوچستان' سندھ' ہر جگہ سے لوگ آتے تھے۔ اور اُن میں ہر طرح کے اور ہر طبقے کے لوگ ہوتے تھے۔ وہ کلاشنکوف دیکھ کر لحہ بھر کے لئے گھبرایا ضرور تھا۔ لیکن پھر اُس نے سوچا۔ بھلا گھبرانے کی کیا بات ہے۔ کلاشنکوف کا ہونا کوئی ایسی گھبرانے والی بات نہیں ہے۔ سرحد میں تو اسلحہ یوں بھی عام ہے۔ اور پھر میاں جی کی بھلا کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ سو وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ لیکن اَب اُن کے تیور اور انداز دیکھ کر وہ اُلجھ گیا تھا۔
"میاں جی! کیا آپ انہیں بالکل نہیں جانتے؟"
"نہیں!" میاں جی خود اُلجھتے ہوئے تھے۔

"اُنہوں نے کیا کہا تھا؟"
"کوئی واضح بات نہیں کی تھی۔ بس کہہ رہے تھے۔ کہ اپنی امانت لینے آئے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ کیسی امانت کہنے لگے یاد کریں۔ کبھی کسی نے آپ کے پاس امانت رکھوائی تھی۔ اُسی نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔ مگر میرے پاس تو کبھی کسی نے کوئی امانت نہیں رکھوائی۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو دوبارہ آنے کا کہہ کر چلے گئے۔"
"ممکن ہے اُنہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ انہیں کہیں اور جانا ہو لیکن"
"ہاں ممکن ہے۔ بلکہ یقیناً انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"
میاں جی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"چھوڑیے میاں جی! ذہن کو مت تھکائیے۔ آئیے میں آپ کا بلڈ پریشر چیک کروں"
باصر نے بلڈ پریشر کیا۔
"کچھ زیادہ ہے لیکن اتنا زیادہ بھی نہیں۔ آپ آرام کریں اور ذہن پر زور نہ ڈالیں۔"
باصر نے تاکید کی۔
"آئیے۔ میں آپ کو اندر پہنچا دوں۔"
میاں جی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن وہ اُلجھے اُلجھے لگ رہے تھے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اُنہوں نے باصر کی طرف دیکھا۔
"میاں! اَب تم جاؤ۔ شاہ محمد تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔"
"جی بہتر ہم جلد ہی آ جائیں گے۔ آپ زیادہ سوچیے گا نہیں۔"
وہ جانے کے لئے پلٹا ہی تھا کہ میاں جی نے اُسے بلا لیا۔
"باصر میاں! سنو!" باصر مڑا وہ بہت مضطرب اور بے چین سے لگ رہے تھے۔
"سنو میاں! سنو! ایک امانت ہے میرے پاس مہراں کی امانت۔ وہ یقیناً اسی لئے آئے تھے۔"
"کیسی امانت؟"
باصر نے چونک کر پوچھا۔ لیکن میاں جی مضطرب سے خود جیسے اپنے آپ سے ہی کہہ رہے تھے۔
"چوروں کی آمد بھی غالباً اُسی سلسلے میں تھی۔ اُنہوں نے مدحت کے زیورات کو چھیڑا تک نہیں۔ داؤد خان کی آمد مہراں کی گمشدگی۔ پھر ڈاکوؤں کا آنا اور اَب یہ لوگ۔ یقیناً اُن کا تعلق بھی سرحد سے تھا۔"
"مگر وہ امانت کیا تھی میاں جی؟"
"پتا نہیں بیٹا! میں نے کبھی وہ تھیلا کھول کر نہیں دیکھا۔ مہراں نے میرے پاس رکھوایا تھا۔ شاید کچھ کاغذات ہوں۔ جائداد کے یا پتا نہیں کیا۔"
"زیورات وغیرہ۔"
باصر نے پوچھا۔
"نہیں زیورات نہیں۔"
میاں جی نے یقین سے کہا۔
"کچھ فائلیں اور کاغذات سے لگتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا شاید مہراں کا تعلق کسی بہت بڑے خاندان سے ہے۔ اور جائیداد وغیرہ کے کاغذات ہیں۔"
"دوبارہ جب یہ لوگ آئیں تو آپ انکو دے دیں وہ کاغذات!"

باصر نے مشورہ دیا۔

''نہیں؟ میاں جی اَب بھی مضطرب سے تھے۔ ''نہیں باصر میاں! یہ لوگ مہراں کے دشمن ہیں۔ میں مہراں کی امانت کسی کے حوالے نہیں کر سکتا۔ کہیں کچھ غلط ضرور ہے۔ آج مجھے یہ یقین ہو گیا۔ مہراں کو اغوا کیا گیا ہے۔ اور وہ کاغذات یا جو کچھ بھی اُس تھیلے میں ہے' ان لوگوں کے لئے بہت اہم ہے۔''

''یہ تو ایسا کرتے ہیں میاں جی! ہم وہ تھیلا کھول کر دیکھ لیتے ہیں۔ ممکن ہے' ہمیں اُس میں کاغذات سے مہراں کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے کہ وہ کون تھی۔ اس طرح اُسے تلاش کرنے میں آسانی ہو۔''

''ہاں یہ صحیح ہے۔''

میاں جی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''خیر اَب تم جاؤ۔ واپس آؤ گے تو پھر بات کریں گے۔ یوں بھی وہ تھیلا میں نے پھر مدحت کو دیا تھا۔ کہ وہ اسے کسی محفوظ جگہ پر رکھ دے۔''

باصر کا ذہن ڈاکٹر شاہ محمد کے گھر بھی مہراں' اُس کی امانت اور اجنبی لوگوں میں اُلجھا رہا۔ ڈاکٹر شاہ محمد نے بھی اس بات کی تائید کی تھی کہ تھیلا کھول کر دیکھ لینا چاہئے۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ممکن ہے مہراں کا کوئی سراغ مل سکے۔

لیکن جب وہ واپس آیا تو میاں جی کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھ چکا تھا۔ وہ تقریباً نیم بے ہوش سے تھے۔ باصر اُنہیں فوراً شہر لایا اور اُنہیں ایڈمٹ کروانا پڑا۔ لیکن میاں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔

تب ڈاکٹر شاہ محمد کے مشورے سے وہ اُنہیں لاہور لے آیا۔ بدر ہاسپٹل میں فوری طور پر ایڈمٹ کروانے کے بعد اُس نے وہیں سے مراد علی کو فون کر کے میاں جی کی بیماری کی اطلاع دی تھی۔

''تم' تم شاہ پور میں تھے۔''

مراد علی کو حیرت ہوئی۔

''تبریز نے تو بتایا تھا کہ تم وہاں نہیں ہو۔''

''میں دو تین روز قبل ہی وہاں گیا تھا میاں جی سے ملنے۔''

باصر نے مختصراً میاں جی کی بیماری کے متعلق بتایا اور جب زینت مراد اور مراد علی ہاسپٹل آئے تو اُنہوں نے ایک بار بھی اُسے گھر چلنے کے لئے نہیں کہا۔ بلکہ۔ ماما کا موڈ تو خاصا آف تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ مجبوراً آئی ہیں۔ اُنہوں نے باصر سے بات تک نہ کی۔ البتہ مراد علی نے پوچھا تھا کہ وہ آج کل کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اور اُس کے یہ بتانے پر کہ وہ کراچی میں جاب کر رہا ہے۔ انہوں نے کہا۔

''والدین جو کچھ کرتے ہیں' اولاد کی بہتری کے لئے ہی کرتے ہیں۔''

''جی!' مراد علی کی بات پر اُس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ میرا بیٹا اتنی معمولی نوکری کرے گا۔ ساڑھے تین چار ہزار روپے تو میری فیکٹری کا ایک عام ورکر لے رہا ہے۔ میرا خواب تو یہ تھا کہ میرا بیٹا اپنے ذاتی کلینک میں بیٹھے گا۔ بہت بڑا کلینک۔''

''بہت سارے خواب پورے نہیں ہوتے پاپا۔

''لیکن بہت سارے خوابوں کی تعبیر آدمی کے اپنے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ جنرل ہادی اَب بھی

''لیکن پاپا۔!'' باصر نے اُن کی بات کاٹ دی۔

ہو سکتا ہے۔ میرے لئے میرے اپنے خواب آپ کے خوابوں سے زیادہ خوبصورت ہوں۔ ا
شاید میں اُن کی تعبیر بھی پالوں۔''

''ہاں ہاں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔''

زینت مراد پہلی مرتبہ بولیں۔

؟میاں جی نے میرے بچوں کو ورغلا لیا ہے پہلے تبریز اَب باصر۔ اچھی طرح جانتی ہوں میں۔''

''پلیز ماما۔!'' باصر نے التجا کی۔

''میاں جی کے متعلق کچھ مت کہیں۔ اُنہوں نے کبھی ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ ہمیشہ ہمیں آپ
ور پاپا کا احترام کرنے کے لئے کہا ہے۔''

''کبھی کچھ نہیں کہا۔ تو پھر تبریز اور تم اُن کی اتنی سائیڈ کیوں لیتے ہو۔ اُن کی اُس گنوار دیہاتی نواسی۔''

'دماما پلیز۔؟'' باصر کا چہرا سُرخ پڑ گیا۔ لیکن اُس نے ضبط سے کام لیا۔

''میاں جی نے مدحت کے متعلق کبھی کچھ نہیں کہا۔ مدحت کے لئے رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے کو
بھی شخص اُسے اپنی شریک زندگی بنا کر فخر محسوس کرے گا۔ تبریز بھائی نے خود میاں جی سے کہا تھا۔ جی تو مانتے ہ
نہیں تھے۔ لیکن یہ میری بھی خواہش تھی' اور ہے۔ مجھے مدحت جیسی بیوی کی ضرورت ہے۔ جنرل ہادی کی بی
جیسی بیوی کی نہیں۔ اور آپ کو میاں جی کو وہ خط نہیں لکھنا چاہئے تھا۔''

''کیسا خط؟''

مراد علی جو اُلجھے اُلجھے سے باصر کی بات سُن رہے تھے۔ اُنہوں نے پوچھا۔

''ماما نے خط لکھا تھا۔ میاں جی کو کہ وہ مدحت کو بہو نہیں بنانا چاہتیں۔''

زینت مراد نے سُپٹا کر اُسے دیکھا۔

''یہ آپ ہاسپٹل میں کیا ذکر لے بیٹھے۔ دیکھیں میاں جی شاید جاگ گئے ہیں۔''

میاں جی نے کراہ کر کروٹ بدلی تو مراد علی اور باصر فوراً اُن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اُس کے بعد اس
پر موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ میاں جی مزید چار دن ہاسپٹل میں رہے۔ اُسے فون کر کے مزید چھٹی لینی
پڑی۔ وہ میاں جی کے ساتھ ہاسپٹل میں ہی رہا تھا۔ زینت مراد' سونیا اور مراد علی تقریباً روز ہی میاں جی کو دیکھنے
آتے رہے تھے۔ لیکن ماما نے پھر اُس سے بات نہیں کی' بلکہ اُن کا منہ پھولا ہی رہتا تھا۔ سونیا نے البتہ اُس کی
بہت منت کی کہ وہ گھر چلے۔

''گھر بہت سُونا سُونا لگتا ہے' باصر تبریز بھائی بھی تمہارے جانے کے کچھ دن بعد ہی کسی بزنس ٹرپ
پر چلے گئے تھے۔ بہت دل گھبراتا ہے۔ پلیز گھر آ جاؤ۔''

''آ جاؤں گا سونی!'' اُس نے سونیا کی طرف دیکھا اور تسلی دی۔

''لیکن ابھی نہیں''

''پھر کب آؤ گے؟''

''جب ماما میری بات مان جائیں گی۔ اور میاں جی سے خود اپنی زبان سے خوشدلی کے ساتھ مدحت
کا رشتہ مانگیں گی۔''

''مدحت کا' تم مدحت سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' سونیا کی حیرت ہوئی۔

''ہاں!''

''اوہ گاڈ! تم سچ کہہ رہے ہو نا!''

''ہاں کیوں تمہیں حیرت ہو رہی ہے''

''ہاں حیرت بھی اور خوشی بھی سچ باصر' جب ماما نے بتایا تھا کہ تیمی نے مدحت کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے تو مجھے بہت دُکھ پہنچا تھا۔ بے حد۔ مجھے مدحو بہت اچھی لگتی ہے۔ میری بڑی خواہش تھی کہ مدحو میری بھابی بن کر اس گھر میں آئے۔ میں ماما کو قائل کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔ اور رمیض۔ اُس کو بھی بتاؤں گی۔ وہ بھی تیمی بھائی کے انکار سے بہت افسردہ تھا۔

''ماما نے تمہیں تبریز بھائی کے انکار کا تو بتایا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اُنہوں نے مدحت کے لئے میاں جی سے میری بات کی تھی''۔

''نہیں۔ بالکل نہیں'' سونیا نے بتایا۔

''میں سمجھتی تھی تم جو جنرل ہادی کی بیٹی سے شادی کرنے سے انکار کر رہے ہو تو شاید تم کسی کو پسند کرتے ہو۔ شاید کسی اپنی کولیگ کو۔ اس لئے میرے دل میں ایک بار خیال آیا بھی کہ ماما سے کہوں اگر تیمی بھائی مدحو سے شادی نہیں کرتے تو باصر کی کر دیں۔ لیکن پھر اسی خیال سے چُپ ہو رہی کہ تم تو پہلے ہی بھاگے ہوئے ہو''۔

''تم ماما سے کہتیں بھی تو ماما نے نہیں ماننا تھا سونی!''

باصر نے افسردگی سے کہا۔

''پتا نہیں ماما کو مدحت اچھی کیوں نہیں لگتی حالانکہ وہ تو اتنی اچھی اتنی محبت کرنے والی لڑکی ہے''

''بہر حال میں اَب تمہاری بھرپور نمائندگی کروں گی۔ پاپا اور ماما دونوں سے''

سونیا نے اُسے یقین دلایا۔

مراد علی چاہتے تھے کہ میاں جی کچھ دن لاہور ہی رہیں۔ لیکن میاں جی نے انکار کر دیا۔

''نہیں وہاں مدحت اکیلی ہے۔ پریشان ہوگی۔ یوں تو ڈر والی کوئی بات نہیں۔ بہت لوگ ہوتے ہیں۔ بھاگاں ہے' فاضل ہے۔ ڈاکٹر شاہ محمد ہیں لیکن پھر بھی وہ پریشان ہوگی۔ روتی رہے گی۔''

اور مراد علی کے اصرار کے باوجود میاں جی شاہ پور واپس آ گئے تھے۔ اُنہیں مدحت کی بہت فکر تھی۔

''مجھے ڈر ہے باصر' کہیں وہ لوگ پھر نہ آ جائیں۔''

راستے میں اُنہوں نے کہا۔

''اوہ۔''

میاں جی کی بیماری کی پریشانی میں وہ اُن لوگوں کو تو بھول ہی گیا تھا۔

''ایسا کریں میاں جی! آپ اور مدحت میرے ساتھ کراچی چلیں۔ وہاں تبریز بھائی کے پاس فلیٹ ہے اپنا۔''

''نہیں۔ نہیں ایسی ڈرنے والی بھی کوئی بات نہیں ہے۔''

''کہیں وہ لوگ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں''۔

وہ پریشان ہو گیا تھا۔

''زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے میاں نہ ایک لمحہ بڑھ سکتا ہے نہ کم ہو سکتا ہے۔''

لیکن پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھا۔ آنے سے پہلے اُس نے ڈاکٹر شاہ محمد کو تاکید کی تھی کہ وہ رات کو میاں جی کے پاس ہی رہا کریں۔ فاضل منشی اور دو تین اور افراد سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ خیال رکھیں۔ فاضل تو خیر رہتا

ہی میاں جی کے پاس تھا۔ اُسے تاکید کی تھی کہ اس طرح کے اجنبی لوگ اگر دوبارہ آئیں تو میاں جی کے پاس لے جانے سے پہلے ڈاکٹر شاہ محمد بابو یا گاؤں سے چند اور لوگوں کو بھی بلا لینا۔''

میاں جی نے جانے سے پہلے مہراں کا تھیلا اُس کے حوالے کر دیا۔

''باصر میاں! مجھے ڈر ہے کہ یہاں شاید اس امانت کی حفاظت نہ ہو سکے۔ تم اسے ساتھ لے جاؤ۔ کچھ دن انتظار کر لو۔ شاید مہراں آ جائے اور اگر نہ آئے یا تم مناسب سمجھو تو اسے کھول کر دیکھ لینا۔ شاید مہراں کا سراغ مل جائے۔''

سو اَب وہ تھیلا اُس کے بریف کیس میں پڑا تھا۔

وہ کتنی دیر سے آنکھیں موندے پڑا تھا۔ لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ تبریز کو اُس نے دو تین بار رنگ کیا تھا۔ لیکن کوئی اُٹھا نہیں رہا تھا۔ شاید تبریز گھر پر نہیں تھا یا پھر کراچی سے باہر تھا۔ خدا جانے تبریز بھائی کا بزنس کیا ہے۔

وہ اَب تبریز کے متعلق سوچنے لگا۔ اور وہ ہر وقت اتنے پریشان اور اُلجھے ہوئے کیوں رہتے ہیں۔

بہر حال اب کے جب بھی وہ ملے' میں ان سے ضرور پوچھوں گا۔ وہ اتنے آپ سیٹ کیوں رہتے ہیں۔

اور یہ کہ اُن کے ساتھ اور کیا مسئلہ ہے۔

اُس نے یونہی لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اُٹھایا۔ اور تبریز کے فلیٹ کے نمبر ملانے لگا۔ لیکن دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی۔ کسی نے اُٹھایا نہیں۔ تب ہی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون! آ جایئے!''

ریسیور رکھتے ہوئے وہ اُٹھ بیٹھا۔

''کیوں بھئی خیریت تھی اتنے دن لگا دیئے''

دروازہ کھولتے ہوئے ڈاکٹر حفیظ نے کہا۔

ڈاکٹر حفیظ بھی اس ڈاکٹرز ہاسٹل میں ہی رہتے تھے۔ اُس کا تعلق اسلام آباد سے تھا۔ وہ اُس سے سینئر تھے۔ لیکن ابھی غیر شادی شدہ تھے۔ اور بہت خوش باش آدمی تھے۔ باصر کو بالکل چھوٹے بھائیوں کی طرح چاہنے لگے تھے۔

''ہاں بس وہ میاں جی کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔''

باصر نے بتایا۔

''بیٹھیے آپ پلیز آپ گئے نہیں اسلام آباد۔''

''کہاں بھی ڈاکٹر رحیم نے جانے ہی نہیں دیا۔

میں نے تمہیں بتایا تھا نا ڈاکٹر رحیم کے متعلق۔''

اُنہوں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں شاید آپ نے ایک بار ذکر تو کیا تھا۔ کہ آپ کے کوئی دوست ہیں جو اپنے کلینک میں نشے کے عادی افراد کا علاج کرتے ہیں۔''

''ہاں ہاں بالکل وہی بھئی باصر بہت عظیم انسان ہیں وہ' اُنہوں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رکھا ہے۔ گھر بار جائداد سب فروخت کر دیا۔ تاکہ ان مریضوں کو زیادہ سے زیادہ سہولیات مہیا کر سکیں۔ یہ کلینک بنانے کے لئے اُنہوں نے اپنا ذاتی گھر فروخت کر دیا۔ اور بھی بہت کچھ کر رہے ہیں۔ اُن کے پاس بہت آئیڈیاز ہیں۔ پتا ہے باصر' آج کل وہ کیا سوچ رہے ہیں کہ ان نشے کے عادی افراد کو بہتری کے بعد بھی کم از کم ایک

سال تک وہ کلینک میں ہی رکھیں۔ یہ مدت زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ اُن کے خیال میں باہر جاکر یہ پھر سے نشے
شکار ہو جاتے ہیں۔ اُن کی۔ الگ کالونی ہو۔ وہاں ہی اُن کے لئے روزگار مہیا کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے اُ
کی یہ بات بہت پسند آئی ہے۔"

"یہ تو ایک وقت طلب منصوبہ ہے۔"

باصر نے کہا۔

"ہاں لیکن ڈاکٹر رحیم کے عزائم بلند ہیں اور مجھے یقین ہے ایک دن وہ کامیاب ہو جائیں گے۔ ا
ملک میں بے شمار عبدالستار ایدھی ہیں میرے دوست لیکن اُنہیں کام کرنے کے مواقع میسر نہیں ہیں۔ جذبہ۔
رہنمائی نہیں ہے۔ رکاوٹیں کھڑی کرنے والے زیادہ اور تعاون کرنے والے کم ہیں۔"

"تم چلنا کسی دن تمہیں ملواؤں گا ڈاکٹر رحیم سے میں تو آج کل تقریباً روز ہی جاتا ہوں وہاں تین چار گ
رضا کارانہ طور پر کام کرتا ہوں۔ لیکن واپس آکر۔ گھنٹوں اَپ سیٹ رہتا ہوں۔ ان مریضوں کی حالت دیکھ کر۔

بچے بوڑھے جوان لڑکیاں' پتا نہیں کون لوگ ہیں جو یہ زہر پھیلا رہے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہو
باصر! کیا ان کے اپنے بچے نہیں ہوتے کیا ان کے دل میں یہ خوف نہیں ہوتا کہ کبھی ان کے بچے بھی اس لت :
گرفتار ہو سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر حفیظ جذباتی ہو رہے تھے۔ اور باصر کا ذہن یکدم تبریز کی طرف چلا گیا۔ امریکہ جانے۔
پہلے تبریز کیا تھا۔ اور اَب۔

ابھی تک وہ خوف کے سائے میں لپٹا دکھائی دیتا ہے۔ اور خود وہ ماما' پاپا کوئی بھی اُس کی طرف۔
مطمئن نہیں ہے۔ ہر وقت الگ ڈر سا لگا رہتا ہے کہ جانے کب کسی وقت وہ پھر اس لت میں مبتلا نہ ہو جائے۔

"کیا سوچنے لگے ہو یار۔ شاید تم تھکے ہوئے ہو میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔"

"نہیں' میں تھکا ہوا تو ضرور ہوں۔ لیکن ڈسٹرب بالکل نہیں ہوا۔ بلکہ آپ کے آنے سے میرا ذ
بٹ گیا ہے۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ میں بھی آپ کے ساتھ ڈاکٹر رحیم کے ہاسپٹل میں جایا کروں اور رضا کار
طور پر کام کروں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے باصر! بلکہ میں خود بھی سوچ رہا تھا کہ کسی دن تم سے کہوں گا۔ بلکہ
کیوں نہیں کرتے' تم آج ہی میرے ساتھ چلو۔"

"نہیں' آج میں کچھ تھکا ہوا ہوں۔ کل سے انشاءاللہ آپ کے ساتھ چلوں گا۔ میری عدم موجو
میں تبریز بھائی تو نہیں آئے تھے؟"

باصر کو اچانک خیال آیا۔

"نہیں"۔

"پتا نہیں کہاں ہیں وہ' لاہور بھی نہیں گئے۔ فلیٹ پر بھی کوئی فون ریسیو نہیں کر رہا۔"

"ہاں یاد آیا" ڈاکٹر حفیظ نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔

"ایک اور شخص آیا تھا تمہیں پوچھتا ہوا۔ شاید تبریز کا کوئی پیغام لایا ہو۔"

"کچھ کہا نہیں تھا!"

"نہیں" ڈاکٹر حفیظ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

ایسا لگتا ہے کہ اس شخص کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ لیکن یاد نہیں آ رہا تھا۔ خیر تم سناؤ گھر

گئے تھے یا صرف میاں جی سے مل کر آ گئے ہو۔"

"گھر تو نہیں البتہ لاہور گیا تھا ماما اور پاپا سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"اُن سے خفگی دور ہوئی؟"

"نہیں" باصر نے اُداسی سے کہا۔

"پتا نہیں کیوں ماما مجھے سمجھ نہیں رہی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں زندگی صرف دولت اور پیسے سے ہے۔ دل کا
سکون اور آرام ان کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔"

"اُداس کیوں ہوتے ہو یار' ماں باپ ہیں ایک دن تو اُن کی خفگی دور ہوگی ہی۔ کب تک خفا رہیں گے۔"
ڈاکٹر حفیظ نے اُسے کے کندھے پر تھپکی دی اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"او کے بوائے! ہم تو اَب چلتے ہیں تم آرام کرو۔"

باصر نے سر ہلایا اور ڈاکٹر حفیظ کے جانے کے بعد پھر لیٹ گیا۔

"پتا نہیں ماما کی خفگی کب دُور ہوگی۔ تب تک کہیں بہت دیر نہ ہو جائے۔ میاں جی اور مدحت انتظار
نہ کر سکیں۔ پر نہیں مدحو انتظار کرے گی۔ آخری سانسوں تک' محبت اتنی کمزور تو نہیں ہوتی یا پھر کمزور ہوتی
ہے۔ مکڑی کے جالے کی طرح بیک وقت کمزور بھی اور مضبوط بھی۔ اور اگر مدحت میری زندگی میں شامل نہ ہو سکی
پتا نہیں میں اس بنا کیسے زندہ رہوں گا۔ زندگی کتنی مشکل ہو جائے گی میرے لئے۔"

اُس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کروٹ لی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

"کم آن!"

"سر! آپ سے ملنے کے لئے کوئی صاحب آئے ہیں۔"

چوکیدار نے دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"کون ہے؟"

"نام تو نہیں بتایا صاحب لیکن پہلے بھی ایک بار آئے تھے جب آپ لاہور گئے ہوئے تھے؟

"اچھا بھیج دو۔"

باصر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"السلام علیکم!" باصر نے کھڑے ہوتے ہوئے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تشریف رکھیں جناب!"

شکریہ۔

میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ دراصل ایک پیغام دینا تھا آپ کو تبریز مراد علی خان کا۔"

"اوہ!" باصر چونک پڑا۔

"تبریز بھائی کیسے ہیں اور کہاں ہیں؟"

"تبریز خان کو اچانک امریکہ جانا پڑ گیا۔ ایک ضروری کام سے وہاں اُن کا قیام اُن کی توقع سے کچھ
زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ اس لئے اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپکو پیغام دے دوں۔ علاوہ ازیں اُنہوں نے کچھ رقم
بھجوائی تھی۔ اُسے آپ تک پہنچانا تھا۔ میں نے ڈرافٹ بنوا لیا تھا۔ آپ کا نام کا۔ یہ رقم ڈاکٹر شاہ محمد۔"

وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اور پھر خود سے ہی بولا۔

"میرے خیال میں یہی نام بتایا تھا۔ کے لئے ہے"۔

اُس نے ایک سفید لفافہ باصر کی طرف بڑھایا۔
باصر اُلجھی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔لفافہ پکڑتے ہوئے اس نے اجنبی کی طرف دیکھا
''میرا نام سمندر خان ہے۔''
باصر کو اچھی نظروں سے اپنی طرف دیکھتے پا کر اُسے آپ تعارف کروانے کا خیال آیا۔
''اور میں تبریز مراد علی خان کا دوست ہوں۔''
''لیکن تبریز بھائی امریکہ کیوں گئے ہیں۔؟''
وہ دراصل بس اچانک ہی انہیں جانا پڑ گیا۔ بزنس کے سلسلے میں یوں تو ان کے پارٹنر کو جانا تھا
کوئی ایمرجنسی ہو گئی تھی۔''
''اچھا۔!'' باصر نے کسی قدر مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔
چائے منگواؤں آپ کے لئے؟''
''نہیں نہیں بس شکریہ میں اَب آجاؤں گا۔''
سمندر خان نے مصافحہ کرتے ہوئے جانے کی اجازت چاہی۔ باصر نے لفافہ ٹیبل پر رکھ دیا۔
نے شاید دل میں ہاسپٹل بنوانے کا عہد کر لیا ہے۔اور پاپا دیکھیں گے اور ماما بھی کہ اُن کی مدد کے بغیر بھی
میں ہاسپٹل بن گیا۔
''باصر!'' ڈاکٹر حفیظ دستک دیے بغیر اندر آ گئے۔
''خیریت ہے ڈاکٹر آپ واپس آ گئے''
''ہاں خیریت ہے''
ڈاکٹر حفیظ بیٹھ گئے۔
''میں نے اُس شخص کو آج پھر ہاسپٹل گیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔لیکن میں اپنے
میں نکل گیا۔وہ تم سے ہی ملنے آیا تھا نا'تم ملے اُس سے''
''ہاں!'' باصر نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔
''میں راستے سے پلٹ آیا ہوں۔اچانک ہی مجھے یاد آ گیا کہ میں نے اس شخص کو کہاں دیکھا
باصر تم کب سے اسے جانتے ہو اور تمہارے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔؟''
''میں نے آج سے پہلے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا۔ یہ تبریز بھائی کا پیغام لایا تھا میرے
انہیں اچانک امریکہ جانا پڑا۔ کہہ رہا تھا کہ وہ اُن کا دوست ہے اور اس کا نام سمندر خان ہے۔''
''یہی بالکل یہی نام سمندر خان!
ڈاکٹر حفیظ نے کہا۔
''مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' باصر نے پوچھا۔
''میں نہیں جانتا باصر! کہ اس شخص کی دوستی تمہارے بھائی سے کیسے ہوئی ہے۔لیکن مجھے اتنا
ہے کہ اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح ڈرگ مافیا سے ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر رحیم کے ہاسپٹل میں ایک
داخل ہوا تھا۔وہ ایک مل اونر کا بیٹا تھا۔لیکن ہماری تمام کوششوں کے باوجود وہ صحت یاب نہیں ہو رہا تھا۔
جب اس سلسلے میں تحقیق کی گئی تو پتا چلا کہ ایک اٹنڈنس اُسے باقاعدگی سے ہیروئن مہیا کر ر
اُسے گرفتار کر لیا گیا۔اور پھر اُس کے ذریعے کئی اور کیریر پکڑے گئے۔اور بالآخر سمندر خان کا نام لیا گیا

کو ہیروئن مہیا کرتا ہے۔یقین کرو باصر اُن کیریر میں تعلیم یافتہ نوجوان بھی تھے۔ایم ایس سی۔بی ایس سی۔
گاری نے جنہیں یہ کام کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔''
''تو کیا یہ گرفتار نہیں ہوا؟''
باصر نے پوچھا۔
''ہوا۔ہوا مائی بوائے۔لیکن معلوم نہیں یہ کیسے آزاد ہوا۔''
اچھا میں چلتا ہوں۔''
وہ اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے۔
''تمہارا بھائی آئے تو اُسے اس شخص کے متعلق خبردار ضرور کرنا۔کہیں وہ اُسے بھی پھنسا نہ لے۔
رات کو ملیں گے۔''
باصر اُلجھا ہوا سا بیٹھا تھا۔اور ذہن میں کئی طرح کے خیالات آ اور جا رہے تھے۔
تبریز کے پشاور اور کراچی کے ٹور۔
اجنبی لوگوں کی گھر میں آمد۔
تبریز کا رویہ
اَب امریکہ جانا۔
بزنس پارٹنر۔دو لاکھ کا چیک۔ہاسپٹل کے لئے روپیہ فراہم کرنا۔
اُس کا خوفزدہ رہنا۔
لیکن تبریز!
''او نہیں!''
اُس نے دونوں آنکھیں موند کر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے سر کو دبایا۔
تبریز اور ڈرگ مافیا۔تبریز کا مدحت سے شادی کرنے سے انکار۔یہ سب تبریز کا انجام کیا ہوگا۔اُس
پریشان ہو کر سوچا اور اُسے لگا جیسے اُس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔
''نہیں۔نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔تبریز کا ڈرگ مافیا سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔وہ تو خود اس لت میں
رفتار ہو گیا تھا۔وہ بھلا کیسے۔کتنی تکالیف اُٹھائی ہیں۔اُس نے کتنی اذیت سہی ہے پھر بھلا کیونکر۔
وہ بار بار خود کو یقین دلا رہا تھا۔لیکن ذہن میں شک کے کانٹے اُگ آئے تھے۔اور دل جیسے گواہی
رہا تھا کہ تبریز کہیں نہ کہیں اُلجھا ہوا ضرور ہے۔
اوہ خدایا اگر ایسا ہوا تو
لوگ کیا کہیں گے۔
میاں جی کا پوتا۔
اتنے بڑے اتنے معزز خاندان سے تعلق رکھنے والا مجرم۔
دل میں اُٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر وہ باہر نکل آیا۔کوریڈور میں ڈاکٹر مسرور ملے۔اُس ڈاکٹر
بھی باصر کی اچھی خاص سلام دُعا تھی۔
''ہیلو ڈاکٹر باصر!
اُس نے وش کیا۔

''ہیلو۔''

''کیسے ہیں آپ؟''

''اچھا ہوں۔''

''کہیں جا رہے ہیں؟''

''ہاں باہر جانے کا ارادہ ہے' تمہاری بائیک لے جا سکتا ہوں۔''

''کیوں نہیں۔''

ڈاکٹر مسرور نے جیب سے بائیک کی چابی نکال کر اُس کی طرف اُچھالی۔

''تھینک یو۔''

باصر نے شکریہ ادا کیا۔

اُس کے ذہن کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ذہن میں کیا ہو رہا ہے۔ کچھ سوچے کہ اُسے کہاں جانا ہے۔ وہ بائیک لے کر سڑک پر نکل آیا۔ پھر پتا نہیں کب' پتا نہیں کیسے وہ اجنبی اُس بائیک کے سامنے آ گیا۔ اور اُچھل کر سڑک کے کنارے گر پڑا۔ گھبرا کر اُس نے بریک لگائے اور تقریباً بھاگ کر اُس تک پہنچا۔ اجنبی بے ہوش ہو چکا تھا۔ اُس نے پاس سے گذرتی ہوئی۔ ایک دو ٹیکسیوں کو روکنے کی کوشش کی وہ رُکے بغیر نکل گئیں۔ بظاہر اجنبی کے جسم پر کوئی چوٹ نہیں تھی۔ نہ ہی وہ زخمی ہوا تھا۔ شاید سر سڑک پر لگا تھا۔ اُس کی پیشانی کو رگڑا۔ ہولے ہولے آوازیں دیں۔ تو اجنبی نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔''

''اوہ تھینک گاڈ۔ آپ ہوش میں آ گئے۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ میری بائیک سے۔''

''کوئی بات نہیں۔''

''میری غلطی!''

باصر نے کچھ کہنا چاہا تو اُس نے ٹوک دیا۔

''غلطی کسی کی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اصل بات ہے قسمت!''

''آپ کیا محسوس کر رہے ہیں۔!''

باصر نے شرمندگی سے پوچھا۔

''بس صرف سر چکرا رہا ہے۔ باقی بھگوان نے کرم کیا ہے!؟''

''آپ پلیز اُٹھیں۔ آئیں میں آپ کو گھر پہنچا دیتا ہوں۔''

باصر نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا۔

معجزانہ طور پر وہ بچ گیا تھا۔ اُسے کہیں بھی چوٹ نہیں لگی تھی۔

میں اس شہر میں اجنبی ہوں نوجوان!''

اجنبی مسکرایا۔

''آج ہی لاہور سے آیا ہوں۔ اور اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں اپنا سامان رکھ کر شہر کے گشت کو نکلا تھا۔''

''آپ لاہور کے رہنے والے ہیں۔''

''نہیں' میں ہندوستان سے آیا ہوں۔ لاہور میں میرے بھائی کے ایک دوست رہتے ہیں کے پاس کچھ دن قیام رہا۔ میرا نام دیپو ہے۔''

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔''

باصر نے اُس سے ہاتھ ملایا۔

''آپ یہاں اجنبی ہیں تو کچھ دن مجھے اپنی میزبانی کا شرف بخشیں۔''

''میں ڈاکٹر باصر ہوں۔ اور یہاں ڈاکٹرز ہوسٹل میں میرا قیام ہے۔''

''اوہ!'' اجنبی مسکرایا۔

''میں بھی آپ ہی کی برادری سے تعلق رکھتا ہوں۔

آئی مین مستقبل کا ڈاکٹر دیپو۔ دیپو مجھے پیار سے بلایا جاتا ہے۔ میرا اصل نام۔''

''میں بھی آپ کو دیپو کہنا پسند کروں گا۔''

''کیوں نہیں۔'' دیپو نے قہقہہ لگایا۔

''میں فائنل ائیر میں ہوں۔''

''تو پھر یہ طے ہے کہ آپ میرے ساتھ چل رہے ہیں؟''

''باصر نے پوچھا۔

''آپ کے ساتھ!''

دیپو نے لمحہ بھر کے لئے سوچا۔

''میرے خیال میں اس میں کوئی حرج نہیں۔ آپ مجھے اچھا انسان پائیں گے۔ اور اچھا میزبان بھی۔''

''اچھے انسان تو آپ اُسی وقت ثابت ہو گئے تھے۔ جب آپ حادثے کے بعد مجھے دیکھنے کے لئے رُک گئے۔ اور میزبان آپ کیسے ہیں۔ اس کے متعلق تو آپ کی میزبانی کے بعد ہی بتایا جا سکتا ہے۔''

دیپو زور سے ہنسا۔ باصر بھی مسکرا دیا۔

اور دونوں ساتھ ساتھ بائیک کی طرف چل پڑے۔

o☆o

کدی موڑ مہاراں ڈھولیا
تیری راواں نے سر گھولیا
(اے محبوب کبھی تو اونٹنی کی مہار موڑ، تیری راہوں پر میری جان قربان)

مہراں آنکھیں موندے گنگنا رہی تھی اور لیزا اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھی گھٹنوں پر تھوڑی ر۔ بہت دھیان سے اُسے سن رہی تھی۔

میں نباتی دھوتی رہ گئی
کوئی گنڈھ سجن دل بہہ گئی
کوئی سجن اولا بولیا
(میرا ہار سنگھار بیکار گیا اور محبوب کے دل میں کدورت پیدا ہوگئی۔ شاید میں نے کوئی نا منا۔ بات کہہ دی تھی)۔
کدی موڑ مہاراں ڈھولیا۔

''مہراں!'' لیزا نے آہستگی سے اسے پکارا۔
''ہوں'' مہراں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔
''تمہاری آواز میں بہت سوز ہے، بہت درد ہے اور دل چاہتا ہے تم گاتی رہو اور میں سنتی رہوں''
''ماں جی بھی یہی کہتی تھیں''
مہراں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
''ماں جی کون؟ لیزا نے پوچھا۔
''تمہاری ممی!''

''نہیں''۔ مہراں کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ آگئی۔
''جس عورت نے مجھے جنم دیا تھا۔ اس نے مجھے کبھی اپنی بیٹی نہیں سمجھا، شاید وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی۔ میرے وجود میں جو ایک کمی سی تھی، شاید اس کمی نے اسے مجھ سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔
لیکن میاں جی کہتے تھے'' بیٹا! ماں تو اپنی تخلیق سے کبھی نفرت نہیں کر سکتی'' ایک بار جب میں نے ان سے پوچھا تھا کہ اگر کوئی بچہ پیدائشی طور پر معذور ہو تو کیا والدین اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں؟ تو تب میاں جی نے مجھے سمجھایا تھا اور میں میاں جی کی بات رد نہیں کر سکتی تھی۔ لیزا! حالانکہ میرے تجربے نے تو مجھے بتایا تھا کہ سگی ماں بھی کبھی کبھی، کہیں کہیں ایسا ہو جاتا ہے۔
— لیزا! میاں جی کا دل تو سمندر تھا محبت سے بھرا، انہیں کیا پتا کہ نفرت کیا ہوتی ہے۔ اوہ۔!''
اس نے بات کرتے کرتے لیزا کی طرف دیکھا۔
''میرا دماغ کچھ صحیح کام نہیں کرتا۔ پتا نہیں کہاں کی بات کہاں لے جاتی ہوں، تم نے مجھ سے کچھ پوچھا تھا''۔
''ہاں ماں جی کے متعلق'' لیزا نے دہرایا۔
''ماں جی نے مجھے جنم نہیں دیا تھا، لیکن مجھے بیٹیوں کی طرح چاہا۔ انہوں نے ایک دن بھی مجھے تمسخر یا حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ کبھی مجھے شکوہ ہوتا کہ خدا نے مجھے اتنا چھوٹا قد کیوں دیا، تو پتا ہے لیزا! وہ مجھ پر بہت خفا ہوتی تھیں۔ کہتی تھیں۔ ناشکری نہیں کرتے مہراں، اس سوہنے رب نے تجھے عقل ذہن، ہاتھ، پاؤں، آنکھیں سب دیے ہیں ناں پھر گلہ کیسا؟'' پتا ہے جب میں داؤد خان کے گھر سے بھاگ کر شاہ پور پہنچی تھی تو جس دروازے پر میں نے دستک دی تھی وہ میاں جی کا دروازہ تھا اور اس روز میاں جی کا دروازہ میرے لیے نہیں کھلا تھا بلکہ محبتوں اور شفقتوں کے در وا ہو گئے تھے۔ ماں جی نے میری روداد سن کر مجھے گلے سے لگا لیا تھا۔ ماں جی، میاں جی کی بیوی تھیں۔ جب تک وہ زندہ رہیں مجھے یوں لگتا تھا، جیسے وہ میری سگی ماں ہوں، جیسے انہوں نے ہی مجھے جنم دیا ہو اور ان کے بعد میاں جی تھے۔
محبت و شفقت کا سمندر۔
پتا نہیں میرے یوں چلے آنے سے وہ کتنا پریشان ہوئے ہوں گے پتا نہیں کہاں کہاں انہوں نے مجھے نہیں ڈھونڈا ہوگا۔
پتا نہیں کیا سوچا ہوگا۔
اتنا تو انہیں یقین ہوگا ناں لیزا! کہ مہراں خود سے اس طرح بتائے بغیر نہیں جا سکتی۔ پتا نہیں انہوں نے پولیس کو بھی خبر دی ہوگی۔
اوہ!'' اُس نے بات کرتے کرتے پھر چونک کر کہا۔
''تم شاید میری باتوں سے بور ہو جاتی ہوگی۔ میں بہت بولتی ہوں ناں۔ پتا نہیں کیوں میں اتنا زیادہ بولنے لگی ہوں، پہلے تو اتنا نہیں بولتی تھی۔ داؤد خان نے مجھ پر تشدد بھی تو بہت کیا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں ٹھنڈے یخ پانی میں میرا سر الٹا کر کے ڈبوئے رکھا۔ میرے بازوؤں، ہاتھوں اور گردن پر جلتا ہوا سگریٹ رکھا اور بھی_ اور بھی بہت اذیتیں دیں۔ میری برداشت سے باہر' لیکن سوہنے رب نے مجھے حوصلہ دیا' ہمت دی اور میں نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ شاید میرا دماغ کہیں متاثر ہوا ہے۔
میں بولتی ہوں تو بولتی ہی چلی جاتی ہوں۔ تم جب تھک جایا کرو، میری باتیں سن سن کر تو مجھے منع کرد

کرو بولنے سے۔"

"نہیں، میں تھکی نہیں"۔

لیزا نے محبت سے اس کا ننھا سا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھے تمہاری باتیں سننا اچھا لگتا ہے مہراں! میرا دل چاہتا ہے، میں تم سے میاں جی کی باتیں سنتی رہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہو چلا ہے کہ اگر کبھی میں میاں جی کے پاس پناہ لینے کے لیے گئی تو وہ مجھے ضرور پناہ دیں گے۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں' میاں جی تو اُس کی مخلوق سے محبت کرتے ہیں"

مہراں نے کہا۔

"اور وہ خود بھی تو اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔ میاں جی کہتے تھے۔ مایوسی کفر ہے مہراں اور وہ اپنے بندوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ اور وہ تمہاری بھی میری بھی ضرور سنے گا لیزا۔"

"جب میں پاکستان جاؤں گی تو میاں جی سے ضرور ملوں گی"۔ لیزا نے کہا۔

"ہاں ضرور ملنا اور انہیں میرا بھی بتانا۔ انہیں بتانا کہ میں یہاں ہوں۔ امریکہ میں اور یہ کہ میں خود سے نہیں آئی۔ مجھے داؤد خان نے اغوا کیا تھا"۔

"مہراں! تم نے یہ تو مجھے بتایا تھا کہ داؤد خان نے تمہیں اغوا کروایا تھا اور پھر تم پر تشدد کرتا رہا لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ کیوں"۔

"اچھا!" مہراں نے حیرت سے کہا۔

"میں نے تمہیں نہیں بتایا"۔

"ہاں نہیں بتایا"۔

لیزا نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر الجھن سی تھی، جیسے وہ سوچ رہی ہو کہ اسے بتائے یا نہیں۔

کچھ دیر بعد اس نے لیزا کو غور سے دیکھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ میری ممی مجھے پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ میں کسی کی بددعا ہوں۔ پتا نہیں انہیں کس نے بددعا دی تھی۔ میرے پاپا مجھ سے محبت نہیں تو نفرت بھی نہیں کرتے تھے۔ دراصل وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ ان کے پاس محبت یا نفرت کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں جب کبھی ممی کے سامنے جاتی تو انہیں دورے پڑنے لگتے تھے۔ وہ چیختے چلانے لگتی تھیں۔ جوں جوں میں بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ ممی نفسیاتی مریض بنتی جا رہی تھیں تب شاید ڈاکٹر کے مشورے پر یا اپنی مرضی سے پاپا نے مجھے پشاور بھیج دیا۔ داؤد خان کی والدہ نے بچپن میں مجھے پالا تھا۔ داؤد خان، پاپا کا ڈرائیور تھا۔ پھر اس کے حالات بہتر ہو گئے تو وہ نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک بار وہ ملنے آیا تو اس کی ماں بھی ساتھ تھی۔ اس نے مجھے پیار کیا تو ممی نے اس سے پوچھا۔

"مہر گل تمہیں اچھی لگتی ہے؟"

"ہاں بی بی صاحب! ہم نے اس کو بچپن میں کھلایا ہے تو ہمیں یاد آتی ہے ہم اس سے پیار کرتے ہیں۔" تب ممی نے اس سے کہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ ہی لے جائے۔

پھر مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ پاپا' ممی اور داؤد خان کے درمیان کیا معاہدہ ہوا لیکن میں پشاور آ گئی اور داؤد خان کے گھر رہنے لگی۔ تب میری عمر دس سال تھی۔ ایک بار داؤد خان کی والدہ نے مجھے بتایا تھا کہ میرے

پا میرا خرچ بھجوا دیتے ہیں اور یہ کہ مجھے ساری زندگی یہاں ہی رہنا ہے اور میرے بعد ممی کے ہاں دو بچے پیدا ئے نارمل اور صحت مند اور یہ کہ ممی میرے وجود سے خوف کھاتی تھیں، انہیں ڈر تھا کہ میں ان کے سامنے رہی تو ن کے باقی بچے بھی میرے جیسے ہی ہوں گے۔

اوہ!" اس نے پھر اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

"یہ ساری باتیں تو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں تم نے پوچھا تھا ناں کہ داؤد خان نے مجھ پر تشدد کیوں کیا۔ میں داؤد خان کے گھر کو اپنا گھر ہی سمجھنے لگی تھی اور میں نے بھی اپنے پرانے گھر کو ممی یا پاپا کو یاد نہیں کیا تھا۔ داؤد خان کی والدہ کو میں اپنی ماں ہی سمجھتی تھی۔ اپنے گھر کے نقوش دھندلا گئے تھے کہ ایک روز داؤد خان نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے گھر میں بے کار کی روٹیاں توڑ رہی ہوں مجھے کچھ کرنا چاہیے اور پتا ہے، اس نے کیا کہا اس نے کہا کہ میں ان کے لیے کام کروں۔ علاقہ غیر سے اور جہاں سے وہ کہے ہیروئن لایا کروں۔ ان کے لیے پیغام رسانی کروں اور ___ پر سوہنے رب کو یہ منظور نہیں تھا۔ میں نے تو حامی بھر لی اس لیے کہ داؤد خان نے کہا تھا کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ میرے ہاتھ پاؤں تڑوا کر کنویں میں پھینک دے گا۔ ان دنوں میں بڑی بزدل ہوا کرتی تھی اور مجھے مرنے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔"

"اب ڈر نہیں لگتا؟" لیزا نے پوچھا۔

"نہیں جھلیے (پاگل) اب کیا ڈرنا۔ زندگی جتنی لکھی ہے اس سے ذرہ بھر نہ بڑھ سکتی ہے، نہ کم ہو سکتی ہے تو پھر کس بات کا ڈرنا۔ پر تب تو میں جاہل۔ اَن پڑھ تھی ڈر گئی اور داؤد خان نے جو کہا کرنے لگی۔ وہ بڑا خوش تھا کبھی کبھی موج میں آتا تو کہتا تھا۔

"مہراں! تو بڑے کام کی شے ہے۔ شکر ہے اس وقت میں نے تیرے پاپا سے انکار نہیں کیا حالانکہ کرنا چاہ رہا تھا لیکن پھر دانتوں تلے نمک تھا ناں تیرے پاپا کا"۔

"میرے پاپا کا کیا نام تھا"

"سردار شیر زمان خان، پر تو کیا کرے گی نام جان کر، ان کے لیے تو مر چکی ہے۔"

حالانکہ جب میں داؤد خان کے ساتھ آئی تھی میری عمر دس سال کے قریب تھی۔ پھر بھی مجھے اپنے پاپا کا نام معلوم نہیں تھا۔ اور معلوم بھی کیسے ہوتا وہاں گھر میں تو سارا وقت میں کمرے میں رہتی تھی، مجھے باہر نکلنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ میری ٹیوٹر مجھے گھر میں ہی پڑھانے آتی تھی۔ ممی نے مجھے اسکول میں بھی داخل نہیں کروایا تھا۔ ہاں پشاور میں مجھے داؤد خان کی والدہ نے قرآن پڑھایا تھا اور گھر میں مجھے اردو پڑھنا لکھنا آ گیا تھا، بلکہ جب داؤد خان مجھے لایا تھا تب میں اچھی خاصی انگریزی کی ریڈنگ بھی کر لیا کرتی تھی۔ داؤد خان کو مجھ پر بہت عتماد ہو گیا تھا۔ ایک بار اس نے کاغذات سے بھرا ہوا ایک بریف کیس مجھے دیا اور کہا۔

"مہراں! اسے سنبھال کر رکھ لو بہت اہم کاغذات ہیں، میں اسے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا"۔

میں نے بریف کیس لے کر اپنے بکسے (بکس) میں رکھ دیا۔

ایک دفعہ وہ کراچی گیا ہوا تھا تو میں نے وہی بریف کیس کھول کر دیکھا اور یونہی کاغذات پڑھنے لگی۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ مجھے اردو پڑھنا لکھنا آتا تھا۔ میں جب پشاور آئی تھی تو میرا پڑھنا لکھنا چھوٹ گیا تھا، لیکن میں ان کاغذوں کو جن میں کوئی چیز آتی کھول کھول کر پڑھتی رہتی تھی۔ آدھے کاغذات انگریزی میں تھے، آدھے اردو میں ان کاغذات سے میں سمجھی۔ کہ داؤد خان کا تعلق جس تنظیم سے ہے، ان کاغذات میں اس کا ذکر ہے۔ بہت سارے نام تھے جن کے آگے شہروں کے نام تھے۔ شاید یہ ان کے نمائندے تھے جو ان کے

لیے کام کرتے تھے اور بھی بہت کچھ تھا۔ میں صحیح طرح سے تو نہیں سمجھ سکی تھی لیکن اتنا مجھے پتا چل گیا تھا کہ یہ کاغذات بہت اہم ہیں اور یہ کہ اگر یہ کاغذات کسی اہم اور بڑے افسر کو مل جائیں تو شاید یہ سب لوگ گرفتار ہو جائیں۔ ان دنوں پی۔ ٹی۔ وی پر منشیات کے خلاف ایک ڈراما آ رہا تھا۔ پتا نہیں یہ اس ڈرامے کا اثر تھا یا پھر میرے سوہنے رب نے میرے دل میں یہ خیال ڈال دیا تھا میں نے سوچا میں یہ کاغذات لے کر کسی طرح اپنے پاپا کے پاس پہنچ جاؤں تو وہ کسی ذمہ دار آدمی کے حوالے کر دیں۔

شاید میرے لاشعور میں کہیں اپنے پاپا اور ممی کی محبت چھپی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا تھا اس طرح میرے اس کارنامے سے خوش ہو کر میرے پاپا مجھے اپنے گھر رکھ لیں گے اور میں نے چپکے چپکے کاغذات بریف کیس سے نکال کر ایک تھیلے میں ڈالے اور تھیلے کو سی دیا اور پھر اس تھیلے کو ایک اور تھیلے میں ڈال کر اوپر اپنے چند جوڑے کپڑے رکھ لیے اور گھر سے باہر نکل آئی۔

میں گھر سے باہر نکل تو آئی تھی لیزا! لیکن مجھے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ گھر جہاں میں نے جنم لیا تھا، کس شہر میں ہے۔ میں اسٹیشن پہنچی اور راولپنڈی کا ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

راولپنڈی اسٹیشن پر اتری تو عجیب سا خوف سر پر سوار ہو گیا مجھے یوں لگتا جیسے ابھی داؤد خان آئے گا اور میرے ہاتھ اور بازو توڑ کر مجھے کنویں میں پھینک دے گا۔ وہاں سے خوف زدہ ہو کر ایک ویگن میں بیٹھ گئی اور جہاں وہ جا رہی تھی۔ اسی جگہ کا ٹکٹ لے لیا۔ لمبی کہانی ہے کیا سناؤں۔

بھٹکتی بھٹکتی شاہ پور پہنچ گئی اور میاں جی نے اپنی شفقت تلے لے لیا۔ اور وہاں مجھے ایسا سکون ملا کہ مجھے داؤد خان اور کاغذات سب کچھ بھول گیا میں نے میاں جی کو کچھ نہیں بتایا کہ میں کون ہوں کہاں سے آئی ہوں۔

ایک بار میاں جی نے مجھے کہا تھا

''تمہارے گھر کا پتا معلوم کروا کے تمہیں بھجوا دوں؟'' لیکن میں نے انکار کر دیا۔

''اور وہ کاغذات؟'' لیزا نے پوچھا۔

''تم نے وہ کاغذات کسی ذمہ دار آدمی کو پہنچائے؟

''نہیں''

''کیوں''

''بس میں نے سوچا، میاں جی کو کیوں پریشان کروں پتا نہیں وہ ذمہ دار آدمی کتنا غدار نکلے اور میاں جی کو پریشان کرے''۔

''اور اب وہ کاغذات کہاں ہیں؟''

''اب!'' مہراں نے اسے گھورا۔

''تمہیں کیوں بتاؤں۔ میں نے داؤد خان کو نہیں بتایا تو تمہیں کیوں بتاؤں؟''

''اچھا نہ بتاؤ'' لیزا ہنس دی۔

مجھے جان کر کرنا بھی کیا ہے؟ لیکن داؤد خان کو تمہارا پتا کیسے چلا؟''

''بس قسمت میں یہی لکھا تھا۔ وہ تیمی میاں کے ساتھ آیا تھا میاں جی سے ملنے اور وہاں مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا''۔

''تمہیں کتنا عرصہ ہو گیا ہے یہاں آئے ہوئے؟''

لیزا نے پوچھا۔

''پتا نہیں کتنے دن اور کتنی راتیں گزر گئی ہیں۔ پہلے پشاور تھی پھر داؤد خان نے یہاں بھجوا دیا۔ اسے شاید ڈر تھا کہ کہیں میاں جی مجھے تلاش نہ کروالیں۔ دراصل تیمی میاں آئے تھے پشاور، انہوں نے داؤد خان سے میرے متعلق دریافت کیا تھا۔ پر تم اتنا کرید کرید کر کیوں پوچھتی ہو مجھ سے؟''

وہ گھور کر اسے دیکھنے لگی۔

''کہیں داؤد خان نے تو تمہیں میرے پیچھے نہیں لگایا؟''

''نہیں نہیں تو' پلیز مہراں! میرا اعتبار کرو۔ میں تو خود تمہاری طرح اس کے جال میں پھنس گئی ہوں''۔

لیکن مہراں مشکوک نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں اور گنگنانے لگی' جیسے اس کی موجودگی سے بالکل بے خبر ہو گئی ہو۔

بلھے شاہ میں تیری بردی ہاں
تیرا مکھ ویکھن نوں کردی ہاں
نت سو سونتاں کردی ہاں!
ہن بیٹھ پنجر وچ وس کر جی

(بلھے شاہ میں تیری کنیز ہوں اور تیرا دیدار کرنا چاہتی ہوں۔ روز سو سومنت کرتی ہوں اب تو اس وجود میں آ کر سما جاؤ)

لیزا کی نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں اور وہ بڑے دھیان سے مہراں کو گاتے سن رہی تھی مہراں کے ہونٹوں سے نکلنے والے لفظ اس کے اندر عجیب سی ہلچل مچا رہے تھے۔ ع

نت سو سو منتاں کردی ہاں!

یوں لگتا تھا جیسے لفظ اس کے وجود میں اتر کر اپنے الگ معانی دے رہے ہوں۔

کیا کیا نہیں کیا میں نے۔

کیا کچھ نہیں چھوڑا۔

لیکن کیا ملا ہے؟

ہُن بس کر جی، ہُن بس کر جی

اک بات اساں نوں ہس کر جی

(اَب بس کرو جی اب بس کرو جی، اور ہمارے ساتھ ہنس کر ایک بات کر لو۔)

مہراں کے ساتھ ساتھ لیزا کے بھی ہونٹ ہل رہے تھے۔

اب بس کر ___ اب بس کر

اے تبریز مراد علی کے خدا

اے ریٹا کے خدا!

اور ___ اور ___!

آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے۔

اے خدا! اب تو ___ اب تو سیدھا راستہ دکھا دے۔

اب تو ___!

''تم کیوں روتی ہو؟''

مہراں نے آنکھیں کھول کر حیرت سے اسے دیکھا۔

''میں کیوں روتی ہوں''؟

لیزا نے ہاتھوں کی پُشت سے آنسو صاف کیے۔

''میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میں کیوں روتی ہوں۔ اچھی لڑکی۔ آنسو تو میرے اندر سے نکلتے ہیں خود بخود، جیسے دریا سما گئے ہوں اور ایک بار پروفیسر احسان نے کہا تھا۔

''آنسو! اس کی بارگاہ میں آنسوؤں کی بڑی وقعت ہے، بڑی قیمت ہے''۔

پر میرے آنسو تو بڑے بے وقعت، بڑے بے قیمت ہیں''۔

''بول ناں کیوں روتی ہے؟''

مہراں نے اسے خاموش دیکھ کر پھر پوچھا۔

کیا بتاؤں؟''

لیزا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''مجھے کچھ نظر ہی نہیں آتا ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہے، روشنی کی کوئی کرن کہیں نہیں ہے''۔

''مایوسی تو کفر ہے، اس نے 'سوہنے رب نے کہا ہے مایوس ہونے والا ہم میں سے نہیں ہے تو کیوں مایوس ہوتی ہے۔ رب کی رحمت سے تو شیطان ہی مایوس ہوتا ہے''۔

''کچھ دن پہلے تک میں بھی تمہاری طرح مایوس نہیں تھی حالانکہ اندھیرا تب بھی اتنا ہی گہرا تھا۔ پر کبھی کبھی اس گہرے اندھیرے میں سے کہیں سے کوئی روشنی کی کرن سی آجاتی تھی' چاہے لمحوں کے لیے ہی سہی۔ پر اب تو___!''

''اب کیا ہو گیا ہے؟''

''اب ساری امیدیں ختم ہو گئی ہیں مہراں! میں نے اپنا آپ داؤد خان کے پاس گروی رکھ دیا ہے۔ پہلے میں اپنے وجود کی خود مالک تھی جو میرا دل چاہا میں نے کیا' حتیٰ کہ میں نے بہت سے اپنوں کو بھی چھوڑ دیا پر اَب___!''

''پر تم نے ایسا کیوں کیا؟''

مہراں کی آنکھوں میں اب تجسس اتر آیا تھا۔

''انہی اپنوں کی زندگی کے تحفظ کی خاطر جنہیں میں نے خود چھوڑ دیا تھا''۔

''تم کچھ عجیب سی نہیں لگتی ہو''۔

مہراں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''اور تمہاری باتیں میری سمجھ میں بھی نہیں آتیں تم_ تم داؤد خان کی ہی ملازمہ ہو؟''

''ہاں یہی سمجھ لو''۔

''تو پھر میرے پاس آکر کیوں بیٹھتی ہو؟ میں تو اس کی مجرم ہوں مجھے تو اس نے قید کر رکھا ہے''

مہراں پھر مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ وہ جب سے آئی تھی اسی طرح بات کرتے کرتے اس کی ذہنی رو الٹ جاتی تھی۔ یہ ساری باتیں جو ابھی کچھ دیر پہلے اس نے لیزا کو بتائی تھیں اس میں سے کئی باتیں وہ پہلے بھی بتا چکی تھی۔ یقیناً اس کا ذہن تشدد سے متاثر ہوا تھا۔

''قیدی تو میں بھی ہوں مہراں! قیدی تو نینسی بھی ہے لیکن ہم سب کی قید مختلف نوعیت کی ہے''۔

''میں اپنوں کی محبت کی قیدی ہوں۔ نینسی اپنی ضرورتوں کی قیدی ہے۔ بس جرم کی نوعیت الگ الگ ہے مہراں! قید تو سب ہی ہیں''۔

مہراں بنا کچھ بولے یونہی مشکوک نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

''تمہارے پاس میں اس لیے نہیں آئی کہ مجھے نینسی یا داؤد خان نے کہا ہے۔ تمہارے پاس تو میں آتی ہوں اپنے لیے_ تم گاتی ہوناں تو_!''

''نہیں، میں اپنے مولا کی ثناء کرتی ہوں، اسے پکارتی ہوں''۔

مہراں نے اسے ٹوک دیا۔

''ہاں جو بھی ہے''۔

لیزا نے آہستگی سے کہا۔

''مجھے تمہارا گانا اچھا لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی دن تمہارے بول میرے دل کے بند قفل کھول دیں گے' جیسے کسی دن تمہارا مولا خود میرے دل میں اتر آئے گا اور میں پکار اٹھوں گی کہ ہاں ہے۔ کوئی ہے سب سے ماورا، سب سے بلند_ اور یہ کہ میری تلاش سچ تھی''۔

مہراں الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تم کسے تلاش کر رہی ہو؟''

''بھگوان کو___ خدا کو''۔

لیزا نے آہستگی سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

مہراں نے اسے جاتے دیکھ کر پھر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

لیزا نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

یکا یک ہی اس کے دل میں عجیب سی ویرانی اتر آئی تھی۔

ایک دم اندر اتنا سناٹا ہو گیا تھا کہ اُسے اپنے آپ سے خوف آنے لگا تھا۔ کوریڈور میں وہ لحہ بھر کو رک گئی اور اس نے سوچا نینسی کی طرف جائے شاید اس کی باتوں سے طبیعت کا یہ اضمحلال آپ ہی آپ ختم ہو جائے' مگر نہیں، اسے یاد آیا۔ نینسی تو صبح سے غائب تھی۔ جاتے ہوئے وہ اسے کہہ گئی تھی کہ اسے دیر ہو جائے گی، اس لیے وہ مہراں کو لنچ کروا دے اور خود بھی کر لے۔

نینسی چونکہ گھر پر نہیں تھی، اس لیے باہر بھی گھومنے نہیں جایا جا سکتا تھا کیونکہ جب وہ گھر پر نہیں ہوتی تھی تو اکثر باہر سے لاک کر جاتی تھی۔

تو پھر واپس مہراں کے پاس چلی جائے۔

لیکن نہیں' مہراں اب اس سے بات نہیں کرے گی۔ یوں بھی اس کے موڈ کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا بات کرتی تو گھنٹوں کرتی رہتی اور خاموش ہوتی تھی تو بھلے اس سے ہزاروں باتیں پوچھ لو بس ٹکر ٹکر دیکھے جاتی تھی۔ جانے اس کے دماغ کے کون سے حصے اور کیسے متاثر ہوئے تھے۔

''اوہ!'' اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے اسے خیال آیا۔

مہراں کا کمرا تو اس نے لاک ہی نہیں کیا تھا نینسی کی خاص ہدایت تھی کہ جب بھی وہ مہراں کے پاس سے آئے، دروازہ لاک کر دیا کرے۔ یہ تو اس کی مہربانی تھی کہ اس نے لیزا کو مہراں کے پاس جانے کی اجازت

دے دی تھی۔

واپس مڑ کر اس نے دروازہ لاک کیا اور چابی وہیں ٹیبل پر رکھ کر پلٹی ہی تھی کہ دروازہ کھلا اور تبریز اندر داخل ہوا۔ لمحہ بھر کے لیے اسے یوں لگا جیسے دل کی دھڑکنیں رک سی گئی ہوں۔

تبریز کی نظریں بھی اس سے ملیں۔ وہ دو قدم آگے بڑھا۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"اچھی ہوں"۔

اس نے کہنا چاہا لیکن ہونٹ جیسے کسی نے سی دیے ہوں۔ لفظ اندر ہی کہیں گھٹ گئے ہوں وہ صرف ہونٹ ہلا کر رہ گئی اور آنسو جیسے بند توڑ کر باہر نکل آئے۔

"کیا ہوا؟"

تبریز پریشان ہو گیا۔

"خیریت تو ہے کسی نے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں" لیزا نے نفی میں سر ہلایا۔

تو پھر___ پھر آپ اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟"

تبریز بے چین سا لگ رہا تھا۔

"پلیز! آپ مت روئیں مجھے تکلیف ہوتی ہے آپ کے رونے سے"۔

"سوری!" لیزا نے آنسو صاف کیے۔

"میں آپ کے لیے کچھ کر بھی تو نہیں سکتا۔ بتائیں پلیز! میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں اگر میرے اختیار میں ہوا تو میں ضرور کوشش کروں گا"۔

وہ تھکا تھکا سا کوریڈور میں پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں" لیزا اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"یونہی اتنے دنوں بعد آپ کو دیکھا تو میرا دل بھر آیا"

تبریز کی نظریں بے اختیار اٹھیں۔ کسی قدر حیرت سے اس نے لیزا کو دیکھا۔

"مگر میں نے تو آپ سے دوبارہ آنے کو نہیں کہا تھا"

"وہ تو بس آج اتفاق سے میٹنگ کے بعد میڈم مارتھا بگ باس وغیرہ چند دنوں کے لیے ٹیکساس چلے گئے اور نینسی نے مجھ سے کہا کہ اس نے اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے جانا ہے سو میں اس کی واپسی تک فلیٹ میں ٹھہروں اور میں نے بھی سوچا___ چلا جاتا ہوں آپ کا حال بھی دریافت کر لوں گا"۔

"جی!" لیزا کی نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔

"مگر میں___ میں نے ہر لمحہ آپ کو یاد کیا ہے سوچا ہے نہیں___!"

"کیوں؟" تبریز اب بھی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یقین کریں مس لیزا! میں بھی آپ کی طرح بے بس ہوں بلکہ شاید آپ سے بھی زیادہ میں چاہوں بھی تو آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا"۔

"میں جانتی ہوں" لیزا کے رخساروں پر رنگ سا دوڑ گیا۔

"میں_ میری تو بس اتنی خواہش ہے کہ آپ کبھی کبھی مجھ سے مل لیا کریں۔ جب تک یہاں ہیں۔

[illegible]اس خاموشی کو توڑا۔

"کیا آپ اور میں ساری زندگی یونہی گزار دیں گے مجرموں کی طرح، ہم کہیں چلے جاتے ہیں۔ دنیا کے کسی کونے میں کوئی تو جگہ ایسی ہوگی، جہاں ہم چھپ کر زندگی گزار لیں گے"۔

تبریز خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

یہ لڑکی لیزا جو کبھی رتن کماری ہوتی تھی جس کا ایک گھر تھا۔ ماں، بھائی، بھابی ایک مکمل گھر اور اس نے ایک لڑکی ہوتے ہوئے اس گھر کو ایک مقصد کو پانے کے لیے چھوڑ دیا۔ محبتوں کی ساری زنجیریں کاٹ ڈالیں اور میں ایک مرد ہوں جو عورت سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتا ہے ٹھیک ہے، نشے نے میرے اعصاب کو کمزور کر دیا ہے۔ لیکن اب تو میں بہت بہتر ہوں اور اگر میں کوشش کروں تو شاید، ممکن ہے کہیں کوئی راستہ نکل آئے۔ میاں جی بھی تو کہتے تھے ڈھونڈنے والوں کے لیے ہزاروں راستے ہوتے ہیں۔ کوئی ایک در بند ہو تو دوسرا کھل جاتا ہے۔ کیا خبر دنیا کے کسی کونے میں کوئی ایک گوشہ ہمارے نام کا بھی ہو جہاں میں اور یہ لڑکی اس مجرمانہ زندگی کے خوف سے آزاد ہو کر ایک صاف ستھری زندگی کے گزار سکیں۔

مگر میرا بھلا اس سے کیا ناتا_ کوئی ناتا نہیں تو پھر اتنی دیر سے اس کے پاس کیوں بیٹھے ہو، اسے اپنے اوپر بیتی وہ کہانی کیوں سنا رہے ہو، جسے تم نے آج تک کسی کو بھی نہیں سنایا، اپنے پیاروں کو بھی نہیں۔ کتنا دل چاہا تھا اسکا کہ وہ میاں جی کو یہ ساری کہانی سنا دے اور پھر ان کی گود میں سر رکھ کر خوب روئے۔

پتا نہیں میاں جی ہی اسے بچا لیں۔

مگر وہ چپ چاپ دل میں سارے آنسو چھپائے شاہ پور سے آ گیا تھا۔

ماما اور پاپا اس سے کتنے خفا خفا رہتے تھے پاپا اکثر طنز کرنے لگے تھے اور ماما اجنبی لگنے لگی تھیں۔

اس نے کسی سے بھی اپنا دکھ نہیں کہا تھا حتیٰ کہ باصر سے بھی نہیں۔ حالانکہ باصر نے پوچھا بھی تھا اور اب کے کراچی کے قیام میں اس کا دل چاہا بھی تھا کہ وہ اور نہیں تو باصر کو ہی کچھ بتا دے کوئی تو اسکا ہمدرد ہو۔ کوئی تو ہو اس کا دکھ جاننے والا، اگر کبھی اچانک وہ پکڑا جائے اور ذلت کی موت اس کا مقدر بنے۔ کوئی ایک تو ہو اس پر آنسو بہانے والا، اسے بے گناہ سمجھنے والا، لیکن پھر باصر سے سب کچھ کہتے کہتے اس نے لب سی لیے تھے۔

نہیں، وہ پہلے ہی پریشان ہے۔ ماما اور پاپا کے غلط فیصلے کی وجہ سے وہ اسے پریشان نہیں کرے گا پھر کبھی سہی۔ اور اس اجنبی لڑکی کے سامنے اس نے اپنے سارے آنسو بہا دیے تھے۔ کوئی ناتا نہیں تھا تو پھر کیوں؟

یکایک اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ کچھ ناتے بے زبان ہوتے ہیں، خود بخود قائم ہو جاتے ہیں۔ اپنے آپ دل کے رشتے جڑ جاتے ہیں شاید ایسا ہی کوئی ناتا اس کا بھی قائم ہو گیا تھا۔ ایسا ہی کوئی رشتہ جڑ گیا تھا۔ اس اجنبی لڑکی کے ساتھ جس سے شاید وہ آج چوتھی بار مل رہا تھا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ وارفتگی سے اسے تک رہی تھی اور اس کی آنکھوں کے کونوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں لیزا کی پلکیں جھک گئیں۔ چہرے پر رنگ سے دوڑ گئے اور تبریز مراد علی کا دل جیسے پہلی بار ایک انوکھی دھڑکن سے روشناس ہوا۔

محبت ابر کی صورت
اترتی ہے سواد ہجر میں کچھ اس طرح جیسے
صدائے آشنا کوئی
گھنے، گہرے اندھیرے جنگلوں کی بے یقینی میں
رخ منزل دکھاتی ہے
روشنی کا کام کرتی ہے۔

میرا۔ میرا بہت دل گھبراتا ہے"۔

"اچھا کوشش کروں گا" تبریز مسکرا کر بولا۔

"نینسی اچھی لڑکی ہے یقیناً میرے یہاں آنے پر اعتراض نہیں کرے گی"۔

"ہاں" لیزا کی آنکھیں روشن سی ہو گئیں

"تھینک یو"۔

"لیکن میڈم مارتھا کے آتے ہی میں واپس چلا جاؤں گا۔ بس چند دن بعد اور آپ کب تک جا رہی ہیں؟"

"معلوم نہیں" لیزا ایک دم افسردہ ہو گئی۔

"میرا خیال ہے، آپ کی واپسی داؤد خان کے ساتھ ہی ہوگی"۔

"نہیں پلیز نہیں، کیا میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی، مجھے اس سے خوف آتا ہے"۔

تبریز کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا ویسے آپ پاکستان میں کس کے پاس جائیں گی؟"

"میڈم نے کہا تھا، انہوں نے کراچی میں میرے لیے فلیٹ کا بندوبست کر دیا ہے جب میں کراچی جاؤں گی تو کوئی نہ کوئی ایئر پورٹ پر مجھے اپنا منتظر ملے گا"۔

"ہوں کراچی میں آپ کا اپنا تو کوئی نہیں ہے ناں"!

"ہاں، لیکن ریٹا، آن اور ممی، وہ سب بہت اچھے ہیں۔ میڈم نے مجھے ان سے ملنے سے منع نہیں کیا اور آپ___ کیا آپ مستقل کراچی میں رہتے ہیں؟"

"نہیں میرا گھر لاہور میں ہے۔ کراچی تو میں کبھی کبھار مس اینجل کے کہنے پر آتا ہوں"۔

"لاہور"! لیزا کے چہرے پر سایہ سا اتر آیا۔

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ پاکستان میں آپ مجھ سے ملتے رہیں گے"

"ہاں جب کبھی کراچی آیا تو ملوں گا"۔

لیزا کے اندر اداسی سی اترنے لگی۔ پتا نہیں کیا تھا وہ___ وہ کیوں اس شخص کی جدائی کے تصور سے بے قرار ہونے لگتی تھی۔ حالانکہ یہ اجنبی شخص یہ دلربا شخصیت کا مالک، نرم خو۔

تبریز مراد علی اس سے تین چار بار ہی تو ملا تھا' لیکن پتا نہیں کیوں ہر بار جب وہ ملتا اسے لگتا جیسے وہ ہمیشہ سے اس کے ساتھ تھا۔ اور اب اس سے جدائی کے تصور سے اس کا دل کٹ رہا ہو۔ ریٹا ہوتی تو وہ اس سے ضرور پوچھتی کہ کیا کبھی اس نے بھی ایسا ہی محسوس کیا تھا، لیکن ریٹا نہیں تھی، اور پتا نہیں ریٹا اب بھی کیفی کے لیے اپنے دل میں ویسی ہی محبت محسوس کرتی ہے یا نہیں۔ کیا پتا ریٹا نے اسے بھلا دیا ہو اور___ مگر نہیں ریٹا بھلا اس کو بھول سکتی ہے۔ وہ تو کہتی تھی کیفی کی بے وفائی نے اسے سچا محب بنا دیا ہے۔ اس کی محبت سے طلب ختم کر دی ہے۔

لیکن میں___ میرے دل میں اس شخص کی طلب جاگ اٹھتی ہے جب وہ میرے سامنے بیٹھا ہوتا ہے تو میرا دل اس کی رفاقت کی تمنا کرنے لگتا ہے اور باقی ساری تمناؤں پر یہ ایک تمنا غالب آ جاتی ہے۔

"آپ کیا سوچنے لگیں"؟ تبریز نے اسے سوچوں میں کھوئے دیکھ کر پوچھا۔

"لیزا! ہم کچھ نہیں کر سکتے ہم سب مجبور ہیں، بہت بے بس ہیں"۔

"اس وقت نینسی نہیں ہے، ہم بھاگ جائیں چھپ جائیں کہیں، بہت دور چلے جائیں کسی ایسے

"میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں میڈم مارتھا کے لیے کام کروں گی، اس لیے کہ میں دیپو، ماتا جی، بھابھو، بھاجی ان سب کے لیے زندگی کی خواہش مند تھی۔ شاید میں اکیلی تھی تنہا تھی۔ شاید اس لیے صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ میں ان کی زندگی کی اب بھی خواہاں ہوں___ میں وکی کے لیے اپنی جان دے سکتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں آپ کی موجودگی سے مجھے یوں لگنے لگا ہے' جیسے میں بہادر ہو گئی ہوں، مضبوط ہو گئی ہوں۔ پتا نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے، جیسے آپ کی مدد سے میں اس قید سے نکل جاؤں گی۔ آپ نے کہا تھا ناں کہ ذریعہ صرف ذریعہ ہے۔ ذریعے کی موت مقصد کی موت نہیں ہے اور ابھی ابھی کچھ دیر پہلے مجھے یوں لگا ہے' جیسے میرا مقصد میرے اندر موجود ہے اور آپ ذریعہ بن کر آئے ہیں، جیسے آپ کے توسط سے مجھے منزل مل جائے گی جیسے___"

وہ لمحہ بھر کو چپ سی ہو گئی۔

"اگر ہم یہاں سے بھاگ جائیں اور یہ لوگ ہمیں نہ ڈھونڈ سکیں اور پھر تمہارے دیپو بھائی کو تمہاری بھابھو کو اور___!"

"ہاں ہو سکتا ہے، وہ انہیں مار دیں، لیکن اگر ان کے بھاگیہ میں یہی لکھا ہے کہ انہیں اسی طرح مرنا ہے تو میں لیکھ نہیں بدل سکتی ناں، ہم انسان بڑے بزدل ہوتے ہیں۔ یونہی آنے والے لمحوں سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ہونا تو وہی ہوتا ہے جو ہمارے لیکھ میں ہے۔ ہمارا ڈر اور خوف ہاتھوں کی ریکھاؤں کو تو نہیں بدل سکتا ناں اور پتا ہے وہ بھی یہ ہی کہتی ہے کہ ہمارے مقدر میں یونہی لکھا تھا اور سوہنا رب چاہے تو پل میں مقدر کی ریکھائیں بدل دے اور ہونا تو وہی ہوتا ہے ناں جو اس کی مرضی ہوتی ہے"۔

"وہ کون ہے؟" تبریز کے چونک کر پوچھا۔

"وہی قیدی عورت"۔

"وہ مسلمان ہے"۔

"ہاں"۔

"لیکن نینسی تو کہہ رہی تھی کہ وہ بہت خطرناک ہے اور یہ کہ میں اسے چیک کر لوں، کہیں وہ بھاگ ہی نہ جائے"۔

"نہیں، وہ تو بڑی بے ضرر سی ہے" لیزا اٹھ کر واپس صوفے پر بیٹھ گئی۔

تبریز کی نظریں پھر اس کے چہرے پر ٹھہر سی گئیں۔

دلکش آنکھوں اور صبیح چہرے والی یہ لڑکی اگر اسے ان حالات میں نہ ملی ہوتی تو_ تو وہ اسے بتاتا کہ اچھی لڑکی تم نے بالکل اچانک بالکل بے خبری میں میرے دل میں جگہ بنائی ہے۔ اپنے آپ میرا ناتا تیرے ساتھ جڑ گیا ہے۔ آؤ ہم دونوں زندگی کے سفر میں رفیق بن جائیں' لیکن اب بھلا وہ اس سے کیا کہتا۔ کون سے خواب اسے دکھاتا جن کی کوئی تعبیر ہی نہیں تھی۔

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ دنیا کے کسی گوشے میں چھپ کر رہنے کا خواب دیکھنا تو آسان ہے، لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے یہ لوگ کوئی عام لوگ نہیں تھے۔ میڈم مارتھا کا تعلق اگرچہ کسی بڑی تنظیم سے نہیں تھا لیکن بگ باس بھی کوئی کمزور انسان نہیں تھا۔

کئی ممالک میں اس کے لوگ پھیلے ہوتے تھے وہ زبردست پیمانے پر ہیروئن کی تجارت کر رہا تھا۔ ڈرگ مافیا کے سب سے بڑے گروہ کے ساتھ بھی اس کا لین دین تھا۔ چونکہ اسے کسی کے ماتحت رہ کر کام کرنا پسند نہیں تھا اس لیے ڈیوڈ رچرڈ جو ڈرگ مافیا کے بڑوں میں سے ایک تھا کہ کہنے پر بھی اس نے اپنے آدمیوں کے

ملک میں جہاں یہ لوگ ہمیں تلاش نہ کرسکیں''۔

لیزا اٹھ کر اس کے پاؤں کے پاس آکر بیٹھ گی اور اپنا ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

''پلیز! آپ جانتے ہیں ناں آپ کا خدا کہتا ہے مایوسی کفر ہے''۔

''ہاں''۔تبریز نے کہا۔

''تو پھر آپ مایوس کیوں ہیں۔کوشش کیوں نہیں کرتے چلیں ہم بھاگ جائیں کہیں چھپ جائیں''۔

''وہ ہمیں جلد یا بدیر پکڑ لیں گے''

لیزا کا ہاتھ ابھی تک اس کے گھٹنوں پر تھا۔

''پلیز!!''

تبریز ساکت بیٹھا تھا۔

وہ کہہ رہی تھی۔

''اس کی رحمت بے حساب ہے،دینے پر آئے تو تو خزانے لٹا دے کیا تمہیں اپنے خدا پر یقین نہیں ہے''۔

''ہاں ہے شاید نہیں ہے''تبریز مراد علی الجھ سا گیا۔

''میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے ، بے گناہ بے جواز اس نے مجھے سب کچھ بھلا دیا ہے۔ یقین ،ایمان، آس امید کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس۔ بالکل تہی دامن ہوں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، جیسے میں کوئی روبوٹ ہوں۔ میری اپنی کوئی مرضی نہیں کوئی خواہش نہیں میں زندگی کو نہیں گزار رہا، زندگی مجھے گزار رہی ہے''

تبریز کی آواز بھرا گئی۔

''کوئی آس کا دیا نہیں، کوئی امید کی لو نہیں کوئی یقین کا سرا نہیں ہے لیزا بی بی۔ میں تو جیسے اندر سے بالکل خالی ہوں''۔

''آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے کیا آپ بھی میری طرح گھر سے کسی یقین کی تلاش میں نکلے تھے؟ کسی سچ کی کھوج تھی آپکو''؟

''نہیں میں تمہارے جیسا نیک فطرت نہیں ہوں۔ میں تو دنیادار انسان ہوں، پھر مجھے کسی یقین کی کیا ضرورت تھی۔ میرا یقین تو پہلے ہی پختہ تھا میرا ایمان تو پہلے ہی مکمل تھا۔ ایک خدا ایک رسول، ایک کتاب پر یقین کامل اور اس یقین میں رتی بھر بھی شک کی گنجائش نہیں تھی''۔

''پھر؟''لیزا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''پھر__!''تبریز مراد علی کی آنکھیں خون رنگ ہوگئیں۔

''میں__ ناکردہ گناہوں کی پاداش میں مارا گیا ہوں، میں__!''

وہ ہولے ہولے اپنے اوپر گزری داستان سنا رہا تھا اور لیزا دم بخودی اس کی باتیں سن رہی تھی وہ تو اپنے آپ کو مظلوم سمجھنے لگی تھی۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ دکھی ہے، لیکن یہ ملوک آنکھوں والا اجنبی، اس نے تو اس سے بھی زیادہ پرخار راستوں پر سفر کیا ہے۔ جب وہ نشے کی طلب میں بے چین ہو کر اپنے تڑپنے کی کیفیت بتا رہا تھا تو لیزا کے ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ اور وہ بمشکل اپنے آپ کو تھامے بیٹھی تھی۔

یوں لگتا تھا جیسے اس کی کہانی سے اس کا دل پھٹ جائے گا۔

جب تبریز نے اپنی بات ختم کی تو دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بہت سارے خاموش لمحے دونوں کے درمیان سے گزر گئے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے بڑی دیر بعد لیزا نے

''ہاں وہ نارمل نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے، وہ پاگل ہو جائے گی کسی دن ہم اسے ساتھ لے جائیں گے ں کا علاج کروائیں گے، وہ بہت سادہ اور معصوم ہے''۔

''لیکن وہ__!''

''داؤد خان نے اس کی ذمہ داری مجھے سونپی ہے جب تک وہ میرے فلیٹ میں ہے، اس کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ میری کوتاہی پر میڈم مجھے گولی بھی مار سکتی ہیں۔ تم لوگ آزاد ہو کہیں بھی جا سکتے ہو۔ میڈم نے تمہیں باہر جانے کی اجازت بھی دے رکھی ہے۔ میں کہہ سکتی ہوں تم گھومنے کی غرض سے گئی تھیں پھر واپس نہیں آئیں۔ تبریز کا تو بہت دنوں تک پتا بھی نہیں چلے گا۔ میڈم سمجھیں گی وہ چلا گیا ہے، لیکن یہ قیدی عورت __!''

''تو کیا وہ قیدی رہے گی۔ داؤد خان واپس آکر اس پر پھر تشدد کرے گا بے چاری__!''

''دیکھو میں کوشش کروں گی کہ جب داؤد خان اسے اپنے فلیٹ میں لے جائے تو وہاں سے کسی نہ کسی طرح اسے نکال لوں۔ لیکن میں وعدہ نہیں کرتی۔ تم بیٹھو میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں اور پھر کافی پیتے ہوئے سوچتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے''۔

☆☆☆☆

آنٹی ایلس کے گھر آئے ہوئے انہیں پندرہ دن ہو گئے تھے۔ پہلے لیزا آئی تھی۔ اس روز میڈم مارتھا نینسی کے اپارٹمنٹ میں ہی تھیں اور انہوں نے لیزا کو بتایا تھا کہ اسے اب پاکستان جانا ہے اور اس کے لیے وہاں رہائش کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ گل خان جو ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہے گا، ان کا اپنا آدمی ہے۔ علاوہ ازیں مس اینجل اس کے لیے کسی خاتون کا انتظام بھی کر دیں گی جو گھر کی دیکھ بھال کر لیا کرے گی۔ باقی ہدایات یہ کہ تم نے ہمارے لیے کیا کرنا ہے تمہیں پاکستان جا کر مس اینجل سے مل جائیں گی۔ تب لیزا نے ان سے اجازت لی کہ وہ ریٹا وغیرہ کے لیے کچھ شاپنگ کرنا چاہتی ہے۔

''تم اکیلی جاؤ گی یا نینسی کے ساتھ؟''

''نو میڈم مجھے تو آج وہ جولیس سے''۔نینسی نے معذرت کی تو میڈم مارتھا ہنس پڑیں۔

''تم شادی کب کر رہی ہو ڈرالنگ؟''

''جلد ہی نینسی نے مسکرا کر کہا۔

میڈم مارتھا نے نینسی سے کہا کہ''وہ لیزا کو شاپنگ کے لیے کچھ رقم دے دے''۔

اور پھر میڈم مارتھا کی موجودگی میں ہی وہ نینسی سے روپے لے کر اپارٹمنٹ سے نکل آئی تھی اور مسٹر نیلسن کے اسٹور کے باہر جولیس اس کا منتظر تھا اور وہاں سے وہ آنٹی ایلیس کے پاس آگئی تھی۔ چند دن بعد تبریز بھی وہاں آگیا تھا۔ وہ ایئرپورٹ جانے کے بجائے آنٹی ایلیس کے گھر پہنچ گیا تھا۔

اور اب پندرہ دن سے وہ دونوں وہاں ہی تھے۔ اس دوران نینسی ایک بار آئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ میڈم مارتھا لیزا کے غائب ہونے پر بہت حیران ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان جانے والی فلائٹس وغیرہ چیک کی گئی ہیں اور اب اسے ملک میں ہی تلاش کیا جا رہا ہے اور اسکے لیے ایک پیشہ ور شخص کی خدمات لی گئی ہیں۔ تبریز کے متعلق بھی اطلاع مل چکی ہے کہ وہ پاکستان میں نہیں پہنچا۔ کل شام ہی مس اینجل نے اطلاع دی ہے کہ اس نے پاکستان آکر رپورٹ نہیں دی۔ میڈم بہت غصے میں ہیں، لیکن باس کو یقین ہے کہ جلد یا بدیر تم لوگ ڈھونڈ لیے جاؤ گے۔

اتھا ان کے ساتھ شامل ہونا پسند نہیں کیا تھا اسے تنہا کام کرنا پسند تھا۔
شروع میں تو اس کے ساتھ صرف چند افراد تھے لیکن اب ان کی تعداد کافی تھی۔
"تبریز نینسی آجائے گی جلدی کرو پلیز۔ اگر ہم پکڑے گئے تو وہ ہمیں مار دیں گے ناں تو کیا وہ
ندگی بہتر نہیں ہوگا"۔
وہ اس طرح اتنی آسانی سے ہمیں نہیں ماریں گے لیزا! اذیتیں دے دے کر، زندہ رکھیں گے اور___"
"جو بھی ہو" لیزا نے اس کی بات کاٹ دی یکا یک اس کے اندر وہ لڑکی بیدار ہوگئی تھی، جو ایک رات
چپکے سے اپنے گھر سے نکل کر انکل رابرٹ گھر آ گئی تھی۔ سارے خوف اور ڈر پیچھے چھوڑ کر، سارے ناتے توڑ کر
۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
"آپ ساتھ ہوں گے تو میں ہر اذیت سہہ لوں گی"۔
"لیزا تم؟" تبریز نے اس کی طرف دیکھا۔
"اپنی قسمت آزما دیکھو علی!"
نینسی اچانک دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔
"نینسی تم"۔ تبریز گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔
"تم کب آئیں"؟
"جب تم میڈم مارتھا کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کے متعلق بتا رہے تھے"۔
"اوہ! تبریز پھر بیٹھ گیا۔
"تو تم نے سب کچھ سنا ہے"؟
"ہاں اور میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی قسمت آزما کر دیکھ لو۔ میں تمہاری اتنی مدد کر سکتی ہوں کہ
مضافات میں میری ایک بوڑھی خالہ کا فارم ہے، تم وہاں چھپ جاؤ کچھ دنوں کے لیے، بلکہ کچھ عرصہ کے لیے
مجھے یقین ہے کہ وہاں تمہیں کوئی تلاش نہیں کر سکے گا۔ کچھ عرصہ بعد تم وہاں سے کہیں او چلے جانا"۔
"نینسی تم؟" تبریز نے حیرت سے اسے دیکھا۔
کیا معجزے یوں بھی نمودار ہوتے ہیں کیا ان کے لیے خدا کی رحمت کے دروازے وا ہونے والے
ہیں اور اس کے دل میں پہلی بار امید کی ایک ہلکی سی کرن جگمگا اٹھی۔
کیا خبر___ کیا خبر زندگی ان کے لیے کوئی انعام لیے منتظر ہو۔ کیا خبر کوئی معجزہ ہو جائے کوئی انہونی

اور وہ___!
وہ اور لیزا اس جال___ سے آزاد ہو جائیں پھر___ ہاں پھر وہ لیزا کو میاں جی کے پاس لے جائے
گا اور میاں جی اس کی راہنمائی کریں گے میں انہیں کہوں گا' وہ لیزا کے دل سے شکوک کے سارے کانٹے نکال
پھینکیں اور یقین کا وہ سرا اس کے ہاتھ میں تھما دیں جو کھو گیا ہے۔
"اور تم!" لیزا نے تبریز کو خاموش دیکھ کر نینسی کو مخاطب کیا۔
"کیا تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم چلے گئے تو کیا میڈم مارتھا تمہیں اس کی سزا نہیں دیں گی"؟
"میڈم مارتھا! ہاں شاید___ لیکن ہم کچھ بہتر راستہ تلاش کر لیتے ہیں یوں کہ تم لوگ اس طرح جاؤ
کہ میرا دامن صاف رہے۔ یعنی کوئی پلان بنا لیتے ہیں۔ میڈم تو شاید چند دن ٹیکساس میں ہی رہیں اور علی! تم
نے کب پاکستان جانا ہے؟"

دراصل آج کل باس بہت پریشان ہیں___ ڈرگ مافیا کے بڑوں سے ان کا کوئی جھگڑا ہو گیا ہے۔
سو وہ چھوٹی موٹی باتوں کی طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں اور یہ تمہارے لیے اچھا ہے۔ بہت جلد تمہارے لیے
کوئی بہتر انتظام کر لوں گی۔ جولی نے ثوبان سے بات کر لی ہے' اور اب پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ نینسی نہ تو خود آئی
تھی اور نہ ہی اس نے کوئی اطلاع بھجوائی تھی۔ لیزا کو بہت بے چینی ہو رہی تھی۔
"پتا نہیں کیا بات ہے نینسی بہت جلد آنے کا وعدہ کر کے گئی تھی، پھر آئی کیوں نہیں"۔
اس نے ناشتا کرتے ہوئے تبریز سے پوچھا۔
"ممکن ہے کوئی مصروفیت ہو" تبریز نے خیال ظاہر کیا۔
"لیکن ہم آخر کب تک یہاں چھپے رہیں گے"۔
"جب تک یہاں چھپنا ہمارے لیے ضروری ہے"۔
تبریز نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے غور سے لیزا کی طرف دیکھا، جو بہت پریشان لگ رہی تھی۔
"دیکھیں مس لیزا! جب ہم نے ایک فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم نے خود کو اس جال سے ہر صورت نکالنا
ہے، تو ہمیں حوصلے اور صبر سے کام لینا ہے۔ موت بھی ہمارا مقدر ہو سکتی ہے اور آزادی بھی"۔
مجھے پتا ہے، لیکن کب تک ہم یونہی یہاں بے کار بیٹھے رہیں گے"۔
"جب تک حالات سازگار نہیں ہوں گے۔ نینسی نے کہا تھا، ایک ماہ بھی لگ سکتا ہے اور زیادہ بھی"۔
"نینسی کی آنٹی کیا سوچتی ہوں گی"۔
"کچھ بھی نہیں وہ ایک بہت اچھی خاتون ہیں او نینسی نے کہا تھا کہ ہمیں اس کے متعلق پریشان نہیں
ہونا چاہیے۔ آنٹی ہمارے یہاں قیام سے خوش ہوں گی"۔
تب ہی آنٹی ایلیس نے لیزا کو آواز دی۔
سنو نینسی کا فون آیا ہے اس نے تمہارے لیے پیغام دیا ہے کہ وہ دو تین روز میں آئے گی"۔
"اچھا!" لیزا کے چہرے پر اطمینان اتر آیا۔ ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے وہ بہت مطمئن لگ رہی تھی۔
نینسی آئے گی تو یقیناً یہاں سے جانے کی کچھ سبیل بن جائے گی، لیکن پھر___ پھر کیا ہوگا۔
ڈش واشر میں برتن ڈالتے ہوئے وہ سوچ میں کھو گئی۔
پتا نہیں شیخ ثوبان ہمیں کہاں لے کر جائے گا اور پھر وہاں اس اجنبی ملک کے کسی اجنبی گاؤں میں
باقی ماندہ زندگی گزر جائے گی اور وہاں کوئی بھی اپنا نہیں ہوگا اور تبریز___ تبریز مراد علی! پتا نہیں یہ بھی اسی شہر اسی
گاؤں میں رہے گا یا کہیں اور چلا جائے گا۔ کتنے دن ہو گئے تھے انہیں ایک گھر میں رہتے ہوئے لیکن ان پندرہ
دنوں میں ان کی آپس میں بہت کم بات ہوئی تھی۔ وہ آنٹی ایلیس کے بیڈروم میں سوتی تھی جب کہ تبریز کے لیے
آنٹی ایلیس نے نینسی کا بیڈروم کھول دیا تھا۔ دراصل نینسی کو انہوں نے ہی پالا تھا۔ اور نینسی اب بھی پندرہ بیس
دن بعد ضرور ان سے ملنے آتی اور ایک دو روز رہ کر جاتی تھی۔ تبریز سے اس کی ملاقات ناشتے، لنچ اور ڈنر پر ہی
ہوتی تھی۔ تبریز اکثر کمرے میں ہی مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہ شام کی چائے باہر لان میں آ کر پی لیتے تو
کوئی بات ہو جاتی تھی۔
آنے والے لمحے کیسے ہوں گے؟ شاید دونوں ہی ان سوالوں سے خوفزدہ تھے اور اس موضوع پر انہوں
نے بہت کم بات کی تھی لیزا کے لبوں پر کئی بار یہ سوال آیا تھا کہ وہ تبریز سے پوچھے تو سہی کہ آگے کیا ہوگا۔ لیکن پھر
وہ پوچھ نہ سکی۔ کہیں تبریز یہ نہ کہہ دے کہ اب کیا سوچنا۔

''میڈم کی واپسی پر''۔

''توتم پاکستان جانے کے بجائے فارم پر آنٹی ایلس کے پاس چلے جانا۔ میں لیزا کو بھی کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچادوں گی اور پھر تم لوگ وہاں سے عرب ریاستوں کی طرف نکل جانا۔ میں جولیس سے کہوں گی وہ کوئی انتظام کردے گا۔ اس کی کئی عربوں سے دوستی ہے بلکہ یہاں سفارت خانے میں بھی اس کا ایک دوست ہے شیخ ثوبان بہت پیارا انسان ہے۔ اگر مجھے جولیس سے محبت نہ ہوتی تو میں ثوبان سے محبت کرتی''۔

نینسی ہنسی۔

''تم ___ تم بہت اچھی ہو نینسی''۔ تبریز نے ممنونیت سے کہا۔

''لیکن تم ہمارے لیے اپنے آپ کو مصیبت میں نہ ڈالو۔ خدا کوئی سبب بنادے گا۔ ہم ضرور کچھ کریں گے۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے اندر سے مایوسی کی ساری گرد کو جھاڑ دیا ہے۔ میاں جی کہتے تھے، بندہ کوشش کرے تو خدا اپنے بندوں کی ضرور مدد کرتا ہے''۔

''مجھے کچھ نہیں ہوگا مسٹر علی''۔ نینسی پھر مسکرائی۔

''میں کوئی بہت اچھی لڑکی نہیں ہوں، لیکن لیزا کی صحبت میں رہ کر میرے اندر بھی نیکی کرنے کی خواہش جاگ اٹھی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کوئی نیکی کرلوں، کوئی چھوٹی سی نیکی ہی سہی۔ پلیز مسٹر علی مجھے یہ نیکی کرنے دو اور پھر تمہیں شاید نہیں پتا کہ میں نے ہی میڈم مارتھا کو انفارم کیا تھا کہ تم بہت جلد ملک چھوڑ کر جارہے ہو۔ پلیز مجھے اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے دو''۔

''نینسی!'' لیزا بے اختیار آگے بڑھ کر اس کے گلے لگ گئی۔

''خداوند یسوع مسیح تمہیں اس نیکی کا ضرور اجر دے گا''۔

''آل رائیٹ!'' نینسی نے اسے تھپکی دی۔

''اور تم جب اپنے آپ کو آزاد محسوس کرو، ہر خوف سے تو سنو مسٹر علی سے شادی کرلینا۔ ابھی ابھی میں نے علی کی آنکھوں میں تمہارے لیے محبت کی جوت جلتے دیکھی ہے''۔

لیزا کے دل میں ایک ساتھ کئی چراغ جل اٹھے اس نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا، لیکن علی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا، بلکہ وہ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا دکھائی دیتا تھا۔

اور چراغ بجھنے لگے۔

پتا نہیں نینسی کو دھوکا ہوا ہے۔ بھلا وہ اتنا دلکش اتنا پیارا شخص مجھ جیسی بے مایہ بے وقعت لڑکی سے کیوں محبت کرے گا' بے گھر ___!

''تم گئی تھیں اس کے کمرے میں؟'' نینسی نے پوچھا تو لیزا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''ہاں''۔

''کیا کر رہی تھی وہ؟''

''کچھ نہیں بس دیوار سے سر ٹیکے آنکھیں موند کر گا رہی تھی''۔

''پتا نہیں کیوں مجھے اس پر بھی بہت ترس آتا ہے معصوم عورت معلوم نہیں اس نے داؤد خان کا کیا بگاڑا ہے۔ میڈم بتا رہی تھیں، یہ اسکا پرسنل افیئر ہے کوئی''۔

''ہم ___ ہم اسے بھی ساتھ لے جائیں گے نینسی''

''اسے!'' نینسی سوچ میں پڑ گئی۔

''میں'' لیزا کے ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

''میں۔ میں تو وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ تو ___ وہ تو شاید اول روز سے ہی اس کی محبت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اسی روز جب پہلی بار اس نے اسے دیکھا تھا اور ریٹا نے کہا تھا۔

کہ کسی کو سوچتے رہنا محبت ہے۔

کسی چہرے کو آنکھوں اور خوابوں کی دعا پر نقش کرنا۔

ٹھٹھرتی آبشاروں میں بجھی ٹھنڈی ہوا سہنا۔

شبوں کے گنبدوں میں گونجتی بے چینیوں کے درمیان رہنا۔

خلا میں دیکھتے رہنا۔

محبت ہے۔

کسی کھوئے ہوئے کو غیر ارادی طور پر

ہر اجنبی چہرے میں اکثر ڈھونڈتے رہنا

محبت ہے۔

اور اس نے اس ملوک آنکھوں والے اجنبی کو کہاں کہاں نہیں تلاشا تھا۔ ہر اجنبی چہرے کی طرف یہ سوچ کر نگاہ اٹھائی کہ کہیں یہ وہی نہ ہو۔

وہی سنجیدہ اور اداس سا اجنبی کتنی راتیں جاگ کر اس نے اسے سوچا تھا اور کب کیسے چپکے سے اس کے دل میں اس کی رفاقت کی خواہش جاگی تھی۔ اور اس خواہش نے کیسے چپکے چپکے اس کے من میں جگہ بنالی تھی کہ اس کے دل سے سچ کی طلب کم ہوگئی تھی۔ اور محبت کی طلب جاگ اٹھی تھی تبریز مراد علی کی محبت کی طلب۔

اور آج جب وہ اسے اپنی محبتوں کا یقین دلا رہا تھا اور وہ ساکت بیٹھی تھی۔

''سوری لیزا'' تبریز نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

''شاید تمہیں میری بات اچھی نہیں لگی۔ لیکن میں نے تمہیں محض اپنے دل کی بات بتائی ہے اور تمہیں اپنی رفاقت کا یقین دلایا ہے لیکن اگر تم ایسا نہیں چاہو گی تو ضروری نہیں ہے کہ ایسا ہی ہو۔ تم جس طرح زندگی گزارنا چاہو گی' میں ہر طرح تمہاری مدد کروں گا۔ پلیز تم کبھی اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھنا۔ شاید قدرت ہم پر مہربان ہو جائے' شاید اس پیارے خدا کو ہم پر رحم آجائے۔ کوئی معجزہ ہو جائے اور ہم مکمل طور پر آزاد ہو جائیں۔ تب تم جہاں جانا چاہو گی میں تمہیں وہاں پہنچادوں گا۔

ہندوستان میں تمہارے عزیزوں کے پاس یا جہاں بھی۔ بس تم دعا کرتی رہا کرو کہ ہم اپنے عزیزوں کے ساتھ مل کر زندگی کا سفر طے کرسکیں''۔

تبریز بول رہا تھا۔ لیکن لیزا ساکت بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اور دل کے اندر ایک طوفان سا ایک ہلچل سی مچی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ شدید آندھیوں کی زد میں ہو۔

اس شخص کی محبت کی طلب تھی اسے لیکن اس شخص کی محبت ملنے کی امید نہیں تھی۔ رتی بھر بھی نہیں اور یہ شخص۔ یہ اجنبی اس سے اپنی محبتوں کا اظہار کر رہا تھا۔

اور اس نے تصور تک نہیں کیا تھا۔ سوچا تک نہیں تھا کہ کبھی اس شخص کی رفاقت اسے ملے گی۔ وہ ریٹا بھی تو جسے کیفی نے محبتوں کے خواب دکھائے تھے۔ لیکن جو اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ اور جس کی رفاقت کے لیے ریٹا نے راتوں کو جاگ جاگ کر تڑپ تڑپ کر دعائیں مانگی تھیں۔ لیکن وہ اس کی دسترس سے نکل گیا تھا۔ اور ایک وہ تھی۔

پلان تو تم نے ہی بنایا تھا پھر۔

''ہاں پلان تو میں نے ہی بنایا تھا'' اس نے برتن پونچھ کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے زیر لب کہا۔

''جس طرح گھر سے بغیر سوچے سمجھے نکل آئی تھی۔ اس طرح اب بھی۔ اب بھی میں نے کیا تھا لیکن میں نے ٹھیک کیا ہے۔ گناہ اور جرم کی زندگی سے عزت اور گمنامی کی موت بہتر ہے''۔

تمام برتن صاف کرنے کے بعد وہ باہر نکل آئی تبریز باہر کرسی پر نیم دراز اخبار پڑھ رہا تھا۔ لیزا بھی خاموشی سے اس کے قریب ہی آ کر بیٹھ گئی۔

''کیا سوچ رہی ہیں آپ؟''

تبریز نے اخبار پڑھتے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''کچھ نہیں''

لیزا چونک پڑی۔

''آپ شاید بہت پریشان ہیں کیا بات آپ کو زیادہ پریشان کر رہی ہے''

لیزا جواباً خاموش ہی رہی۔

''کیا آپ پچھتا رہی ہیں۔'' تبریز نے پھر پوچھا۔

''نہیں تو پچھتانا کیسا جو ہو گیا سو ہو گیا۔''

''ہاں جو ہو گیا سو ہو گیا۔ کم از کم یہ اطمینان تو ہے۔ اور رہے گا کہ ہم نے ذلت کی زندگی کو خیر باد کہہ دیا ہے اور ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بدرجہا درجے بہتر ہوتی ہے''

''ہاں''۔ لیزا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''میں کچھ اور سوچتی ہوں''۔

''مثلاً کیا'' لیزا نے اخبار میز پر رکھ دیا اور اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گیا مثلاً یہ کہ ایک رات اچانک لیٹے لیٹے مجھے خیال آیا تھا کہ ہمارا دھرم سچا نہیں ہے۔ سچ کچھ اور ہے جو میری نظروں سے اوجھل اور چھپا ہوا ہے اور میں اس سچ کی کھوج میں گھر سے نکل پڑی۔ میں سمجھتی تھی کہ بس دنوں کی بات ہے۔ مجھے سچ کا پتا چل جائے گا اور پھر میں اس سچ کا دامن تھام کر ایک بار ماتا جی اور بھابھی کے پاس ضرور جاؤں گی اور اس سچ کی روشنی ان کو ضرور دکھاؤں گی۔ شاید کوئی کرن ان کے من میں بھی روشنی کر دے لیکن دن کیا مہینے بیت گئے۔ یوں سال بیت جائیں گے۔ اور شاید میرا اپنا من بھی یونہی تاریک رہے گا۔ انکل رابرٹ سچ کہتے تھے۔

''رتو! یہ کانٹوں کا سفر ہے''۔

''بڑی مشکل راہ ہے چندا'' پر میں نے سوچا تھا بھلا اس دنیا میں کوئی بات ناممکن بھی ہے۔ جب من میں آگ لگی ہو۔ دل میں سوز ہو تمنا کا گداز ہو تو پھر بھلا منزل ملنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ پر میری منزل تو شاید ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں چھپ گئی ہے۔ اب تو مجھے یوں لگنے لگا ہے جیسے میرے من کی وہ آگ ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ اور اس کی جگہ ایک نئی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ ایک نئی تمنا ایک نیا سوز دل میں پیدا ہو گیا ہے۔ شاید اس تمنا کا انجام بھی وہی ہو۔''

''آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں لیزا'' تبریز نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

''سوری میں شاید کچھ غلط کہہ گئی ہوں۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ اب ہم بھاگ کر یہاں آنٹی ایلیس کے پاس چھپ گئے ہیں۔ ہم نے سوچا ہے کہ ہم کہیں کسی ریاست میں جا کر چھپ جائیں گے اور وہاں ایک صاف

جس کے دل میں اس کی طلب تو تھی لیکن اس نے اسے مانگا نہیں تھا۔ اور وہ قیدی عورت کہتی تھی۔

''کبھی کبھی وہ سوہنا رب بن مانگے بھی جھولیاں بھر دیتا ہے جیسے اس نے مجھے بن مانگے میاں جی اور ماں جی کی محبت دے دی تھی''۔ اور مہراں کے اس سوہنے رب نے اس کی جھولی بھی بن مانگے بھر دی تھی۔ اور اللہ کی یہ رحمت اس سے یکلخت نہیں سمٹ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ اس کے دامن میں اتنی وسعت نہیں ہے کہ وہ اس انعام کو سمیٹ سکے۔

''وہ نوازنے پر آئے تو اپنے گناہگار بندوں کو بھی نوازتا چلا جاتا ہے۔''

بابا کہا کرتا تھا۔

''ارے بی بی جی کیوں تردد کرتی ہو۔ کیوں گھلاتی ہو اپنی جان کو۔ جب اس نے بلانا ہوا اپنی طرف تو خود ہی بلا لے گا۔ خود ہی بند در کھلتے جائیں گے''

اور جیسے وہ اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ جیسے بند در کھلتے جا رہے تھے۔ اور میں تو اتنی گناہ گار ہوں۔ میرے دل سے تو اس کی طلب بھی مٹتی جا رہی تھی۔ میرے دل کے اندر تو یہ شک کے لمبے لمبے کانٹے اُگے تھے۔ اور اُن کانٹوں کی چبھن سے میرا اپنا ہی من زخمی ہو رہا تھا۔

اور میں نے تو ایک بار بھی اسے نہیں پکارا۔

ایک بار بھی اپنی طلب اس پر ظاہر نہیں کی اور اس نے کیسے جان لیا۔ کیسے نواز دیا مجھے۔

''وہ سب جانتا ہے اندر کا بھی اور باہر کا بھی سب اس کے علم میں ہے۔ وہ کبھی اپنے بندوں سے غافل نہیں ہوتا''

بابا نے ایک دن کہا تھا۔

اور وہ مجھ سے بھی غافل نہیں تھا۔

وہ ___ کیفی کا خدا۔ مہراں کا خدا اور تبریز مراد علی کا خدا۔ ارے اس نے مجھے کیسے نواز دیا۔ کس طرح مجھ گناہگار بے دین کو لامذہب کو۔

آنسو پلکوں کا بند توڑ کر اس کے رخساروں پر پھسل آئے۔

''اور اس کی درگاہ میں آنسوؤں کو بہت جلد رسائی ملتی ہے'' پروفیسر احسان کہہ رہے تھے۔

''میرے مولا''۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔

''اے سچ۔ اے حق۔ میرے آنسوؤں کا نذرانہ قبول کر۔ اور مجھے آگاہی دے۔ میرے دل کو اپنے ہونے کا یقین دے مجھے اپنا پتا دے میرے آقا۔

میرے دل سے آج سارے شکوک ختم کر دے۔ آج مجھے سیدھا راستہ دکھا دے۔

حق کا راستہ۔

اے خدا۔ اے بھگوان۔ اے یسوع مسیح کے خداوند۔

تو ہے۔ تو یقیناً ہے۔

تو نے مجھے بے طلب دیا ہے۔

''بن مانگے میری جھولی بھر دی ہے''۔

اس کے اندر کے آنسوؤں کے سمندر ابل رہے تھے۔

بہت دنوں بعد دل پھر انہی کیفیات کی زد میں تھا۔

ستھری اور خوف سے آزاد زندگی گزار سکیں گے تو کیا ممکن ہے یہ محض ایک خواب نہیں ہے۔

کیا یہ خواب بھی اس خواب کی طرح بکھر نہیں جائے گا جو خواب میں نے دیکھا۔ تھا سچ کی تلاش کا خواب۔ سچے دین کی تلاش میں کہاں سے چلی ہوں اور کہاں آ کر ٹھہر گئی ہوں۔ خالی ہاتھ تہی دامن'۔

''آپ نے خود ہی اس روز کہا تھا ناں کہ تمہارا خدا کہتا ہے کہ مایوسی کفر ہے تو پھر آپ کیوں مایوس ہو رہی ہیں۔

تبریز کی نگاہیں لیزا کے چہرے پر تھیں اور لیزا نگاہیں جھکائے اب بھی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''تمہارے خدا پر میرا یقین ابھی پختہ نہیں ہے۔ جب میں کراچی میں تھی تو پروفیسر احسان فتح پوری کی باتیں کبھی کبھی میرے وجود کی عمارت کو ہلا کر رکھ دیتی تھیں۔ مجھے یوں لگتا تھا' وہ خدا جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے۔ وہ میرے آس پاس ہی کہیں ہے اور مجھے اپنے ہونے کی گواہی دے گا۔ لیکن پروفیسر احسان کہتے تھے۔ اس کی گواہی تمہارا دل دے گا۔ اور دل کی گواہی سب سے معتبر ہے۔ جس دن تمہارے دل نے اس کی وجود کی گواہی دی۔ اس دن تمہارے بند قفل کھل جائیں گے۔ تمہیں خود بخود ادارک ہو جائے گا۔ مگر پتا نہیں کیوں دل گواہی دیتے دیتے ٹھٹک سا جاتا ہے۔ پروفیسر احسان کہتے تھے کہ مایوسی کفر ہے اور وہ قیدی عورت بھی یہی کہتی تھی۔

''میرا سوہنا رب کہتا ہے مایوسی کفر ہے''

لیکن میں کیا تبریز مراد علی! میں تو چلتے چلتے تھک گئی ہوں۔ میرے پاؤں میں تو اتنے کانٹے چبھے ہوئے ہیں کہ مجھے مزید چلنا مشکل ہو رہا ہے۔ کیا وہ اپنی طلب میں اپنی تلاش میں آنے والوں کے لیے راستے اتنے ہی مشکل بنا دیتا ہے۔ میں۔ اس کی آواز بھر گئی۔

''میں تمہارے ساتھ بھاگ کر یہاں آ گئی ہوں اس لیے کہ مجرم زندگی گزارنا میرے لیے عذاب تھا۔ لیکن اب میں سوچتی ہوں۔ آگے کا سفر کیسے طے کروں گی۔ میں اکیلی عورت ہوں۔ کیا دنیا کا کوئی گوشہ ایسا بھی ہوگا جہاں عورت تنہا زندگی گزار سکے۔ بالکل تنہا باپ، بھائی، شوہر، بیٹا کسی بھی سہارے کے بغیر۔ وہاں کراچی میں رہتا تھی۔ آن تھی۔ ممی تھیں پھر میڈم مارتھا کا سہارا تھا۔ وہاں کون ہوگا۔ تم نہ جانے کہاں چلے جاؤ گے کب تک ساتھ دو گے''۔

لیزا تبریز نے نرمی سے کہا۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں حق کی تلاش میں تمہاری صحیح راہبری کر سکوں گا۔ اس کی گواہی تو تمہارا دل ہی دے گا۔ پروفیسر صاحب صحیح کہتے تھے۔ لیکن زندگی کے باقی ماندہ سفر میں' میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ تم تنہا نہیں ہو۔ میں ہوں تمہارے ساتھ ہم دونوں مل کر اکٹھے زندگی کا سفر طے کریں گے۔ میرے بھی تو سب مجھ سے بچھڑ جائیں گے۔ ہم دونوں مل کر ایک گھر ایک خاندان بنائیں گے۔

''تم۔ تم مجھ سے شادی کرو گے؟''

''ہاں'' تبریز مسکرایا

''مگر میں۔ میں تو ودھوا (بیوہ) ہوں'' لیزا کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''ہمارے پیارے نبیؐ نے بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی ہے اور ہمارے مذہب میں ہے کہ بیوہ عورتوں کی شادی کر دو۔ لیکن میں تم سے اس لیے شادی نہیں کروں گا کہ تم اکیلی ہو۔ یا مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ بلکہ لیزا۔ میں میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ شاید محبت اسی جذبے کو کہتے ہیں جو میرے دل میں تمہارے لیے بیدار ہوا ہے۔ آج سے پہلے میرے دل میں شاید کسی کے لیے ایسا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ تم میرے لیے کیا محسوس کرتی ہو۔''

خان اپارٹمنٹ میں نہیں تھا۔ اور مہراں گھر میں اکیلی تھی۔ میرے ساتھ جولیس تھا۔ میں نے مہراں کو فوراً جولی کے ساتھ بھیج دیا اور خود وہاں ہی بیٹھ کر داؤد خان کا انتظار کرنے لگی۔ داؤد خان آیا تو معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ مہراں گھر پر نہیں ہے۔ میں نے مہراں کا دروازہ لاک کر دیا تھا۔ جوتر جو داؤد خان کی عدم موجودگی میں اپارٹمنٹ میں ہوتا ہے وہ اس وقت اپنے کمرے میں تھا۔ اسے معلوم بھی نہیں ہو سکا کہ میں نے چپکے سے مہراں کو غائب کر دیا ہے۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا تھا۔ سامنے مہراں کے کمرے کی چابی دیکھ کر اچانک ہی میرے دل میں خیال آیا تھا اسے آزاد کرنے کا۔ جولیس گاڑی میں تھا۔ بس میں نے مہراں کو اس تک پہنچا دیا۔ اور جونز جب باہر آیا تو اسے پتا ہی نہ چل سکا''

''اور اب'' حبیبہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''اب تک داؤد خان کو پتہ چل چکا ہوگا''

''معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے' چل چکا ہو۔ ہو سکتا ہے رات کو جب جونز اسے کھانا وغیرہ دینے جائے تو پتا چلے''

''اور اب وہ کہاں ہے؟''

''جولیس اسے یہاں لانے ہی والا ہوگا۔ علی کہاں ہے؟''

''میرے کمرے میں ہوگا''

''کم آن۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے بلکہ میرے ساتھ نہیں جولیس کے ساتھ۔ جولی ابھی مہراں کو چھوڑنے آئے گا تو تمہیں ساتھ لے جائے گا اور آج کا دن تم شیخ ثوبان کے اپارٹمنٹ میں گزارنا۔ اور کل۔ بہت جلد علی اور مہراں بھی تم سے آملیں گے''۔

''تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ نینسی۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی اور تمہارے لیے دعا کروں گی؟

حبیبہ نے نینسی کا شکریہ ادا کیا۔ اور وہ دونوں کچن سے باہر نکل آئیں۔ تبریز اپنے کمرے میں ہی تھا۔ حبیبہ کے جانے کا سن کر وہ بے چین سا ہو گیا۔

کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ ہم دونوں اکٹھا جاتے''

''نہیں''۔ نینسی مسکرائی

''لیکن تم فکر نہیں کرو۔ ایک دو روز میں تم بھی وہاں پہنچ جاؤ گے''۔

''اور ثوبان''۔

''بہت گریٹ آدمی ہے۔ بہت نائس مین ہے میں نے اسے ساری بات سچ بتا دی ہے۔ وہ ہر طرح سے تمہاری مدد کے لیے تیار ہے۔ اس کے ملک میں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ایک بار تم اس کے ملک میں پہنچ جاؤ۔ پھر اگر تم نے چاہا تو وہ کیا ہے کہ تمہاری جھلک بھی کسی کو نظر نہیں آئے گی''۔

تب ہی باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔

''اوہ میرا خیال ہے جولی آ گیا ہے لیزا تم اپنا سامان لے آؤ۔

سامان ہی کیا تھا۔ ایک بیگ جس میں چند جوڑے کپڑے تھے اور بس پاسپورٹ وغیرہ تو پہلے ہی نینسی نے ثوبان کو پہنچا دیا تھا۔

بیگ اٹھا کر آنٹی ایلیس کو خدا حافظ کہہ کر جب وہ پورچ تک آئی تو نینسی اور تبریز باہر کھڑے تھے اور تبریز حیران آنکھوں سے مہراں کو دیکھ رہا تھا۔

''مہراں آپا آپ یہاں''۔

وہی ہاں اور نہ کی تکرار۔ برسوں کے بند دروازے جیسے کھل رہے تھے۔ قفل ٹوٹ رہے تھے۔ اور تازہ ہوا کے جھونکے روح میں تازگی پیدا کر رہے تھے جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا اور لبوں سے بے آواز صدائیں نکل رہی تھیں۔

"اے خدا۔ اے پیغمبروں کے خدا
اے زمین و آسمان کے مالک
اے کائنات کو تخلیق کرنے والے۔
تو ہے۔
تو یقیناً ہے۔
میں نے تجھے تسلیم کیا۔
میں تجھ پر ایمان لائی۔
دل گواہی دے رہا تھا۔
جسم کا رواں رواں پکار رہا تھا۔
"تو ہے۔"
"تو موجود ہے"

اور پھر آنسوؤں کے سمندر اس کی آنکھوں سے پھٹ پڑے۔ اور بے آواز صداؤں کو آواز مل گئی۔

"ہاں ہے"۔

اس نے بے تحاشا آنسو بہاتی آنکھوں سے تبریز کی طرف دیکھا۔

"میں ایمان لائی۔"
میرے دل نے گواہی دی ہے
کہ وہ ہے
دور آسمانوں پر۔
اور اس کے سوا کوئی اس کائنات کا مالک نہیں۔ وہ ایک ہے۔ واحد ہے۔ اور اس کا کوئی شریک نہیں۔
میں تبریز مراد علی۔ تمہارے خدا تمہارے مذہب پر ایمان لائی۔
یہی سچا دین ہے۔
یہی حق ہے۔
میرے دل نے گواہی دی۔
میری روح نے گواہی دی۔
خود بخود آپوں آپ۔

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"لیزا۔ لیزا۔" تبریز نے اسے آواز دی۔

"بی ایزی۔ پلیز حوصلہ"

لیکن لیزا روتے روتے بے ہوش ہو کر گرنے لگی تو تبریز نے یکدم اٹھ کر اسے تھام لیا اور گھبرا کر آنٹی ایلیس کو آوازیں دینے لگا۔

☆☆☆☆

اوہ تیمی میاں آپ یہاں"۔

مہراں کے چہرے پر خوشی پھوٹ پڑی۔

"میرے سوہنے رب نے میری دعائیں سن لیں"۔

"آپ تو داؤد خان" تبریز نے حیرانی سے پوچھا۔

"آپ داؤد خان کے پاس تھیں۔ اس نے آپ کو اغوا کیا۔ وہ یہاں لایا۔ لیکن کیوں؟"

"تم۔ تم اسے جانتے ہو" نینسی اور حبیبہ نے بیک وقت پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ یہ مہراں آپا ہیں میاں جی بیٹی ہی سمجھتے تھے انہیں۔ کتنا پریشان ہوئے ہیں وہ۔ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا ہم نے انہیں۔ لیکن ہمیں یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آپ کو کس نے اور کیوں اغوا کر لیا تھا"۔

مہراں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ وہ یکدم وہاں ہی زمین پر بیٹھ گئی۔ وہ سب اس کی طرف متوجہ تھے اور انہیں خبر بھی نہیں ہوئی کہ کب کچھ لوگوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا تھا۔

سب سے پہلے نینسی کی نظر ان پر پڑی تھی۔

"داؤد خان" اس کے لبوں سے چیخ سی نکلی۔

"ہاں" داؤد خان خباثت سے مسکرایا۔

"ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ غدار تم ہو گی؟"

حبیبہ تبریز، نینسی مہراں جولیس سب حیران ساکت کھڑے تھے اور داؤد خان کے آدمیوں کا گھیرا ان کے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

O☆O

پھر کئی دن اور گزر گئے۔ لیزا کو سنبھلنے میں دیر لگی تھی۔ لیکن اب وہ سنبھل چکی تھی۔ دل میں جیسے ساکت سمندروں کا سا ٹھہراؤ اور سکون آ گیا تھا۔

وہ تبریز سے نماز سیکھ رہی تھی۔ کلمہ طیبہ تبریز نے اسے سکھا دیا تھا۔ اور اکثر اس کے ورد زبان رہتا تھا۔ تبریز نے اپنی محبت کا اظہار کر دیا تھا تو جیسے اس کی محبت کی بے چینی بھی ختم ہو گئی تھی منزل کٹھن ضرور تھی لیکن بالآخر مل گئی تھی۔

''ہم جب کبھی پاکستان جائیں گے'' تبریز کہتا۔

''تو میاں جی کے پاس ضرور جائیں گے۔ وہ تمہیں سب کچھ سکھا دیں گے۔ تم باقاعدہ اسلام قبول کرنا اور تمہارا اسلامی نام میاں جی رکھیں گے''۔

''جب میرے دل نے گواہی دے دی ہے کہ تمہارا مذہب سچا ہے تو پھر باقاعدہ اور بے قاعدہ کیا۔ پروفیسر احسان کہا کرتے تھے کہ جس نے اسے دل اور روح کے ساتھ تسلیم کر لیا وہ مسلم ہے''

''ٹھیک ہے تمہیں تمہاری منزل مل گئی ہے لیکن مجھے خوف سا آنے لگا ہے جیسے میری منزل کہیں مجھ سے دور نہ چلی جائے۔''

اور وہ خاموش ہی رہتی۔ تبریز نے اسے حبیبہ کا نام دیا تھا۔

حبیبہ کا مطلب ہوتا ہے، رفیق، ساتھی دوست اور لیزا! ہم زندگی کے سفر میں ہمیشہ ساتھی اور رفیق رہیں گے''۔

لیزا نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

''پلیز اب رویا نہ کرو۔ دیکھو وہ خدا جس نے تمہیں حق کی روشنی دی ہے۔ تمہارے قلب کو منور کیا ہے۔ وہ یقیناً ہمیں اس آزمائش سے بھی نکالے گا۔''

اور حبیبہ کے دل کو بھی یقین تھا کہ وہ خدا جس نے اس کے دل کو یقین کی روشنی سے مالا مال کیا ہے۔ وہ خود بہت جلد اس کی آزمائشیں ختم کر دے گا۔ اور اس یقین نے اسے بہت پرسکون کر دیا تھا اور آنے والے لمحوں کی جیسے اسے رتی بھر فکر نہیں تھی۔ اس وقت بھی وہ آنٹی ایلیس کے پاس بیٹھی چپس بنانے کے لیے آلو کاٹ رہی تھی اور اس کے لبوں پر کلمہ طیبہ کے الفاظ تھے کہ نینسی نے کچن کے کھلے دروازے کو انگلی سے بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''تم نینسی''۔ وہ یکدم کھڑی ہو گئی۔

''تم نے اتنے دن لگا دیے۔ ہم تمہارے لیے پریشان ہو رہے تھے۔''

''ہاں ڈیر کچھ دیر ہو گئی تھی۔ دراصل میڈم اور باس آج کل بہت اَپ سیٹ ہیں۔ ان کی باقاعدہ ٹھن گئی ہے۔ ڈرگ مافیا کے ساتھ۔ ہر روز ہی میٹنگ ہو رہی تھی۔ ادھر میڈم کو شک ہے کہ شاید تمہیں اور تبریز کو ڈرگ مافیا والوں نے اغوا کر لیا ہے۔ اور یہ تم لوگوں کے لیے اچھا ہے۔ میں نے جولیس سے بات کر لی تھی۔ میڈم اور باس چند دنوں کے لیے باہر گئے ہیں۔ اچھا موقع ہے۔ شیخ نے سارا بندوبست کر لیا ہے۔ کل شام کی فلائٹ سے تم ثوبان شیخ کے ساتھ دبئی چلی جانا۔ تبریز اور مہراں بعد میں آ جائیں گے۔''

''مہراں'' حبیبہ نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا تم مہراں کو لے کر آئی ہو''۔

''ہاں نینسی مسکرائی۔

''بس اتفاق سمجھ لو ڈیر آج صبح داؤد خان کے اپارٹمنٹ میں مادام کا ایک پیغام لے کر گئی تھی۔ داؤد

میاں جی یہ دیپو ہے۔ میرا دوست۔ باصر نے میاں جی سے اس کا تعارف کروایا۔

یہ اسلام قبول کرنا چاہتا ہے میں اسے آپ کے پاس لے آیا ہوں''

باصر ابھی کچھ دیر پہلے ہی شاہ پور پہنچا تھا۔ اور سیدھا میاں جی کے پاس باہر مردانے میں آیا تھا۔

''اسلام قبول کرنا چاہتا ہے'' میاں جی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

جی ہاں میاں جی! باصر کے چہرے پر مسرت اور خوشی تھی۔ حاضرین مجلس کے چہرے بھی چمک اٹھے تھے اور وہ پرشوق نظروں سے دیپو کو دیکھ رہے تھے۔

''بیٹا آپ کیوں اسلام قبول کرنا چاہتے ہو۔

اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑنا آسان تو نہیں ہوتا۔ آپ نے یہ مشکل فیصلہ کیوں کیا؟''

''میاں جی'' دیپو نے عقیدت سے ان کے ہاتھوں کو تھام کر آنکھوں سے لگایا۔

یہ فیصلہ واقعی بہت مشکل تھا اور ہے' لیکن میاں جی جب خدا اپنے بندوں کو صحیح راستہ دکھانا چاہتا ہے تو کچھ بھی مشکل نہیں لگتا۔ سارے فیصلے خود بخود ہو جاتے ہیں۔ میری ایک جڑواں بہن تھی رتو۔ ایک روز اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہمارا دھرم سچا نہیں ہے اور یہ کہ سچا دھرم کوئی اور ہے۔ اور وہ سچے دھرم کی تلاش میں گھر سے نکل پڑی۔ اور اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا کیا خبر رتو صحیح کہتی ہو۔ وہ تو بہت سمجھدار اور ذہین تھی اس نے کبھی کوئی بے وقوفانہ حرکت نہیں کی تھی۔ پھر اس نے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا لیا۔

تب میں نے تمام مذاہب کا مطالعہ کیا اور میرے شعور نے مجھے سمجھایا کہ اصل اور سچا دین اسلام ہے۔ میرے ذہن اور دل نے اس دین کو سچا مان لیا تھا۔ لیکن اسے قبول کرتے ہوئے میں ڈر رہا تھا۔ بھاجی سے ماتا جی سے بھابھو سے جو سب پہلے ہی رتو کو چلے جانے سے اندر سے ٹوٹ گئے تھے۔ تب میں رتو کو تلاش کرنے کے بہانے یہاں چلا آیا۔

انکل رابرٹ نے مجھے بتایا کہ ریتو جان سے شادی کر کے پاکستان چلی گئی ہے۔ اسے سچے دھرم کی تلاش تھی لیکن وہ سچا دھرم شاید تلاش نہیں کر پائی اور میں۔ مجھے اس کی تلاش نہیں تھی لیکن میں نے اسے پالیا۔

میں ریتو کی تلاش میں کراچی گیا تھا۔ وہاں مجھے باصر مل گیا۔ اور وہ فیصلہ جو میں نہیں کر پا رہا تھا۔ شاید میں لاشعوری طور پر ریتو کا منتظر تھا۔ وہ فیصلہ میں نے کر لیا اور میاں جی میں آپ کے سامنے اور ان سب لوگوں کے سامنے دین اسلام قبول کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ۔

''نہیں کوئی معبود سوائے اللہ تعالیٰ کے اور محمدﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

میاں جی نے بے اختیار اسے گلے سے لگالیا اور ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''خداوند کریم تمہیں اس مذہب پر قائم رہنے کی اور اس کے احکام پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

''آمین''

سب نے بیک زبان کہا اور میاں جی نے ساتھ ہی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ اتفاق رائے سے دیپو کا نام بلال احمد رکھا گیا۔ یہ نام رکھنے کی تجویز ڈاکٹر شاہ محمد کی تھی۔

''آج سے بلال میرا بیٹا ہے''۔

دیپو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''میں سمجھتا تھا کہ نیا دین قبول کروں گا تو سارے رشتوں سے محروم ہو جاؤں گا۔ لیکن نہیں معلوم تھا کہ اس کے عوض مجھے ڈاکٹر شاہ محمد جیسا باپ، باصر جیسا بھائی اور میاں جی جیسے شفیق بزرگ مل جائیں گے۔ پتا نہیں آج یہاں میاں جی کے پاس بیٹھے بیٹھے مجھے یقین ہو چلا ہے کہ ایک روز ریتو بھی مجھے مل جائے گی۔ میری پاگل سی بہن جانے سچے دین کی تلاش میں کہاں کہاں بھٹک رہی ہوگی۔ جانے پاؤں میں کتنے کانٹے چبھے ہوں گے۔ راستے کتنے پتھروں سے اٹے ہوں گے۔

دیپو۔ یعنی بلال احمد کی آواز بھرا گئی تو ڈاکٹر شاہ محمد نے اسے گلے سے لگالیا۔

''تمہاری بہن کی لگن سچی ہوئی تو وہ منزل ضرور پالے گی بیٹا۔ اور مجھے بھی یقین ہے کہ ایک روز وہ تمہیں ضرور ملے گی۔

ڈاکٹر شاہ محمد بہت خوش تھے۔ اسی خوشی میں انہوں نے فاضل سے کہا کہ وہ نذیر کی دکان میں جتنی مٹھائی ہے اٹھالائے اور دیپو کے مسلمان ہونے کی خوشی میں شاہ پور کے ہر گھر میں بانٹے۔

بلال کو ڈاکٹر شاہ محمد کے حوالے کر کے باصر مدحت کے پاس آیا۔ مدحت بھاگاں کے ساتھ کچن میں مصروف تھی۔ اسے باصر کے آنے کی خبر مل چکی تھی۔

''مدحو''۔ باصر نے آہستگی سے اسے آواز دی۔

مدحت نے سر موڑ کر اسے دیکھا اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی پلکیں جھک گئیں باصر وارفتگی سے اسے تک رہا تھا۔ کئی لمحے خاموشی سے گزر گئے۔

کیسے ہیں آپ؟'' مدحت کچن سے باہر آ گئی''

''اچھا ہوں تم کیسی ہو؟''

''اچھی ہوں۔ آپ اتنی جلدی کیسے آ گئے''

''ایک کام تھا۔ میاں جی سے ملنے آیا تھا بلکہ ایک دوست کو میاں جی کے پاس لایا ہوں اُس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔''

''اچھا خوشی ہوئی''

وہ دونوں چلتے ہوئے صحن میں آ گئے۔

''میں جب یہاں سے گیا تھا تو سوچ رہا تھا جانے اب کب تم سے ملاقات ہوگی۔ اتنی جلدی دوبارہ تمہیں دیکھنے کا تصور تک نہیں تھا مجھے یاد کرتی تھیں تم''

''ہوں'' مدحت نے سر ہلایا۔

''انکل آئے تھے''

''کب؟'' باصر کو حیرت ہوئی۔

''چند دن ہوئے میاں جی سے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات بھی ٹھہرے تھے مجھے بھی بہت پیار کیا تھا۔ اور جاتے ہوئے مجھے کہا تھا وہ کچھ دنوں تک انگلینڈ جا رہے ہیں اور وہاں ابو سے ملیں گے''۔

''تمہارے ابو سے کیوں''

''پتا نہیں''

''کہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ماما مان گئی ہیں''

''نہیں'' مدحت افسردہ ہو گئی۔

''وہ کبھی نہیں مانیں گی۔ کبھی نہیں''

''افسردہ نہیں ہوتے سویٹ گرل سب اچھا ہوگا میاں جی ہیں ناں۔ اور ہمارا خدا ہے ہمارے ساتھ''۔

''تبریز آ گئے ہیں کیا؟''

''نہیں'' باصر کے چہرے پر سایہ سا دوڑ گیا۔

''آؤ مدحو۔ کہیں بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔ میرے دل پر بہت بوجھ سا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس سے بات کروں۔

مجھے وہم سا ہے شک سا ہے۔

وہ دونوں برآمدے میں بچھی کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔

''کیسے شک'' مدحت نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''مجھے شک ہے مدحو کہ تبریز بھائی ڈرگ مافیا کے چکر میں پھنس گئے ہیں۔''

''نہیں'' مدحت نے حیرانی سے کہا

''یہ کیسے ہو سکتا ہے''۔

''ہے۔ ہو سکتا ہے مدحو۔ بلکہ یہ شک کیا مجھے یقین سا ہو چلا ہے۔ وہ شخص جو تیمی بھائی کا پیغام اور پیسے لایا تھا۔ وہ ایک بار پولیس کسٹڈی میں رہ چکا ہے ہیروئن فروخت کرنے کے چکر میں میرے ایک دوست ہیں ڈاکٹر حفیظ۔ انہوں نے بتایا تھا مجھے۔ پھر ڈاکٹر رحیم نے بھی اس کی تصدیق کی۔ اور میں نے اپنے طور پر کھوج لگایا۔ ایک صحافی میرے ہاسپٹل میں کئی دن تک زیر علاج رہا۔ بہت بولڈ لڑکا ہے۔ اس نے مجھے اس کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ اور جو تکلیف دہ بات مجھے معلوم ہوئی ہے وہ یہ تھی کہ سمندر خان''۔

''سمندر خان کون؟ مدحت نے اسے ٹوک دیا۔

''وہی کیریر جو تیمی بھائی کا پیغام لایا تھا۔

میرے پاس وہ داؤد خان کا آدمی ہے۔ داؤد خان وہی شخص ہے جو تیمی بھائی کے ساتھ ایک بار یہاں

آیا تھا۔ میاں جی کے پاس۔ اس صحافی سے مجھے معلوم ہوا کہ کوئی ثبوت نہ ہونے کی بنا پر پولیس داؤد خان کو گرفتار نہیں کر سکی تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ داؤد خان ڈرگ مافیا سے متعلق ہے۔ دراصل اس صحافی کے ماموں پولیس میں ایک بڑے عہدے پر ہیں اور اسکی معلومات کا ذریعہ وہ ہیں''

''تو___ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تبریز تیمی بھائی'' مدحت کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

''ہاں مجھے شک ہے مدحوا راس لیے میں بہت پریشان ہوں۔ میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں مدحوا ور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے ان کی مدد کروں۔ کیسے انہیں اس جال سے باہر نکالوں۔ مجھے یقین ہے مدحو کہ تبریز۔ بھائی کو اس جال میں پھنسایا گیا ہوگا۔ تب ہی تو وہ راتوں کو ڈر کر جاگ اٹھتے تھے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں''۔

''ہاں۔'' مدحت نے پریشانی سے کہا۔

''آپ میاں جی سے اس کا ذکر کر دیں۔ شاید میاں جی کے پاس کوئی حل ہو اس کا''

''ہاں لیکن میں پہلے ڈاکٹر شاہ محمد سے بات کروں گا''

''ہاں یہ ٹھیک ہے'' مدحت نے کہا

''ڈاکٹر انکل اچھا مشورہ دے سکیں گے میاں جی کی طبیعت یوں بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ پریشان ہو جائیں گے۔''

''وہ جی۔ میاں جی بلا رہے ہیں آپ کو باہر بھاگاں نے آ کر کہا۔

''باہر فاضل آیا ہے گیٹ پر''

''اچھا مدحو میں چلتا ہوں۔ رات میں باہر ہی ٹھہروں گا میرا دوست ہے ناں ساتھ۔ جانے سے پہلے ملنے آؤں گا''۔

''کب جانا ہے؟''

''صبح ہی شاید۔ یا پھر کل دن میں کسی وقت تم۔ تبریز بھائی کے لیے دعا کرنا''۔

وہ مدحت کو خدا حافظ کہہ کر باہر آیا تو میاں جی اکیلے تھے۔

''آؤ بیٹا بیٹھو'' انہوں نے شفقت سے کہا۔

''دیپو میرا مطلب ہے بلال کہاں ہے؟''

''شاہ محمد اسے ہاسپٹل دکھانے ساتھ لے گیا ہے''

''اوہ ہاں ہاسپٹل کا کام کیسا ہو رہا ہے رک تو نہیں گیا۔''

''نہیں''

میاں جی مسکرائے۔

''بڑی تیزی سے کام ہو رہا ہے کنسٹرکشن شروع ہو چکی ہے''

اور روپے وغیرہ کا بندوبست''

''ہو رہا ہے وہ۔ رب العزت بڑا مسبب الاسباب ہے۔ لوگ پیسہ بھیج رہے ہیں۔ یہاں جو بھی آتا ہے۔ ہاسپٹل کے لیے کچھ دے کر ہی جاتا ہے انشاء اللہ بہت جلد یہ ہاسپٹل مکمل ہو جائے گا۔ دراصل اس ملک کے لوگوں میں جذبہ بہت ہے''۔

''ہاں یہ تو ہے'' باصر نے تائید کی۔

''یقین کرو بیٹا۔ ہمارے ایک بزرگ ہیں بلوچستان سے ان کا تعلق ہے۔ ان کے بچے غیر ممالک

ں ہوتے ہیں۔ انہوں نے بچوں سے ہاسپٹل کی بات کی۔ انہوں نے چیک بھجوائے۔

''دوستوں سے ذکر کیا۔ اکثر چیک اور ڈرافٹ وہاں سے آ رہے ہیں۔ بڑی بڑی رقموں کے''۔

''خدا کا شکر ہے میاں جی کہ اچھے مقصد کے لیے لوگ ہمارا ساتھ دے رہے ہیں''

''شکر ہے اس کی ذات کا بیٹا۔ ہاں میں نے تمہیں اس لیے بلوایا ہے کہ وہ تم نے مہراں کا تھیلا کھول کر دیکھا تھا۔ کچھ اس کا پتا چلا؟

''نہیں میاں جی! میں بس اور ہی الجھنوں میں پڑا رہا''۔

''کیسی الجھنیں؟''

''بس یوں ہی میاں جی یہ بلال مل گیا تھا اچانک ہاسپٹل سے آ کر___ ہر روز اس کی بہن کو ڈھونڈنے نکل جاتے۔ اس کے پاس سے ان لوگوں کا پتا گم ہو گیا تھا جن کے ساتھ وہ ہندوستان سے آئی تھی بلال کو صرف اتنا پتا تھا کہ وہ لوگ کراچی میں رہتے ہیں۔ بس یوں ہی گھومتے پھرتے تھے کہ شاید کہیں اسے اپنی بہن نظر آ جائے''۔

''بیٹا وہ تھیلا محفوظ تو ہے ناں''

''جی میاں جی''

''دراصل بیٹا تمہارے جانے کے بعد بھی کچھ لوگ آئے تھے دھمکیاں دیتے رہے''

''اوہ''

باصر نے پریشانی سے میاں جی کو طرف دیکھا۔

''میاں جی آپ کو پولیس کو خبر کرنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا چکر ہے''

''میرا خیال ہے بیٹا وہ بہت اہم کاغذات ہیں۔ اور ان کا تعلق ان لوگوں کی ذات سے ہے میں نے ان کی گفتگو سے یہی اندازہ لگایا تھا۔ فاضل بتا رہا تھا کہ اس بار وہ لوگ کافی مایوس ہو کر گئے ہیں اور جاتے ہوئے وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کہ خان کو یونہی شک ہے ممکن ہے مہراں نے وہ کاغذات تلف کر دیے ہوں۔ اتنا عرصہ بیت گیا ہے۔ پتا نہیں کہاں کہاں بھٹکتی پھری ہے اور پھر یہاں تک پہنچی ہے۔ ممکن ہے راستے میں ہی کہیں کھو بیٹھی ہو۔

میرا خیال ہے ان ہی لوگوں نے مہراں کو اغوا کروایا ہے۔ پتا نہیں بے چاری بچی زندہ بھی ہے یا نہیں''۔

میاں جی اداس ہو گئے۔

''بہت خدمت کرتی تھی میری۔ بہت خیال رکھتی تھی جانے کس حال میں ہوگی''

''میاں جی آپ فکر نہیں کریں۔ میں جاتے ہی وہ تھیلا کھول کر دیکھوں گا اور جو بھی ہوا آپ کو مطلع کر دوں گا۔

''ٹھیک ہے بیٹا۔ ہاں مراد آیا تھا میرے پاس معذرت خواہ تھا کہ زینت نے مجھے جو خط لکھا تھا اس کے متعلق اسے کوئی علم نہیں تھا''

''اوہ''۔ باصر کا چہرا کھل اٹھا

''اور کوئی بات کی تھی انہوں نے۔''

''نہیں۔ ہاں یاد آیا سونیا کے رشتے کی بات کی تھی۔ بتا رہا تھا عبید کا رشتہ آیا ہے سونیا کے لیے''

''پروفیسر عبید۔'' باصر نے پوچھا

''ہاں۔''

''اور آپ نے کیا کہا؟''

''میں نے کیا کہنا تھا بیٹا۔ اولاد کی بہتری کو والدین زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اور میرے خیال میں عبید اچھا لڑکا ہے۔ تمہاری ماما اور پاپا کو بھی پسند ہے۔''

''جی میاں جی! بہت بہترین انسان ہیں۔ سونیا ان کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔'' پتا نہیں ماما اور پاپا اس سے کب تک خفا رہیں گے۔ سونیا کے رشتے کی بات چل رہی تھی اور اسے خبر تک نہیں تھی۔ پتا نہیں یونہی سونیا کی رخصتی بھی ہو جائے گی اور شاید ماما اسے بلوائیں تک نہیں۔ وہ افسردہ ہو گیا۔

''کیا سوچنے لگے بیٹا''؟

''کچھ نہیں'' اس نے چونک کر میاں جی کی طرف دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

''میں ذرا ڈاکٹر شاہ اور بلال کی طرف جا رہا ہوں''

''ہاں جاؤ۔ بلال کہہ رہا تھا تم صبح واپس چلے جاؤ گے''

''جی میاں جی! مجھے چھٹی نہیں مل سکی۔ بلال کو چھوڑ جاؤں گا۔ دراصل وہ چاہتا ہے کہ کچھ دن یہاں رہ کر اسلامی تعلیمات سے پوری طرح روشناس حاصل ہو سکے۔

''اچھا تو پھر بابو کو کہہ دینا وہ صبح سوزوکی کے لیے کہہ دے گا شہر جانے کے لیے''۔

''جی میاں جی کہتا جاؤں گا'' باصر انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

اگلے روز جب وہ روانہ ہوا تو میاں جی نے اسے پھر تاکید کی کہ مہراں کے تھیلے کو کھولنا اب بہت ضروری ہو گیا ہے۔

اور کراچی پہنچ کر فارغ ہوتے ہی سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہی تھا۔ لیکن جوں جوں وہ کاغذات دیکھتا جا رہا تھا اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔

پاکستان میں ہیروئن کی تجارت کرنے والوں کا پورا بائیو ڈیٹا موجود تھا۔ لفظ لفظ کون کب اور کس وقت اس گروہ میں شامل ہوا۔ اس کی شمولیت کی وجہ۔ اس کا خاندانی پس منظر۔ اس کے گھر کے افراد۔ اس کا کاروبار۔ ایک ایک تفصیل موجود تھی۔

باصر نے تمام کاغذات کو تفصیل سے دیکھا۔ بگ باس جس کا اصلی نام معلوم نہیں ہو سکا تھا اس گروہ کا سربراہ تھا اور ۱۹۷۲ء میں اس نے مس اینجل کی مدد سے یہ کام شروع کیا تھا۔

مس اینجل، دواؤد خان، سمندر خان، جان ڈیوس اور متعدد افراد۔

بڑے بڑے ریفارمرز کے نام بھی اس میں شامل تھے۔ جو بظاہر بڑے شریفانہ کاروبار کر رہے تھے اور جن کا ملک میں بڑا نام اور شہرت تھی۔

کاغذات دیکھ کر باصر کے سارے وجود پر ایک سنسنی طاری ہو گئی تھی۔ اس نے کاغذات کو سنبھال کر رکھا اور اپنے صحافی دوست کو فون کیا اور پھر اس کے توسط سے اس کے ماموں سے ملا جو ایک ذمہ دار عہدے پر تھے۔ کاغذات دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ان کی آنکھیں بھی کھلی رہ گئی تھیں۔

اور پھر چند ہی دنوں میں ملک میں وسیع پیمانے پر گرفتاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ ملک میں جیسے تہلکہ سا مچ گیا تھا' اخبارات شور مچا رہے تھے پولیس کو اس شاندار کارنامے پر خراج تحسین پیش کیا جا رہا تھا۔ اتنے وسیع پیمانے پر گرفتاریاں اس سے قبل نہیں ہوئی تھیں۔ پولیس نے اخباروں کو اس بات کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا کہ انہیں ان افراد کے متعلق معلومات کہاں سے حاصل ہوئی۔ صرف اتنا کہا گیا تھا کہ پولیس بہت عرصے سے ان لوگوں کے پیچھے تھی۔ اب مناسب ثبوت مہیا ہو جانے کے بعد ان پر ہاتھ ڈالا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے قبل کئی بار ایسا اتفاق ہو چکا ہے کہ ثبوت نہ ہونے کی بنا پر یہ لوگ گرفتار نہیں کیے جا سکے تھے۔

باصر نے میاں جی کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ وہ کچھ دنوں تک خود آ کر انہیں تفصیل بتائے گا۔

داؤد خان ملک سے باہر ہونے کی وجہ سے گرفتار نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ کئی ایسے افراد بھی گرفتار ہوئے تھے۔ جن کے متعلق کاغذات نہیں تھے لیکن ان کے متعلق گرفتار ہونے والوں سے پتا چلا تھا۔

کم از کم ہیروئن کے اسمگلروں کے ایک گروہ کا عارضی طور پر خاتمہ ہو چکا تھا۔ ان کے بچنے کے امکانات بہت کم تھے۔

باصر کے صحافی دوست ظفر رانا نے اسے بتایا تھا کہ مہراں کے متعلق پتا چلا ہے کہ داؤد خان اسے اپنے ساتھ امریکہ لے گیا تھا۔ البتہ داؤد خان کی بوڑھی والدہ نے بتایا ہے کہ مہراں کے والد ایک دولت مند آدمی ہیں اور انہوں نے خود مہراں کو ان کے گھر بھجوایا تھا کیونکہ مہراں کی وجہ سے ان کی بیوی نفسیاتی مریض بنتی جا رہی تھی اور اسے خوف تھا کہ اس کے دوسرے بچے بھی کہیں مہراں کی طرح ابنارمل نہ ہوں۔ ظفر رانا نے مہراں کے والدین کا ایڈریس لے لیا تھا اور باصر کو بتایا تھا کہ بہت جلد وہ ان سے رابطہ کرے گا۔

مہراں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد باصر نے ایک ماہ کی چھٹی لی اور شاہ پور روانہ ہو گیا۔ لاہور ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد کتنی ہی دیر تک وہ کھڑا سوچتا رہا یکایک اس کا جی چاہنے لگا تھا کہ وہ گھر جائے۔ سونیا سے' ماما سے' پاپا سے ملے۔ سونیا جو ماما کا دفاع کرتی تھی جب کبھی وہ یا رمیض ماما کا گلہ کرتے تو وہ انہیں سمجھایا کرتی تھی۔

''وہ ایسی ہی ہیں۔ ان کی محبت کا انداز یہی ہے وہ اپنا رہنے کا طریقہ نہیں بدل سکتیں۔ تم ناحق کڑھا نہ کرو۔'' وہ سونیا اس گھر سے رخصت ہو جائے گی۔ کتنی بے رونقی سی ہو جائے گی۔

رمیض آتا تھا تو سونیا اور رمیض کی جھڑپ سے کتنی زندگی اور رونق ہوتی تھی گھر میں۔ اب تو سونیا اکیلی ہو گی۔ اداس ہوتی ہو گی۔ عبید بھائی بہت اچھے ہیں۔ لیکن پتا نہیں سونیا کی کیا رائے ہے۔ پتا نہیں ماما اور پاپا نے اس سے اس کی رائے بھی لی ہے یا نہیں۔ مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا تھا تو بھلا سونیا سے کیا پوچھا ہو گا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ عبید بھائی بہت نفیس انسان ہیں۔ سونیا خوش رہے گی، مجھے یقین ہے۔

پتا نہیں ماما، پاپا نے میرے لیے دل اتنا سخت کیوں کر لیا ہے۔ وہ مجھے سونیا کے رشتے کے متعلق بتا تو سکتے تھے۔ اور اب تو انہیں میرا ایڈریس بھی معلوم تھا۔ میاں جی سے لے سکتے تھے۔

وہ کتنی ہی دیر تک ایئرپورٹ پر اداس کھڑا رہا۔ وہ گھر جائے یا نہیں۔ اس نے ٹیکسی کو روکا اور پھر منع کر دیا۔ نہیں وہ گھر نہیں جائے گا

ماما کو جب اس کی ضرورت نہیں ہے تو وہ کیوں جائے۔ وہ بھی صبر کر لے گا۔ ہاں سونیا کی شادی پر وہ ضرور آئے گا۔ میاں جی سے پتا تو چل ہی جائے گا۔ وہ گھر جانے کے بجائے سیدھا شاہ پور آ گیا اور شاہ پور میں ماما، پاپا، [illegible]نیا سب کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے حیرت زدہ رہ گیا۔

''سونی'' وہ بے اختیار سونیا کی طرف بڑھا۔

''کیسی ہو تم۔ میں سارا راستہ تمہیں یاد کرتا آیا ہوں''۔

''ادھر ماما بھی ہیں'' سونیا نے اس کی توجہ ماما کی طرف مبذول کرائی۔

''السلام علیکم ماما''۔اس نے افسردگی سے کہا۔زینت مراد نے کھڑے ہو کر اسے گلے سے لگالیا۔

''ابھی تک ناراض ہو بیٹا''؟

''ماما ناراض تو آپ تھیں، میں تو نہیں''

''مائیں بیٹوں سے زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہ سکتیں''

''ماما! باصر کی آواز بھرا گئی لیکن اس نے خود پر قابو پالیا۔

''یہ آپ سب لوگ یہاں اچانک کیسے آ گئے ہیں۔

''جناب ہم آئے ہیں مدحت بھابھی کو میاں جی سے ہمیشہ کے لیے مانگنے۔یعنی رمیض نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

''ارے شیطان تم بھی ہو''

باصر نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا۔

''جی جناب ہم۔ویسے اگر ہم ماما کا دل نہ موم کرتے تو___''

''تو کیا؟''باصر نے اسے الگ کرتے ہوئے پوچھا''

''تو ماما یہاں نہ آتیں۔تو جناب آپ کو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے''

''تھینک یو چھوٹے بھائی۔ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں''

''کچھ نہیں۔ہماری زندگی کا سویرا بغیر کسی تردد کے طلوع ہو چکا ہے''

''کیا مطلب؟''

''یعنی ہمیں ماما کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں''

''کون؟''باصر نے تجسس سے پوچھا۔

''کہیں ماما نے جنرل ہادی کی بیٹی تمہارے سر تو نہیں منڈھ دی۔

''آہاہا''۔رمیض نے قہقہہ لگایا''جنرل ہادی کی بیٹی نے خود ہی بیاہ رچالیا ہے میں سویرا وہاب کی بات کر رہا ہوں''

''اوہ۔چھوٹی سی کیوٹ سی لڑکی''

''جی۔میں بھی چھوٹا سا کیوٹ سا لڑکا ہوں''

ہماری چند دن کی عدم موجودگی میں بڑے بڑے انقلاب آ گئے ہیں''

''جی ہاں''

''اور ایک انقلاب یہ ہے کہ شیراز ماموں بھی اٹھارہ سال بعد وطن آ رہے ہیں''

''اوہ رئیلی''۔تب تو مدحو بہت خوش ہو گی''

''یقیناً آپ اس خوشی کا مطالعہ بذات خود جا کر کر سکتے ہیں''

رمیض نے پھر قہقہہ لگایا اور باصر مسکراتا ہو مدحت کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆☆

رتن سے لیزا اور لیزا سے حبیبہ بننے تک کا سفر کتنا کٹھن اور پرخار تھا۔لیکن بالآخر منزل مل گئی تھی۔ سامنے بیت اللہ شریف کے مینار نظر آ رہے تھے۔اور حبیبہ کے دل کی دھڑکنیں رک رہی تھیں جذبے بے قابو ہو رہے تھے۔یوں لگ رہا تھا جیسے دل اچھل کر آنکھوں میں آ جائے گا۔سارا جسم ہی آنکھ بن گیا تھا۔تبریز کا ہاتھ

تھامے وہ سہج سہج قدم اٹھا رہی تھی اور اس کے جسم کے روئیں روئیں سے لبیک اللہم لبیک' لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک لبیک کی صدائیں اٹھ رہی تھیں۔اور وجود پر بے خودی سی طاری تھی۔سامنے خانہ کعبہ تھا۔

کالے غلاف' سنہری ماتھے والے لباس میں لپٹا اللہ کا گھر۔حبیبہ کو یوں لگا جیسے ساری کائنات ٹھہر گئی ہو' اس کے اردگرد کچھ نہ ہو' کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔تبریز کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

یہ حقیقت ہے یا خواب۔

بالآخر وہ وہاں کھڑی تھی۔

جہاں کے لیے وہ چلی تھی۔

ایک مبہم منزل کی جستجو میں گھر سے چل پڑی تھی اور آج وہ وہم وہ خیال' حقیقت بن گیا تھا۔

منزل مل گئی تھی۔

یقین وایمان کی روشنی نے من کے اندھیرے دور کر کے اجالا ہی اجالا کر دیا تھا۔

وہ دم بخود ساکت کھڑی تھی۔

''اے خدا میں حاضر ہوں۔

تیرے گھر کے سامنے موجود ہوں''

میرے بے وقعت وجود کو قبول کر میرے آقا۔

وہ بے خودی میں سب کے ساتھ طواف کر رہی تھی۔شیخ ثوبان نے بتایا تھا کہ خانہ کعبہ کا طواف کبھی نہیں رکا۔یہاں تک کہ ایک مرتبہ صدیوں پہلے بارش ہوئی۔اتنی کہ خانہ کعبہ تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔

اس شام سانپ خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے رہے۔

لوگ دیوانہ وار طواف کر رہے تھے اور اونچی اونچی آواز میں دعائیں پڑھ رہے تھے۔

مختلف رنگوں مختلف نسلوں اور مختلف ممالک کے لوگ جن کا ایک ہی لباس تھا۔وہ ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ایک ہی جذبے میں بھیگے ہوئے تھے۔

سات چکر پورے کرنے کے بعد اس نے تبریز کی طرف دیکھا جو خانہ کعبہ کی دیوار سے چمٹا بلک رہا تھا۔

اس کے اردگرد اور لوگ باب ملتزم سے چمٹے رو رہے تھے گریہ کر رہے تھے۔

اور پروفیسر احسان کہتے تھے۔

''اس کی بارگاہ میں آنسوؤں کی بڑی وقعت ہے بڑی قیمت ہے۔وہ آنسوؤں کا نذرانہ قبول کر لیتا ہے۔حبیبہ کا پورا وجود آنسوؤں میں ڈوب گیا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

کچھ پتا نہیں تھا۔

کب اس نے دو نفل پڑھے۔

کب سعی کے ساتھ چکر پورے کیے اور کب واپس ہوٹل میں آئی۔آنسو ابھی اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

''میں کب تھی اس کی بندہ پروری کے قابل۔

کیا تھی میں،

ایک ذرہ حقیر۔

کتنی بار راستے سے ہی پلٹ جانے کا سوچا۔ کتنی بار بے یقین ہوئی کتنی بار نادم ہوئی۔
پر وہ۔ وہ سخی ہے، غنی ہے۔
کہاں تھا میرا جذبہ اتنا پختہ
پر اس نے مجھے بلایا۔
اس نے میرے بند قفل کھولے۔
مجھے روشنی دی۔ مجھے عقل دی، شعور دیا''

''حبیبہ''

تبریز نے نرمی سے اسے پکارا۔
''حوصلہ کرو۔ کچھ کھا پی لو۔ پلیز''

''تبریز''۔
حبیبہ کی آنکھوں سے اب بھی جھڑی لگی تھی۔
''میں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے مولا کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ کیسے؟
اس نے مجھے روشنی عطا کی۔
اس نے مجھے حق کا ادراک دیا۔
اس نے مجھے تمہاری رفاقت بخشی۔
بن مانگے، اور پھر اس نے مجھے یہاں بلا لیا۔
اپنے پاس۔ میں تو ساری زندگی سجدے کرتی رہوں شکریہ ادا کرتی رہوں۔ پھر بھی شکریہ ادا نہ ہو سکے۔
میرا دل چاہتا تھا کعبہ کی دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر ختم ہو جاؤں۔ پھر میرا دل چاہتا تھا ان دیواروں میں خود کو جذب کر دوں۔ تبریز میں تمہیں کیسے اپنا دل چیر کر دکھاؤں۔ میں نے اپنے مولا سے کہا۔
آقا میرے دیپو کو بھی ایمان کی روشنی عطا کر۔ اس کے دل کی سیاہی بھی دھو دے۔
اور مجھے یوں لگا تھا جیسے سیاہ غلاف میں چھپا ہوا خدا مسکرا رہا ہو اور اس نے کہا۔
ہم نے تیری دعا قبول کی۔
تبریز۔ تبریز مجھے لگتا ہے جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔ میرا وجود ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ میری بے وقعت سی ذات میں یہ سب کچھ سمویا نہیں جا رہا''
وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
تبریز نے اسے پانی پلایا۔ سکون آور دوا دی اور اس کے سونے کے بعد خود شیخ ثوبان کی طرف چلا گیا۔ جو ساتھ والے روم میں ٹھہرے ہوئے تھے۔
گزشتہ دو مہینے ___ جس عذاب اور اذیت میں گزرے تھے اس کی تھکن ابھی تک روح پر طاری تھی۔ داؤد خان نے انہیں جس عقوبت خانے میں رکھا تھا اس کا تصور ہی جسم پر لرزا طاری کر دیتا تھا۔ نینسی اور جولیس ناحق مارے گئے تھے۔ محض ان سے ہمدردی کی پاداش میں۔
جولیس، تبریز، حبیبہ اور مہران کو ایک ہی جگہ رکھا گیا تھا۔ البتہ نینسی کو الگ رکھا گیا تھا۔
''نینسی کے لیے بگ باس نے موت کی سزا تجویز کی ہے'' ایک روز داؤد خان نے بتایا۔
''اس لیے کہ اس نے تنظیم کے ساتھ غداری کی ہے'' جولیس کی آنکھیں یکدم ویران ہو گئی تھیں اور

چہرے پر زردی اتر آئی تھی۔
''کیا میں اس سے مل سکتا ہوں'' اس نے داؤد خان سے التجا کی۔ ''پلیز ایک بار مجھے اس سے ملوا دو''
''ہا'' داؤد خان نے قہقہہ لگایا تھا۔
''ضرور وفادار عاشق تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔ اور اگر تم موت کے سفر میں اس کا ساتھ دینا چاہو گے تو بھی ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا''
''ہاں ہاں۔ میں اس کا ساتھ دوں گا۔ مجھے اس کے ساتھ موت قبول ہے''۔
وہ چیخنے لگا تھا۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔
داؤد خان چلا گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
''تمہیں پتا ہے۔ ہم دو ماہ بعد شادی کرنے والے تھے'' وہ بار بار تبریز کا ہاتھ پکڑ کر اسے بتاتا ''ہم نے سوچا تھا ہم اپنا ہنی مون فرانس میں منائیں گے۔ ہمارا اسپین جانے کا پروگرام بھی تھا۔ اسے اسپین دیکھنے کا بہت شوق ہے۔
بلکہ ہم نے سوچ رکھا تھا کہ اگر ہمارے پاس کچھ زیادہ پیسے ہوئے تو ہم مشرق کے کسی ملک میں بھی جائیں گے۔
پراسرار مشرق۔
اسے مشرق پسند تھا۔ اس لیے وہ مشرقیوں کو پسند کرتی تھی۔
تبریز اور حبیبہ احساس جرم میں مبتلا ہو جاتے۔ وہ نینسی سے اور جولیس سے شرمندہ تھے بگ باس اور میڈم مارتھا نے ان پر اذیتوں کی انتہا کر دی تھی۔ ہر روز ایک نئی اذیت، ایک نئی تکلیف۔
اور اصل اذیت تو ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو تب شروع ہوگی۔ جب دیپو، وکی، بھابی، بھابھو اور ماتا جی کی لاشوں کی تصویریں ایک ایک کر کے اسے دکھائی جائیں گی۔
حبیبہ سوچتی۔ لیکن اسے اتنی بے چینی اور بے قراری نہ تھی۔
وہ عجیب سے نشے میں مست تھی۔ پا لینے کا نشہ سا اس کے وجود پر طاری تھا۔
تبریز کبھی کبھی بہت حیران ہو کر اسے دیکھتا۔
ایک روز مارتھا نے اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی لیکن اس نے سسکی تک نہ لی۔ وہ تبریز سے کچھ نہ کچھ سیکھتی رہتی تھی۔
کلمے۔ قرآن مجید کی کچھ آیات۔ اور سارا دن اس کی زبان پر یہ آیات ہوتیں۔ جب پہلے روز اس نے بند کمرے میں نماز پڑھی تو اس پر بے خودی سی طاری ہوگئی۔
اردگرد سے بالکل غافل ہوگئی۔ اس کا دل چاہا وہ سجدے پر سجدے کیے جائے اور یونہی زمین پر سر رکھے رکھے ختم ہو جائے۔
جولیس حیرت سے اسے دیکھتا۔
اس لڑکی میں بڑا حوصلہ ہے
''تمہیں افسوس نہیں ہوتا پچھتاوا نہیں ہوتا حبیبہ کہ تم نے کیوں اپنا گھر چھوڑا'' ایک روز تبریز نے پوچھا۔
''نہیں'' اس نے اعتماد سے کہا اب نہیں''

''کیوں؟ نہ تم گھر سے نکلتیں نہ اتنی تکالیف تمہیں اٹھانی پڑتیں''

''جو کچھ میں نے پالیا ہے اس کے مقابلے میں یہ تکالیف معمولی سی ہیں۔ اگر ساری زندگی مجھے کانٹوں پر چلنا پڑے تب بھی میں بخوشی چلتی رہوں گی تم نے تبریز میری طرح سفر نہیں کیا۔ تم اس شک اور وہم کے عذاب سے نہیں گزرے تمہیں کچھ تلاش نہیں کرنا پڑا۔ مجھے یہ راستہ کھوجنا پڑا ہے۔ اس لیے مجھے تکالیف کچھ بھی نہیں لگتیں۔''

آنے والوں لمحوں کی کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہوگا۔ زندگی یا موت۔

لیکن تبریز نے بھی خود کو حبیبہ کی طرح ساری فکروں سے آزاد کرلیا تھا۔ جو ہوگا سو دیکھا جائے گا۔

اگر خدا کو زندگی منظور ہے۔ عزت کی زندگی تو کوئی سبیل بن جائے گی۔

اور اگر نہیں۔

تو ذلت کی زندگی سے یہ موت بدر جہا بہتر ہے۔ جولیس کو ان تینوں کے سکون پر حیرت ہوئی

مہراں اکثر بے خود رہتی۔

بابا فرید گنج یا مہر علی شاہ کو گاتی رہتی۔ ہوش میں ہوتی تو حبیبہ اور تبریز علی سے میاں جی اور ماں جی کی باتیں کرتی۔

حبیبہ یا تو تبریز سے اسلام کے متعلق سیکھتی رہتی یا پھر زمین پر سجدہ ریز دکھائی دیتی۔ کبھی کبھی آنسو بھی اس کی آنکھوں میں نظر آتے تھے۔ لیکن آنسوؤں کے باوجود چہرے پر سکون ہوتا۔

لیکن جولیس بے چین اور مضطرب رہتا۔

کبھی اپنے بال نوچنے لگتا۔ کبھی شیخ ثوبان کو گالیاں دینے لگتا جس نے ان کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ اسے داؤد خان اور بگ باس کے متعلق سب کچھ بتا کر آیا تھا۔ داؤد خان کے اپارٹمنٹ کا پتا بھی دے کر آیا تھا۔ نینسی کے اپارٹمنٹ کا ایڈریس بھی اس کے پاس تھا اور میڈم مارتھا کا پرسنل فون نمبر بھی۔ پھر کیا شیخ ثوبان نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ انہیں ڈھونڈنے اور تلاش کرنے کی۔ حالانکہ اس روز جب وہ لیزا کو لے کر نہیں پہنچا تھا۔ اسے تب ہی پتا چل جانا چاہیے تھا کہ اس کے ساتھ کچھ غلط ہوگیا ہے' اس روز بھی وہ شیخ ثوبان کو گالیاں دے رہا تھا کہ داؤد خان آیا تو وہ اس سے الجھ پڑا۔

''تم نے ہمیں یہاں کیوں بند کر رکھا ہے جو کچھ کرنا ہے۔ کر و مارنا ہے تو مار ڈالو۔ اور نینسی کو کیا تم نے مار ڈالا ہے؟ کیا کیا ہے اسے؟''

''بے فکر رہو؟''

داؤد خان اسے دھکا دیا۔

''تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی لیکن ابھی باس دوسرے معاملات میں مصروف ہے۔ اس لئے فی الحال تمہاری طرف توجہ نہیں دے سکتا۔ شاید خدا نے تمہاری زندگی کے سانس بڑھا دیے ہیں لیکن تم سب کو۔ ہاں تم سب کے لیے سزائیں تجویز ہوچکی ہیں۔ تبریز مراد علی خان۔ تم ایک بار پھر گلیوں اور نالیوں میں گرے ہوئے دکھائی دو گے۔ ایک ایک سے نشے کی بھیک مانگتے ہوئے اور پھر ایک دن یونہی تڑپ تڑپ کر کسی گندی نالی کے کنارے مر جاؤ گے اور تمہاری لاوارث لاش پر مکھیاں بھنبھنائیں گی اور کتے اس کو بھنبھوڑیں گے''

تبریز نے جھرجھری لی۔

تبریز مراد علی خان۔

مراد گروپ آف انڈسٹریز کے ڈائریکٹر مراد علی خان کا بیٹا۔

بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈگری یافتہ تبریز مراد علی خان اور لاوارث۔ ہا۔

''اور تم جولیس عاشق وفادار' تمہیں اور تمہاری محبوبہ کو ایک ساتھ گولی سے اڑایا جائے گا۔ اور اگر تم نے چاہا تو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا جائے گا۔ دو مہینے بعد تمہاری شادی ہونے والی تھی ناں۔ ہا۔''

شاید کمرے میں کہیں مائیکروفون لگے تھے اور ان کی گفتگو کہیں سنی جاتی تھی۔

''اور تمہارا شیخ ثوبان ہم تک نہیں پہنچ سکتا تم جہاں قید ہو۔ یہاں کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا اور میڈم مارتھا کے اس فون کا کہیں وجود ہی نہیں ہے''۔

جولیس بری طرح اپنے بال نوچنے لگا۔ لیکن داؤد خان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

''اور تم عہد حاضر کی ولی''

وہ حبیبہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''ہم تمہیں ماریں گے نہیں۔

بس تمہارے اس گل گوتھنے سے بھتیجے کا پہلے بازو توڑیں گے پھر ٹانگیں پھر ''

ہا۔

تمہیں یقین نہیں آرہا ناں۔ لیکن بے فکر رہو۔ تمہاری یقین دہانی کے لیے اسکی فلم تیار کر لی جائے گی۔ پھر تمہارے اس بھائی کی باری آئے گی۔ وہ ڈاکٹر۔

تب ہی دروازہ کھول کر ایک شخص اندر آیا اس نے داؤد خان سے کچھ کہا تو وہ عجلت میں باہر نکل گیا۔

اور یہ اسی شب کا ذکر ہے۔ اپارٹمنٹ میں خاموشی تھی۔

''شاید سب لوگ کہیں گئے ہوئے ہیں''

جولیس نے تبریز سے کہا۔

''ہاں شاید''

یقیناً باہر کوئی نہیں ہے۔

جولیس نے یقین سے کہا۔

کیونکہ باہر قدموں کی چاپ اور باتوں کی آوازیں سارا وقت آتی رہتی ہیں اور اب مسلسل دو گھنٹوں سے خاموشی ہے۔

جولیس اٹھ کر دروازے سے زور آزمائی کرنے لگا لیکن بے سود۔ تب عالم جنون میں اس نے کھڑکی کا شیشہ توڑ ڈالا۔ نیچے سڑک پر دوڑتی گاڑیاں کھلونوں کی طرح لگ رہی تھیں۔

پتا نہیں کون سی جگہ ہے۔ انہیں بند گاڑی میں یہاں لایا گیا تھا۔ جولیس نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔

سامنے سڑک کے پار والی بلڈنگ کے اپارٹمنٹ کی کھڑکی کھلی تھی اور پردے ہٹے ہوئے تھے۔

جولیس کچھ دیر کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا پھر مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔

اور پھر اسی رات کا ذکر ہے۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد باہر قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ شاید وہ لوگ آگئے تھے۔

جولیس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

''آج اگر داؤد خان آیا تو میں اسے مار ڈالوں گا۔''

اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر کہا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے پھر سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ کچھ

دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ اور دس پندرہ آدمی بیک وقت اندر داخل ہو گئے۔ ان میں سے کچھ ایشیائی تھے اور کچھ امریکن۔

''جولیس اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''میں آج تمہیں''

پھر لفظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے اور وہ بھاگ کر ایک اسمارٹ سے شخص سے لپٹ گیا۔

''تم گدھے۔ فول اب آئے ہو۔ اب۔ اب۔ اب تک تو انہوں نے نینسی کو مار دیا ہو گا اور میں۔ میں بھلا جی کر کیا کروں گا۔

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

تبریز نے اندازہ لگایا تھا۔ کہ آنے والا شخص شیخ ثوبان ہے۔ اور پھر شیخ ثوبان کے ساتھ ایک بند گاڑی میں وہ وہاں سے آ گئے۔ اسی اپارٹمنٹ میں انہیں نینسی بھی مل گئی تھی۔ بہت نڈھال اور شکستہ حال تھی وہ۔ غالباً اسے اکثر بھوکا رکھا جاتا تھا۔

شیخ ثوبان نے اسے بتایا تھا کہ داؤد خان کے فلیٹ اور نینسی کے اپارٹمنٹ پر اس نے انہیں تلاش کیا تھا۔ اب بھی اس کے آدمی داؤد خان کے اپارٹمنٹ کی نگرانی کر رہے تھے۔ اور سارے عرصے میں وہ صرف ایک بار اپنے اپارٹمنٹ میں آیا اور اس کے آدمیوں کو جُل دے کر نکل گیا۔ آج اتفاق سے وہ اپنے اپارٹمنٹ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے والے فلیٹ پر پڑی۔ اس کی عادت تھی کہ اکثر فارغ وقت میں وہ دوربین لے کر دیکھتا رہتا تھا۔

فلیٹ کی کھڑکی میں اسے جولیس نظر آیا۔ اس نے دو تین بار غور سے دیکھا۔ وہ جولیس ہی تھا۔

یعنی جس شخص کو وہ سارے شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ وہ اس کے اپارٹمنٹ کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں موجود تھا اور اسے خبر تک نہیں تھی۔

جولیس کو دیکھتے ہی اس نے اپنے امریکن دوستوں کو بلا لیا۔ ان میں سے کچھ افراد ایسے تھے جن کا تعلق ایسی تنظیموں سے تھا جو اُجرت پر ہر کام کر دیتی تھیں۔ حتیٰ کہ قتل بھی۔ پولیس کو انفارم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سو وہ تین گھنٹوں بعد ہی انہیں آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اپارٹمنٹ خالی تھا اور لاک تھا۔ اس کے ایشیائی دوستوں میں سے ایک ہر طرح کے لاک کھولنے میں ماہر تھا۔ سو اس طرح وہ آزاد ہو کر شیخ ثوبان کے ساتھ آ گئے تھے۔

شیخ نے انہیں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرایا تھا۔ یہ سیاہ فام امریکی شیخ ثوبان کا عزیز ترین دوست تھا۔ اور اس کے اختیارات لامحدود تھے۔

وہ کیا کرتا تھا۔

کون تھا اس کے متعلق تو معلوم نہیں ہو سکا تھا لیکن چند ہی دنوں میں اس نے ان کے جانے کا انتظام کر دیا تھا۔ اور ٹھیک پندرہ دنوں بعد دوبئی میں شیخ ثوبان کے محل نما مکان میں بیٹھے ٹی۔ وی دیکھ رہے تھے۔ اور شیخ ثوبان کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ جسے آج کی فلائٹ سے پہنچنا تھا۔

ٹی۔ وی پر دوبئی میں ہونے والے ایک میوزک کنسرٹ کی جھلکیاں دکھائی جا رہی تھیں جس میں پاکستان سے آنے والے فنکار گا رہے تھے۔

تبریز اور جولیس باتیں کر رہے تھے۔ فی الحال جولیس اور نینسی بھی ان کے ساتھ آئے تھے۔ بعد میں

ان کا پروگرام ناروے جانے کا تھا۔ جولیس کا ایک چچا ناروے میں رہتا تھا۔ اور جولیس کا خیال تھا کہ وہ ناروے میں اپنے چچا کے ساتھ ان کے بزنس میں شراکت کر لے گا اور باقی ماندہ زندگی وہاں ہی گزار دے گا۔

حبیبہ اپنے دھیان میں مگن تھی لیکن اس کی نظریں ٹی۔ وی پر تھیں۔ یکایک وہ چونک پڑی۔

''چھاپ تلک سب چھین لیو''

اسکرین پر ریٹا گا رہی تھی۔

آنکھیں بند کیے بے خودی کے عالم میں۔

آواز میں گداز اور سوز۔

یوں لگتا تھا جیسے اس کا سارا وجود ہی سراپا سوز ہو۔ چہرے پر محبت کی روشنی تھی۔ آنکھوں میں جیسے آنسو ٹھہرے سے گئے تھے۔ وہ گا رہی تھی اور لوگ دم بخود سن رہے تھے۔

اس نے ریٹا کا گانا پہلے بھی سنا تھا۔ لیکن تب اس کی آواز میں اتنا درد نہیں تھا۔

یہ درد تو اب رچا تھا۔ اس کی آواز میں شاید کیفی کی محبت نے یہ درد بخشا تھا اسے۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ اور اس سے مزید گانے کی فرمائش کر رہے تھے اور وہ سب کا شکریہ ادا کر رہی تھی اور حبیبہ کی نگاہیں اس پر جمی تھیں کہ شیخ ثوبان آ گیا اور جولیس نے اٹھ کر ٹی۔ وی کا سوئچ آف کر دیا۔ شیخ ثوبان ان کے لیے خوشخبری لایا تھا۔

میڈم مارتھا، بگ باس اور داؤد خان کار ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔

گمان غالب ہے کہ یہ اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ قتل تھا کیونکہ اسی روز داؤد خان کے فلیٹ میں پانچ لاشیں ملیں جو غالباً مارتھا کے آدمی رہے ہوں گے۔ اخباروں نے لکھا ہے کہ بگ باس اور مارتھا، ہیروئن کے اسمگلر تھے اور ان کا ٹکراؤ کسی مخالف گروپ سے ہو گیا تھا جس نے انکے گروہ کا خاتمہ کر دیا۔ نینسی کو اس وقت تک یقین نہیں آیا جب تک شیخ ثوبان نے انہیں اخبار نہیں دکھا دیا۔ اخبار دیکھنے کے بعد جولیس نینسی کی کمر میں بازو ڈال کر ناچنے لگا اور ناچتے ناچتے اس نے اعلان کیا کہ وہ اب ناروے ہرگز نہیں جائے گا۔ بلکہ واپس امریکہ جائے گا اور وہاں جاتے ہی ایک ہفتے بعد نینسی سے شادی رچا لے گا۔

شیخ ثوبان ہنس رہا تھا

تبریز کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ برسوں بعد اسے یوں لگا تھا جیسے اس کے کندھوں سے کوئی بہت بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ جیسے وہ طویل قید کے بعد آزاد ہوا ہو۔

''اب ہم بھی پاکستان جائیں گے حبیبہ اور وہاں میں تمہیں میاں جی سے ملواؤں گا۔ ماما سے، سونیا سے۔ رمیض اور باصر سے''

''لیکن وہاں مس اینجل بھی تو ہوں گی۔ وہ''

حبیبہ نے پوچھا۔

''میم اینجل اور دوسرے کارندے تو محض مہرے تھے۔ بادشاہ پٹ جائے تو مہروں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی''

تبریز اپنے اندر بڑی تقویت محسوس کر رہا تھا۔

''میں مس اینجل اور دوسرے لوگوں کے متعلق وہاں جاتے ہی پولیس کو باخبر کر دوں گا۔ اور پھر وہاں جا کر میاں جی، ماما، اور پاپا کی اجازت سے مجھے تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا رفیق سفر بھی تو بنانا ہے کیا تمہیں میرا وعدہ یاد نہیں''

حبیبہ کی نظریں جھک گئی تھیں

مگر پاکستان جانے سے پہلے ہی شیخ ثوبان کے محل نما مکان میں ایک شام دونوں نکاح کے بندھن میں بندھ گئے۔ اس شام شیخ ثوبان کے گھر میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ اور ان روشنیوں کا عکس حبیبہ کے چہرے پر اتر آیا تھا اور اس کی لانبی پلکیں بار بار بھیگ جاتی تھیں۔

میں گناہ گار عاجز بھلا اس قابل کہاں تھی کہ وہ مجھے اتنا نوازتا۔

''اور جب وہ نوازنے پر آتا ہے تو آدمی کا دامن چھوٹا پڑ جاتا ہے''

مہراں نے اسے سمجھایا تھا۔ اس رات مہراں بھی بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ جس روز سے وہ آئی تھی' ہاسپٹل میں تھی کیونکہ اس کی طبیعت کافی خراب تھی۔ ذہنی حالت بھی کچھ ٹھیک نہ تھی۔ لیکن اس روز تبریز اسے لے آیا تھا۔

''مہراں آپا آج میرا نکاح ہے''

''لیکن یہاں''۔

مہراں قدرے بہتر تھی۔

''ہاں مجبوری ہے آپا۔ شیخ ثوبان عمرہ کرنے جا رہے ہیں۔ میرا دل بھی چاہا اور حبیبہ بھی جانا چاہتی تھی۔ لیکن بغیر محرم کے کیسے ممکن تھا۔ حبیبہ کے لیے وہاں جانا۔ سو یہی فیصلہ ہوا کہ نکاح ہو جائے''

''وہ دینے والا بھی بڑا بے نیاز ہے''

مہراں نے آہستگی سے کہا۔

جسے چاہے پر بلا لے۔ ایک وہ تھی جو برسوں سے یہ خواہش دل میں پالے تھی اور ایک یہ تھی حبیبہ۔

مہراں کو ڈاکٹر نے سفر کی اجازت نہیں دی تھی۔ طے یہی پایا تھا کہ عمرے سے واپسی پر وہ پھر دبئی آئیں گے اور یہاں سے مہراں کو ساتھ لے کر وطن واپس چلے جائیں گے۔ چنانچہ آج وہ تینوں مکہ میں موجود تھے۔

شیخ ثوبان کے ساتھ تبریز دوبارہ حرم شریف کی طرف چلا گیا اور جب عشاء کی نماز پڑھ کر واپس آیا تو حبیبہ جاگ اٹھی تھی اور اس کے اضطراب میں کچھ کمی آ گئی تھی۔

اگلی صبح انہیں مدینے روانہ ہونا تھا اور چند دن مدینہ ٹھہر کر واپسی تھی۔ مدینہ میں شیخ ثوبان کے ایک دوست کے ہاں قیام کا بندوبست تھا۔

صبح نماز فجر کے بعد وہ روانہ ہو گئے حبیبہ کے دل پر عجیب کیفیت طاری تھی۔

نماز ظہر کے وقت وہ مسجد نبویؐ کے سامنے تھے۔ شیخ ثوبان، حبیبہ کو بتا رہے تھے کہ ترکوں نے مسجد نبویؐ کی تعمیر و توسیع کے لیے مدینہ سے چھ سات کوس دور ایک بستی تعمیر کی تھی، جہاں تعمیر کا کام کیا جاتا تھا۔

اور حبیبہ کا اندر باہر تشکر کے جذبات سے بھیگتا جا رہا تھا کہ اسے یہ سعادت یہ مقام نصیب ہوا۔

مہراں نے جانے کیا کیا پیغام دیے تھے، ذہن سے نکل گئے تھے۔ پتا نہیں مہراں نے کیا کیا کہا تھا کہ جب مسجد نبویؐ میں جانا تو میرے آقا سے کہنا کیا___؟ کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی، لوگ ہی لوگ تھے۔ کچھ تلاوت کر رہے تھے، کچھ نوافل ادا کر رہے تھے اور کچھ درود شریف کا ورد کر رہے تھے۔

بڑا روح پرور نظارہ تھا۔

''یہ وہ چبوترا ہے، جہاں موذن اذان دیتا ہے۔

اور وہ ریاض الجنتہ کے سامنے دائیں جانب وہ ممبر رسول ﷺ ہے جس پر بیٹھ کر آپ ﷺ وعظ فرمایا

کرتے تھے''

شیخ ثوبان بتا رہے تھے۔

وہ سن بھی رہی تھی اور نہیں بھی۔

عجیب بے خودی کا عالم طاری تھا اس پر۔

اس بے خودی میں وہ روضہ رسول ﷺ کی جالیوں کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے اختیار ہو گئیں۔ سامنے وہ گول سوراخ تھا، جس میں سے اندر حضور کی قبر مبارک نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اٹھتی تھیں پھر جھک جاتی تھیں۔ اردگرد بھی لوگ تھے۔

وہ درود شریف پڑھ رہے تھے۔

سلام پڑھ رہے تھے۔

جن کی آنکھوں نم تھیں، وجود عاجزی اور آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ ساکت کھڑی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ کو ذرا سا اوپر اٹھایا کہ جالیوں کو چھو لے لیکن پھر ہاتھ نیچے گر گیا۔

''میں اس قابل کہاں؟''

میں گناہ گار عاجزی بندی۔

اتنی دیر سے ٹھہرے ہوئے آنسو پلکوں کا بند توڑ کر رخساروں پہ بہہ نکلے۔

''میرے آقا''

اس کے ہونٹ ذرا سا وا ہوئے مگر پھر شرطوں نے اسے آگے دھکیل دیا۔ پیچھے لوگوں کا ایک ہجوم شوق تھا۔ آنکھوں میں نمی اور نگاہوں میں جذبات سموئے۔

وہ تین دن مدینہ میں رہے اور صبح، دوپہر شام، تینوں وقت مسجد نبوی میں حاضری دی۔

حبیبہ کا دل چاہتا تھا کہ وہیں کسی کونے میں کسی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جائے۔ اور نگاہوں سے روضہء اقدس کی جالیوں کو چومتی رہے، مگر واپس تو جانا ہی تھا۔ دو دن مزید مکہ میں ٹھہر کر شیخ ثوبان کے ساتھ وہ واپس دبئی آ گئے اور دبئی واپس آنے کے ٹھیک ایک ہفتے بعد حبیبہ، تبریز اور مہراں پاکستان کی طرف محو پرواز تھے۔

☆☆☆☆

مراد علی کی آمد سے میاں جی کی حویلی میں ہی رونق نہیں اتری تھی بلکہ یوں لگتا تھا جیسے پورے شاہ پور میں رونق اتر آئی ہو۔

باصر اور مدحت۔

پروفیسر عبید اور سونیا

رمیض اور سویرا۔

سب کے رشتے طے پا گئے تھے اور اب منگنی کی تقریب ہونا باقی تھی۔ خیال یہی تھا کہ یہ تقریب شاہ پور میں ہی منعقد کی جائے۔ صرف تبریز کا انتظار تھا لیکن تبریز کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں تھی کہ وہ کہاں ہے اور کب تک آئے گا۔

''اتنا تو مجھے پتا ہے کہ تیمی بھائی امریکہ میں ہیں لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں اور کس جگہ پر ہیں اور ان سے کیسے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے سمندر خان سے بھی پوچھا تھا لیکن اس نے لاعلمی کا اظہار کیا ہے''

باصر نے سونیا کو بتایا جو تبریز کے لیے بہت پریشان ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ سب بڑے کمرے

میں بچھی دری پر بیٹھے تھے۔
''لیکن معلوم نہیں تبریز بھائی کب آئیں گے تب تک میری چھٹی ختم ہو جائے گی''
رمیض نے پریشانی سے کہا
''بھئی منگنی کی رسم ملتوی نہیں ہونی چاہیے'' رمیض نے حتمی لہجے میں کہا۔
''میری صرف ایک ہفتے کی چھٹی ہے اور میں ماما سے جا کر کہتا ہوں کہ اسی ہفتے میں یہ تقریب ہو جانا چاہیے''
''ویسے مجھے ماما کے اس طرح اتنی جلدی بدل جانے پر بہت حیرت ہے'' باصر نے کہا۔
''بات تو حیرت والی ہے لیکن پاپا اور ماما کے درمیان ہی مذاکرات ہوئے ہیں کچھ۔ دراصل پاپا بہت ناراض تھے ماما سے، وہ خط جو انہوں نے میاں جی کو لکھا تھا اس وجہ سے''۔
سونیا نے تفصیل بتائی۔
''اور پھر میں اور رمیض بھی بہت ضد کر رہے تھے''
''یہ بھی بتاؤ ناں کہ اس میں اہم کردار عبید بھائی نے ادا کیا ہے''۔
رمیض نے کہا تو سونیا کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی اور پلکیں جھک گئیں۔
''باصر بھائی فائنل تو عبید بھائی نے ہی کھیلا ہے ماما کے ساتھ۔ سونیا کے ساتھ شادی کی شرط ہی انہوں نے یہی رکھی تھی کہ باصر اور مدحت کی شادی، اور غالباً یہ سازش سونیا نے ہی تیار کی تھی''
''کیوں سونی؟''
رمیض نے اس کی طرف دیکھا۔
''اوہ تھینکس! تم سب کا بہت بہت شکریہ''۔
باصر نے محبت سے دونوں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔
''یہ مدحت کو کیا میاں جی نے منع کر دیا ہے ہمارے پاس آنے سے''؟
''نہیں وہ بھلا کیوں منع کرتے، وہ خود ہی نہیں آتی'' سونیا نے بتایا۔
''میں ابھی لاتا ہوں اسے''
رمیض باہر نکلا، لیکن برآمدے میں اسے بھاگاں مل گئی۔
''کچھ مہمان آئے ہیں۔ فاضل نے انہیں اندر بھیجا ہے''
بھاگاں کے پیچھے ایک خاتون اور ایک مرد کھڑے تھے۔
رمیض آگے بڑھا۔
''آیئے پلیز!''
وہ انہیں لے کر واپس کمرے میں آ گیا۔
''تشریف رکھیں'' اس نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔
''سونی! بھاگاں سے چائے کے لیے کہو یہ میاں جی کے مہمان ہیں''
باصر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا، لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''میاں جی! میاں جی سے کب ملاقات ہو گی''۔
[illegible] نے بے چینی سے [illegible]

وہ بہت مضطرب اور بے چین لگ رہی تھیں۔
''وہ ذرا کچھ مصروف ہیں شاید''
''وہ ہیں کہاں''
مرد بھی بے قرار دکھائی دیتا تھا۔
''کیا آپ کی ان سے ملاقات نہیں ہوئی'' باصر نے پوچھا۔
''نہیں'' دونوں نے بیک وقت کہا۔
''میاں جی باہر نہیں ہیں کیا؟'' باصر نے رمیض سے دریافت کیا۔
''ہاں شاید وہ ڈاکٹر انکل اور پاپا کے ساتھ اسپتال کی طرف گئے ہیں''
''اوہ!'' عورت بہت بے قراری دکھائی دے رہی تھی۔
کب تک آ جائیں گے؟''
''کچھ دیر میں' خیریت تو ہے ناں خاتون'' باصر نے پوچھا
''وہ ___ وہ کہاں ہے مہر ___ مہر گل؟'' عورت نے بے صبری سے کہا۔
''کون ___؟ مہراں آپا؟'' باصر نے حیرانی سے کہا آپ مہراں آپا کے ___؟
''والدین ہیں ہم ___ میں ماں ہوں ___ ماں ہوں اس کی۔ عورت کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔
''آپ ___!''
باصر اور رمیض کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔
''ہاں، پلیز بلاؤ اسے جلدی ___ کہاں ہے وہ''؟
''وہ تو ___ وہ تو نہیں ہیں'' باصر کی نظریں جھک گئیں۔
''وہ تو کئی ماہ ہوئے یہاں سے چلی گئی تھیں''۔
''نہیں، ایسا مت کہو ___ ایسا مت کہو''
عورت دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
مرد نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر باصر سے مخاطب ہوا۔
''یہاں سے شاہ پور سے میاں جی نے ہمیں خط بھجوایا تھا کہ کیا ہم مہراں کے والدین ہیں اور کیا ہمیں اس کے متعلق کچھ علم ہے۔ ہم نے پشاور سے پتا کیا وہاں داؤد خان کے گھر سے پتا چلا کہ وہ یہاں ہے شاہ پور میں۔
''وہ یہاں تھیں، برسوں پہلے آئی تھیں، لیکن پھر اچانک چند ماہ پہلے کہیں چلی گئیں۔ ہم نے میاں جی نے انہیں بہت ڈھونڈا، داؤد خان مجرم ہے''
''ہاں میں نے اخبارات پڑھے تھے''
''اس کی والدہ نے بتایا تھا کہ داؤد خان مہراں آپا کو کہیں لے گیا ہے۔ آپ کو پشاور میں کسی نے غلط بتایا ہے''۔
''میری بدنصیب بچی!''
عورت اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
''مت رو اب! یہ تم ہی تھیں جس نے اسے گھر سے بے گھر کیا تھا۔ تم ہی اسے دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ تم ہی اس کے وجود سے الرجک ہو گئی تھیں۔ دورے پڑنے لگے تھے تمہیں، مجبوراً مجھے اسے خود سے دور کرنا پڑا''

مرد غصے سے بول رہا تھا اور عورت مسلسل روئے چلی جا رہی تھی اور باصر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح انہیں دلاسا دے۔

"میری مہر پتا نہیں کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی، پتا نہیں زندہ بھی ہے یا نہیں"

عورت روتے روتے بول رہی تھی، مرد خاموش تھا۔ تب ہی باہر سے باتوں کی آواز آئی۔

"شاید میاں جی آ گئے ہیں"

باصر کھڑا ہو گیا۔

"ہم بھی اب چلیں گے" مرد نے کہا

"ہم تو مہر کے لیے آئے تھے، وہ نہیں تو ہم ٹھہر کر کیا کریں گے"۔

"نہیں___ نہیں پلیز آپ بیٹھیں میاں جی شاید ادھر ہی آ رہے ہیں۔ مہراں آپا انہیں بھی بہت عزیز تھیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ یہاں سے یوں ہی کھڑے کھڑے آ کر چلے جائیں"۔

تب ہی ڈاکٹر شاہ محمد ہنستے ہوئے اندر داخل ہوئے ان کے پیچھے میاں جی اور مراد علی تھے۔

"باصر! خوشخبری سنو! آج تمہارے پاپا سے بھی اسپتال کے لیے دس لاکھ کا چیک لکھوا لیا ہے"۔

انہوں نے قہقہہ لگایا۔

"اور یہ پہلا اور آخری چیک نہیں ہے"؟

وہ مڑ کر مراد علی کو دیکھنے لگے جو مسکرا رہے تھے۔

"شیور!" انہوں نے کہا۔

"جو مجھ سے ہو سکا کروں گا، بلکہ وہاب سے بھی کہوں گا کہ وہ بھی کچھ کرے"۔

"میاں جی! آپ کے مہمان ہیں، مہراں آپا کے والد اور والدہ" باصر نے تعارف کروایا۔

مرد نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔

عورت بدستور سر جھکائے رو رہی تھی۔

"بڑے بدنصیب ہیں آپ اتنی نیک دل بچی کو خود سے جدا کر رکھا تھا۔ اللہ کی نعمتوں کو یوں ٹھکراتے ہیں"

عورت نے روتے روتے سر اٹھایا۔

"ہم واقعی بڑے بدنصیب ہیں میاں جی" عورت نے روتے روتے کہا۔

"رباب تم!" ڈاکٹر شاہ محمد بے اختیار آگے بڑھ آئے۔

"مہراں تمہاری بیٹی تھی۔ تمہاری!"

عورت حیرت سے آنکھیں کھولے ڈاکٹر شاہ محمد کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ Disable Child ابنارمل بچی تمہارے گھر کیسے پیدا ہوگئی۔ یہ نحوست تو صرف میرے خاندان کا مقدر تھی"

عورت کی نظریں جھک گئی تھیں۔

"بلال!"

لمحہ بھر بعد اس نے جھکی جھکی نظروں سے پوچھا۔

کہاں ہے کیسا ہے؟"

"مر چکا ہے"۔

ڈاکٹر شاہ محمد نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆☆

بارہ ربیع الاول کی خوبصورت صبح تھی۔ اور آج میاں جی کی حویلی میں بیک وقت سونیا اور باصر کی منگنی کی تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ دو دن بعد رمیض کی منگنی کا فنکشن لاہور میں ہونا طے پایا تھا۔

بھاگاں، فاضل اور بابو ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ باہر مہمان خانے کو سجایا جا رہا تھا۔ یوں بھی شاہ پور کی روایت تھی کہ بارہ ربیع الاول کو میاں جی کی حویلی میں دیگیں پکتی تھیں۔ شاہ پور کے ہر گھر میں کھانا حویلی سے جاتا تھا۔ فاضل جھنڈیاں لگا رہا تھا۔ میاں جی کے عقیدت مند دور دور سے آئے تھے۔ باصر اور رمیض باتیں کرتے ہوئے حویلی سے باہر نکلے۔

"دل میں اداسی سی ہے"۔ رمیض نے باصر سے کہا۔

"اتنی خوشی کے باوجود بار بار تبریز بھائی کا خیال آ رہا ہے"

"ہاں، خدا انہیں خیریت سے رکھے، جہاں بھی ہوں"۔

باصر نے بھی افسردگی سے کہا اور وہ دونوں مردانے کی طرف مڑ گئے، جہاں سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ بہت جذب سے میاں___ صاحب گا رہے تھے۔

نمی دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقصم
مگر نازم بہ آں ذوقِ کہ پیش یار می رقصم

"میاں صاحب کی آواز میں بڑا سوز ہے"۔ باصر نے تبصرہ کیا۔

تب ہی ایک ٹیکسی دروازے پر آ کر رکی۔

رمیض اور باصر نے ایک ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"شاید وہاب انکل اور عبید بھائی وغیرہ آ گئے ہیں" رمیض نے کہا۔

"لیکن یہ تو ٹیکسی ہے۔ ان کی گاڑی تو نہیں ہے"۔

"ارے تبریز بھائی" رمیض چیخا۔

ٹیکسی سے تبریز، مہراں اور حبیبہ اتر رہے تھے۔

"مہراں آپا بھی ہیں۔ شکر ہے میاں جی نے ان کے والدین کو روک لیا تھا" باصر نے زور سے کہا۔

تبریز کرایہ ادا کر کے آگے بڑھا اور جب وہ ان کے قریب پہنچا تو رمیض دوڑ کر ان سے لپٹ گیا۔

"آپ بڑے خاص موقع پر پہنچے ہیں تبریز بھائی"۔

حبیبہ دم بخود سی مردانے سے باہر آتے دیپو کو دیکھ رہی تھی اور اندر میاں جی گا رہے تھے۔

اگر یک قطرہ شبنم بہ پوند بر سر خار
من آں قطرہ شبنم بہ نوکِ خارمی رقصم
بہ نوکِ خارمی رقصم
بہ نوکِ خارمی رقصم

میاں جی گا رہے تھے اور حبیبہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ نگاہیں دیپو پر جمی ہوئی تھیں اور لب ہل رہے تھے۔

تو بے شک عظیم ہے۔
تو رحیم ہے۔
تیری رحمتوں کی کوئی حد نہیں۔
نوازنے پہ آئے تو تیری رحمتیں دامن سمیٹ نہ پائے۔ میں تیری اتنی نوازشوں کے قابل تو نہ
میرے مولا، پر تو نے مجھے بے حساب دیا۔
رمیض اونچی آواز میں بول رہا تھا، باصر ہنس رہا تھا۔ مہراں بھی ہنس رہی تھی اور رو بھی رہی تھی___
حبیبہ نے ان سب کی طرف دیکھا۔
روتی آنکھوں سے مسکرائی اور بے اختیار قریب آنے والے دیپو سے چمٹ گئی۔
"یہ تم ہو___ تم ہو ناں دیپو؟"
"ہاں___ میں" دیپو نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے بھرائی آواز میں کہا۔
"لیکن دیپو نہیں، بلال احمد اور تم ریتو ہو ناں کیسی ہو؟"
"میں ریتو نہیں حبیبہ ہوں"
اس نے سر اٹھا کر دیپو کی طرف دیکھا، مسکرائی اور خوشی سے سرشار ہو کر وہیں سجدہ شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ ریز ہو گئی۔

اختتام